مجموعہ احادیثِ قدسیہ

300 احادیثِ قدسیہ کا حسین مجموعہ، دل پذیر تشریحات، علمی فوائد و نکات اور مکمل و مستند حوالہ جات کے ساتھ

مؤلف

مولانا خالد محمود صاحب

فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

بیت العلوم

ہیڈ آفس: ۲۰، نابھہ روڈ چوک پرانی انارکلی، لاہور فون: 37352483

برانچ: 32-A ترنگی سٹریٹ 38 اردو بازار لاہور فون: 37313884

مجموعہ

احادیثِ قدسیہ

مجموعہ

احادیثِ قدسیہ

300۔احادیثِ قدسیہ کا حسین مجموعہ، دل پذیر تشریحات،
علمی فوائد ونکات اور محقق و مستند حوالہ جات کے ساتھ

مؤلف

مولانا خالد محمود صاحب

فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

بیت العلوم

۲۰۔ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۴۸۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب

مجموعہ احادیثِ قدسیہ

مؤلف

مولانا خالد محمود صاحب
فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

باہتمام

مولانا محمد ناظم اشرف

طباعت بارِ اول

دسمبر ۲۰۱۱ء

ناشر

بیت العلوم

ہیڈ آفس: ۲۰ - نابھہ روڈ چوک پرانی انارکلی، لاہور، فون 042-37352483
برانچ: دکان نمبر ۱۰ الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ - اردو بازار لاہور، فون 042-37313884
www.baitululoom.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿تقریظ﴾

(مبلغِ اسلام مولانا محمد کفیل خان مدظلہ)
(استاذ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور)

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ مسلمان دیگر مذاہب کے بالمقابل علمِ حدیث میں ممتاز تھے اور ممتاز رہے، تمام مذاہب خواہ خود ساختہ ہوں یا خدا ساختہ اُن کے پاس ان کی مذھبی کتابیں تو تھیں، لیکن ان کے گرد اِن کے مذھبی پیشواؤں کا پہرہ نہ تھا، ان کی روایات ان کی کتابوں کی ترجمان نہ تھیں، پھر جو کچھ بھی ہوا وہ سب کے سامنے ہے، وہ کتابیں نہ لفظاً محفوظ رہیں نہ معناً محفوظ رہ سکیں، ہر کتاب ہر نئے ایڈیشن پر نیا موڑ لیتی رہی، اور ہر ایک قوم کی کتاب محض ایک تاریخی یادگار ہو کر رہ گئی۔

جب کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کے گرد علمِ حدیث کو پہرے دار بنا دیا، چنانچہ وہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ عملِ نبوۃ کو بھی روایت کرتے گئے اور پہلی پانچ صدیوں میں اس پر خاصی محنت ہوئی یہاں تک کہ علمِ حدیث کے سائے میں قرآن کریم ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رہا۔

یہ حقیقت دوسرے مذاھب کے لئے عموماً اور اھلِ کتاب کے لئے خصوصاً نہایت تلخ تھی لہٰذا ان کی نظرِ عتاب علومِ اسلامی میں سے صرف اس پر مرکوز ہو گئی اور وہ پوری کوشش و کاوش سے اس کے راستے میں شکوک وشبہات کے کانٹے بکھیرتے گئے۔ دراصل مسلمانوں کو علمی قیادت اسی قوم سے چھین کر عطا فرمائی گئی تھی اس لئے ان کا بُغض دیگر اقوام کے مقابل مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھا، یہ علمی راہ سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے اور علمِ حدیث پر چڑھائی کر دی۔ ہندوستان میں انگریزی عمل داری تھی۔ انگلستان سے

پادری آتے اور عجیب عجیب انداز میں لوگوں کے ذہن میں شکوک وشبہات کے جراثیم پیدا کرتے رہے۔ افسوس اس بات کا ہے ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مغربی مآخذ پر زیادہ اعتماد کرتا رہا، علماء کی تصانیف کا مطالعہ کسر شان سمجھتے ہوئے خود کو اسی فکر میں ڈھال لیا جو انگریز پیدا کرنا چاہتا تھا۔ **الحمد للّٰہ** علماءِ کرام نے ہر دور میں حدیث کی عظمت کے پرچم کو بلند رکھا۔

ایک وہ وقت تھا کہ پورے برصغیر میں مشکوٰۃ اور مشارق الانوار کے چند نسخے تھے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ عرب سے بخاری، موطاء کے نسخے لائے اور یہاں کے لوگ ان کتابوں سے روشناس ہوئے، لیکن آج **الحمد للّٰہ** چپے چپے پر آقا علیہ السلام کے فرامین کی دھوم مچی ہوئی ہے۔

ہر شخص اپنی اپنی ہمت کے مطابق اس فرضِ دین میں شامل ہو رہا ہے۔

اجازت ہو تو آ کر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں

سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہوگا

اب دنیا میں دربارِ رسالت کی پہرے داری سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے، الحمدللّٰہ ہمارے فاضل دوست محترم حضرت مولنا خالد محمود صاحب مدظلہ (مدرس جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد) جو ایک باعمل عالم کے فرزند ارجمند ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی نہایت اعلیٰ ادبی، علمی ذوق رکھتے ہیں اور زمانہ طالبِ علمی ہی سے لکھنے لکھانے کے شوقین اور انتہائی محنتی اور ذھین طلباء میں شمار ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے بھی یہ خدمت لی کہ زیر نظر کتاب جو احادیثِ قدسیہ کے مجموعے پر مشتمل ہے انتہائی جاندار مقدمے، مفید معلومات اور نفیس تشریحات پر مشتمل ہے، خصوصاً ابتدائی صفحات پر ملنے والی معلومات تو کوزے میں دریا سمیٹنے کے مترادف ہیں۔ موصوف کی جو خاص عاشقانہ سوچ اور والہانہ عقیدت ہے وہ کئی جگہ پر قلب سے قلم پر اور وہاں سے پڑھنے والے پر بھی طاری ہوتی نظر آتی ہے اور الفاظ نظر کے راستے دل پر اثر انداز ہو کر بخارِ عشق کی شکل میں آنکھوں سے جاری ہوتے ہیں۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

محترم قارئین! حدیث، ترجمہ حدیث تشریحِ حدیث انتہائی نازک اور کٹھن مرحلہ ہے جسے ہمارے فاضل دوست نے انتہائی خوبی سے نبھایا ہے (میری یہ معروضات سوائے ریشم پرٹاٹ کے پیوند کے اور کچھ بھی نہیں)

کسے خبر ہے کہ کیا رنج و غم اٹھاتے ہیں
تراش کر جو زباں کو قلم اُٹھاتے ہیں

فاضلِ مؤلف نے باعتبار متن کے حدیث کی تین اقسام یعنی حدیثِ قدسی، حدیثِ مرفوع اور حدیثِ موقوف میں سے حدیثِ قدسی پر جو کام کیا ہے۔ اللہ اسے قبولیت اور مقبولیت عطا فرماتے ہوئے ہم سب کو دین کی خدمت اور آقا ﷺ کی غلامی کے لئے قبول فرمالے۔

اور تمام صاحبانِ قلم کے علم و قلم میں خوب خوب برکتیں پیدا فرمائے۔

ہوئی جب دشمنانِ دین کی یلغار سُنت پر
سنبھالا پرچمِ اسلام اھلِ علم نے بڑھ کر
حفاظت سند کی پھر متن کی جب ہو چکی پوری
تو اُمت پھر منظم ہوگئی آقا تیرے در پر

دعا گو! گدائے در محمد و آل و اصحاب محمد ﷺ
بندۂ فقیر محمد کفیل عفی عنہ
مدرس جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد
۱۰/صفر ۱۴۳۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

حدیثِ قدسی احادیث کی وہ بلند ترین قسم ہے، جس کی خبر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو الہام یا خواب کے ذریعہ دی ہو اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے معنیٰ ومفہوم کو اپنے مبارک الفاظ میں بیان فرمایا ہو۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ جسے سرکارِ دوعالم ﷺ نے خواب، الہام یا جبریل امین کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہو اور الفاظ کا انتخاب خود آپ ﷺ کا ہو۔ ایسی حدیث کی قدر ومنزلت اور تقدس وعظمت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، جس کے الفاظ کا چناؤ حضور ﷺ کا ہو اور مفہوم حق تعالیٰ شانہ کا عطا کردہ ہو۔

محدثین عظام کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ انہوں نے حدیث کی ہر ہر جہت پر تحقیق کے دروازوں سے پوری امتِ مسلمہ کو نہ صرف یہ کہ روشناس کرایا بلکہ اپنی انتھک محنت اور عرق ریزی سے حدیث کی سند اور متن پر علم و یادداشت کے دریا بہا دیے۔ صحابہ کرامؓ نے جس طرح کھپ کر حفظِ حدیث کی امانت کو تابعین تک پہنچایا، اور تابعین نے جس احتیاط و جانفشانی کے ساتھ اسے تبع تابعین کے سپرد کیا، اور پھر ہر نسل یہ مقدس امانت جس اہتمام اور کڑی شرائط کے ساتھ بعد کی نسل کو سونپتی رہی، اس کی داستان ایسی مسلسل اور حیرت انگیز ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

احادیث کی دیگر اقسام کی مانند احادیث قدسیہ کو جمع کر کے مجموعہ تیار کرنا زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک کئی کتب عربی اور اردو میں منظر عام پر آچکی ہیں، احقر کی یہ پرانی خواہش تھی کہ احادیثِ قدسیہ پر مبنی کوئی مجموعہ طبع کرنے کی بیت العلوم کو بھی سعادت نصیب ہو جائے۔ یہ خواہش کئی برس تک دیگر اہم امور کی وجہ سے دبی رہی، پھر اس اہم اور نازک کام کے لئے ذوق اور شوق دونوں چیزیں درکار تھیں جس کے لیے ہر کس وناکس کا انتخاب بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بالآخر ہمارے محبت کرنے والے دوست مولانا خالد محمود صاحب مدظلہم العالی جنہیں فنِ حدیث اور عربی ادب میں ایک خاص ذوق حاصل ہے اور اُن کی مختلف موضوعات پر درجنوں کتابیں اُن کے ذوق وشوق کی عکاس ہیں، انہوں نے

نے نازک کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی، مولانا موصوف کی لگن اور جذبہ کا نتیجہ تھا کہ کچھ ہی عرصے کے بعد مولانا موصوف احادیث قدسیہ کا مسودہ تھامے احقر کے پاس تشریف لے آئے۔ چونکہ اس دوران مشاورت کا سلسلہ جاری رہا، اس لیے طے شدہ باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے احادیثِ قدسیہ کا یہ مجموعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سننِ ابی داؤد، سننِ نسائی، سننِ ابن ماجہ اور موطا امام مالک کی مستند ترین کتب حدیث سے اخذ کیا گیا۔ حدیث کا کام نازک اور دشوار ہونے کے ساتھ ساتھ ذمہ داری والا بھی ہوتا ہے۔ مولانا مدظلہم العالی نے اس کام کو بڑے احسن طریقے پر بھرپور محنت سے انجام دیا، اور فائدہ کے تحت احادیث کی بہت مفید تشریحات کیں۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مولانا موصوف کو اس کارِ خیر پر اجرِ عظیم عطا فرمائیں، نیز احقر اور بیت العلوم کے تمام کارکنان کو بھی اس اجرِ عظیم میں حصہ دار بنادیں۔ آمین

احقر محمد ناظم اشرف
یکم محرم الحرام ۱۴۳۳ء
27 نومبر 2011ء

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿مقدمہ مؤلف﴾

الحمد للّٰہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، والصلاۃ والسلام علی افضل المرسلین، وخاتم النبیین، سیدنا محمد، وعلیٰ آلہ الطیبین، وصحابتہ الاکرمین، والتابعین لھم باحسان الیٰ یوم الدین.

وبعد: یہ کتاب ان ''احادیث قدسیہ'' پر مشتمل ہے جو مندرجہ ذیل کتب حدیث میں موجود ہیں:

(۱) امام دارالہجرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **''الموطاء''**۔

(۲) امام المحدثین محمد بن اسماعیل البخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **''صحیح البخاری''**۔

(۳) امام ابوالحسن مسلم بن الحجاج القشیری النیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **''صحیح مسلم''**۔

(۴) امام ابوعیسیٰ الترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **''الجامع''**۔

(۵) امام ابوداؤد السجستانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **''سنن ابی داؤد''**۔

(۶) امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **''سنن النسائی''**۔

(۷) امام ابن ماجہ القزوینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **''سنن ابن ماجہ''**۔

کتاب ہذا میں ''احادیث قدسیہ'' کی جمع وتالیف کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر حدیث مکرر آئی ہو اور روایات مختلف نہ ہوں اور ایک ہی صحابی رسولؐ سے مروی ہو تو اسے صرف ایک بار ہی ذکر کیا جائے گا۔ لیکن جب روایات مختلف ہوں، خواہ ایک ہی کتاب میں کمی بیشی کے لحاظ سے ہو یا عبارت اور صحابی رضی اللہ عنہ کی تبدیلی کے اعتبار سے ہو تو ایسی صورت میں دوسری روایت کو بھی (افادۂ عام کی خاطر) ذکر کیا جائے گا۔ خواہ وہ روایت مکمل ذکر کی

جائے یا اس میں موجود کمی اور زیادتی سے آگاہ کر دیا جائے' البتہ ایسا بہت ہی کم ہوا ہے۔

ہمارا ارادہ ہوا کہ ان احادیث قدسیہ مبارکہ کی تشریح وتوضیح' علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ کی "شرح صحیح البخاری" سے کی جائے' اس لیے کہ ان کے ہمعصر محدثین کرام نے اسے بہت پسند بھی کیا ہے اور ائمہ متاخرین نے بھی اسے بنظر استحسان دیکھا ہے۔

نیز امام الائمہ' قدوۃ العلماء والصلحاء امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی معروف ومشہور اور مستند ومتداول "شرح صحیح مسلم" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

اس لیے کہ علمائے امت کے نزدیک ان کا قول معتمد ہے اور وہ مؤلفین ومصنفین کا مرجع ہیں۔ نیز ان کی طرف کسی قول کی نسبت' قوی حجت کی علامت ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں بہت سی احادیث مبارکہ کی تشریح کیلئے کتب تفاسیر ولغت کی طرف بھی مراجعت کرنا پڑی ہے' جیسے تفسیر ابن کثیر' تفسیر قرطبی' تفسیر ابن جریر' تفسیر کشاف' تفسیر خازن' تفسیر روح المعانی' تفسیر مدارک التنزیل' تفسیر کبیر اور تفسیر عثمانی وغیرہ۔ نیز علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی "فتح الباری" اور علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی "عمدۃ القاری" ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرح مشکوٰۃ "مرقات المفاتیح" اور لمعات التنقیح' اشعۃ اللمعات اور مظاھر حق جیسی قابل اعتماد کتابوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

بعض مقامات پر ہم نے شرح القسطلانی کی مکمل عبارت اخذ کی ہے اور بعض جگہوں پر عبارت کا حاصل اور خلاصہ لے لیا ہے اور یہ خلاصہ بعض جگہ ایک ہی مقام کی عبارت کا ہے اور بعض جگہوں پر ان مختلف مواضع کی عبارات کا خلاصہ ذکر کر دیا گیا ہے جہاں وہ حدیث مبارک' صحیح بخاری میں مکرر آئی ہے۔

البتہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی "شرح صحیح مسلم" سے اکثر جگہ پر اختصار کے بغیر مکمل عبارت نقل کر دی گئی ہے' اس لیے کہ ان کی شرح انتہائی جامع اور بلیغ ہے۔

کتاب ہذا تقریباً تین سو سے کچھ زائد "احادیث قدسیہ" پر مشتمل ہے۔ جس میں بعض وہ مکررات بھی شامل ہیں' جن کی روایات میں الفاظ کا اختلاف ہے یا راویانِ حدیث

مختلف ہیں۔

نیز ہم نے اس مقدمہ کتاب میں ''حدیث قدسی'' کا معنی ومفہوم' حدیث قدسی اور قرآن کریم میں فروق اور حدیث قدسی اور دیگر عام احادیث مبارکہ میں فروق کو بھی واضح کیا ہے،تاکہ قارئین کرام کوافادہ عام حاصل ہو۔

بعدازاں ہم نے ان ائمہ کرامؒ کے حالات زندگی اختصار کے ساتھ ذکر کیے ہیں جن کی کتب حدیث سے ''احادیث قدسیہ'' کا یہ ذخیرہ مبارکہ جمع کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ سے بصد عجز و نیاز دعاوالتجاء ہے کہ وہ ذات عالی ہمیں ان ائمہ عظام کے راستے پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائے' اس لیے کہ وہ محدثین عظام' نجوم ہدایت' مصابیح دنیا (چراغ جہاں) اور خدامِ سنّتِ رسول امین علیہ السلام ہیں۔ ان ائمہ کرام نے سنت محمدیہ کی حفاظت واشاعت' دین اسلام کے دفاع اور واضعین کی وضع وتحریف سے دین مبین کو محفوظ رکھنے کی خاطر اپنی جانیں تک قربان اور عمریں فنا کردیں۔ رضی اللہ عنھم وارضاھم ونفع المسلمین بعلومھم. (آمین) اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری مدد ونصرت فرمائے اور راہ صواب کی توفیق بھی عطاء فرمائے' اور میرے قابل قدر عزیز ودوست جناب مولانا محمد ناظم اشرف صاحب مدظلہ العالی (مدیر بیت العلوم) کو بھی اس مبارک کتاب کی اشاعت پر جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی تمام خدمات کو قبول فرمائے۔ (آمین) نیز یہ کہ ہمارے اس کام کو محض اپنی رضا اور خوشنودی کا ذریعہ بنائے۔

انہ جواد کریم' وبالا جابة جدیر' وھو حسبنا ونعم الوکیل۔

حدیث قدسی سے متعلق ابحاث!

(۱) حدیث قدسی کا معنی ومفہوم۔ (۲) قرآن اور حدیث قدسی میں فرق۔ (۳) حدیث قدسی، حدیث نبوی، قرآن کریم اور سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کی کتابوں کے مابین فرق کی وجوہات۔

یہ ابحاث کریمہ، علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "**الاتحافات السنية في الاحاديث القدسية**" سے نقل کردہ ہیں۔ انہوں نے ان ابحاث کو "**الاتحافات السنية**" کے خاتمہ میں ذکر کیا ہے۔

اسی طرح سید جمال الدین قاسمی دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "**قواعد التحديث من فنون مصطلح الحديث**" سے بھی ہم نے کچھ مواد نقل کیا ہے۔

اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے حتی المقدور ان ائمہ کرامؒ نے اس کو ذکر کیا ہے، اس لیے ہم نے ان ائمہ عظام کی جلالتِ شان کے پیش نظر ان کی کتابوں کو ہی مرجع ومصدر بنایا ہے۔ علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "اَلْقُدُس" قاف اور دال کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جس کے معنی ہیں، پاکیزگی، اور "**الارض المقدسة**" یعنی پاک زمین، اور اسی سے "**بيت المقدس**" کا لفظ بھی ماخوذ اور معروف ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: **تقدس الله** یعنی اللہ تعالیٰ عیوب سے پاک ہے، اور وہ "**القدوس**" ہے۔ (كذا في المصباح)

ان احادیث مبارکہ کی نسبت "قُدُس" کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ ان کے معنی، اللہ وحدہ کی طرف منسوب ہیں، جیسا کہ "حدیث قدسی" کی تعریفات سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ "حدیث قدسی" اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس کی خبر اللہ جل شانہ، نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام یا خواب کے ذریعہ دی ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا معنی ومفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو۔ قرآن کریم، حدیث قدسی سے افضل ہے، اس لیے کہ اس کے الفاظ

بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ ہیں۔ (الاتحافات السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ)

محدث کبیر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "حدیث قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں جسے رواۃ کے سردار اور ثقات کے مصدر و منبع حضور سرور کائنات علیہ افضل التحیات والتسلیمات نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہو، کبھی تو جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے اور کبھی وحی یا الہام یا خواب کے ذریعہ، جس کی تعبیر کا اختیار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوتا ہے کہ جس عبارت میں چاہیں اسے بیان کر دیں اور یہ "حدیث قدسی" قرآن مجید اور فرقان حمید کے مغایر ہے بایں طور کہ قرآن حکیم کا نزول روح الامین جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے ہی ہوتا تھا اور لوح محفوظ سے جن الفاظ کے ساتھ اس کا نزول ہوتا تھا یقینی طور پر ان ہی الفاظ میں وہ باقی رہتا ہے اور اسے ہر دور اور ہر زمانہ میں تواتر کے ساتھ قطعی طور پر نقل کیا جاتا ہے، اور علماء کرام کے ہاں اس پر بہت سی تفریعات متفرع ہوتی ہیں جن میں سے مشہور یہ ہیں:

(۱) احادیث قدسیہ کی قراءت سے نماز درست نہیں ہوگی (۲) جنبی شخص، حیض ونفاس والی عورت کیلئے اس کا چھونا حرام نہیں ہے۔ (۳) احادیث قدسیہ قرآن کریم کی طرح معجز نہیں ہوتیں۔ (۴) ان کا منکر کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔ (مرقات المفاتیح)

﴿قرآن کریم اور حدیث قدسی کے درمیان وجوہ فرق﴾

بخاری کے شارح علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ "کتاب الصوم" کے آغاز میں لکھتے ہیں: قرآن کریم کے الفاظ معجز ہیں اور انہیں جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے نازل کیا گیا ہے اور احادیث قدسیہ معجز نہیں ہیں اور بغیر واسطہ کے نازل ہوئی ہیں۔ ان کو حدیث قدسی، حدیث الٰہی اور حدیثِ ربانی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے (اس کے بعد فرماتے ہیں کہ) اگر آپ یہ سوال کریں کہ تمام احادیث ہی اسی طرح ہیں کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاس سے تو کچھ نہ فرماتے تھے؟ میں کہتا ہوں کہ ان میں فرق ہے، وہ یہ ہے کہ حدیث قدسی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہی اسے روایت کیا جاتا ہے جبکہ دیگر احادیث کا حال اس کے خلاف ہے۔ نیز ان میں یہ فرق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حدیث قدسی کا تعلق اللہ

تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات جلالیہ و جمالیہ کی دوسروں سے براءت اور پاکی سے ہوتا ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم ان الفاظ کا نام ہے جو جبریل علیہ السلام، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر نازل ہوئے ہوں اور حدیث قدسی وہ ہے جس کے معنی و مفہوم اللہ تعالیٰ نے الہام یا خواب کے ذریعہ بتائے ہوں۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سامنے اپنے الفاظ میں اسے بیان کیا ہو جبکہ دیگر احادیث کی نہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہوتی ہیں۔ (کذا فی کتاب الفوائد)

شیخ محمد علی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ "کشاف الاصطلاحات والفنون" میں حدیث کی انواع واقسام کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ "حدیث یا نبوی ہوگی یا الٰہی، اسے حدیث قدسی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ حدیث قدسی وہ حدیث ہے جسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تعالیٰ سے روایت کریں جبکہ عام حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ بات نہیں ہوتی۔ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "الفتح المبین فی شرح الحدیث الرابع والعشرین" میں اس کے متعلق میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے یہی مذکورہ بات معلوم و مفہوم ہوتی ہے۔

علامہ چلپی رحمۃ اللہ علیہ نے "حاشیۃ التلویح" میں رکن اول میں قرآن مجید کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "احادیث الٰہیہ وہ احادیث مبارکہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کیا، ان کو اسرار الوحی بھی کہا جاتا ہے۔" (انتہیٰ)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس موقع پر لکھتے ہیں کہ "وحی ملتو یعنی قرآن کریم اور وہ وحی جسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب تعالیٰ سے روایت کیا ہے، جو احادیث الٰہیہ اور احادیث قدسیہ کے نام سے بھی موسوم ہیں جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے، جنہیں بعض ائمہ کرام نے ایک بڑی جلد میں جمع بھی کیا ہے۔ وحی کی ان دونوں قسموں کے مابین فرق واضح کرنا ضروری ہے، فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ جس کلام کی اللہ جل شانہ کی طرف نسبت کی جاتی ہے اس کی چند اقسام ہیں:

(۱) پہلی اور اعلیٰ قسم قرآن مجید ہے، اس لیے کہ وہ معجز ہونے کے لحاظ سے باقی کتابوں سے ممتاز اور مرورِ زمانہ کے باوجود ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے۔ تغیر وتبدل سے محفوظ ہے۔ بے وضو شخص کیلئے اس کا چھونا حرام ہے، جنبی آدمی کیلئے اس کی تلاوت ممنوع، اس کی روایت بالمعنیٰ بھی درست نہیں ہے، نماز میں صرف اس کی تلاوت جائز ہے، اس کا نام قرآن مجید ہے۔ اس کے ہر حرف کے پڑھنے کے بدلے میں دس نیکیاں ملتی ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں اس کی فروخت ممنوع ہے اور شوافع کے نزدیک مکروہ ہے، قرآن کریم کے جملہ کو آیت اور سورت کا نام دیا جاتا ہے جبکہ اس کے علاوہ دیگر کتابوں اور احادیث قدسیہ کیلئے ان احکامات میں سے کوئی حکم بھی ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ ان کا چھونا اور پڑھنا ان لوگوں کیلئے جائز ہے جن کا ابھی ذکر ہوا اور ان کی روایت بالمعنیٰ بھی درست ہے اور ان کا نماز میں پڑھنا جائز نہیں ہے بلکہ اس سے نماز باطل ہوگی، اور ان کو قرآن بھی نہیں کہا جاسکتا اور ان کے پڑھنے والوں کو ہر حرف پر دس نیکیاں بھی عطاء نہیں ہوں گی اور ان کا فروخت کرنا بھی ممنوع نہیں ہوگا اور بالاتفاق مکروہ بھی نہیں ہوگا اور ان کے حصوں کو آیت یا سورت کا نام بھی بالاتفاق نہیں دیا جائے گا۔

(۲) دوسری قسم انبیائے کرام علیہم السلام کی وہ کتب ہیں جو تغیر وتبدل سے قبل کی حالت پر موجود ہوں۔

(۳) تیسری قسم احادیث قدسیہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اور ان کی اسناد (نسبت) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رب تعالیٰ کی طرف کی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کا حصہ ہیں اور اکثر وبیشتر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوتی ہے، اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان احادیث کو ارشاد فرمایا ہے لیکن کبھی ان کی نسبت حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف بھی کی جاتی ہے اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان احادیث کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے امت کو بتانے والے ہیں جبکہ قرآن کریم کا حال اس کے برخلاف ہے کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اور احادیث قدسیہ میں یوں کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ جل شانہ سے روایت کرتے ہیں

کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

احادیث قدسیہ کے علاوہ دیگر احادیث نبویہؐ کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا تمام احادیث وحی الٰہی کے ذریعہ آتی تھیں یا نہیں؟ آیت کریمہ: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى[1]۔ پہلی بات کی تائید کرتی ہے، اسی لیے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: **الا انی اوتیت الکتاب ومثله معه**" یعنی خوب سن لو! مجھے کتاب اور اس کے ساتھ اس جیسا اور کچھ بھی عطا کیا گیا ہے"۔ اور یہ احادیث وحی کی کسی کیفیت میں منحصر نہیں ہیں بلکہ یہ احادیث وحی کی کسی بھی کیفیت میں نازل ہو سکتی ہیں۔ جیسے خواب کا دیکھنا' دل میں القاء ہونا' فرشتے کی زبانی بتانا وغیرہ۔

احادیث قدسیہ کے رواۃ ان احادیث مبارکہ کو دو صیغوں کے ساتھ نقل کرتے ہیں: راوی یوں کہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں جو آپ ﷺ نے رب تعالیٰ سے روایت کی ہے، یہ فرمایا ہے' یہ اسلاف امت کی تعبیر ہے۔ ۲: راوی یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جسے رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔" (انتهىٰ کلامه)

امیر حمید الدین کے فوائد میں مرقوم ہے کہ قرآن حکیم اور حدیث قدسی کے مابین چھ طرح سے فرق ہے۔

(۱) قرآن مجید معجز ہے اور حدیث قدسی معجز نہیں۔ (۲) نماز میں صرف قرآن پاک کی تلاوت جائز ہے حدیث قدسی کی نہیں۔ (۳) قرآن حکیم کا منکر کافر ہے جبکہ حدیث قدسی کا منکر کافر نہیں ہے۔ (۴) قرآن کریم میں یہ ضروری ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جبریل علیہ السلام واسطہ ہوں جبکہ حدیث قدسی کیلئے یہ ضروری نہیں ہے۔ (۵) قرآن کریم کے الفاظ یقینی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہی ہوتے ہیں جبکہ حدیث قدسی کے الفاظ کیلئے یہ لازمی نہیں ہے بلکہ اس کے الفاظ حضور نبی کریم ﷺ کی طرف سے بھی ہو سکتے ہیں۔ (۶) قرآن کریم کا بلا طہارت چھونا جائز نہیں ہے جبکہ حدیث قدسی کو بے وضو شخص بھی چھو سکتا ہے۔ (انتهىٰ)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ہماری اس بات سے حدیث قدسی اور منسوخ التلاوۃ قرآن کے درمیان فرق بھی واضح ہو گیا، جیسا کہ آپ کو اس بحث سے معلوم ہو گیا جسے ہم نے "الاتقان فی علوم القرآن" سے نقل کیا ہے کہ اسے قرآن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اسے آیت بھی کہتے ہیں۔ یہاں تک "الاتحافات السنیۃ" کے آخری حصہ سے نقل کردہ حصہ ختم ہوا۔ اب یہاں سے سید جمال الدین قاسمی دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "قواعد التحدیث" سے کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے:۔

حدیث قدسی کا بیان:

علامہ شہاب ابن حجر الہیتمی رحمۃ اللہ علیہ "شرح الاربعین النوویۃ" میں چوبیسویں حدیث مسلسل بالدمشقین جو کہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: "اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کر دیا ہے اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے لہٰذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔"...... (الحدیث)۔ اس حدیث کے تحت ابن حجر الہیتمی فرماتے ہیں کہ: "یہ عظیم النفع بحث ہے اور انتہائی اہم ہے جس میں وحی متلو، قرآن حکیم اور اس وحی کے مابین فرق بیان کیا گیا ہے جسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں۔ یعنی احادیث الٰہیہ جسے احادیث قدسیہ بھی کہتے ہیں ان کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ بعض علماء نے ان احادیث کو بڑی جلد میں جمع کیا ہے اور مذکورہ حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ عظیم المرتبت احادیث قدسیہ میں سے ہے۔

جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کلام کی تین قسمیں ہیں:

(۱) یہ قسم سب سے اشرف و اعلیٰ ہے اور یہ قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ یہ دوسری اقسام سے اپنے اعجاز کی وجوہِ کثیرہ کی وجہ سے ممتاز ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے۔ تغیر و تبدل سے محفوظ ہے، بے وضو کیلئے اس کا چھونا اور جنبی کیلئے اس کی تلاوت کرنا حرام ہے۔ نیز اس کی روایت بالمعنی بھی درست نہیں ہے اور نماز میں اسی کا پڑھنا ضروری ہے۔ اور اسی کا نام قرآن ہے اور اس کے ہر ہر حرف کے پڑھنے کے بدلے میں دس نیکیاں ملتی

ہیں۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق اس کی بیع ممنوع ہے اور شوافع کے ہاں مکروہ ہے اور اس کے جملہ کو آیت اور سورت کہا جاتا ہے جب کہ اس کے علاوہ دیگر کتابوں اور احادیث قدسیہ کیلئے ان میں سے کوئی حکم ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ ان کا بے وضو اور جنبی کیلئے چھونا اور پڑھنا درست ہے اور ان کی روایت بالمعنیٰ بھی درست ہے اور ان کا نماز میں پڑھنا جائز نہیں بلکہ نماز اس سے باطل ہو جائے گی اور انہیں قرآن بھی نہیں کہا جائے گا اور ان کے پڑھنے والے کو ہر حرف کے بدلہ میں دس نیکیاں بھی نہیں ملتیں اور ان کی بیع بالاتفاق نہ ممنوع ہے اور نہ ہی مکروہ نیز بالاتفاق ان کے کسی حصہ کو آیت یا سورت بھی نہیں کہا جاتا۔

(۲) تحریف سے قبل انبیائے کرام علیہم السلام کی کتب۔ (۳) احادیث قدسیہ، یعنی وہ احادیث مبارکہ جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور خبرِ آحاد مروی اور منقول ہوں، یہ بھی کلام اللہ کا حصہ ہیں اور عام طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ان احادیث کی نسبت کی جاتی ہے، بایں طور کہ اللہ تعالیٰ ہی ان احادیث کے ارشاد فرمانے والے ہیں، بعض اوقات ان کی نسبت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی کی جاتی ہے اس لحاظ سے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان احادیث کی خبر اللہ جل شانہ کی طرف سے دینے والے ہیں، جبکہ قرآن حکیم کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی کی جاتی ہے اور اس کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اور احادیث قدسیہ کے متعلق یوں کہا جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

احادیث قدسیہ کے علاوہ دیگر احادیث نبویہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا وہ تمام کی تمام وحی الٰہی کے ذریعہ نازل شدہ ہیں یا نہیں؟ قرآن پاک کی یہ آیت کریمہ: ''وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی'' کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں فرماتے، اس سے تو پہلی بات کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''الا انی اوتیت الکتاب و مثلہ معہ'' ''سن لو کہ مجھے کتاب (قرآن کریم) دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس جیسا اور بھی'' اور یہ احادیث قدسیہ وحی کی کیفیات میں سے کسی خاص کیفیت میں منحصر نہیں ہیں بلکہ وحی کی کسی بھی کیفیت سے یہ نازل ہو سکتی ہیں، جیسے خواب کے ذریعے یا دل

میں القاء کے ذریعے یا فرشتے کی زبانی۔

احادیث قدسیہ دو صیغوں سے روایت کی جاتی ہے:۔

(۱) رسول اللہ ﷺ اپنے رب جل جلالہ سے روایت کرتے ہیں، اس کے ذیل میں فرمایا یہ سلف کی تعبیر ہے اسی لیے علامہ نووی نے اسے ترجیح دی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جیسا کہ اسے رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔ دونوں عبارتوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔

قرآن کریم اور احادیث قدسیہ میں فرق ہے کہ قرآن کریم وہ ہے جسکے الفاظ ومعانی دونوں وحی جلی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوں' اور حدیث قدسی وہ ہے کہ جس کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوں لیکن اس کے معنی الہام یا خواب میں اللہ جل شانہ کی طرف سے آپ ﷺ پر القاء کیے گئے ہوں۔ بعض کہتے ہیں کہ قرآن کریم معجز الفاظ اور ایسے قول وفرمان کا نام ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے نازل کیا گیا ہے جبکہ حدیث قدسی معجز نہیں ہوتی اور بغیر واسطے کے نازل ہوتی ہے۔ ان کو حدیث قدسی' حدیث الٰہی اور حدیث ربانی کہا جاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید ان الفاظ کا نام ہے جن کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور نبی کریم ﷺ پر نازل کیا' اور حدیث قدسی میں آپ کو الہام کے واسطے سے اس حدیث کے مطلب القاء کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر احادیث کی نہ تو آپ ﷺ نے نسبت اللہ کی طرف کی ہے۔ اور نہ ہی انہیں اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔ (انتھٰی ما نقل عن ابن حجر الهیتمیؒ)

اس کے بعد امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے سید احمد بن مبارک سے "الابریز" میں اپنے شیخ سید عبدالعزیز الدباغ رحمۃ اللہ علیہ کے سوالات کی صورت میں ایک صوفیانہ کلام اور ان کے جوابات نقل کیے ہیں جو چاہے وہاں مراجعت کر لے۔ واللہ اعلم

﴿صحاحِ ستّہ کے مؤلفین کے مختصر حالات زندگی﴾

(۱) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام وکنیت ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم مغیرہ بن بردزبہ الجعفی البخاری ہے۔ آپ کو جعفی اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ آپ کے جدامجد مغیرہ مجوسی تھے اور وہ یمان جعفی بخاری کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے چنانچہ اس نسبت سے آپ کو جعفی کہا جاتا ہے اور جعفی یمن کے ایک قبلہ کے جد اعلیٰ ہیں۔ آپ بروز جمعۃ المبارک ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو پیدا ہوئے اور عید الفطر کی رات ۲۵۶ھ کو تقریباً باسٹھ برس کی عمر (تیرہ روز کم) پاکر وفات پائی۔ آپ نے کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔

آپ نے مختلف امصار وبلاد کے محدثین کرام سے علم حاصل کرنے کیلئے متعدد سفر کیے اور بہت سے حفاظ حدیث سے احادیث مبارکہ لکھیں، جیسے مکی بن ابراہیم بلخیؒ، عبداللہ بن عثمان مروزیؒ، عبیداللہ بن موسیٰ عبسیؒ، ابونعیم فضل بن دکینؒ علی بن مدینیؒ، احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ وغیرہ۔ اور ایک خلق کثیر نے آپ سے احادیث اخذ کی ہیں۔

فیربری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ صحیح بخاری کا سماع نوے ہزار آدمیوں نے کیا ہے لیکن اب میرے علاوہ ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دس سال کی عمر میں علم حاصل کرنا اور گیارہ سال کی عمر میں مشائخ عظام کے پاس آنا شروع کر دیا تھا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب "صحیح البخاری" کو تقریباً چھ لاکھ احادیث مبارکہ سے مرتب کیا ہے۔ اور میں نے ہر حدیث درج کرنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کی ہے۔ امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو وہاں کے محدثین ان کے پاس آئے اور انہوں نے آپ کا امتحان لینا چاہا، چنانچہ سو احادیث کے متون اور اسناد کو تبدیل کر کے دس آدمیوں کے حوالہ کیا اور انہیں یہ حکم دیا کہ وہ یہ احادیث امام بخاری کے سامنے بیان کریں چنانچہ ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے ان سو احادیث میں سے ایک حدیث کے بارے میں دریافت کیا۔ امام بخاریؒ نے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم نہیں

ہے۔ اس نے دوسری حدیث کے بارے میں سوال کیا، آپ نے اس کے متعلق بھی یہی فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں ہے، یہاں تک کہ اس آدمی نے دس کی دس احادیث بیان کر دیں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہر حدیث کے متعلق یہی فرماتے کہ میں اس حدیث کو نہیں جانتا، پھر ان میں سے دوسرا آدمی آگے بڑھا اور اس نے سوال کیا اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں بھی پہلے آدمی کے جواب کی طرح ہی فرمایا۔ یہاں تک کہ دس کے دس آدمی سوال سے فارغ ہو گئے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سب کے جواب میں یہی فرماتے رہے کہ مجھے یہ حدیث معلوم نہیں ہے، علماء تو آپ کے انکار سے سمجھ گئے کہ انہیں سب معلوم ہے اور اس ردوبدل کو بھانپ گئے ہیں لیکن دوسرے لوگ یہ بات نہ سمجھ سکے۔ جب وہ دس کے دس افراد اپنے سوالات سے فارغ ہو گئے تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان میں سے پہلے شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے فرمایا کہ تم نے جو پہلی حدیث بیان کی تھی وہ دراصل اس طرح سے ہے۔ اور دوسری حدیث اس طرح سے ہے، جس ترتیب سے اس نے دس حدیثیں بیان کی تھیں وہ تمام کی تمام بیان کر کے اس کی صحیح سند کو ذکر کیا اور ہر سند کے ساتھ اس کے متن کو لگایا، اس کے بعد باقی نو آدمیوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا، یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے آپ کے قوت حافظہ کا اعتراف کیا اور انہیں آپ کے فضل و کمال کا یقین ہو گیا۔

(۲) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام وکنیت ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم قشیری نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ ہے۔
آپ کی پیدائش ۲۰۴ھ اور وفات ماہ رجب ۲۶۱ھ کو ہوئی۔ آپ نے ستاون سال کی عمر پائی۔

آپ نے طلب علم کیلئے اطراف عالم کا سفر کیا اور یحییٰ بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ، قتیبہ بن سعیدؒ، اسحاق بن راہویہؒ، احمد بن حنبلؒ، قعنبیؒ، رملہ بن یحییٰؒ اور دیگر محدثین کرام سے حدیث کا علم حاصل کیا۔

آپ کئی بار بغداد بھی آئے اور وہاں احادیث بیان کیں اور خلق کثیر نے آپ

سے فیض علم حاصل کیا۔ حدیث صحیح کی معرفت میں اپنے ہمعصر محدثین پر آپ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ''مسند'' کو تین لاکھ سنی ہوئی احادیث سے جمع کیا ہے۔ خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ امام مسلمؒ نے امام بخاریؒ کا طریق اختیار کیا ان کے علم میں غور کیا اور ان کے نقش قدم پر چلے۔ رحمھما اللّٰہ تعالیٰ. آمین

(۳) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام و کنیت ابو عبداللہ مالک بن انس اصبحی ہے۔ آپ امام دار الہجرت کے لقب سے معروف ہیں۔ آپ ۹۵ھ کو پیدا ہوئے اور مدینہ منورہ میں ۱۷۹ھ کو ۸۴ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ آپ امام حجاز بلکہ فقہ و حدیث میں امام الناس ہیں۔ آپ کے فخر و اعزاز کیلئے یہی بات کافی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

آپ نے ابن شہاب زہریؒ، یحییٰ بن سعید انصاریؒ، نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ آپ سے کسب فیض کرنے والوں کی تعداد شمار سے باہر ہے جن میں امام شافعیؒ، محمد بن ابراہیم بن دینارؒ، ابن عبدالرحمٰن مخزومیؒ، عبدالعزیز بن ابی حازمؒ جیسے محدثین بھی شامل ہیں۔ یہ حضرات آپ کے ہم پلہ اصحاب میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ معن بن عیسیٰ قزازؒ، عبدالملک بن عبدالعزیز ماجشونؒ، یحییٰ بن یحییٰ اندلسیؒ، عبداللہ بن مسلمہ قعنبیؒ، عبداللہ بن وہبؒ اصبغ بن فرجؒ جو کہ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابو داؤدؒ، امام ترمذیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معین اور دیگر بہت سے ائمہ حدیث کے مشائخ و اساتذہ میں سے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رحمۃ اللہ علیہ راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''عنقریب لوگ علم کے حصول کیلئے دور دراز کے سفر کریں گے لیکن وہ مدینہ سے بڑا عالم کسی کو نہیں پائیں گے۔'' (جامع الترمذی)

امام عبدالرزاقؒ اور امام سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ اس سے امام مالکؒ مراد ہیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ''ایسا بہت کم ہوا ہے کہ میں نے کسی سے علم حاصل کیا ہو

اور احادیث لکھی ہوں اور وہ وفات سے پہلے میرے پاس فتویٰ پوچھنے اور علم حاصل کرنے نہ آیا ہو"۔

ایک روز امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے سنی ہوئی احادیث بیان کیں تو لوگوں نے آپ سے مزید احادیث سنانے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا: تم ربیعہ کا کیا کرو گے؟ ربیعہ اس وقت ایک جگہ آرام کر رہے تھے، ایک شخص ربیعہ کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ آپ وہی ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کے حوالہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ احادیث بیان کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں! امام ربیعہؒ سے پوچھا گیا کہ امام مالکؒ نے آپ سے کیسے استفادہ کیا، جبکہ آپ نے اپنی ذات سے فائدہ نہیں اٹھایا؟ انہوں نے جواب دیا کہ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ مال و دولت کا ایک مثقال علم کی ایک گٹھری پر بھاری ہوتا ہے۔

-امام مالک رحمۃ اللہ علیہ علم کی بے حد تعظیم کیا کرتے تھے، جب حدیث بیان کرنے کا ارادہ ہوتا تو پہلے وضو کرتے، وقار و عظمت سے بیٹھتے، خوشبو لگاتے آپ بڑے باوجاہت انسان تھے۔ کسی مدنی شخص کے آپ کے بارے میں بہت عمدہ اشعار ہیں:

یدع الجواب فلا یراجع ھیبۃ   والسائلون نواکس الاذقان

ادب الوقار وعز سلطان التقی   فھو المطاع ولیس ذا سلطان

"آپ اگر کسی سوال کا جواب نہ دیتے تو رعب وہیبت کے بارے ان سے مراجعت نہ کی جاتی اور سوال کرنے والوں کے منہ جھکے ہوئے ہوتے، انہیں وقار کا ادب اور تقویٰ کی شاہانہ عزت حاصل ہے ان کی فرمانبرداری کی جاتی ہے حالانکہ وہ صاحب سلطنت نہیں ہیں۔"

یحیٰ بن سعید قطانؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں میں امام مالکؒ سے زیادہ صحیح حدیث بیان کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب علماء کا تذکرہ ہوتا ہے تو امام مالک چمکدار ستارے کی مانند ہوتے ہیں۔ مروی ہے کہ مُکرَہ (جس شخص سے زبردستی طلاق لی گئی ہو) کی طلاق کے بارے میں خلیفہ منصور نے حدیث روایت کرنے سے روک

رکھا تھا پھر از راہ امتحان مکرہ کی طلاق کا مسئلہ پوچھنے کیلئے کسی کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھیجا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں کے مجمع میں یہ حدیث بیان کی کہ ''مکرہ کی طلاق واقع نہیں ہوتی'' خلیفہ نے ان کو کوڑے لگوائے، لیکن آپ نے پھر بھی اس حدیث کو بیان کرنا ترک نہیں کیا۔

خلیفہ ہارون رشید نے جب حج کیا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ''الموطأ'' کا سماع کیا اور آپ کو تین ہزار دینار دیئے اور ان سے کہا کہ آپ کو ہمارے ہمراہ چلنا چاہیے، میں نے یہ عزم کیا ہے کہ جس طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کو ایک قرآن پر جمع کیا تھا اسی طرح میں سب کو ''الموطأ'' پر جمع کردوں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمام لوگوں کو ''الموطأ'' پر جمع کرنا ممکن نہیں، اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وصال نبوی ؐ کے بعد اطراف عالم میں منتشر ہوگئے تھے۔ اس لیے اہل مصر کے پاس بھی علم کا ایک بڑا خزانہ ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اختلاف امتی رحمة'' یعنی میری امت کا اختلاف باعث رحمت ہے۔ اور میرا آپ کے ساتھ چلنا بھی ممکن نہیں ہے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''المدينة خير لهم لو كانوا يعلمون'' یعنی لوگوں کیلئے مدینہ بہتر ہے اگر وہ سمجھیں، اور تمہارے دیئے ہوئے یہ دینار تو ویسے ہی رکھے ہیں میں اس کو مدینة الرسول ؐ پر ترجیح اور فوقیت نہیں دے سکتا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے دروازے پر خراسان کے گھوڑوں اور مصر کے خچروں کی ایسی جماعت دیکھی ہے کہ ان سے زیادہ خوبصورت گھوڑے اور خچر میں نے نہیں دیکھے، میں نے ان سے کہا کہ یہ کتنے خوبصورت جانور ہیں! انہوں نے فرمایا کہ یہ میری طرف سے تمہیں ہدیہ وتحفہ ہے۔ میں نے کہا کہ آپ بھی اپنی سواری کیلئے ان میں سے ایک جانور رکھ لیجئے۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے اللہ سے حیا آتی ہے کہ میں اس مٹی کو کسی جانور کے کھروں سے روندوں جہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک موجود ہے؟ آپ کے مناقب وفضائل بے شمار ہیں، رحمة الله عليه. آمین

(۴) امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام وکنیت سلیمان بن اشعث بن اسحاق اسدی سجستانی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ آپ نے طلب علم کیلئے اطراف عالم کے سفر کیے، ملکوں ملکوں پھرے اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کیا اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ نے اہل عراق، شام، مصر اور اہل خراسان سے احادیث لکھیں، آپ کی پیدائش سنہ ۲۰۲ھ کو اور بصرہ میں ۱۶ شوال المکرم ۲۷۵ھ کو وفات ہوئی۔ آپ نے علم حدیث امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے شیوخ واساتذہ امام احمد بن حنبلؒ، عثمان بن ابی شیبہؒ اور قتیبہ بن سعیدؒ وغیرہ محدثین کرام سے حاصل کیا۔

آپ سے آپ کے بیٹے عبداللہؒ، ابوعبدالرحمٰن نسائیؒ اور ابوعلی لولوئیؒ وغیرہ ایک خلق کثیر نے اکتساب فیض کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "السنن" امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اسے بہت عمدہ اور مستحسن قرار دیا۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ لاکھ احادیث لکھیں پھر ان میں سے چار ہزار آٹھ سو احادیث کو منتخب کیا، میں نے اپنی اس کتاب میں صحیح اور اس کے مشابہ اور قریب قریب درجہ کی احادیث درج کی ہیں اور احادیث کے اس بے کراں ذخیرے میں سے صرف چار احادیث انسان کے دین کیلئے کافی ہیں، وہ چار احادیث یہ ہیں:

(۱) فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم: "انما الاعمال بالنیات" یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

(۲) فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "من حسن اسلام المرء ترکه مالایعنیه" یعنی انسان کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کام ترک کردے۔

(۳) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک: "لایکون المومن مومناحتی یرضی لاخیه مایرضی لنفسه" یعنی کوئی شخص اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کیلئے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

(۴) فرمان رسالت: ''الحلال بیّن والحرام بیّن......الحدیث'' یعنی حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے............''۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ علم ورع، عبادت وتقویٰ کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔

مروی ہے کہ ان کی ایک آستین کشادہ اور دوسری تنگ تھی ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ کشادہ آستین کتابوں کیلئے ہے اور دوسری کے فراخ اور کشادہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم دین میں سنن ابی داؤد جیسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ یہ کتاب اختلاف کے باوجود لوگوں کے ہاں مقبول ہے۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب میں ایسی کوئی حدیث ذکر نہیں کی جس کے ترک کرنے پر علماء کا اجماع اور اتفاق ہو۔ ابن الاعرابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس قرآن مجید اور اس کتاب (یعنی سنن ابی داؤد) کے علاوہ کوئی علم کا ذریعہ نہ ہو تو ان کے ہوتے ہوئے اسے کسی اور علم کی ضرورت نہیں ہے۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ سے قبل محدثین کرام نے جوامع اور مسانید وغیرہ لکھی تھیں جو سنن واحکام کے علاوہ اخبار، قصص اور مواعظ وآداب کو جامع اور حاوی تھیں لیکن محض سنن کے جمع کرنے اور ان کو دیگر موضوعات سے الگ کرنے کا کسی نے ارادہ نہیں کیا اور امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کو اس سلسلہ میں جو امتیازی شان حاصل ہو سکی وہ کسی اور کو نہ مل سکی۔

ابراہیم حربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ کتاب لکھی تو ان کے لئے احادیث کو جمع کرنا اس طرح سہل اور آسان ہو گیا جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کیلئے لوہے کو موم کر دیا گیا تھا۔

(۵) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام وکنیت ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ ترمذی ہے۔ آپ کی ولادت ۲۰۰ھ کو اور وفات ترمذ میں بروز پیر ۱۳ رجب المرجب ۲۷۹ھ کو ہوئی۔ آپ کا شمار حفاظِ حدیث اور علماء حدیث میں ہوتا ہے۔ آپ کو صدر اول کے مشائخ سے ملاقات حاصل ہے، جیسے قتیبہ بن سعیدؒ، محمد بن بشارؒ اور علی بن حجرؒ وغیرہ۔ خلق کثیر نے آپ سے علم حاصل کیا، علم

حدیث میں آپ کی بہت سی تصانیف ہیں اور آپ کی یہ کتاب "جامع الترمذی" بہترین اور مفید ترین کتاب ہے اور اس میں احادیث کا تکرار بھی بہت کم ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب حجاز، عراق اور خراسان کے علماء کے سامنے پیش کی تو سب نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور اسے نظر استحسان سے دیکھا اور جس گھر میں یہ کتاب موجود ہو تو گویا اس گھر میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کلام فرمانے والے موجود ہیں۔

(۶) امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام وکنیت ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی بن بحر نسائی ہے۔ آپ کی پیدائش ۲۱۵ھ کو اور وفات مکہ مکرمہ میں ۳۰۳ھ کو ہوئی۔ آپ بھی حفاظ وائمہ حدیث میں سے ہیں۔ آپ نے علم حدیث قتیبہ بن سعیدؒ، علی بن خشرمؒ، اسحاق بن ابراہیمؒ، محمد بن بشارؒ اور ابوداؤد سجستانیؒ وغیرہ سے حاصل کیا۔ نیز خلق کثیر نے آپ سے فیض علم حاصل کیا۔ حدیث میں آپ کی بہت سی کتابیں ہیں۔ آپ شافعی المذہب تھے اور شافعی مسلک میں آپ کی ایک کتاب مناسک حج پر بھی ہے۔ آپ متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔

حافظ علی بن عمر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے زمانے کے قابل ذکر اہل علم پر سبقت اور تقدم حاصل ہے۔ طرسوس میں شیوخ وحفاظ حدیث کی ایک بڑی جماعت کی ان سے ملاقات ہوئی جن میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے امام عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے اور سب نے آپ کی منتخب کتاب کو لکھا۔

ایک مرتبہ کسی حاکم نے ان سے ان کی کتاب "السنن" کے بارے پوچھا کہ کیا اس کی تمام احادیث صحیح درجہ کی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اس میں صحیح، حسن اور اس کے قریب درجہ کی تمام احادیث موجود ہیں۔ حاکم نے کہا کہ آپ ہمارے لیے صرف صحیح درجہ کی احادیث کو جمع کر کے لکھ دیں۔ چنانچہ آپ نے السنن سے المجتبیٰ کو مرتب کیا اور جس حدیث کی سند میں کلام تھا اسے ترک کر دیا۔ صاحب تیسر الوصول لکھتے ہیں کہ ان ائمہ

کرام کے مناقب واحوال تو بے شمار ہیں، میں نے کچھ تھوڑا سا حصہ نقل کیا ہے، جس سے علم حدیث میں ان کی جلالت شان، اور بلند مرتبتی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔ آمین

(۷) امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا نام وکنیت ابوعبداللہ محمد ابن یزید بن ماجہ ہے، آپ معروف ومشہور کتاب "السنن" کے مؤلف ہیں۔ جو آپ کے علم وعمل، تبحر و وسعت مطالعہ اور اصول وفروع میں اتباع سنت پر دلالت کرتی ہے۔ یہ کتاب ۳۲ کتب، ۱۵۰۰ ابواب اور ۴۰۰۰ احادیث مبارکہ پر مشتمل ہے۔ تمام احادیث عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی ہیں، چند احادیث اس سے مستثنیٰ ہیں۔

امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب، جامع تفسیر اور کامل تاریخ کا درجہ بھی رکھتی ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے ان کے زمانے تک کی تاریخ مندرج ہے۔ آپ سے قدیم اور کبار علماء روایت کرتے ہیں۔ مثلاً ابن سیبویہؒ، محمد بن عیسیٰ صفارؒ، اسحاق بن محمدؒ اور علی بن ابراہیمؒ وغیرہ۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو ہوئی، اس وقت عمر مبارک ۶۴ برس کی تھی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ ماخوذ از (البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۵۲)

☆☆☆
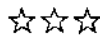
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) ﴿ذکر اللہ اور کلمہ توحید کی فضیلت﴾

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے فرشتے راستوں میں چلتے پھرتے ہیں اور ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے ہیں، پھر جب وہ ایسی قوم کو پاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کررہی ہوتی ہے تو ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں کہ آ جاؤ! تمہارا اصل مطلوب اور مقصود یہاں ہے۔ پھر وہ فرشتے ان کو آسمان تک اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے ہیں کہ میرے بندے کیا کررہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ آپ کی پاکی، بڑائی اور حمد وثناء کو بیان کررہے تھے۔ پروردگار فرماتا ہے کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں، خدا کی قسم! انہوں نے آپ کو نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ مجھے دیکھ لیں تو ان کی کیا کیفیت ہو؟ فرشتے کہتے ہیں کہ اگر وہ آپ کو دیکھ لیں تو آپ کی عبادت اور زیادہ کرنے لگیں اور آپ کی بزرگی اور حمد وثناء بیان کرنے اور آپ کی پاکی بیان کرنے میں مزید بڑھ جائیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ مجھ سے کیا مانگ رہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ آپ سے جنت مانگ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ نہیں، خدا کی قسم! اے پروردگار! انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اسے دیکھ لیں تو ان کا کیا حال ہو؟ فرشتے کہتے ہیں کہ اگر وہ جنت کو دیکھ لیں تو ان کی حرص اور طلب میں اور اضافہ ہو جائے، پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ کس چیز سے پناہ مانگ رہے تھے! فرشتے کہتے ہیں کہ وہ دوزخ سے پناہ مانگ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے دوزخ کو دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں، خدا کی قسم! اے پروردگار! انہوں نے دوزخ کو نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اسے دیکھ لیں تو ان کا کیا حال ہو؟ فرشتے کہتے ہیں کہ اگر وہ اسے دیکھ لیں تو ان کا دوزخ سے خوف اور بڑھ جائے اور اس

سے اور زیادہ بھاگنے والے ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی۔ پھر ان فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے کہ ان لوگوں میں فلاں شخص بھی موجود تھا جو حقیقت میں ان میں شامل نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنے کسی کام سے آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ایسے ہم نشیں اور ساتھی ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا شخص بھی محروم القسمت نہیں ہوتا۔'' (صحیح البخاری، باب فضل اللّٰہ تعالٰی ج ۸ص ۸۶، ۸۷، مشکوٰۃ المصابیح، باب ذکر اللہ عزوجل والتقرب الیہ ص۱۹۷)

فائدہ:

اس حدیث مبارک میں اللہ تعالیٰ، فرشتوں سے اپنے بندوں کے بارے میں اس لیے پوچھتے ہیں تاکہ اولادِ آدم کی فضیلت فرشتوں پر واضح ہو، اس لیے کہ فرشتوں نے یہ کہا تھا کہ اے پروردگار! کیا آپ زمین پر ایسی مخلوق کو پیدا فرما رہے ہیں جو فساد پھیلائے گی اور خون ریزی کرے گی، حالانکہ ہم آپ کی تسبیح وتقدیس کہتے ہیں، اب یہی فرشتے ان کے بارے میں گواہی دے رہے ہیں کہ تمام تر خواہشات کے باوجود اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس کی حمد وثناء بیان کر رہی ہے۔ ان کی زبانوں پر سبحان اللہ، الحمدللہ اور اللہ اکبر کا ورد جاری ہے۔ گویا ان فرشتوں کی جانب سے یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ واقعی اولادِ آدم فضیلت ومنقبت کی حامل ہے۔ ذکر کرنے والوں کے ہمراہ بیٹھنے والا شخص بھی رحمت خداوندی سے محروم نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ نے اس شخص کی بھی مغفرت کر دی جو وہاں اپنے کسی کام سے آیا تھا، اس کا مقصد ذکر الٰہی میں شامل ہونا نہ تھا لیکن پھر بھی مجلس ذکر کی برکت سے اس کی بھی مغفرت ہوگئی، اس لیے کہ مجلس ذکر میں حاضر ہونے سے مردہ قلوب کو جلا ملتی ہے، خواہ ذکر میں شرکت کا ارادہ نہ بھی ہو تب بھی اس کے قلب کو حیاتِ جاودانی حاصل ضرور ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات عظیم فضل واحسان والی ہے۔ اس حدیث سے مجلس ذکر وعبادت کی شرافت وفضیلت معلوم ہوتی ہے۔ ان مجالس میں عبادت کی تمام انواع شامل ہیں۔ خواہ علم دین کا تذکرہ وتکرار ہو یا تلاوت قرآن پاک ہو یا

ذکرواذکار کی مجالس، ایسی تمام مجالس انوارات وبرکات اور حیات قلبی کی مجالس ہیں۔

واللہ اعلم۔(شرح القسطلانی)

(۱) ذکر اللہ کی قسمیں:

اللہ کا ذکر دل سے بھی ہوتا ہے اور زبان سے بھی، اور افضل یہ ہے کہ دل اور زبان دونوں سے اللہ کا ذکر ہو، اور اگر ان میں سے کسی ایک سے ہو تو پھر دل کا ذکر افضل ہے۔

پھر ذکر قلبی کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک قسم تو یہ ہے کہ ’’خدا کی عظمت، جبروت وملکوت اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں، جو زمین وآسمان میں ہیں، غور وفکر اور استغراق‘‘ اس قسم کے ذکر کو ’’ذکر خفی‘‘ کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں منقول ہے کہ وہ ذکر خفی ستّر درجہ افضل ہے جسے حفظہ (اعمال لکھنے والے فرشتے) بھی نہیں سُنتے، چنانچہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو حساب کتاب کیلئے جمع کرے گا تو حفظہ (اعمال لکھنے والے فرشتے) وہ تمام ریکارڈ لے کر حاضر ہوں گے جنہیں انہوں نے اپنی نوشت اور یادداشت میں محفوظ کر رکھا ہوگا، وہ تمام ریکارڈ دیکھ کر اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ دیکھو! میرے بندوں کے اعمال میں اور کیا چیز باقی رہ گئی ہے؟ (جو تمہارے اس ریکارڈ میں نہیں ہے)، وہ عرض کریں گے کہ پروردگار بندوں کے اعمال کے سلسلہ میں جو کچھ بھی ہمیں معلوم ہوا اور جو کچھ بھی ہم نے یاد رکھا ہم نے اسے اس ریکارڈ میں جمع کر دیا ہے، اس ریکارڈ میں ہم نے ایسی کوئی چیز محفوظ کرنے سے نہیں چھوڑی جس کی ہمیں خبر ہوئی، تب اللہ تعالیٰ بندہ کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ ’’میرے پاس تیری ایسی نیکی محفوظ ہے جسے کوئی نہیں جانتا اور وہ ذکر خفی ہے، میں تجھے اس نیکی کا اجر عطا کروں گا‘‘۔

(مسند ابی یعلیٰ عن عائشۃؓ، البدور السافرۃ فی احوال الأخرۃ للسیوطی، بحوالہ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۵ ص ۴۹)

(۲) ذکرِ قلبی کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جو احکام دیئے ہیں، خواہ

ان کا تعلق امر (حکم) سے ہو یا نہی (ممانعت) سے، ان کی ادائیگی کا وقت آنے پر اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے، ذکر قلبی کی ان دونوں قسموں میں پہلی قسم افضل اور اعلیٰ ہے۔

بعض فقہاء کہتے ہیں کہ ''ذکر'' کا اطلاق صرف زبان کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنے پر ہوتا ہے، اور قول مختار کے مطابق اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ''وہ اپنے آپ کو سنائے، یعنی ذکر کرنے والے کی زبان کم سے کم اس درجہ میں جاری ہو کہ وہ خود سن لے''۔ ان فقہاء کے قول کے مطابق اس درجہ سے کم کا ذکر معتبر نہیں، نیز یہ فقہاء یہ کہتے ہیں کہ دل کے ذکر کی حیثیت از قسم علم و تصور قلب کے فعل کی تو ہے لیکن اسے ذکر نہیں کہیں گے، ذکر اسی کو کہیں گے جس کا تعلق زبان کی ادائیگی سے ہو، اب نہیں کہا جا سکتا کہ اس بات سے ان فقہاء کا مقصود کیا ہے؟ اگر مطلب یہ ہے کہ لغوی طور پر ''فعل قلب'' پر ذکر کا اطلاق نہیں ہوتا تو یہ بات اس چیز کے خلاف ہے جو لغت کی کتابوں میں موجود ہے۔

چنانچہ ''صحاح'' اور ''قاموس'' میں لکھا ہے کہ ''ذکر نسیان کی ضد ہے'' اور ظاہر ہے کہ یہ خود قلب کا فعل ہے، کیونکہ جس طرح نسیان (بھول) کا تعلق قلب سے ہے اسی طرح اس کی ضد یعنی ذکر (یاد) کا تعلق بھی قلب ہی سے ہے۔

ہاں یہ اور بات ہے کہ جو کچھ زبان سے ادا ہوتا ہے اسے بھی ذکر کہا جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ لفظ ذکر فعل قلب اور فعل لسان دونوں کے درمیان مشترک ہے، جس طرح فعل قلب کو ذکر کہتے ہیں اسی طرح فعل لسان کو بھی ذکر کہا جاتا ہے، لہٰذا جیسے ذکر باللسان معتبر ہے ایسے ہی ذکر بالقلب بھی معتبر ہے، بلکہ ذکر بالقلب ہی افضل ہے، مشائخ طریقت رحمہم اللہ بھی فرماتے ہیں کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں، قلبی اور لسانی، اور ذکر قلبی کا اثر، ذکر لسانی کے اثر سے کہیں زیادہ قوی اور افضل ہے۔

جن فقہاء نے ذکر قلبی کا انکار کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ شریعت نے جن مواقع پر ذکر باللسان کی تعلیم دی ہے جیسے تسبیحات، قرأت نماز اور نماز کے بعد کے اذکار واوراد وغیرہ تو وہاں قلبی ذکر کافی نہیں ہوتا بلکہ لسانی ذکر ہونا چاہیے، ان فقہاء کی مراد یہ نہیں ہے کہ ذکر قلبی پر اخروی اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا۔ (مظاہر حق ج ۲ ص ۲۸۱)

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے ایک ایک ذرہ پر حاوی ہے، وہ ایک ایک

فرد کے ایک ایک لمحہ کے حالات کی واقفیت رکھتا ہے، اس لیے اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ (اس حدیث میں) اللہ تعالیٰ فرشتوں سے ذکر کرنے والے بندوں کے بارہ میں جو کچھ پوچھتا ہے وہ علم حاصل کرنے کیلئے پوچھتا ہے، بلکہ وہ جاننے کے باوجود محض الزاماً فرشتوں سے سوال کرتا ہے تا کہ ان پر ابن آدم کی کمال عبدیّت ظاہر ہو، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت یہ فرشتے ہی تو تھے جنہوں نے کہا تھا کہ پروردگار! تو آدم اور ابن آدم کو کیوں پیدا کرتا ہے، یہ تو دنیا میں سوائے فسق وفساد کے اور کچھ کریں گے ہی نہیں، تیری تسبیح وتقدیس تو بس ہم ہی کر سکتے ہیں اور وہ ہم کرتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کو اس قسم کے سوال کر کے ان پر ابن آدم کی بزرگی کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح وہ ان فرشتوں کو بتانا چاہتا ہے کہ تم نے دیکھا جس مخلوق کے بارہ میں تم غلط گمان رکھتے تھے وہی مخلوق اب کس طرح میری عبادت، میری یاد اور میرے ذکر میں مشغول رہتی ہے۔ اور خود تم ہی اس کی شہادت (گواہی) دیتے ہو۔

''بخاری'' کی روایت میں تو اس سوال کے ساتھ ہی فرشتوں کی طرف سے اس کا جواب بھی منقول ہے، لیکن ''مسلم'' کی روایت میں صرف سوال ہی منقول ہے۔ جواب ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''بخاری'' کی روایت میں تو یہ جملہ صرف سوال ہی کیلئے ہے لیکن ''مسلم'' کی روایت میں یہ سوالیہ جملہ تعجب کیلئے ہے۔

دونوں روایتوں کے آخری جملہ کے ذریعہ امت کے لوگوں کو اہل ذکر کی ہمنشینی اور صحبت اختیار کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ خدا کی یاد اور اس کے ذکر میں مشغول رہنے والے خدا کے نیک وصالح بندوں کی ہمنشینی وصحبت اختیار کرنا فلاح وسعادت کی بات ہے۔

کسی عارف نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ اللہ کی صحبت (یعنی اس کی یاد اور اس کے ذکر) میں مشغولیت اختیار کرو، اگر یہ نہ کر سکو تو پھر ان مقدس بندوں کی صحبت وہمنشینی اختیار کرو جو اللہ کی صحبت اختیار کیے ہوئے ہیں یعنی جو ذکر وشغل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوامی حضور رکھتے ہیں۔ (مظاہر حق ج ۲ ص ۴۸۹)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے کچھ فضیلت والے فرشتے ہیں جو چلتے پھرتے ہیں اور ذکر کی مجالس تلاش کرتے ہیں، پھر جب وہ ذکر والی مجلس پاتے ہیں تو وہ بھی ان کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے پروں سے ایک دوسرے کو ڈھانپ لیتے ہیں اور زمین سے آسمان تک کی فضا کو بھر دیتے ہیں، پھر جب اس مجلس سے واپسی پر آسمان پر چڑھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ان بندوں کے پاس سے آئے ہیں جو آپ کی تسبیح بیان کررہے تھے اور تکبیر وتحمید اور کلمہ لا الہ الا اللہ کا ورد کررہے تھے اور آپ سے سوال کررہے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ مجھ سے کیا سوال کررہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ آپ سے آپ کی جنت کا سوال کررہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے میری جنت کو دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ پروردگار! نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ میری جنت کو دیکھ لیں تو پھر ان کا کیا حال ہو؟ پھر وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ سے پناہ بھی مانگ رہے تھے، اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ وہ کس چیز سے پناہ مانگ رہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ پروردگار! وہ آپ کی آگ (جہنم) سے پناہ مانگ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے میری آگ کو دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ نہیں، اللہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ میری آگ کو دیکھ لیں تو ان کا کیا حال ہو! پھر فرشتے کہتے ہیں کہ وہ بندے آپ سے مغفرت کے بھی خواستگار تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کی مغفرت کردی اور جو کچھ وہ مانگ رہے تھے میں نے وہ سب کچھ ان کو دیدیا اور جس چیز سے وہ پناہ چاہ رہے تھے میں نے ان کو اس سے پناہ (بھی) دیدی، فرشتے کہتے ہیں کہ اے پروردگار! ان بندوں میں ایک گنہگار شخص بھی موجود تھا جو وہاں سے گزرتے ہوئے یونہی ان کے ساتھ بیٹھ گیا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی بھی مغفرت کردی، کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا ہم نشیں بھی محروم اور بدنصیب نہیں ہوتا'' (باب فضل مجالس الذکر ج۱۰ حاشیہ القسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب ذکر اللہ عزوجل والتقرب الیہ ص۱۹۷)

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے زمین میں گھومتے پھرتے ہیں اور وہ ان فرشتوں کے علاوہ ہیں جو بندوں کے اعمال لکھتے ہیں، وہ فرشتے جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والی کسی مجلس کو پاتے ہیں تو ایک دوسرے کو پکارتے ہیں کہ اپنے اصل مقصود کی طرف آ جاؤ، چنانچہ وہ فرشتے اکٹھے ہوتے ہیں اور زمین سے آسمان تک ان کو گھیر لیتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ تم میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟ وہ کیا کر رہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ آپ کی حمد وثناء بیان کر رہے تھے اور آپ کا ذکر کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ نہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ان کا کیا حال ہوتا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ اگر وہ آپ کو دیکھ لیتے تو وہ آپ کی حمد وثناء اور ذکر پہلے سے زیادہ کرنے لگتے، پھر اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا چیز مانگ رہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ جنت مانگ رہے تھے، اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے اس کو دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں، اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو ان کا کیا حال ہوتا؟ وہ فرشتے کہتے ہیں کہ اگر وہ اس کو دیکھ لیتے تو ان کی طلب اور حرص میں مزید اضافہ ہو جاتا، پھر اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ وہ کس چیز سے پناہ مانگ رہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ آتش دوزخ سے پناہ مانگ رہے تھے، اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے اس کو دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اس کو دیکھ لیتے تو ان کا کیا حال ہوتا؟۔ فرشتے کہتے ہیں کہ اگر وہ اس کو دیکھ لیتے تو ان کے خوف اور پناہ میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو جاتا اور اس سے اور دور بھاگتے، پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان سب کی مغفرت کر دی، فرشتے کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں فلاں ایک گنہگار شخص بھی موجود تھا جو اپنے کسی کام سے آ گیا تھا، ان میں شامل نہ تھا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا شخص بھی محروم اور بدنصیب نہیں ہوتا''

(صحیح الترمذی، باب ماجاء ان للّٰہ ملائکۃ سیاحین فی الارض ج۲ص۲۸۰)

(۴) ابواسحاق ؒ اغرّ ابومسلمؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے متعلق شہادت دی کہ ان دونوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے شہادت دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جب بندہ کہتا ہے لآ الہ اللّٰہ واللّٰہ اکبر تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے سچ کہا! میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میں ہی اللہ ہوں، سب سے بڑا ہوں، اور جب بندہ کہتا ہے: لآ الہ الا اللّٰہ وحدہ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے سچ کہا، میرے سوا کوئی معبود نہیں میں اکیلا ہوں، اور جب بندہ کہتا ہے لآ الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے سچ کہا میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میرا کوئی شریک نہیں، اور جب بندہ کہتا ہے لآ الہ الا اللّٰہ لہ الملک ولہ الحمد تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے سچ کہا میرے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہت میرے لیے ہے اور تمام تعریفیں میرے لیے ہیں، اور جب بندہ کہتا ہے لآ الہ الا اللّٰہ، ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے سچ کہا، میرے سوا کوئی معبود نہیں، اور میرے سوا نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی کوئی طاقت اور قدرت نہیں دے سکتا۔''

ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اغر ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی بات کہی جسے میں سمجھ نہ سکا میں نے ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ انہوں نے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا اغر ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا کہ ''جس شخص کو (مذکورہ) کلمات اپنی وفات کے وقت پڑھنے نصیب ہوئے تو دوزخ کی آگ اسے نہیں چھوئے گی۔'' (مشکوٰۃ المصابیح، باب ثواب التسبیح والتحمید والتہلیل والتکبیر ص۲۰۱، سنن ابن ماجہ باب فضل لا الہ الا اللّٰہ ج۲ص۲۱۹)

فائدہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے اس حدیث مبارک کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ جل شانہ، سے نقل کیا ہے اور انہوں نے فرمایا کہ یہ روایت بطور سچی شہادت کے ہم نے نقل کی ہے کہ جس میں ذرا بھی کوئی وہم یا شک نہیں ہوسکتا، اگر یہ روایت خلاف واقع ہو تو اس کا انجام بدانہیں برداشت

کرنا ہوگا، دراصل ان کا یہ کلام خبر اور روایت کی تاکید کے لیے ہے۔

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ جب ان کلمات اور اذکار کو پڑھتا ہے (جو مذکورہ حدیث میں موجود ہیں) تو اللہ جل شانہ اس پر خوش ہوتے ہیں اور اس کی بات کی تصدیق کرتے ہیں، جس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس پر اس کو بہترین جزاء اور عظیم ثواب عطا فرمائیں گے، نیز اگر بندہ ان اذکار وکلمات پر اعتقاد رکھتے ہوئے ان پر عمل کرتا رہے، یہاں تک کہ موت کے وقت قول اور اعتقاد دونوں اعتبار سے مذکورہ کلمات اسے نصیب ہوئے تو اللہ تعالیٰ اس کو آتشِ دوزخ سے نجات دلائیں گے کیونکہ وہ مذکورہ کلمات کثرت سے پڑھتا تھا۔ اسی لیے یہ کلمات کثرت سے ہر ایک کو بھی پڑھنے چاہئیں۔

لَآ الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر، لآ الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ، لآ الٰہ الا اللّٰہ، لہ الملک ولہ الحمد، لا الٰہ الا اللّٰہ، ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ" (شرح القسطلانی)

(۵) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیان فرمایا کہ "اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے نے اللہ کی حمد وثناء یوں بیان کی کہ **یَارَبِّ لَکَ الْحَمْدُ، کَما یَنبغِی، لِجَلَالِ وَجْھِکَ وَلَعَظِیمُ سُلطَانِکَ** (اے میرے رب! آپ کے لیے ہے تمام تعریفیں جو آپ کی ذات کی جلال اور سلطنت کی عظمت کے مناسب ہوں) تو وہ دوفرشتوں کے لیے (لکھنا) گراں ہوگیا، سمجھ نہ آسکا کہ اسے کس طرح لکھیں! چنانچہ وہ دونوں آسمان پر گئے اور عرض کیا اے ہمارے رب! تیرے ایک بندے نے ایک ایسی بات کہی کہ ہم سمجھ نہیں پارہے کہ اسے کس طرح لکھیں؟ اللہ تعالیٰ نے پوچھا، حالانکہ وہ اپنے بندے کے قول کو خوب جانتے ہیں، میرے بندے نے کیا کہا ہے؟ ان فرشتوں نے کہا کہ اے میرے رب! اس بندے نے یہ کلمات کہے ہیں: **یا رب لک الحمد کما ینبغی لجلال وجھک وعظیم سلطانک**، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ان کلمات کو ویسے ہی لکھ دو جیسے اس نے کہے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ مجھ سے ملاقات کرے گا تو میں ہی اس کو اس کی جزا دوں گا۔"

(سنن النسائی باب فضل الحامدین ج۲ص۲۲۰)

فائدہ:

مذکورہ کلمات کے پڑھنے پر بندے کے اعمال نامہ میں کس قدر اجر و ثواب لکھا جائے، فرشتے اسے سمجھ نہ پائے۔ اس لیے کہ اس کا اجر اس قدر زیادہ ہے کہ اللہ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھی اس پر مطلع نہیں فرمایا: (شرح القسطلانی)

(۶) حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ کلمات پڑھتے تھے۔ "سبحان اللّٰہ وبحمدہ استغفر اللّٰہ واتوب الیہ" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ کو کثرت سے یہ کلمات پڑھتے ہوئے دیکھتی ہوں "سبحان اللّٰہ وبحمدہ استغفر اللّٰہ واتوب الیہ" (اس کی کیا وجہ ہے) آپؐ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے خبر دی ہے کہ میں اپنی امت میں ایک علامت دیکھوں گا جب میں اس علامت کو دیکھوں تو کثرت سے "سبحان اللّٰہ وبحمدہ استغفر اللّٰہ واتوب الیہ" پڑھا کروں، میں وہ علامت دیکھ چکا ہوں (یعنی) اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ ○ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا○ (سورۃ النصر) "جب اللہ کی نصرت اور فتح آجائے اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتے دیکھیں تو آپ اپنے رب کی حمد کی تسبیح کریں اور اس سے مغفرت طلب کریں، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔" (صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ باب مایقول فی الرکوع والسجود ج۳ ص ۱۲۸ ہامش القسطلانی)

مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں، اَللّٰھم اغفِرْلی یعنی اے اللہ! میری مغفرت فرما، اس کے ذریعہ مذکورہ سورت میں دیئے گئے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔

فائدہ:

صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکوع اور سجدہ میں کثرت سے **سبحانک اللھم ربنا وبحمدہ، اللھم اغفرلی** پڑھا کرتے تھے، اس طرح آنحضور ﷺ قرآن کے اس حکم پر عمل کرتے تھے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں مذکورہ لفظ "یتاول القرآن" کا مطلب یہ ہے کہ سورۃ النصر میں اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے کہ آپ اپنے رب کی تحمید وتسبیح بیان کریں اور اس سے استغفار کریں وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے، اس کی تعمیل میں آنحضرت ﷺ مذکورہ کلمات پڑھا کرتے تھے۔ اور رکوع اور سجدہ کی حالت میں اس لیے پڑھتے تھے کہ نماز میں یہ دو حالتیں دوسری حالتوں سے اعلیٰ اور افضل ہیں اور اس طرح حکم کی تعمیل کامل درجہ کی ہوگی۔ سبحان اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص اور عیب سے منزہ اور پاک ہے اور اس ذاتِ عالی نے سبحان اللہ پڑھنے کی توفیق عطا کی ہے۔ لہٰذا اس انعام پر بطور شکر کے الحمد للہ پڑھنا چاہیے، اور آپ کا استغفار کرنا عبودیت وبندگی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے افتقار اور احتیاج کے طور پر ہے۔ واللہ اعلم (شرح النووی علی مسلم)

(۸) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام مخلوق کے روبرو میری امت کے ایک شخص کو نجات دیں گے اس کے سامنے ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے، ہر رجسٹر حدِ نگاہ تک دراز ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: کیا تو ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے؟ کیا میرے ان فرشتوں نے جو حفاظت وکتابت پر مامور ہیں، تجھ پر کوئی ظلم کیا ہے؟ وہ کہے گا کہ نہیں! اے میرے رب! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو کیا تیرے پاس کوئی عذر ہے؟ وہ کہے گا کہ نہیں، اے میرے رب! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیوں نہیں! تیری ایک نیکی موجود ہے پس آج تجھ پر کوئی ظلم نہ ہوگا، چنانچہ ایک پرچہ نکالا جائے گا جس میں لکھا ہوگا" **اشھد ان لآ الہ الا اللہ واشھدان محمدًاعبدہ ورسولہ**، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے وزن کے لیے

حاضر ہو جاؤ، وہ بندہ کہے گا کہ اے میرے رب! اتنے رجسٹروں کے مقابلہ میں اس پرچہ کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ آج تجھ پر ظلم نہ ہوگا، پھر تمام رجسٹر ایک پلڑے میں اور وہ پرچہ دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا، وہ تمام رجسٹر اڑ جائیں گے۔ اور وہ پرچہ بھاری پڑے گا، پس اللہ کے نام کے ساتھ کوئی دوسری چیز وزنی نہیں ہو سکتی۔(سنن الترمذی باب فیمن یموت وھو یشھدا ان لا الہ الا اللّٰہ، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحساب والقصاص ص۴۸۶)

(۸) امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیثِ مذکور کو اپنی سنن میں بھی حضرت عبداللہ بن عمر و بن العاص رضی اللہ عنہ سے باب مایرجی من رحمۃ اللّٰہ یوم القیامۃ میں نقل کیا ہے اور اس کے الفاظ ترمذی کی طرح ہیں، البتہ اس میں مزید یہ الفاظ بھی ہیں؟ کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی نیکی ہے؟ اس پر وہ شخص مبہوت ہو کر کہے گا کہ نہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیوں نہیں! تمہاری تو بہت سی نیکیاں ہیں اور آج تم پر کچھ ظلم نہ ہوگا"

(۹) حضرت انس بن مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" حفاظت پر مامور کوئی دو فرشتے ایسے نہیں جو اللہ تعالیٰ کے دربار میں رات یا دن کو اعمال لے کر جائیں اور اللہ تعالیٰ نامہ اعمال کے شروع اور آخر میں کوئی خیر و بھلائی پائیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے بندے کے نامہ اعمال کے شروع اور آخر کے درمیان کے سارے گناہ معاف کر دیئے"۔

(جامع الترمذی من ابواب الجنائز ج ۱ ص ۱۸۳)

(۱۰) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دوزخ کی آگ سے اس شخص کو نکال دو جس نے مجھے ایک دن بھی یاد کیا ہو یا کسی بھی موقع پر مجھ سے ڈرا ہو۔(سنن الترمذی ج ۲ ص ۹۸)

(۱۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" بے شک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ابنِ آدم! تو میری عبادت کے لیے فارغ ہو جا، میں تیرے دل کو غنا سے بھر دونگا۔ اور تیرے فقر و فاقہ کو دور کر دوں گا، اگر تو ایسا نہ کرے گا تو

تیرے ہاتھوں کو مشاغل سے بھر دوں گا (مصروف کر دوں گا) اور تیرے فقر و فاقہ کو دور نہ کروں گا۔" (جامع الترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق ص ۴۴۰)

(۱۲) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "تمہارا پروردگار بکریوں کے اس چرواہے سے خوش ہوتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چرا رہا ہو اور نماز کے لیے اذان کہے اور پھر نماز پڑھے، اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کو دیکھو کہ یہ اذان دیتا ہے اور نماز قائم کرتا ہے اور مجھ سے ڈرتا ہے، میں نے اپنے بندے کی مغفرت کر دی اور اسے جنت میں داخل کر دیا۔"

(سنن النسائی، باب الاذان لمن یصلی وحدہ ج ۲ ص ۲۰ مشکوٰۃ المصابیح، باب فضل الاذان ص ۶۵)

(۱۳) مطرف بن عبداللہ بن الشخیر سے روایت ہے کہ عیاض بن حمار المجاشعی فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وعظ میں فرمایا کہ "خبردار! میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں وہ باتیں سکھا دوں جو تم نہیں جانتے اور میرے رب نے وہ باتیں مجھے آج ہی سکھائی ہیں۔ میں نے جو مال کسی بندے کو دیا وہ حلال ہے اور میں نے اپنے تمام بندوں کو دین حنیف (دین فطرت) پر پیدا کیا، مگر شیاطین ان کے پاس آئے اور انہوں نے ان کو اپنے دین سے دور کر دیا اور انہوں نے ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں اور ان شیاطین نے ان کو حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک کریں جس کی میں نے کوئی دلیل نہیں اتاری، اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف نظر ڈالی تو ان کے عرب و عجم کو ناپسند فرمایا سوائے اہل کتاب کے چند باقی ماندہ لوگوں کے، اور ارشاد فرمایا کہ میں نے آپ کو اس لیے معبوث کیا ہے تاکہ آپ کا امتحان لوں اور آپ کے ذریعہ دوسروں کا امتحان لوں اور میں نے آپ پر ایسی کتاب اتاری ہے جس کو پانی نہیں دھوئے گا۔ اور آپ اسے سوتے جاگتے پڑھیں گے، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں قریش کو آگ بگولہ کر دوں، میں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! پھر تو وہ میرے سر کو کچل دیں گے اور اس کو روٹی (کی طرح) پناہ دیں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کو نکال دوں گا، جس طرح انہوں نے آپ کو نکالا اور آپ ان کے ساتھ لڑیں، ہم آپ کے ساتھ لڑیں گے،

آپ خرچ کریں۔ ہم آپ پر خرچ کریں گے، آپ ایک لشکر بھیجیں ہم اس جیسے پانچ لشکر بھیجیں گے اور جو لوگ آپ کی اطاعت کرتے ہیں ان کے ساتھ مل کر ان لوگوں کے ساتھ قتال کریں جو آپ کی نافرمانی کرتے ہیں۔

اور فرمایا کہ اہلِ جنت تین قسم کے ہیں ایک تو عدل وانصاف کرنے والے، صدقہ وخیرات کرنے والے صاحبِ توفیق صاحبانِ اقتدار، دوسرا وہ رحمدل، رقیق القلب شخص جو ہر قرابت دار اور مسلمان پر رحم کرنے والا ہو اور تیسرا وہ پاکباز شخص جو عیال دار ہو، اور فرمایا کہ اہل جہنم پانچ قسم کے ہیں، ایک تو وہ ضعیف اور کمزور جن میں کوئی عقل وشعور نہ ہو جو تم میں دوسروں کے تابع دار ہوں جو اہل وعیال اور مال ومنال کے خواہش مند نہ ہوں، دوسرا وہ خیانت گر جو ہر وقت تاک میں لگا رہتا ہو اور معمولی چیز میں بھی خیانت کرتا ہو اور تیسرا وہ شخص جو صبح وشام تمہارے مال واولاد کے بارے میں دھوکہ اور فریب دینے کے درپے رہتا ہو اور چوتھا آپ نے بخل یا جھوٹ کا ذکر فرمایا اور پانچواں وہ شخص جو فحش گو ہو۔"

(صحیح مسلم، باب الصفات التی یعرف بها فی الدنیا اهل الجنة واهل النار ج ۱۰ ص ۳۱۴، مشکوٰة المصابیح، باب الانذار والتحذیر ص ۴۵۹)

(۱۴) محمد بن مثنیٰ العنزی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ محمد بن ابی عدی رحمۃ اللہ علیہ نے ہم سے حدیث بیان کی، انہوں نے سعید سے اور انہوں نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس سند کے ساتھ، اور انہوں نے اپنی حدیث میں یہ الفاظ ذکر نہیں کیے "ہر وہ مال جو میں نے کسی بندے کو دیا وہ حلال ہے۔"

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دوسری روایت سے بھی نقل کیا ہے، فرمایا کہ مجھے عبدالرحمٰن نے بشر العدویؒ سے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا مجھے یحییٰ بن سعیدؒ نے بیان کی، ان سے صاحب الدستوائی ہشام نے اور ان سے قتادہؒ نے اور ان سے مطرفؒ نے اور ان سے عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ نے بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن وعظ فرمایا، پھر مذکورہ حدیث بیان فرمائی۔

(۱۵) مطرف بن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

ایک روز رسول اللہ ﷺ وعظ کے لیے ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا:
''میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے (پھر حدیثِ ہشام کی طرح حدیث ذکر کی) البتہ اس میں یہ الفاظ زائد نقل کیے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی بھیجی کہ تم لوگ تواضع اور عاجزی اختیار کرو یہاں تک کہ کوئی شخص کسی پر فخر کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی کوئی شخص کسی پر ظلم وزیادتی کرے۔''

انہوں نے اپنی حدیث میں یہ بھی کہا کہ ''وہ تم میں تابع داری کرنے والے ہوں گے جو مال واولاد کے خواہشمند نہ ہوں گے۔'' میں (قتادہ) نے پوچھا کہ اے ابو عبداللہ (مطرف بن عبداللہ) کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں، خدا کی قسم! میں نے ایسے لوگوں کو زمانہ جاہلیت میں دیکھا ہے، ان کا آدمی قبیلہ کی صرف اس عوض کی بناء پر حفاظت کرتا تھا کہ ہم بستری کے لیے ان کی ایک لڑکی اسے حاصل ہو جائے۔

فائدہ:

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ کے اس ارشاد کا کہ ''جو مال میں نے کسی بندے کو دیا وہ حلال ہے'' مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر وہ مال جو میں نے اپنے کسی بندے کو دیا ہے وہ اس کیلئے حلال ہے، اور لوگوں نے جو چیزیں اپنے طور پر اپنے اوپر حرام کرلی ہیں وہ غلط ہیں، کوئی چیز خود حرام کرنے سے حرام نہیں ہو جاتی، جیسے سائبہ، وصیلہ، بحیرہ اور حامی وغیرہ جن کو مشرکین نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا، اصل بات یہ ہے کہ انسان جس مال کا مالک ہے وہ اس کے لیے حلال ہے، تاوقتیکہ کوئی حق اس کے متعلق نہ ہو، اور یہ جو فرمایا کہ ''میں نے تمام بندوں کو دین حنیف پر پیدا کیا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو گناہوں سے پاک وصاف اور ہدایت قبول کرنے والا بنا کر پیدا کیا گیا تھا لیکن شیاطین کے بہکاوے میں آکر وہ راہِ راست سے ہٹ کر گمراہی میں جا پڑتے ہیں اور ہلاک وبرباد ہو جاتے ہیں۔

ان احادیثِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ سے فرمایا کہ ہم نے

آپ کو نبی بنا کر مبعوث کیا ہے تا کہ یہ دیکھیں کہ آپ لوگوں کو دعوتِ توحید اور تبلیغ رسالت کا فریضہ اور فریضہ ءِ جہاد ادا کرتے ہیں یا نہیں! اور آپ کی بعثت کے ذریعہ ہم نے لوگوں کا بھی امتحان لیا ہے کہ تا کہ یہ دیکھیں کون آپ پر ایمان لاتا ہے اور آپ کی فرماں برداری کرتا ہے اور کون نافرمانی کرتا ہے اور بغض وعداوت کو اختیار کرتا ہے، ہر ایک کو اپنے عمل کی جزا و سزا ملے گی۔

اس میں یہ جو فرمایا کہ ''اسے پانی نہیں دھوئے گا اور آپ اسے سوتے جاگتے پڑھیں گے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ہمیشہ سینوں میں محفوظ رہے گا اور اخلاف اپنے اسلاف سے اسے سیکھتے اور پڑھتے پڑھاتے رہیں گے اور آپ اسے نہایت اطمینان وسکون اور آسانی سے تلاوت کر سکیں گے۔ بعض علماء نے سوتے جاگتے پڑھتے رہنے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قرآن آپ کے لیے دونوں حالتوں یعنی نینداور بیداری دونوں حالتوں میں محفوظ رہے گا۔(شرح النووی)

(۲) ﴿عقیدے کی اصلاح اور درستگی﴾

(۱۶) حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''ابنِ آدم مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، وہ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ زمانہ میں ہوں، تمام امور میرے اختیار میں ہیں، میں دن اور رات کو الٹتا پلٹتا ہوں''۔(صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الجاثیۃ ج ٦ ص ۱۳۳، ایضاً فی باب، لا تسبو الدھر ج ۸ ص ۴۱، کتاب الادب، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان ص ۱۳)

(۱۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ ''اولادِ آدم زمانہ کو برا بھلا کہتی ہے، حالانکہ زمانہ میں ہوں، میرے قبضہ قدرت میں ہیں دن اور رات'' امام بخاری نے یہ حدیث مبارک یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلَامَ اللّٰہ کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ تعالٰی ''میں بھی مذکورہ الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے، امام مسلم اور امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث مبارک میں الادب اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے التفسیر میں ذکر کی ہے اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

(۱۸) ''ابن آدم مجھے تکلیف پہنچاتا ہے کہتا ہے کہ اے زمانہ کی ناکامی! اور بربادی، حالانکہ زمانہ میں ہی ہوں، میں اس کے دن اور رات کو الٹتا پلٹتا ہوں'' صحیح مسلم کی دیگر روایات بخاری کی روایات کی طرح ہیں، لہٰذا یہاں ان کے ذکر کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔

فائدہ:

''ابن آدم مجھے تکلیف پہنچاتا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے بارے ایسی بات کہتا ہے جو میری شایان شان نہیں ہے، ایسا شخص اپنے لیے تباہی کا سامان جمع کر رہا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص حقیقتاً اللہ جل شانہ کو ایذاء یا تکلیف پہنچا سکتا ہے۔

''زمانہ میں ہوں'' یعنی زمانہ کا خالق و مالک میں ہی ہوں۔ اس میں جو حوادثات اور انقلابات رونما ہوتے ہیں وہ سب کچھ میرے حکم سے ہی ہوتے ہیں اور یہ سمجھنا کہ زمانہ نے مصیبت ڈھائی ہے یا اس نے کچھ کیا ہے یہ سراسر غلط ہے، آخر زمانہ کے قبضہ میں کیا ہے؟ اس لیے زمانہ کو برا بھلا کہنا اس کے خالق کو برا بھلا کہنے کے مترادف ہے۔

مسند احمد میں صحیح سند کے ساتھ ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''زمانہ کو برا بھلا نہ کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ زمانہ میں ہوں، دن اور رات میرے قبضہ اختیار میں ہیں، میں ہی دن رات کو نیا اور پرانا کرتا ہوں اور ایک بادشاہ کے بعد دوسرا بادشاہ لاتا ہوں۔'' لہٰذا جب انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے تو وہ درحقیقت اس کے خالق و مالک کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔ حدیث مبارک کا مقصد یہ ہے کہ اپنے عقیدہ کی اصلاح اور درستگی کی جائے اور گفتگو میں حسنِ ادب کا لحاظ رکھا جائے، لوگوں کا یہ غلط عقیدہ تھا کہ مرورِ زمانہ ہی ہلاکت و بربادی میں مؤثر حقیقی ہے۔ ہر حادثہ اور واقعہ کو زمانہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور ان کے اشعار بھی زمانہ کے شکووں سے بھرے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی اکیلے تمام حوادثاتِ زمانہ کے حقیقی فاعل ہیں اور زمانہ کی طرف نسبت بطورِ ظرف کے کی جاتی ہے۔ اسی بناء پر حدیثِ مذکور میں زمانہ کو برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے۔

(۱۹) حضرت اعرج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابنِ آدم مجھے جھٹلاتا ہے، حالانکہ یہ اس کے لیے نامناسب ہے، اور وہ مجھے برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ یہ اس کے لیے نامناسب ہے، وہ مجھے اس طرح جھٹلاتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جس طرح اللہ نے مجھے پہلی بار پیدا کیا ہے اس طرح دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ پہلی بار پیدا کرنا میرے لئے دوبارہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں۔ (یعنی دونوں صورتیں برابر ہیں) اور مجھے برا بھلا اس طرح کہتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد منتخب کی ہے، حالانکہ میں اکیلا ہوں، بے نیاز ہوں نہ میری کوئی اولاد ہے اور نہ میں کسی کی اولاد ہوں، اور کوئی بھی میرا ہمسر نہیں

ہے۔" (صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الاخلاص ج۶ ص۱۶۰، مشکوۃ المصابیح، کتاب الایمان ص۱۴)

فائدہ:

"ابن آدم مجھے جھٹلاتا ہے" اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بعث بعد الموت کے منکر ہیں، یا ابن آدم کی جنس مراد ہے، "حالانکہ اس کے لیے نامناسب ہے" مطلب یہ ہے کہ اسے جھٹلانا مناسب نہیں ہے اور نہ ہی اسے جھٹلانے کا کوئی حق ہے۔ "حالانکہ پہلی بار پیدا کرنا میرے لیے دوبارہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے لیے دونوں امر برابر ہیں، حالانکہ عادۃً دوسری بار پیدا کرنا پہلی بار پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی نسبت سے یہ دونوں امر برابر ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں تو بس "کن" کہنے کی دیر ہے، جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو کن (ہوجا) کہتے ہیں تو وہ چیز وجود پذیر ہو جاتی ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اولاد منتخب کی ہے" اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرنا اللہ تعالیٰ کی شان میں انتہائی گستاخی ہے، اس لیے کہ اولاد بغیر بیوی کے نہیں ہوتی، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان سب چیزوں سے منزہ اور پاک ہے، "میں اکیلا اور بے نیاز ہوں، نہ میں کسی کی اولاد ہوں اور نہ میری کوئی اولاد ہے" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واجب الوجود ہے، ہمیشہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، نہ اس کی بیوی ہے، نہ اولاد ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مثل اور ہمسر ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، سارے اس کے محتاج ہیں۔ (شرح القسطلانی)

(۲۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی ایک روایت یہ ہے کہ "اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جس طرح میں نے اس کو پہلی بار پیدا کیا ہے اس طرح اس کو دوبارہ ہرگز پیدا نہیں کروں گا۔ اور اس کا مجھے برا بھلا کہنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد بنائی ہے، حالانکہ میں بے نیاز ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ میں کسی سے پیدا کیا گیا ہوں اور نہ

ہی میرا کوئی ہمسر ہے۔"

(۲۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "ابن آدم مجھے جھٹلاتا ہے، حالانکہ اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ مجھے جھٹلائے، اور ابنِ آدم مجھے برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ مجھے برا بھلا کہے، اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جس طرح میں نے اس کو پہلی بار پیدا کیا ہے اس طرح اس کو دوبارہ پیدا نہیں کروں گا، حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا میرے لیے پہلی بار پیدا کرنے سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اور اس کا مجھے برا بھلا کہنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد منتخب کی ہے، حالانکہ میں اللہ ہوں، اکیلا بے نیاز ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ میں کسی سے پیدا ہوا ہوں اور نہ ہی میرا کوئی ہمسر ہے۔"

(سنن النسائی، باب ارواح المؤمنین ج ۴ ص ۱۱۲)

(۲۲) عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مقامِ حدیبیہ میں رات کو بارش ہوئی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ صبح کی نماز پڑھی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے رب نے کیا ارشاد فرمایا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "میرے بندوں میں سے کچھ لوگ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور کچھ کفر کرنے والے ہیں۔ چنانچہ جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہم پر بارش ہوئی ہے تو وہ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے ہم پر بارش برسی ہے وہ میرا انکار کرنے والے ہیں، اور ستاروں پر ایمان لانے والے ہیں"۔ (صحیح البخاری من ابواب الاستسقاء، باب قول اللّٰہ تعالیٰ وتجعلون رزقکم انکم تکذبون)

فائدہ:

بعض مشرکین کا عقیدہ تھا کہ بارش ستاروں کی وجہ سے ہوتی ہے، فلاں ستارہ

جب طلوع یا غروب ہوگا تو بارش برسے گی۔ حالانکہ ستارے تو خود اللہ کی مخلوق ہیں، بارش تو اللہ برساتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ بارش مثلاً ثریا ستارے کے غائب ہونے پر برستی ہے اور اس سے اس کی مراد وقت اور موسم کی تعیین اور اندازہ لگانا ہو تو یہ ممنوع نہیں ہے اور خلافِ شریعت نہیں ہے۔ (شرح القسطلانی مختصراً ج ۲ ص ۲۵۷)

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب التوحید باب "یریدون ان یبدلوا کلام اللّٰہ" ج ۹ ص ۱۴۵ پر بھی اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(۲۳) حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بارش ہوئی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "میرے کچھ بندے میرے ساتھ کفر کرنے والے ہوگئے اور کچھ بندے مجھ پر ایمان لانے والے ہوگئے"

(۲۴) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو الموطاء میں حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے بخاری کے ان الفاظ کی طرح نقل کیا ہے جو ابھی سابق میں باب الاستسقاء میں منقول ہوئے۔ دیکھیے الموطاء، حاشیۃ المصابیح ج ۱ ص ۹۱. نیز اس حدیث کو امام نسائی نے اپنی سنن میں باب کراھیۃ الاستمطار میں دو روایتوں کے ساتھ نقل کیا ہے، ایک روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور دوسری روایت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت زید بن خالد رضی اللہ عنہ کی روایت سے مختصر ہے جو یہ ہے:

(۲۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "میں نے اپنے بندوں پر جو بھی انعام واحسان کیا تو ان میں سے ایک گروہ اس انعام کا منکر ہوگیا، کہتا ہے کہ اصل تو ستارے ہیں، ستاروں کی وجہ سے ہی سب کچھ ہو ہے۔"

اور حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

(۲۶) حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بارش ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم نے نہیں سنا کہ تمہارے رب نے اس رات کیا ارشاد فرمایا" اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں نے اپنے بندوں پر جب بھی انعام کیا تو ان میں سے ایک گروہ اس کا منکر ہوگیا، وہ کہتا

ہے کہ ہم پر فلاں فلاں ستاروں کی وجہ سے بارش برسی ہے۔ لیکن جو مجھ پر ایمان لایا اور میرے سیراب کرنے پر اس نے میری تعریف کی تو یہ وہ شخص ہے جو مجھ پر ایمان لایا اور اس نے ستاروں کا انکار کر دیا اور جس نے کہا کہ فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے ہم پر بارش برسی ہے تو یہی وہ شخص ہے جس نے میرے ساتھ کفر کیا اور ستاروں پر ایمان لایا۔"

(۲۷) ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو میری مخلوق کی طرح پیدا کرنے چلا ہے، پس انہیں چاہیے کہ ایک چیونٹی پیدا کر کے دکھائیں یا ایک دانہ یا جو پیدا کر کے دکھائیں"۔(صحیح البخاری ، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ، واللہ خلقکم وما تعملون ج ۹ ص ۲۶۲، مشکوٰۃ المصابیح، باب التصاویر ص ۳۸۵)

(۲۸) ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ منورہ کے ایک گھر میں داخل ہوا چنانچہ انہوں نے گھر کے اوپر کے حصہ میں ایک مصور کو تصویر بناتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو میری طرح پیدا کرنے چلا ہے؟ وہ ایک دانہ پیدا کر کے دکھائے اور ایک چیونٹی پیدا کر کے دکھائے" پھر انہوں نے پانی کا ایک طشت منگوایا اور اپنے ہاتھ بغل تک دھوئے میں نے عرض کیا: اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! کیا یہ (بغل تک ہاتھ دھونا) ایسی چیز ہے جسے آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ زیور پہننے کی انتہاء ہے۔"

(۲۹) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مروان کے گھر میں داخل ہوا تو آپ نے وہاں تصویریں دیکھیں اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ جل شانہ نے فرمایا اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری مخلوق کی طرح کچھ پیدا کرنے چلا ہے؟ انہیں چاہئے کہ ایک چیونٹی پیدا کر کے دکھائیں یا ایک جو کا دانہ پیدا

کر دکھائیں۔

فائدہ:

''میری مخلوق کی طرح پیدا کرنے چلا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کی تصویر بنانا چاہتا ہے، یہ تصویر اگر بُت کی شکل میں بنائی جائے تو ایسا شخص بہت بڑا ظالم ہوگا اور اگر عبادت کے لیے بناتا ہے تو کافر ہو جائے گا، اور دوسرے کفار کی بہ نسبت زیادہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔

ان احادیث مبارکہ میں اللہ جل شانہ نے واضح کر دیا ہے کہ ایک چیونٹی یا گندم کا دانہ بنانا تمہارے اختیار اور بس میں نہیں ہے تو پھر ایسی حرکات کیوں کرتے ہو اور اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہو؟ اب تصویر سازی سے متعلق صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی چند احادیث مبارکہ ذکر کی جاتی ہیں، جو اگرچہ احادیث قدسیہ تو نہیں ہیں لیکن اس موضوع سے متعلق ضرور ہیں:

﴿احادیثِ صحیح بخاری﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر موجود ہو۔''

پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تعلیقاً نقل کیا ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی ارشاد سنا ہے۔

باب عذاب المصوّرین:

مسلم الھمدانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یسار بن نمیر رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں موجود تھے، انہوں نے وہاں تصویریں دیکھیں تو فرمایا کہ میں نے حضرت عبداللہ کو سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے دن سب سے سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔''

حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے انہیں خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو لوگ تصویریں بناتے ہیں وہ قیامت کے روز عذاب میں مبتلا ہوں گے، ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اس میں زندگی ڈالو“

باب نقض الصور:

عمران بن حطان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے بیان کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنے گھر میں کوئی چیز نہیں چھوڑتے تھے جس میں تصویریں ہوں مگر اسے ختم کر دیتے تھے۔“

ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ کے ایک گھر میں داخل ہوا، تو انہوں نے وہاں گھر کے اوپر ایک مصور کو تصویر بناتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ جل شانہ نے فرمایا ”اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو میری مخلوق کی طرح پیدا کرنے چلا ہے، پس انہیں چاہیے کہ ایک دانہ گندم کا بنا کر دکھائیں اور ایک چیونٹی بنا کر دکھائیں“

باب ما وطئی من التصاویر:

سفیان رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن قاسم سے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد (قاسم بن محمد بن ابی ابکر رضی اللہ عنہ) سے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر سے واپس تشریف لائے میں نے طاقچہ پر ایک پردہ لٹکا رکھا تھا۔ جس میں تصویریں تھیں، جب رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا تو اس کو پھاڑ دیا۔ اور فرمایا کہ قیامت کے دن وہ لوگ سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے جو اللہ کی مخلوق کے ساتھ مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر ہم نے اس کے ایک یا دو تکیے بنا لیے۔“

نیز عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”نبی کریم ﷺ ایک سفر سے واپس تشریف لائے، میں نے روئیں دار پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویریں تھیں، آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کو

اُتار دوں، پس میں نے اس کو اتار پھینکا، اور میں اور رسول اللہ ایک ہی برتن میں غسل کرتے تھے۔“

باب من کره القعود علی الصور:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک چھوٹا سا تکیہ خریدا جس میں تصویریں تھیں، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دروازے پر ہی کھڑے ہو گئے۔ گھر میں داخل نہیں ہوئے، میں نے عرض کیا، میں اپنے گناہ سے توبہ کرتی ہوں، (کیا ہوا)؟ آپ نے فرمایا کہ یہ تکیہ کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کے بیٹھنے اور ٹیک لگانے کے لیے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تصویر سازوں کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا، ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اس میں زندگی بھی ڈالو (روح بھی ڈالو) اور فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں، نیز حضرت زید بن خالد، ابوطلحہ انصاری (صحابی رسول رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! بے شک فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر ہو“

(حدیث کے راوی) حضرت بسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ زید بن خالد بیمار ہوئے، ہم ان کی عیادت کے لئے گئے تو دیکھا کہ گھر کے دروازے پر تصویر والا پردہ پڑا ہوا ہے۔ میں نے عبید اللہ بن اسود خولانی جو آنحضورؐ کی زوجہ مطہرہ، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے، سے کہا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ہمیں پہلے تصویروں کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟ عبید اللہ نے کہا کہ کیا تم نے نہیں سنا کہ جس وقت انہوں نے "الا رقمًا فی ثوب" کہا تھا یعنی سوائے اس تصویر کے جو کپڑے میں نقش ہو۔“

باب کراهية الصلوٰة فی التصاویر:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک پردہ تھا جس میں نقش دار تصویریں بنی ہوئی تھیں، جو انہوں نے گھر کی ایک جانب ڈالا ہوا تھا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ: ”مجھ سے یہ دور کر دو، اس کی تصویریں برابر

میری نماز میں سامنے آتی ہیں۔“

باب لاتدخل الملائكة بيتا فيه صورة:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ جبریل علیہ السلام نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آنے کا وعدہ کیا مگر آنے میں تاخیر ہوئی، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر گراں بار ہوا۔ آپ گھر سے باہر نکلے تو جبریل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے اپنی گراں باری کا ان سے ذکر کیا تو جبریل علیہ السلام نے آپ سے فرمایا کہ ہم ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر یا کتا ہو۔“

باب من لم يدخل بيتاً فيه صورة:

قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں خبر دی کہ انہوں نے روئیں دار گدا (یا تکیہ) خریدا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو دروازے پر ہی کھڑے ہو گئے، میں نے آپ کے چہرہ اقدس پر ناگواری کے آثار محسوس کیے، میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں اللہ اور اس کے رسول سے توبہ کرتی ہوں، میں نے کیا قصور کیا ہے؟ آپ نے پوچھا کہ یہ گدا کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ گدا آپ کے بیٹھنے اور ٹیک لگانے کے لیے خریدا ہے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ان تصویر بنانے والوں کو قیامت کے روز عذاب ہوگا اور ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اس کو زندگی بھی بخشو (روح ڈالو) اور فرمایا وہ گھر جس میں تصویریں ہوں فرشتے داخل نہیں ہوتے“

باب من صوّر صورة كلف ان ينفخ فيها الروح:

سعید رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے نضر بن انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ قتادہ سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں (نضر) نے فرمایا کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا، لوگ ان سے سوالات کر رہے تھے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ گرامی ذکر نہیں کر رہے تھے، حتیٰ کہ ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا (اور مسلم میں فقال کی بجائے

فجعل ہے) چنانچہ وہ فتویٰ دے رہے تھے اور یہ نہیں کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، حتیٰ کہ ان سے ایک آدمی نے سوال کیا اور کہا کہ میں تصویریں بنانے والا آدمی ہوں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ قریب ہو جاؤ، وہ قریب ہو گیا، پھر انہوں نے فرمایا کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص دنیا میں تصویر سازی کرے گا قیامت کے دن اس کو اس بات کی تکلیف دی جائے گی کہ وہ اس میں جان ڈالے حالانکہ وہ اس میں جان نہیں ڈال سکے گا۔ (صحیح البخاری، کتاب اللباس)

احادیث صحیح مسلم

صحیح مسلم کی روایات میں صحیح بخاری کی اس آخری حدیث مبارک کے سلسلہ میں مزید الفاظ منقول ہیں۔ جنہیں ہم اتمام فائدہ کی خاطر ذکر کر رہے ہیں۔ سندِ حدیث ذکر کرنے کے بعد اس میں مزید یوں آتا ہے ''ایک آدمی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اور اس نے کہا کہ میں تصویر بنانے والا آدمی ہوں، مجھے اس کے متعلق فتویٰ دیجئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ میرے قریب ہو جاؤ، چنانچہ وہ شخص آپ کے قریب ہو گیا، پھر آپ نے اس سے فرمایا کہ میرے قریب ہو جاؤ، وہ آپ کے قریب ہو گیا، پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر فرمایا میں تمہیں وہ حدیث بتاتا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا ہر تصویر بنانے والا دوزخ میں جائے گا، جتنی اس نے تصویریں بنائی ہیں اتنی ہی اس کے لیے جاندار چیزیں بنائی جائیں گی، پھر وہ اس کو دوزخ میں عذاب سے دوچار کریں گی'' اور فرمایا کہ اگر تم نے تصویریں بنانی ہی ہیں تو درختوں اور بے جان چیزوں کی تصویریں بنالو۔''

امام مسلم نے اس حدیث کو متعدد روایات کے ساتھ نقل کیا ہے اور صحیح مسلم میں بھی صحیح بخاری کی تقریباً تمام احادیث منقول ہیں اور ان میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہے، البتہ زید بن خالد کی وہ حدیث جو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں کچھ اضافہ ہوا

ہے، جسے ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے: حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ، حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویریں، مورتیاں، موجود ہوں، پھر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا کہ انہوں نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا اور مورتیاں ہوں۔'' کیا آپ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جی نہیں میں تمہیں وہ چیز بتاتی ہوں جو میں نے آپ کو کرتے ہوئے دیکھا ہے، میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ کسی جہاد میں تشریف لے گئے تھے، میں نے دروازے پر ایک چادر لے کر ڈال دی، آپؐ جب سفر سے واپس تشریف لائے تو آپؐ نے اس چادر کو دیکھا تو میں آپؐ کے چہرہ اقدس پر ناگواری کے آثار کو پہچان گئی، پھر آپ نے اس چادر کو کھینچا اور اس کو پھاڑ دیا یا اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم نہیں دیا کہ ہم مٹی اور پتھروں کو کپڑے پہنائیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ پھر ہم نے اسے کاٹ کر دو تکیے بنا لیے، اور ان کے اندر کھجور کی چھال بھر دی، آپ نے اس پر کوئی ممانعت نہیں فرمائی'' بخاری کی تمام احادیث کو امام مسلم نے بھی نقل کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

تصویر سازی کے احکام:

(۱) جو فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا اور تصویریں یا مورتیاں موجود ہوں، اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اللہ کی رحمت لے کر زمین پر اترتے ہیں اور بندوں کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں، لیکن جو فرشتے بندوں کی حفاظت یا ان کے اعمال لکھنے پر مامور ہیں وہ بندوں سے کسی بھی حالت میں جدا نہیں ہوتے، جیسا کہ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے فرمایا ہے، اور گھر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان قیام پذیر ہو، خواہ وہ مکان ہو یا خیمہ ہو یا کچھ اور۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ان کتوں کو مستثنیٰ کیا ہے جن کے رکھنے کی شارع نے اجازت دی ہے اور وہ ایسے کتے ہیں جو انسان، کھیتوں کے لیے یا شکار کے لیے یا جانوروں کی حفاظت کے لئے رکھتا ہے۔

(۲) حرام تصویروں سے مراد وہ تصویریں ہیں جو جانداروں کی ہوں، جب تک کہ ان کا سر موجود ہو اور احترام واعزاز کے لیے رکھی گئی ہوں، بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے، ہر طرح کی تصویر کو شامل ہے اس کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ کھلم کھلا خدا کی نافرمانی ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کے ساتھ مشابہت اختیار کی جاتی ہے اور اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور بعض تصویریں ان چیزوں کی ہوتی ہیں جن کی ماسوا اللہ پرستش کی جاتی ہے۔ حدیث مذکور میں یہ قید لگا کر کہ ''اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری طرح مخلوق بنانے چلا ہے'' ان تصاویر کو ذی روح اور جاندار چیزوں کی تصویروں کے ساتھ مقید کر دیا ہے، خواہ ان کو لکیریں کھینچ کر بنایا جائے یا شکل وصورت بنا کر یا اس کی حرمت جاننے کے باوجود بنایا جائے، وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا چاہتے تھے اور اس ذات کا انکار کرتے تھے، اس لیے ان کا آلِ فرعون کے زمرہ میں داخل ہونا کچھ بعید نہیں ہے، لیکن اگر کوئی مصور، اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کے ساتھ مشابہت یا مقابلہ کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو وہ تصویر سازی کی بناء پر گنہگار تو ضرور ہوگا لیکن کافر نہیں ہوگا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علماء نے لکھا ہے کہ جاندار کی تصویر بنانا سخت ترین حرام ہے اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اس لیے کہ اس پر سخت وعید آئی ہیں، خواہ یہ تصویر سازی، توہین کے لیے ہو یا احترام واعزاز کے لیے ہو، لیکن بے جان چیز کی تصویر سازی حرام نہیں ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ اس سے بچوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں، بچوں کی گڑیاں حرام نہیں ہے۔ اس کے بعد علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ساری بحث کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ دیوار یا چھت یا تکیے پر بنی ہوئی تصویریں ممنوع ہیں لیکن ایسی جگہیں جہاں تصویروں کا احترام نہ ہوتا ہو بلکہ پاؤں میں روندی جاتی ہوں جیسے بستر، اور گدے وغیرہ، اور ایسی تصویر

جس کا سر کٹا ہوا ہو وہ جائز ہے، اس لیے کہ جو تصویریں دیواروں پر ہوتی ہیں وہ بتوں کے مشابہ ہوتی ہیں۔ مذکورہ حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اسے روح ڈالنے پر مجبور کیا جائے گا اس کا بظاہر مقتضی یہی ہے کہ ایسا شخص ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہے گا اور یہ اس شخص کے متعلق ہے جو پرستش کی خاطر تصویریں یا مورتیاں بناتا ہو، اگر عبادت اور پرستش مقصود نہ ہو اور اس کو حلال نہ جانتا ہو تو وہ گنہگار ہوگا اور حدیث کا مقصد صرف زجر و توبیخ ہوگا۔

اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں تصویر کے شرعی احکام از مولانا مفتی محمد شفیعؒ

مختلف احادیث میں تطبیق کی صورت:

بعض احادیث میں تصاویر کی عمومی طور پر ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اور بعض احادیث میں کپڑے میں منقش تصاویر کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور بعض احادیث میں ایسی تصاویر کی اجازت دی گئی ہے جن کی توہین ہوتی ہو اور بعض احادیث میں ممانعت کی وجہ یہ آئی ہے کہ ان کی طرف دیکھنے سے عبادت میں خلل واقع ہوتا ہے، خشوع و خضوع قائم نہیں رہتا اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تصویر صاحب تصویر کی شناخت کے لیے ہو تو وہ جائز ہے ممنوع نہیں ہے، جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں جبریل علیہ السلام نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صورت دکھائی تھی، کیونکہ اس سے مقصد اس زوجہ مطہرہ کی شخصیت کا آپ کو تعارف کروانا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا تھا۔ اب ان مختلف احادیث میں تطبیق کیسے ہوگی؟

چنانچہ ان احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ تصویر سازی کی سخت ترین حرمت اس صورت پر محمول ہوگی جہاں تصویر سازی سے مقصد اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق میں مشابہت اختیار کرنا ہو یا عبادت اور تعظیم کی خاطر تصویر بنائی جائے۔ جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''اس سے بڑا ظالم کون ہوگا؟ جو میری طرح پیدا کرنے چلا ہے۔ نیز فرمایا کہ وہ تصویر بنانے والے جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق میں مشابہت اختیار کرنا چاہتے ہیں'' لہٰذا ایسا عمل فی ذاتہٖ حرام ہے اس لیے کہ یہ

شرک ہے یا شرک کے قریب ہے۔

اور صالحین اور اکابرین کی تصویریں اگر اس لیے بنائی جائیں تا کہ لوگ ان کے اعمال میں ان کی پیروی کریں تو یہ مقصد فی ذاتہ تو اچھا ہے لیکن یہ بھی حرام اس بناء پر ہے کہ اس طرح ان تصاویر کی تعظیم اور عبادت کا خطرہ ہے کہ کہیں لوگ ان کی تعظیم اور عبادت نہ کرنے لگیں۔ جیسا کہ بت پرستی کا آغاز بھی اسی سے ہوا تھا، پھر آہستہ آہستہ ان کی پوجا پاٹ شروع ہوگئی، بالخصوص جب ان تصاویر کو عبادت گاہوں اور مساجد میں رکھا جائے تو ایسا ہونا کچھ بعید نہیں، کیونکہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اور جہالت کے عام ہونے کے ساتھ ساتھ شیطان ان لوگوں پر فتنہ وفساد کا دروازہ کھول سکتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا'' تم ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گزرے ہیں پوری پوری پیروی کرو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں گے تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہوں گے'' بہر حال یہ حرمت ان تصویروں کے متعلق ہے جو جسم دار ہوں اور اس میں ان کی زندگی وابستہ ہو۔ لیکن اگر ان کا سر کاٹ دیا جائے یا پیٹ پھاڑ دیا جائے اور اس سے اس میں بڑا سوراخ ہو جائے تو ایسی تصویر حرام نہیں ہوگی، یہی حکم ان تصویروں کا ہے جو کپڑوں میں نقش ہوں اور توہین وتذلیل کی صورت اور حالت میں ہوں، لیکن اگر وہ تصویریں احترام وتعظیم کی صورت میں ہوں تو وہ مکروہ ہوں گی۔ جبکہ ان کی تعظیم عبادت کی حد تک نہ پہنچی ہو، ورنہ وہ حرام ہوں گی۔

وہ تصاویر جن سے اس شخص کی شخصیت کا تعارف کرانا مقصود ہو جیسے شناختی کارڈ وغیرہ کی تصاویر یا دشمن کے جاسوسوں اور مجرموں کی تصاویر جن کا مقصد ان کے شر سے بچنا ہو یا نقصان دہ اور فائدہ مند جانوروں کی تصاویر جن کا مقصد ان کے خواص سے فائدہ اٹھانا ہو تو ایسی تصاویر جو ضرورت کی وجہ سے بنوائی گئی ہوں تو وہ ضرورت کی بناء پر جائز ہیں، بلکہ بعض اوقات ان کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے، اور واجب اور لازمی درجہ میں ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ حصولِ علم کا ذریعہ بن جاتی ہیں، اور انہیں مطلوبہ علم واجب یا مستحب کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ جو فرمایا کہ ''ہم سے اپنے اس پردے کو ہٹا دو، اس لیے کہ اس کی تصویریں برابر نماز میں سامنے آتی ہیں۔'' یہ تصویریں دراصل کپڑے میں منقش تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نقش شدہ تصاویر اگر کسی ممنوع امر تک پہنچنے کا ذریعہ بنیں جیسے فحش قسم کی تصاویر کہ جن کے دیکھنے سے جنسی جذبات ابھرتے ہوں۔ بالخصوص نوجوانوں کے تو ایسی تصاویر حرام ہوں گی۔ یہی حکم فلموں کا ہے کہ ان میں بھی عام طور پر شہوات سے متعلق مناظر پیش کیے جاتے ہیں اور خواہشات کو بھڑکایا جاتا ہے اور عریاں تصاویر دکھائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ مختلف مقامات پر فلمی اشتہارات وغیرہ سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، یہ سب حرام ہیں۔ اس لیے کہ اس سے اخلاق بگڑتے ہیں اور بے حیائی اور گناہوں پر ابھارا جاتا ہے۔ یہی حکم ان فلموں کا ہے جو مختلف جرائم کی تعلیم دیتی ہیں۔ جیسے قتل وغارت، مار دھاڑ، چوری ڈکیتی، خیانت، عشق معاشقہ، زنا کاری وغیرہ پر مشتمل فلمیں۔ اس لیے کہ جو لوگ پہلے ان چیزوں سے ناواقف ہوتے ہیں وہ ان فلموں کی وجہ سے آشنا اور واقف ہو جاتے ہیں اور ان کے طور طریقے سیکھ جاتے ہیں۔ مجرم اگر گرفتار ہو جائے تو گرفتاری سے چھٹکارا حاصل کرنے کے داؤ فریب سیکھ لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارے معاشرہ میں آوارگی، بے راہ روی اور بہت سے جرائم پھیلنا شروع ہو جاتے ہیں۔

علماء نے مورتیوں اور تصویروں کی حرمت سے بچوں کے ان کھلونوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو مکمل تصویر کی شکل میں نہ ہوں، لہٰذا وہ مباح ہیں کیونکہ جن وجوہات کی بناء پر تصاویر حرام ہوتی ہیں وہ ان کھلونوں میں نہیں پائی جاتیں۔ (تفصیل کیلئے دیکھئے: شرح القسطلانی ج ۸ ص ۵۳۷)

(۳۰) مختار بن فُلفُل رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ نے فرمایا: ''آپ ﷺ کی امت برابر یہ کہتی رہے گی کہ یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ حتیٰ کہ وہ کہے گی کہ یہ اللہ کی ذات ہے جس نے ساری مخلوق کو پیدا کیا ہے، پھر اس اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟''۔

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الوسوسۃ فی الایمان)

(۳۱) مختار بن فُلفُل رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضور اکرم ﷺ سے

اس حدیث کو نقل کرتے ہیں۔البتہ (راوی) اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یہ الفاظ ذکر نہیں کیے کہ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کی امت'' امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بہت سی روایات کے ساتھ نقل کیا ہے، ان میں سے کسی روایت میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' جن میں سے درج ذیل حدیث بھی ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

(۳۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''لوگ برابر ایک دوسرے سے پوچھتے رہیں گے، حتیٰ کہ کہا جائے گا کہ اس ساری خلق کو تو اللہ نے پیدا کیا ہے پس اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ لہٰذا جو شخص ان میں سے کوئی بات پائے تو اسے چاہیے کہ یوں کہے، میں اللہ پر ایمان لایا''۔

(۳۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''شیطان تم میں سے کسی کے پاس آ کر کہتا ہے کہ اس کو کس نے پیدا کیا؟ اس کو کس نے پیدا کیا؟ حتیٰ کہ پھر وہ اس کو کہتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟ پس جب وہ اس حد تک پہنچے تو (اس سے) اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور رک جائے۔''

اسی طرح امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعدد روایات پہلی روایت کی طرح نقل کی ہیں اور ان سب میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا''

فائدہ:

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی علامت یہ ہے کہ جب شیطان مردود کسی کے دل میں برے خیالات ڈالے تو وہ شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور ان وساوس اور خیالات کی طرف دھیان نہ دے اور انہیں نہایت قبیح خیال کرے۔ اس لیے کہ شیطان، کافر کو جس طرح چاہتا ہے گمراہ کر لیتا ہے لیکن مومن کو وہ گمراہ نہیں کر سکتا، اس لیے وسوسہ اندازی سے اسے پریشان کرتا ہے۔ وسوسہ کا آنا برا نہیں بلکہ ایمان کی علامت بتایا گیا ہے۔ البتہ وسوسہ کا لانا برا ہے۔ شریعت مطہرہ کی تعلیم یہ ہے کہ ایسے لغو

اور بیہودہ خیالات کو دل میں جگہ نہ دی جائے، بلکہ ان سے اعراض کیا جائے اور ان کو کسی استدلال میں پیش نہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور کسی دوسرے کام میں مشغول ہو کر ان وساوس کو ختم کر دے۔

امام مارزی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ حکم دیا ہے کہ اس طرح کے وساوس اور خیالات کے پیش آنے پر ان سے بالکلیہ اعراض کرے اور بلا کسی حجت ودلیل کے ان کو مسترد کر دے۔ مزید لکھتے ہیں کہ دل میں آنے والے خیالات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ خیالات جو دل میں قرار نہیں پاتے اور ان کے پیش آنے کا سبب کوئی شبہ وغیرہ نہیں ہوتا، ایسے خیالات کو اعراض کے ذریعہ دور کرنا چاہیے، حدیث مذکور میں ایسے ہی خیالات مراد ہیں اور اس کو وسوسہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ خیالات بے اصل ہوتے ہیں یونہی پیش آ جاتے ہیں اس لیے ان کو بے اصل یونہی رد کر دیا گیا لیکن دوسرے وہ خیالات ہوتے ہیں جو دل میں قرار اور جگہ پاتے ہیں اور ان کے پیش آنے کا سبب کوئی شبہ وغیرہ ہوتا ہے تو ایسے خیالات کو نظر واستدلال کے ذریعہ ہی دور کیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔ (شرح النووی، باب بیان الوسوسة فی الایمان)

(۳۴) ابو عمران الجونی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ ایک آدمی نے کہا کہ: "خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ فلاں شخص کی مغفرت نہیں کرے گا، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کون ہے وہ جو میری قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کی مغفرت نہیں کروں گا میں نے اس شخص کی مغفرت کر دی اور تیرے اعمال ضائع کر دیئے یا جیسے آپ نے فرمایا۔" (صحیح مسلم باب النهی عن تقنیط الانسان من رحمة اللّٰه تعالیٰ)

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس طرح کی ایک حدیث اپنی سنن میں باب فی النهی عن البغی کے تحت ج ۴ ص ۲۱۵ پر نقل کی ہے، اس کے الفاظ کافی طویل ہیں جس میں ایک قصہ بھی مذکور ہے وہ حدیث ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

(۳۵) ضمضم بن جوس رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "بنی اسرائیل میں دو آدمی

تھے، جو آپس میں بھائی بھائی تھے۔ ان میں سے ایک تو گنہگار تھا اور دوسرا عبادت و بندگی میں مشغول رہتا تھا، وہ عبادت گزار دوسرے کو ہمیشہ گناہوں میں مشغول دیکھتا تو اس سے کہتا: گناہوں سے باز آجاؤ، (ایک مرتبہ) اس گنہگار نے کہا کہ میرے معاملہ کو میرے رب پر چھوڑ دو، کیا تم مجھ پر نگران مقرر کیے گئے ہو؟ تو اس نے کہا کہ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت نہیں کرے گا یا اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ ان دونوں کی روح قبض ہوئی، پھر دونوں رب العالمین کے سامنے جمع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس عبادت گزار سے پوچھا کہ کیا تم مجھے جانتے تھے یا تم اس پر قادر تھے جو میرے قبضہ میں ہے؟ اور گنہگار سے فرمایا کہ جاؤ میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ اور دوسرے سے فرمایا کہ اسے دوزخ میں لے جاؤ۔"

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس شخص نے ایسی بات زبان سے نکالی جس نے اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ و برباد کر کے رکھ دی۔

فائدہ:

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اہل السنت کے مذہب کے حق میں دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہیں تو بغیر توبہ کے بھی گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں اور معتزلہ نے اس حدیث سے حبطِ اعمال پر استدلال کیا ہے کہ کبیرہ گناہوں کی وجہ سے اعمال حبط اور اکارت ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حبط اعمال سے مراد یہ ہے کہ سیئات کے مقابلہ میں اس کے حسنات کو ساقط کر دیا گیا۔ جسے مجازاً یہاں احباطِ عمل سے تعبیر کر دیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس بات کا احتمال موجود ہے کہ اس شخص (عبادت گزار) سے کوئی ایسا امر صادر ہوا ہو جو موجب کفر ہو، ظاہر ہے کہ کفر یقیناً حبط اعمال کا ذریعہ ہے، تیسرا جواب یہ ہے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ یہ حکم سابقہ شریعت میں ہو، چنانچہ اس کے مطابق اس شخص کے اعمال حبط ہو جائے۔ (شرح النووی)

اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو ہر وقت اللہ جل شانہ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ اپنے نیک اعمال پر نازاں نہیں ہونا چاہیے اور دوسروں کے بُرے اعمال کو دیکھ کر مغرور نہیں ہونا چاہیے اور اس بناء پر دوسروں کی تحقیر نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ اس حدیث مبارک میں اس گنہگار شخص نے اپنے جرم کا اعتراف کر کے اپنے رب کی رحمت و مغفرت پر بھروسہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت اور بخشش فرمادی۔ اور دوسرے عبادت گزار شخص کو یا تو اس بناء پر دوزخ میں ڈالا گیا کہ اس سے کوئی ایسی بات صادر ہوئی تھی جو موجب کفر تھی اور وہ اس وجہ سے ہمیشہ کیلئے جہنم کا ایندھن بن گیا اور یا پھر اس لیے جہنم میں ڈالا گیا کہ اس سے کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہوا جس کی وجہ سے وہ دیگر گنہگار مومنوں کی طرح سزا بھگتنے کیلئے جہنم میں بھیجا گیا۔ اور اس کا گناہ یہ تھا کہ اس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ گنہگار کو معاف نہیں کرے گا اور اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں مداخلت کرے اور کسی کے متعلق مغفرت یا عدم مغفرت کا قطعی فیصلہ صادر کرے۔

نعوذ باللّٰہ من الزلل فی القول و العقیدۃ و العمل آمین. (شرح النووی علی صحیح مسلم)

(۳) نیک اعمال پر کئی گُنا اجر وثواب کا ملنا

(۳۶) ابو رجاء العطاردی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب عزوجل سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے نیکیوں اور بدیوں کے لکھنے کا حکم دیا، پھران کو بیان کیا، لہٰذا جو شخص کسی نیک کا ارادہ کرے پھر اسے انجام نہیں دے سکا تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے اپنے ہاں مکمل ایک نیکی لکھ دیتے ہیں اور اگر وہ اس نیکی کا ارادہ کرکے اسے انجام بھی دے لے تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے اپنے ہاں دس نیکیوں سے سات سو گنا تک لکھ دیتے ہیں بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ، اور جو شخص کسی بدی کا ارادہ کرے پھر اسے انجام نہ دے تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے اپنے پاس ایک مکمل نیکی لکھ دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس بدی کا ارادہ کرکے اسے انجام بھی دیدے تو اللہ تعالیٰ اس کو صرف ایک بدی لکھتے ہیں''۔ (صحیح البخاری، کتاب الرقاق ج ۸ ص ۱۰۳)

(۳۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''جب میرا بندہ کوئی برائی کرنا چاہے تو اس کو نہ لکھو جب تک کہ اس کو انجام نہ دیدے۔ اگر وہ برائی کو انجام دیدے تو اس برائی کو اتنا ہی لکھو اور اگر وہ اس برائی کو میری خاطر چھوڑ دے تو اس کیلئے نیکی لکھ دو، اور جب میرا بندہ کوئی نیکی کرنے کا ارادہ کرے اور اسے بجا نہ لا سکے تو اس کیلئے ایک نیکی لکھ دو اور اگر اس نیکی کو بجالائے تو اس کیلئے دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا تک کا اجر وثواب لکھ دو''۔ بعض روایات میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ ''کئی گنا تک''۔

(صحیح البخاری. کتاب التوحید. باب، يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلَامَ اللّٰهِ ج ۹ ص ۱۴۴)

(۳۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: جب میرا بندہ کسی برائی کا ارادہ کرے تو اس کو نہ لکھو، اگر اس برائی کو کر گزرے تو پھر اس کے لئے ایک برائی لکھو، اور جب کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اسے نہ کر سکے تو اس کیلئے ایک نیکی لکھو اور اگر اس نیکی کو کرلے تو اس کیلئے دس نیکیاں لکھو''۔

(صحیح مسلم، باب تجاوز اللّٰہ تعالیٰ عن حدیث النفس والخواطر بالقلب ...... ج ۸

حاشیہ القسطلانی ص ۴۸۶)

مسلم کی ایک دوسری روایت سند متصل کے ساتھ یوں منقول ہے:

(۳۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ''جب میرا بندہ کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اس کو نہ کر پائے تو میں اس کیلئے ایک نیکی لکھتا ہوں اور اگر اس نیکی کو کر گزرے تو میں اس کیلئے دس نیکیوں سے سات سو گنا تک کا اجر لکھتا ہوں، اور جب کسی برائی کا ارادہ کرے اور اسے نہ کر پائے تو میں اس برائی کو اس کیلئے نہیں لکھتا اور اگر اس برائی کو کر گزرے تو پھر میں اسے ایک برائی لکھتا ہوں۔''

(۴۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا کہ: ''جب میرا بندہ کسی نیکی کرنے کا ارادہ کرے تو میں اس کیلئے ایک نیکی لکھ دیتا ہوں، جب تک کہ اس نے اس نیکی کو نہ کر لیا ہو، اور جب وہ اس نیکی کو کر لیتا ہے تو میں اس کیلئے اسے دس گنا لکھتا ہوں اور جب وہ کسی برائی کا ارادہ کرے تو میں وہ برائی اس کو معاف کر دیتا ہوں جب تک کہ وہ اس کا ارتکاب نہ کرے، اور جب اس برائی کو کر لیتا ہے تو اس کو اتنا ہی لکھتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ فرشتے کہتے ہیں کہ اے پروردگار! تیرا وہ بندہ برائی کا ارادہ رکھتا تھا (حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس کا بخوبی علم ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی نگرانی کرو اگر یہ برائی کر لے تو اس کو اتنا ہی لکھو اور اگر برائی کو چھوڑ دے تو اس کیلئے نیکی لکھو، کیونکہ اس نے میری خاطر ہی اسے چھوڑا ہے۔'' (صحیح مسلم)

(۴۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جب تم میں سے کوئی شخص اپنے اسلام (اعمال) میں حسن پیدا کرتا ہے تو ہر نیکی جسے وہ انجام دیتا ہے اس پر اسے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک کا اجر و ثواب ملتا ہے اور ہر بدی جسے وہ کرتا ہے اس پر اس کیلئے اتنا ہی لکھا جاتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کر لے۔'' (صحیح مسلم)

(۴۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے رب عزوجل سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ کر اس کو بیان فرما دیا ہے لہٰذا جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے پھر اسے نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ اس کو

اپنے پاس ایک کامل نیکی لکھ دیتے ہیں اور اگر نیکی کا ارادہ کر کے اسے کر بھی لے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ہاں دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی کئی گنا تک لکھ دیتے ہیں اور اگر کسی برائی کا ارادہ کرے پھر اسے نہ کر پائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ہاں کامل ایک نیکی لکھ دیتے ہیں اور اگر اس کا ارادہ کر کے اسے کر بھی لے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایک برائی لکھتے ہیں۔'' (صحیح مسلم)

ایک دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے: ''یا اللہ تعالیٰ اس کو مٹا دیتے ہیں اور اللہ کے ہاں وہی ہلاک و برباد ہوگا جو واقعۃً ہلاک و تباہ ہونے والا ہے۔''

(۴۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ عز وجل نے فرمایا کہ (اور اس کا فرمان برحق ہے)۔ ''جب میرا بندہ کسی نیکی کا ارادہ کرے تو اس کیلئے ایک نیکی لکھ دو، اور اگر اس نیکی کو بجالائے تو اس کیلئے اس نیکی کو دس گنا تک لکھ دو، اور جب کسی برائی کا ارادہ کرے تو اسے مت لکھو پھر اگر اس برائی کو کر گزرے تو اس کو اتنا ہی لکھو اور اگر اس کو ترک کر دے اور بعض اوقات یہ فرمایا کہ اسے نہ کرے تو اس کیلئے ایک نیکی لکھ دو، پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی، مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (سورۃ الانعام: ۱۶۰) ''جو شخص نیکی لائے گا اسے اس کا دس گنا اجر ملے گا۔'' ابو عیسیٰ الترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (صحیح الترمذی، باب سورۃ الانعام ج ۲ ص ۱۸۰)

(۴۴) حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''جو شخص نیکی بجالائے گا اسے دس گنا تک اجر ملے گا یا اس سے بھی زیادہ اور جو شخص برائی کا ارتکاب کرے گا تو برائی کا بدلہ اتنی ہی ایک برائی ہے یا میں معاف کر دوں گا، اور جو شخص ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں، اور جو ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے میں ایک باع (دو ہاتھوں کے درمیان کے فاصلے کے برابر) اس کے قریب ہوتا ہوں، اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں اور جو شخص روئے زمین کے بقدر گناہ لے کر میرے پاس آئے گا لیکن وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہوگا تو میں بھی اس کے پاس اسی قدر مغفرت لے کر آؤں گا۔''

(سنن النسائی، القنوت، الرقائق کما فی القسطلانی وسنن ابن ماجه عن ابی ذرؓ)

فائدہ:

امام مازری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ قاضی ابو بکر بن الطیب رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ جو شخص دل سے کسی گناہ کا عزم مصمم کرلے تو اسے اس عزم پر گناہ ہوگا اور مذکورہ احادیث میں جو یہ آیا ہے کہ انجام دینے سے پہلے وہ شخص گنہگار نہیں ہوگا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر گناہ کا پختہ عزم نہ ہو اور یوں ہی اس کا خیال گزرے اور دل میں جگہ نہ پکڑے تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہے، اسے اصطلاح میں "ھمّ" کہا جاتا ہے، اس پر گرفت نہیں ہے جبکہ عزم پر مواخذہ ہے۔

لیکن اکثر فقہاء اور محدثین کرام، قاضی ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں اور احادیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہیں۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عام اخلاف صالحین اور اہل علم فقہاء و محدثین کرام کی رائے وہی ہے جو قاضی ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اس لیے کہ بہت سی دیگر احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دل کے عزم پر مواخذہ ہوگا لیکن علماء کہتے ہیں کہ عزم کرنا ہی گناہ میں شمار ہوگا، نہ کہ وہ گناہ جس کا اس نے ارادہ کیا ہے کیونکہ اس نے ابھی تک اس کا ارتکاب نہیں کیا، اور خوف خدا کے علاوہ کسی چیز نے اسے گناہ کے ارتکاب سے روک دیا ہے۔ البتہ نفسِ اصرار اور گناہ کا عزم کرنا معصیت شمار ہوگا۔ اس لیے گناہ لکھ دیا جائے گا اور جب وہ گناہ کا ارتکاب کرلے گا تو ایک اور گناہ لکھ دیا جائے گا۔ پھر اگر اسے خوف خدا کی وجہ سے چھوڑ دے تو اس پر ایک نیکی لکھی جائے گی۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "اس نے میری خاطر اس کو چھوڑا ہے" لہٰذا خوف خدا کی وجہ سے گناہ کا ترک کرنا اور اپنے نفس امارہ کو قابو میں رکھنا اور خواہش نفس کی نافرمانی کرنا، نیکی کا درجہ رکھتا ہے اور جس ارادے پر مواخذہ نہیں ہوتا اس سے مراد وہ خیالات ہیں جو دل میں جاگزیں نہ ہوں اور قلبی طور پر عزم پختہ اور نیت نہ ہو۔

بعض متکلمین اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص خوف خدا کی

بجائے بندوں کے خوف سے گناہ ترک کردے تو آیا اس پر اسے اجر وثواب ملے گا؟ یا اس کے نامہ اعمال میں نیکی لکھی جائے گی؟ امام مازری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اسے اس پر اجر نہیں ملے گا کیونکہ اس نے لوگوں سے شرم وحیاء کی وجہ سے اس گناہ کو ترک کیا ہے لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ قاضی کے کلام کا آخری حصہ ہے اور یہ بظاہر اچھا کلام ہے جس پر مزید لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

دل سے گناہ کے عزم پر مواخذہ ہونے کے بارے میں بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ'' (سورۃ النور: ۱۹) ''بے شک وہ لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں کے درمیان بے حیائی پھیل جائے ان کیلئے دنیا وآخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

نیز ارشاد ہے: ''اِجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ''۔ (الحجرات: ۱۲)

''بہت سے گمانوں سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔''

اس موضوع سے متعلق بہت سی قرآنی آیات موجود ہیں اور اس بات پر نصوص شرعیہ اور اجماع امت ہے کہ حسد کرنا مسلمانوں کو حقیر جاننا اور ان کے بارے میں بری نیت رکھنا حرام ہے اور یہ دل کے ہی اعمال اور ارادوں (عزم) سے متعلق ہیں۔ واللہ اعلم

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ: ''اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی ہلاک ہوگا جو واقعۃً ہلاک وبرباد ہونے والا ہے''۔ اس کے بارے میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل وکرم بندوں پر نہایت وسیع ہے اس لیے اس نے اس برائی کو بھی نیکی قرار دیدیا جس کا وہ ارتکاب نہ کر پائے، اور اگر برائی کا ارتکاب کرے تو اس کو صرف ایک برائی شمار کیا اور اگر نیکی کا ارادہ کرے تو اسے نہ کرنے کے باوجود اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر وہ نیکی بجا بھی لائے تو دس سے سات سو گنا تک اس کا اجر وثواب اس کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے اس فضل وعنایت سے محروم رہا اور اس کے باوجود بھی اس کے گناہ زیادہ ہو گئے حالانکہ برائیاں تو اتنی

ہی لکھی جاتی ہیں اور نیکیاں بڑھا چڑھا کر کئی کئی گنا کر کے لکھی جاتی ہیں۔ تو ایسا شخص واقعۃً محروم القسمت اور ہلاکت و بربادی کے لائق ہے، اس لیے کہ اس نے نیکیاں کی نہیں اور برائیوں سے پرہیز نہیں کیا، حتیٰ کہ وہ برائیاں اس کی نیکیوں پر غالب آ گئیں۔

امام ابو جعفر الطحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ احادیث اس بات پر دلیل ہیں کہ بندوں کے اعمال لکھنے والے فرشتے ان کے دل کے اعمال اور عزم و ارادوں کو بھی لکھتے ہیں اور یہ احادیث ان لوگوں کے خلاف حجت اور دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فرشتے صرف ظاہری اعمال کو لکھتے ہیں۔ واللہ اعلم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ ''سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی کئی گنا تک'' ان الفاظ میں اس مذہب صحیح و مختار کی تصریح ہے جو علماء نے اختیار کیا ہے کہ اجر و ثواب کی تضعیف سات سو گنا تک موقوف نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مل سکتا ہے۔

قاضی باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ جو شخص کسی گناہ کا دل سے عزم کرے اور اسے کر گزرنے کا پختہ ارادہ کرے تو وہ گنہگار ہوگا اور جن احادیث میں گناہوں کے ارادہ پر معافی کا ذکر ہے اس سے مراد وہ خیالات ہیں جو دل میں جگہ نہ پکڑیں اور یونہی گزر جائیں اور ان کے کرنے کا عزم نہ ہو۔

امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بہت سے فقہاء، محدثین اور متکلمین نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے اور ان کی دلیل صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''میں اس کو معاف کر دیتا ہوں جب تک وہ گناہ کا ارتکاب نہ کر لے'' ظاہر ہے کہ اس حدیث میں عمل (کرنے) سے مراد ہے عملی طور پر اس گناہ کو کرنا جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا تعقب کرتے ہوئے کہا ہے کہ عام اسلاف کا قول وہی ہے جو قاضی باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اس لیے کہ اعمال قلب پر مواخذہ ہونے پر ان کا اتفاق ہے۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ گناہ کے عزم پر محض گناہ لکھا جائے گا نہ کہ وہ گناہ جس کا اس نے ارادہ کیا ہے۔ جیسے کوئی شخص معصیت کے اسباب حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن پھر اس کا ارتکاب نہیں کرتا تو وہ اس حکم کرنے پر گنہگار ہوگا لیکن

اس کو گناہ کے ارتکاب کا گناہ نہیں ہوگا۔

بہت سی نصوص شرعیہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دل میں گناہ کا پختہ عزم کرنے پر مواخذہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے: ''اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ'' (النور: ۱۹)
''بے شک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان والوں کے درمیان بے حیائی کا چرچا ہو ان کیلئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ علماء کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ گناہ کا عزم مصمم کرنے پر مواخذہ ہوگا پھر ان میں اختلاف رائے ہوا تو بعض کہتے ہیں کہ دنیا میں غم وحزن کی صورت میں عذاب ہوگا اور بعض کہتے ہیں کہ قیامت کے روز اس کا عذاب ہوگا، لیکن صرف کتابت کی صورت میں نہ کہ عقوبت (سزا) کی صورت میں۔ جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ گناہ کے ارادے پر مواخذہ نہیں ہوگا انہوں نے اس حکم سے اس ارادے کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو حرم مکہ میں ہو، وہاں چاہے عزم مصمم نہ بھی ہو تب بھی مواخذہ ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَمَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ'' (الحج: ۲۵)
''اور جو شخص اس میں ظلم سے کسی بے دینی کا ارادہ کرے گا ہم اسے دردناک سزا چکھائیں گے''۔ اس لیے کہ حرم مکہ کا احترام اور تعظیم انتہائی ضروری ہے، لہٰذا جو شخص وہاں کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کی بے حرمتی کر کے ایک واجب امر کو ترک کر رہا ہے، اس بناء پر حرم شریف میں کسی گناہ کا ارتکاب کرنا عام جگہوں کی بہ نسبت زیادہ سخت ہوتا ہے اور جو شخص حرم شریف کی توہین کے ارادے سے کسی گناہ کا قصد اور ارادہ کرتا ہے تو وہ نافرمان ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی گستاخی کے ارادے سے اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ کافر ہے۔ صرف اس گناہ کا ارادہ کرنا قابل معافی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کا قصد نہ ہو اور اس ذات کی عظمت شان ذہن سے ہٹ جائے اور گناہ کا ارادہ کر بیٹھے۔ (ملخصًا من الفتح)

بعض علماء نے حرم مکہ میں ارتکاب گناہ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ مقام انتہائی احترام اور تعظیم کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا وہاں گناہ کا ارادہ کرنا بھی گناہ شمار ہوگا لیکن جمہور

علماء کا مذہب یہ ہے کہ خواہ کوئی بھی مکان اور زمان ہو سب میں گناہ کے ارتکاب پر ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے اسے بڑھایا نہیں جاتا۔ البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زمان یا مکان کی عظمت کی وجہ سے گناہ میں تفاوت ہو جاتا ہے۔

بہر حال! ان احادیث مبارکہ میں اس امت محمدیہ پر اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت وفضل کا بیان ہے کہ ان کی نیکیوں کو کئی کئی گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے لیکن برائیوں کو نہیں بڑھایا جاتا بلکہ انہیں محدود رکھا گیا ہے کہ ایک برائی کے ارتکاب پر ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے اور پھر نیکی کے ارادے پر بھی ایک پوری نیکی لکھی جاتی ہے اور برائی اس وقت تک نہیں لکھی جاتی جب تک کہ اس کا ارتکاب نہ کر لے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل واحسان نہ ہوتا تو کوئی بھی شخص جنت میں داخل نہ ہو سکتا۔ اس لئے کہ بندوں کے اعمالِ بد ان کے نیک اعمال سے زیادہ ہی ہوتے ہیں۔

واللہ اعلم۔ (شرح النووی علی صحیح مسلم ج ۱، شرح القسطلانی ج ۹ ص ۲۸۰)

(۴) ﴿اللہ تعالیٰ کے ساتھ حُسنِ ظن رکھنا﴾

(۴۵) ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا میرا بندہ میرے ساتھ گمان کرتا ہے اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کیساتھ ہوتا ہوں، اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو اس سے بہتر ہے اور اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ (کی مقدار) اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک باع (دو پھیلے ہوئے ہاتھوں کے بقدر فاصلہ) اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں'' (صحیح البخاری. کتاب التوحید، باب ویحذر کم اللہ نفسہ ج ۹ ص ۱۲۰، قسطلانی ج ۱۰ ص ۳۸۱)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے تین طرق سے نقل کیا ہے:

(۴۶) پہلا طریق الفاظ روایت کے لحاظ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ روایت کے قریب قریب ہے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ صحیح مسلم میں یہ الفاظ نہیں ہیں: ''اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو اس سے بھی بہتر ہے۔''

(۴۷) دوسری روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں: ''اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک باع کے بقدر اس کے قریب ہوتا ہوں۔''

اور تیسری روایت وہ ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ہم سے بیان فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اگر بندہ ایک بالشت میری طرف بڑھتا

ہے تو میں ایک ہاتھ کے بقدر اس کی طرف بڑھتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ کے بقدر بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک باع کے بقدر بڑھتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک باع کے بقدر بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف اس سے بھی زیادہ تیز بڑھتا ہوں۔''

(صحیح مسلم از حاشیہ قسطلانی ج ۱۰ ص ۱۱۱)

(۴۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔''

(جامع الترمذی، باب حسن الظن باللّٰہ عزوجل)

(۴۹) جامع ترمذی کی ایک رایت میں یوں آتا ہے کہ ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ فرماتے ہیں کہ ''میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، پس اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اسے ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو اس سے بہتر ہے، اور اگر وہ میری طرف ایک بالشت کے بقدر قریب ہوتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ کے بقدر قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ کے برابر قریب ہوتا ہے تو میں اس کی طرف ایک باع (دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر) کے بقدر قریب ہوتا ہوں، اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔''

(۵۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میری یاد میں اس کے دونوں ہونٹ حرکت کرتے ہیں۔'' (سنن ابن ماجہ. باب فضل الذکر ج ۲ ص ۲۱۸)

(۵۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو

میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو اس سے بہتر ہے، اور اگر وہ میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میرے پاس چل کر آتا ہے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں۔" (سنن ابن ماجه. باب فضل العمل ج ۲ ص ۲۲۳)

فائدہ:

اُن احادیثِ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر بندہ میرے بارے یہ گمان کرتا ہے کہ میں اس کے نیک اعمال قبول کر کے اس پر اسے اجر وثواب عطا کروں گا اور توبہ کرنے کی صورت میں اس کی مغفرت کروں گا تو میں اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہوں اور اگر وہ یہ گمان کرتا ہے کہ میں اس کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں کروں گا تو پھر ایسا ہی کرتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ امید ورجا کا پہلو خوف کے پہلو پر راجح اور غالب ہے۔ بعض محققین نے اسے اس شخص کے ساتھ خاص کیا ہے جس کی موت کا وقت آ پہنچا ہو اور اس سے پہلے کی حالت کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ جن میں صحیح تر قول اعتدال کا ہے۔ یعنی امید اور خوف دونوں رکھے، اس لیے انسان کو چاہیے کہ فرائض کو بجا لانے میں خوب جدوجہد کرے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھے کہ وہ اس کو قبول بھی کرے گا اور اس کی مغفرت بھی کرے گا۔ اس لیے کہ اس ذات نے اس کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اور اگر اس نے اس کے خلاف اعتقاد رکھا یا گمان کیا تو وہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہونے والا ہے اور اللہ کی رحمت سے ناامید ہونا کبیرہ گناہ ہے، اور جو شخص اس حالت میں انتقال کر جائے تو اس کے ساتھ اپنے گمان کے مطابق سلوک ہوگا، لیکن گناہوں پر اصرار کرتے ہوئے مغفرت کی امید رکھنا محض جہالت اور خود کو دھوکہ دینا ہے۔

ان احادیثِ مبارکہ میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "میں اسے ایسی مجلس میں یاد کرتا ہوں جو اس سے بہتر ہے" اس مجلس سے مراد ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کی جماعت ہے، اس سے فرشتوں کا انسانوں سے افضل و برتر ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ اس بات کا احتمال موجود ہے

کہ اس سے صرف فرشتوں کی جماعت مراد نہ ہو بلکہ اس سے انبیاء وشہداء کی جماعت بھی مراد ہو، اور اگر اس سے صرف فرشتوں کی جماعت مراد لی جائے تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جس جماعت میں خود رب العزت موجود ہوں وہ جماعت یقیناً ذاکرین کی جماعت سے اعلیٰ اور افضل ہوگی۔ پس یہاں پر افضلیت افراد کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ جماعت کے لحاظ سے ہے۔ (قالہ الحافظ ابن حجرؒ)

''اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے'' یہاں خاص قسم کی معیت مراد ہے، یعنی جب بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اپنی رحمت وعنایت اور ہدایت وتوفیق کے اعتبار سے اس کے ساتھ ہوتا ہوں، یہاں عام معنی کے اعتبار سے معیّت مراد نہیں ہے بلکہ علم اور احاطہ کے لحاظ سے معیت مراد ہے

''میں دوڑ کر آتا ہوں'' اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص معمولی اطاعت کے ذریعہ میرا قُرب حاصل کرتا ہے میں اس کو اس پر اجر عظیم عطا کرتا ہوں اور انسان جس قدر اطاعت میں بڑھتا جائے گا میں اس کو اتنا ہی بڑھا چڑھا کر اجر وثواب عطا کروں گا اور اگر وہ اطاعت میں سست رفتاری دکھائے گا تو میں اسے جلدی سے جلدی ثواب عطا کروں گا۔

ان احادیث مبارکہ میں قریب ہونا یا دوڑ کر آنا بطور مجاز کے استعمال ہوا ہے یعنی مشاکلہ یا استعارہ کے طور پر یہ کلمات استعمال کیے گئے ہیں یا پھر ان کا لازمی معنی مراد لیا گیا ہے، کیونکہ اس طرح کے کلمات کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے لئے مجازاً تو جائز ہے لیکن حقیقتاً جائز نہیں ہے۔ (شرح القسطلانی ج ۱۰ ص ۳۸۱)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

''میں اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب استغفار کر کے مغفرت کا اور توبہ تائب ہو کر قبولیت کا اور دعا کر کے قبول ہونے کا اور کفایت طلب کر کے کفایت کا گمان اور امید رکھتا ہے تو میں اس کے گمان اور امید کو پورا کر دیتا ہوں۔ یعنی اس کی مغفرت کر دیتا ہوں اور اس کی توبہ قبول کرتا ہوں وغیرہ۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد عفو ودرگزر کی امید ہے اور یہ قول زیادہ صحیح ہے۔

اور دل میں یاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خلوت اور تنہائی میں یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس عمل کا جو مخلوق سے پوشیدہ ہے، اجر و ثواب عطاء کرتے ہیں۔

اور حدیث میں یہ فرمانا کہ: ''میں اسے اس سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں'' تو اس کے بارے میں ہمارے اصحاب وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام، فرشتوں سے افضل ہیں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''وَفَضَّلْنَا هُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ'' (الجاثية: ١٦) ''اور ہم نے ان کو دنیا جہاں پر فضیلت بخشی ہے۔'' اور ان احادیث میں یہ تاویل کی جائے گی کہ عام طور پر ذاکرین کی جماعت میں نبیؐ موجود نہیں ہوتے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ ان ذاکرین کو فرشتوں کی جماعت میں یاد کریں گے تو فرشتوں کی وہ جماعت ذاکرین کی اس جماعت سے افضل ہوگی جس میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا گیا ہے اور ان احادیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ''جو میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں ایک باع کی مقدار اس کے قریب ہوتا ہوں۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص میری اطاعت کر کے میرے قریب ہوگا میں اپنی رحمت کے ذریعہ اس کے قریب ہوں گا، یعنی میں اسے اپنی رحمت وعنایت سے نوازوں گا، اسے توفیق دوں گا اور اس کی مدد کروں گا اور وہ جتنا اطاعت اور فرماں برداری میں بڑھتا جائے گا میں اتنی ہی اس کو توفیق دوں گا اور اس کی مدد کروں گا، اگر وہ میری طرف چل کر آئے گا یعنی میری اطاعت میں جلدی کرے گا تو میں اس کی طرف دوڑ کر آؤں گا یعنی اس پر اپنی رحمت برساؤں گا اور حصولِ مقصود کے لیے اسے زیادہ سعی وکوشش نہیں کرنا پڑے گی۔ خلاصہ یہ ہوا کہ بندہ جس قدر اطاعت وفرماں برادری اختیار کر کے اللہ کا قرب حاصل کرے گا اسی قدر اس کو اجر و ثواب سے نوازا جائے گا۔ (شرح النووی)

(۵) نیک بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اعزازات

(۵۲) حضرت اعرج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا ''میں نے اپنے بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال تک گزرا، پس اگر تم چاہو تو یہ آیت کریمہ پڑھو ''فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ'' (السجدہ: ۱۷)

''پس کسی جان کو علم نہیں کہ جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا (سامان) ان کے لئے چھپا رکھا گیا ہے۔'' (صحیح البخاری، باب صفة اهل الجنة ج ۴ ص ۱۱۸)

(۵۳) حضرت اعرج رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اپنے نیک اور صالح بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال تک گزرا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ'' (السجدة: ۱۴) ''پس کوئی جان نہیں جانتی کہ جو آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے چھپا رکھی گئی ہے۔'' (صحیح البخاری، کتاب التفسیر ج ۲، ص ۱۵، مشکوٰة المصابیح، باب صفة الجنة واهلها ص ۴۹۵)

(۵۴) ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ انعامات تیار کر رکھے ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا خیال بھی گزرا، ان نعمتوں کو تو جانے دو جو تمہیں معلوم ہو چکی ہیں، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ''

(السجدة: ۱۴) ''پس کوئی جان نہیں جانتی کہ جو آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے ان کے لیے چھپا کر رکھا گیا ہے۔'' (صحیح البخاری، مذکورہ باب ج ۶ ص ۱۱۶)

(۵۵) صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ''مِنْ بَلْهِ مَا اطَّلَعْتُمْ عَلَيْهِ'' یعنی ان نعمتوں کو تو جانے دو جو تمہیں معلوم ہو چکی ہیں۔'' اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو کتاب التوحید ج ۹ ص ۱۴۴ پر پہلی روایت کی طرح ذکر کیا ہے۔

(۵۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا کہ ''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ (نعمتیں) تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا، اس کی تصدیق کے لیے کتاب اللہ کی یہ آیت ''فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ'' (السجدة: ۱۴) ''پس کوئی جان نہیں جانتی کہ جو ان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک (کا سامان) چھپا رکھا گیا ہے۔''

(صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها ج ۱۰ ص ۲۸۲)

(۵۷) ایک دوسری روایت میں ''ولا خطر علىٰ قلب بشر'' کے بعد ذُخْراً بَلْهَ مَآ اَطْلَعَكُمُ اللّٰهُ عَلَيْهِ'' کے الفاظ زائد ہیں۔

(۵۸) ایک تیسری روایت میں '' ذخراً بله ما اطلعكم اللّٰه عليه'' کے بعد یہ ہے کہ پھر انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ'' (السجدة: ۱۴) ''پس کوئی نفس نہیں جانتا جو ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے چھپا رکھا گیا ہے۔''

(۵۹) ایک چوتھی روایت میں یہ الفاظ زائد منقول ہیں کہ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَّطَمَعاً وَّمِمَّا رَزَقْنَا هُمْ يُنْفِقُوْنَ ٥ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (السجدة: ۱۶، ۱۷) ''ان کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور امید میں پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس

میں سے خرچ کرتے ہیں، پس کوئی جان نہیں جانتی جو ان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے چھپا رکھا گیا ہے۔ یہ بدلہ ہے اس چیز کا جو وہ عمل کرتے تھے۔"

اور جنت میں ایسا درخت ہے کہ اس کے سایہ میں سوار سو سال تک بھی چلے تو اس کی مسافت کو قطع نہیں کر سکے گا اور اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (الواقعة: ۳۰) "اور لمبے سایے ہوں گے" اور جنت میں ایک کوڑے کے برابر بھی جگہ مل جانا دنیا اور اس کے تمام خزانوں سے بہت بہتر ہے، اور اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو" فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (آل عمران: ۱۸۵) "پھر جو شخص دوزخ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔"

(جامع الترمذی ، باب سورة الواقعة ج۲ص۲۲۵)

(۶۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عز و جل ارشاد فرماتے ہیں "میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ (نعمتیں) تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال گزرا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "اور ان نعمتوں کو جانے دو جن پر اللہ نے تم کو مطلع کیا ہے۔" اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو:" فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (السجدة: ۱۸) "سو کسی جان کو معلوم نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے یہ بدلہ ہے، اس چیز کا جو وہ عمل کرتے تھے۔"

(سنن ابن ماجه ، باب صفة الجنة ج ۲ ص ۳۰۵)

فائدہ:

صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث (جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے) میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ بَلْهَ مَا اُطْلِعْتُمْ عَلَيْهِ "اس کے بارے میں تین اقوال ہیں: پہلا قول یہ

ہے کہ" بَلْهَ" اسم فعل بمعنی دَعْ' ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم ان نعمتوں کو چھوڑ دو جن پر تم کو مطلع کیا گیا ہے، یعنی ہم نے جنت میں جو نعمتیں اپنے نیک بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں بہت اعلیٰ اور عظیم ہیں، اس وقت تم دنیا میں جن نعمتوں کو جانتے ہو ان کا ذکر جانے دو، اس لیے کہ وہ جنت میں ذخیرہ کی گئی نعمتوں کے مقابلہ میں بہت معمولی ہیں، چنانچہ علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: دع ما اطلعتم علیہ: فانہ سهل یسیر فی جنب ما ادخرته لهم" (عمدة القاری: ۱۱۴/۱۹) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ لفظ اصل میں" مِنْ بَلْهَ ہے اور" غیر" کے معنی میں ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ نیک بندوں کے لیے نعمتوں کا جو ذخیرہ ہم نے تیار کر رکھا ہے وہ ان نعمتوں کے علاوہ ہے جن پر تم کو مطلع کیا گیا ہے، اس صورت میں "بلهَ" نحوی اعتبار سے مابعد کی طرف مضاف ہے۔ (فتح الباری ۵۱۶/۸) اور تیسرا قول یہ ہے کہ "من بَلْهَ" بمعنی کیف ہے اور بَلْهَ" مبنی بر فتح ہے اور کیف استفہام استبعاد کے لیے ہے اور معنی یہ ہوگا کہ تم ان نعمتوں پر کیسے مطلع ہو سکتے ہو جن کے احاطہ سے انسانی عقلیں قاصر ہیں۔ (فتح الباری ۵۱۶/۸)

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ تین توجیہات میں سے دوسری توجیہ سیاقِ حدیث کے اعتبار سے زیادہ واضح ہے۔

(۶) ﴿آسمانِ دنیا سے رب تعالیٰ کا بندوں کو پکارنا﴾

(۶۲) ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" ہمارے پروردگار رات کے آخری تہائی حصہ میں ہر شب آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ: کون ہے جو مجھے پکارے میں اس کا جواب دوں (قبول کروں)۔کون ہے جو مجھ سے مانگے میں اس کو عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت مانگے میں اس کی مغفرت کردوں؟

(صحیح البخاری ، کتاب الدعوات، باب الدعاء فی نصف اللیل ج ۸ ص ۷۱)

(۶۳) امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الصلوٰۃ کے آخر میں بھی نقل کیا ہے اور باب کتاب التوحید میں بھی "یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوا کَلَامَ اللّٰهِ" کے تحت مذکورہ الفاظ کے قریب قریب یا اس کے مثل نقل کیا ہے۔ نیز امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ حدیث الفاظ بخاری کی طرح نقل کی ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں متعدد روایات کے ساتھ یہ حدیث نقل کی ہے جن میں سے پہلی روایت یہ ہے:

(۶۴) بخاری کے الفاظ کی طرح یہاں پر بھی ہے ،فرق یہ ہے کہ یہاں "یَنْزِلُ رَبُّنا" ہے اور بخاری میں یَتَنَزَّل" کے الفاظ ہیں، جیسا کہ بخاری کے ایک نسخہ میں بھی یہی الفاظ مروی ہیں۔

(۶۵) دوسری روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جب رات کا ابتدائی تہائی حصہ گزرتا ہے تو ہر رات اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ میں بادشاہ ہوں، میں بادشاہ ہوں، کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اس کی پکار کو سنوں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اس کو عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت کی درخواست کرے اور میں اس کی مغفرت کروں؟ مسلسل یہی معاملہ رہتا ہے، یہاں تک کہ صبح صادق روشن ہوتی ہے۔"

(۶۶) تیسری روایت یہ ہے کہ ''جب رات کا ایک حصہ یا دو تہائی حصہ گزر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ: کوئی ہے مانگنے والا کہ اسے عطا کیا جائے؟ ہے کوئی دُعا کرنے والا کہ اس کی دُعا قبول کی جائے؟ ہے کوئی معافی مانگنے والا کہ اس کی مغفرت کی جائے؟ یہاں تک کہ صبح صادق روشن ہو جاتی ہے۔''

(۶۷) چوتھی روایت یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں، پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ ''کون ہے جو مجھے پکارے کہ میں اس کی پکار کو سنوں؟ یا مجھ سے مانگے اور میں اس کو عطا کروں؟ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ''کون ہے جو ایسی ذات کو قرض دے جو نہ محتاج ہے اور نہ ظلم کرنے والی ہے''

(۶۸) پانچویں روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں: ''پھر اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھوں کو کشادہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کون ایسی ذات کو قرض دے گا جو نہ محتاج ہے اور نہ ہی ظلم کرنے والی ہے۔''

(۶۹) چھٹی روایت یہ ہے کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ مہلت دیتے ہیں، یہاں تک کہ جب رات کا ابتدائی تہائی حصہ گزر جاتا ہے، تو آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی ہے مغفرت مانگنے والا؟ کوئی ہے توبہ کرنے والا؟ کوئی ہے دُعا کرنے والا؟ یہاں تک کہ صبح صادق طلوع ہو جاتی ہے۔''

(۷۰) امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بخاری کے الفاظِ روایت (ج ا ص ۳۶۴) کے مثل باب ای اللیل افضل میں نقل کیا ہے، نیز اس کو باب الرؤیۃ ج ۴ ص ۱۸۳ پر بھی نقل کیا ہے۔

(۷۱) ''اللہ جل شانہ آسمانِ دنیا پر نزول کرتے ہیں جس وقت رات کا ابتدائی تہائی حصہ گزر جاتا ہے، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ''کون ہے جو مجھ سے استغفار کرے تو میں اس کی مغفرت کر دوں؟ ایسا مسلسل ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ صبح صادق روشن ہو جاتی ہے۔

(جامع الترمذی: باب نزول الرب عزوجل الی السماء کل لیلۃ ج ۱ ص ۹۰)

فائدہ:

مذکورہ حدیث میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ ”کون ایسی ذات کو قرض دے گا“ تو اس سے مراد عملِ طاعت ہے، جیسے صدقہ وخیرات، نماز، روزہ، ذکر وغیرہ، اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس کو قرض سے اس لیے تعبیر فرمایا تا کہ بندوں کو نیک اعمال کی طرف سبقت لے جانے پر اُبھارا اور اُکسایا جائے اور ان کے ساتھ اپنی ملاطفت اور مہربانی کا اظہار کیا جائے، اس لیے کہ قرض اس سے لیا جاتا ہے جس کو قرض دینے والا جانتا پہچانتا ہو اور دونوں کے درمیان انسیت ومحبت کا تعلق ہو، یہی وجہ ہے کہ جب وہ قرض مانگتا ہے تو وہ فوراً اسے قرض دے دیتا ہے، اس لیے کہ وہ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ اس نے اس کو قرض دینے کا اہل سمجھا ہے اور اس کو یادرکھا ہے۔

اور ”اپنے ہاتھوں کو کشادہ کرنے“ سے مراد اپنی رحمت کو عام کرنا، کثرت سے عطا کرنا اور قبول کرنا اور بندوں پر نعمتوں کی بارش کرنا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ان احادیثِ مبارکہ کا تعلق صفاتِ باری تعالیٰ سے ہے، اس کے بارے میں علماء کے دو مشہور مذہب ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جمہور سلفِ صالحین اور بعض متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ ان باتوں پر ایمان لایا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق اسی طرح برحق ہے، اور ان کا ظاہری معنیٰ جو ہمارے لیے عام متعارف ہے، مراد نہیں ہے اور ان کی تاویل کے لیے کوئی کلام نہیں کیا جائے گا، اس کے ساتھ ساتھ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مخلوق کی تمام صفات جیسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا اور حرکت کرنا اور دیگر تمام صفاتِ مخلوق سے منزہ اور پاک ہے۔

دوسرا مذہب اکثر متکلمین اور سلفِ صالحین کی بہت سی جماعتوں کا ہے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ موقع ومحل کی مناسبت سے ان کی تاویل کی جائے گی، بناء بریں ان حضرات نے ایسی احادیث کی دو تاویلیں کی ہیں۔(۱) امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ ”نزول“ کا مطلب یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی رحمت اوراس کا حکم یااس کے فرشتے نازل ہوتے ہیں، جیسا کہ کسی کے پیروکار اس کے حکم سے کچھ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں نے ایسا کیا۔(۲) ان کلمات کا اطلاق استعارہ کے طور پر ہوتا ہے اوراس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دعائیں کرنے والوں کی دعائیں قبول کرتے ہیں اور ان کے ساتھ لطف ومہربانی کا معاملہ کرتے ہیں پھر بعض روایات میں رات کے آخری تہائی حصہ کا ذکر آیا ہے اور بعض میں رات کے ابتدائی تہائی حصہ کا ذکر ہے اور ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ''جب رات کا ایک حصہ یا دوتہائی حصہ گزر جاتا ہے۔'' ان مختلف احادیث کے متعلق قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس روایت میں رات کے آخری تہائی حصہ کا ذکر آتا ہے وہ صحیح روایت ہے، شیوخِ حدیث نے یہی فرمایا ہے، مزید لکھتے ہیں کہ اس بات کا بھی احتمال موجود ہے کہ نزول ابتدائی تہائی حصہ کے بعد ہوتا ہو اور یہ فرمان کہ''کون ہے جو مجھے پکارے'' یہ آخری تہائی کے بعد ہوتا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ بھی محتمل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ایک وقت کی خبر دی گئی ہو تو آپؐ نے اس کی خبر دے دی، پھر آپ کو دوسرا وقت بتلایا گیا ہو تو آپ نے اس کی خبر دے دی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے دونوں حدیثیں سن کر آگے نقل کر دیں اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے صرف ثلثِ اول والی حدیث سُنی ہو اس لیے انہوں نے صرف وہی بیان کردی۔ اس سے قاضی عیاض کی اس بات کی تردید ہوتی ہے جس میں انہوں نے ثلث اوّل والی روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، حالانکہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اس روایت کو بلا طعن نقل کیا ہے، دونوں روایتیں صحیح ہیں۔

مذکورہ حدیث میں تکرار کے ساتھ''میں بادشاہ ہوں، میں بادشاہ ہوں'' آیا ہے تو یہ تاکید اور تعظیم کی وجہ سے ہے۔اور یہ فرمانا کہ''ایسا مسلسل رہتا ہے یہاں تک کہ صبح صادق روشن ہوتی ہے۔''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ولطف کا زمانہ صبح صادق کے طلوع ہونے تک مسلسل جاری رہتا ہے، اس میں ترغیب دی گئی ہے کہ اس سارے وقت میں اللہ تعالیٰ سے دعا واستغفار کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے، اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ نماز، دُعا اور استغفار وغیرہ کے لیے رات کا آخری حصہ، ابتدائی حصہ سے اعلیٰ اور افضل

ہے۔(شرح النووی علی صحیح مسلم ج ۴ ص ۲۶)

(۷۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اے ابن آدم! تم جب تک مجھ سے دعا کرتے رہو گے اور مجھ سے امید رکھو گے میں تمہاری مغفرت کرتا رہوں گا خواہ تم میں کیسے ہی گناہ پائے جائیں اور میں پرواہ نہیں کروں گا۔ اے ابنِ آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کے بادلوں تک پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے مغفرت مانگو تو میں تمہاری مغفرت کر دوں گا اور میں پرواہ نہیں کروں گا، اے ابنِ آدم! اگر تم میرے پاس زمین بھر گناہ لے کر آؤ گے، پھر اس حالت میں مجھے ملو گے کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہو گے تو میں بھی اسی مقدار میں تمہاری مغفرت کروں گا'' (جامع الترمذی باب فضل التوبۃ والاستغفار)

فائدہ:

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ابنِ آدم! تم اپنے گناہوں کی بخشش کے لیے جب تک مجھے پکارتے رہو گے، اپنی دعاؤں کی قبولیت کی مجھ سے امید باندھے رکھو گے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے رہو گے، اپنے گناہوں کی مغفرت کی دعا کرتے رہو گے اور اپنی توبہ کے قبول ہونے کی امید رکھو گے اور اپنے رب کے ساتھ حسنِ ظن والا معاملہ رکھو گے کہ وہ توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیا کرتا ہے۔ جیسا کہ اس نے اس کا وعدہ کیا ہے، تو اللہ تعالیٰ تمہارے سب گناہ بخش دیں گے، خواہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے کیسی ہی غفلت اور نسیان تم پر طاری ہو۔ ''اور میں پرواہ نہیں کروں گا'' یعنی مجھے کسی کی پرواہ نہیں کہ کوئی پوچھے کہ فلاں کی آپ نے کیوں بخشش فرمائی! اس لئے کہ مجھ سے کسی کو پوچھنے کا کوئی حق نہیں، میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں' جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ'' (الانبیاء: ۲۳) ''اس سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرتا ہے جبکہ لوگوں سے پوچھا جائے گا'' اور میں نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ'' (ھود: ۱۱۴) ''نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں'' تم نے گناہ کا ارتکاب کیا، پھر میری طرف رجوع کیا اور پھر مجھ سے مغفرت کے خواستکار

ہوئے، میری طرف رجوع کرنا اور گناہوں پر معافی مانگنا بہت بڑی نیکی ہے جو تمہاری برائیوں کو مٹا دے گی۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے" **واتبع السیئة الحسنة تمحها**" یعنی برائی کے بعد نیکی کرو، وہ اس برائی کو مٹا دے گی۔"

اے ابنِ آدم! اگر تمہارے گناہ کثرت کے اعتبار سے اتنے ہو جائیں کہ آسمان کے کناروں تک پہنچ جائیں اور زمین و آسمان کے درمیان کی فضا کو بھر دیں، پھر تم مجھ سے مغفرت طلب کرو اور اپنے کیے پر نادم ہو اور توبہ کرو تو میں تمہارے سب گناہ معاف کر دوں گا اور مجھے کسی کی پرواہ بھی نہیں کہ مجھے کوئی رد کے گا، اس لیے کہ میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں، میں نے اپنے فضل اور رحمت سے اس کا وعدہ کر رکھا ہے اور میں وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ اے ابنِ آدم! اگر تم توحید پر جمے رہو اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور پھر میرے پاس زمین بھر گناہ لے کر آؤ تو میں بھی اسی مقدار میں مغفرت لے کر آؤں گا، یعنی مغفرت کروں گا، تاکہ میزانِ عمل میں تمہارے گناہ میری مغفرت کے مقابلہ میں فنا اور لاشے ہو جائیں، پھر تمہارا کوئی ایسا گناہ باقی نہ رہے جس پر تمہیں عذاب بھگتنا پڑے، اس حدیث میں توبہ تائب ہونے والوں کے لیے عظیم خوشخبری اور امید کا تذکرہ بھی ہے اور توبہ میں جلدی کرنے اور اچھی امید رکھنے اور توحید پر ثابت قدم رہنے کی بھی ترغیب ہے، مومن کے لیے افضل یہ ہے کہ جوانی اور صحت کے زمانہ میں امید پر خوف کو غالب رکھے اور بڑھاپے اور بیماری کے وقت امید کو غالب رکھے۔ (شرح النووی علی صحیح مسلم)

(۷۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب نصف شعبان کی رات ہو تو اس کی رات کو قیام کرو (عبادت کرو) اور اس کے دن کو روزہ رکھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس رات غروب آفتاب کے وقت آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ "کیا کوئی ہے مغفرت مانگنے والا کہ اس کی مغفرت کر دوں" کیا ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ میں اس کو رزق دوں؟ کیا ہے کوئی بیمار کہ میں اس کو عافیت بخشوں؟ کیا ہے کوئی ایسا؟ کیا کوئی ہے ایسا؟ یہاں تک کہ صبح صادق طلوع ہو جائے"

(سنن ابن ماجه، باب ماجاء في ليلة النصف من شعبان ج۱ص۲۱۷)

الزوائد میں ہے کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے، اس لیے کہ اس کی سند میں ابن ابی بسرہ راوی ضعیف ہیں، اوران کا نام ابو بکر بن عبداللہ بن محمد ابی بسرہ ہے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن معین رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " یضع الحدیث " یعنی وہ حدیثیں وضع کرتا تھا۔

فائدہ:

اس حدیثِ مبارک میں پندرہ شعبان المعظم کی رات کی فضیلت بیان کی گئی ہے اوراس میں نماز پڑھنے اور دن کو روزہ رکھنے کی فضیلت کا ذکر ہے، پندرھویں شعبان کا روزہ رکھنا مستحب ہے، اس حدیث میں ان بندوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور وسعتِ رحمت کا ذکر ہے جو اللہ سے مانگتے ہیں، اس سے مغفرت طلب کرتے ہیں اوراس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ رات بڑی خیر وبرکت کی رات ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارش برستی ہے، اس لیے مومن بندے کیلئے افضل ہے کہ دعا واستغفار اورتوبہ وانابت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا طلب بنے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کاموں کی توفیق دے جس سے وہ راضی اورخوش ہوتا ہے آمین۔(شرح النووی)

(۷) اللہ تعالیٰ کا بندے سے محبّت کرنا اور مخلوق پر اس کا اثر

(۷۴) نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبریل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ جبریل علیہ السلام اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر جبریل علیہ السلام آسمان والوں میں اعلان کرتے ہیں کہ: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر روئے زمین میں بھی اس کے لیے قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔''

(صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ ج۴ ص ۱۱۱)

(۷۵) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الادب، باب المقۃ من اللّٰہ ج ۸ ص ۱۴ پر بھی اس حدیث کو مذکورہ الفاظ کے قریب قریب نقل کیا ہے، لیکن اس میں یہ الفاظ ہیں ''پھر زمین والوں میں اس کے لیے قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔''

(۷۶) امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب التوحید، باب کلام الرب مع جبریل ونداء الملائکۃ ج ۹ ص ۱۴۲ پر مذکورہ الفاظ کی طرح نقل کیا ہے اور اس میں یہ الفظ ہیں۔ اور اس کے لیے زمین والوں میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔

(۷۷) سہیل بن ابی صالح رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبریل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ جبریل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر آسمان والوں میں اعلان

کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بغض اور نفرت کرتے ہیں تو جبریل علیہ السلام کو بلا کر فرماتے ہیں کہ میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں تم بھی اس سے نفرت کرو، چنانچہ جبریل علیہ السلام اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر وہ آسمان والوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے تم بھی اس سے نفرت کرو، چنانچہ وہ بھی اس سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں، پھر اس کیلئے زمین میں نفرت لکھ دی جاتی ہے"۔(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة ج ۱۰ ص ۶۳، حاشیہ القسطلانی، باب اذا احب اللّٰہ عبداً حبّبه الی عباده)

(۷۸) سہیل بن ابی صالح رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبریل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ جبریل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر آسمان والوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے نفرت کرتے ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرا یہی خیال ہے کہ انہوں نے بغض (نفرت) کے بارے میں بھی اسی طرح کے الفاظ کہے ہیں"(الموطاء ص ۲۰۹ حاشیہ جلد ثانی مصابیح السنة، باب ماجاء فی المتحابین فی اللّٰہ)

(۷۹) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبریل علیہ السلام کو بلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ جبریل علیہ السلام آسمان میں اعلان کرتے ہیں، پھر زمین والوں میں اس کے لیے محبت نازل ہو جاتی ہے اور یہی مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک کا" **اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا**(مریم: ۹۶) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل

کیے رحمٰن ان کے لیے محبت پیدا کر دیں گے۔''

فائدہ:

اللہ تعالیٰ کا کسی بندے کو محبوب اور دوست رکھنے کا مطلب دراصل اس بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و بھلائی اور ہدایت و فلاح کی بارش ہونا اور اس پر رحمتِ خداوندی کا نازل ہونا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی شخص سے بغض اور نفرت کرنا گویا اس شخص کو عذاب میں مبتلا کرنے کے لیے ارادہ خداوندی کو ظاہر کرنا ہے۔ اور زمین و آسمان والوں کا کسی بندے سے محبت کرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ وہ اس بندے کے حق میں دعا و استغفار کرتے ہیں اور اس کی مدح و تعریف کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ محبت کے وہی ظاہری معنی مراد ہیں جو عام طور پر مفہوم ہوتے ہیں یعنی لوگوں کے دل اس بندے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے ہیں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوسری صورت یعنی محبت کو اس کے اپنے ظاہری معنی پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے، کیونکہ جب کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنا صحیح ہو اور اس سے کوئی چیز مانع بھی نہ ہو تو پھر مجازی معنی مراد لینا غیر موزوں ہے، علاوہ ازیں محبت کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنے کی صورت میں پہلے معنی ضمنی طور پر خود بخود متحقق ہو جاتے ہیں۔ (مظاهر حق ج ۴ ص ۵۶۲)

سہیل بن ابی صالح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم میدان عرفات میں تھے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا گزر ہوا، لوگ ان کو دیکھنے لگے، میں نے اپنے والد صاحب سے کہا، ابا جان! میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے محبت فرماتے ہیں، انہوں نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ میں نے کہا کہ اس لیے کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دی گئی ہے، انہوں نے فرمایا کہ تم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث مبارک سنی ہے، جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے، پھر حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی طرح روایت ذکر کی جو حضرت سہیل رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں۔

(صحیح مسلم شرح النووی علی مسلم)

(۸) اولیاء اللہ سے عداوت رکھنے کی سزا اور قربِ الٰہی حاصل کرنے کا افضل طریقہ

(۸۰) حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''جو شخص میرے کسی ولی (محبوب اور دوست) کے ساتھ عداوت رکھتا ہے میں اس کے ساتھ اعلانِ جنگ کرتا ہوں، اور میرا بندہ جس چیز سے میرا قرب حاصل کرتا ہے اس میں مجھے اس سے زیادہ کوئی چیز محبوب اور پسندیدہ نہیں جو میں نے اس پر فرض کی ہے اور میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ مسلسل میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پس جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کو ضرور عطا کرتا ہوں، اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں اس کو ضرور پناہ دیتا ہوں، اور مجھے جو کچھ کرنا ہوتا ہے اس میں مجھے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا تردد مجھے اپنے مومن بندے کی جان کے بارے میں ہوتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کو تکلیف دینا ناپسند کرتا ہوں''

(صحیح البخاری، باب التواضع ۸ ص ۱۰۵)

تقربِ الٰہی کا ثمرہ:

فائدہ: اس حدیث شریف میں مذکور جملہ'' فقد اذنته بالحرب'' کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ظاہر عبارت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص میرے ولی کو ایذاء پہنچاتا ہے اس کی اس انتہائی قابلِ نفرین حرکت کی وجہ سے میں اس کے ساتھ اپنی لڑائی کا اعلان کرتا ہوں۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ساتھ اس کی لڑائی کا اعلان کرتا ہوں، پس وہ

شخص میرے ولی کو ایذاء پہنچا کر گویا مجھ سے لڑنے والا ہے۔ ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ ایسا کوئی گناہ نہیں ہے کہ جس کے مرتکب کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ اس سے اعلان جنگ کرتا ہو سوائے اس گناہ یعنی خدا کے کسی محبوب بندے اور ولی کو ایذاء پہنچانے کے اور سود کھانے کے، سود کھانے والوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ''فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ'' یعنی اگر تم اس سے باز نہیں آتے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ دونوں گناہ نہایت ہی قابل نفرین اور بدترین ہیں، اور ان دونوں میں دنیا اور آخرت دونوں کی مکمل تباہی اور بربادی کا خطرہ ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بندہ سے اللہ تعالیٰ کی لڑائی اس کے خاتمۂ بد (برے انجام) پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ جس سے اللہ تعالیٰ لڑیں وہ کبھی بھی فلاح ونجات نہیں پا سکتا۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۵ ص ۵۴)

''جو میں نے اس پر فرض کیا ہے الخ'' کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی چیزیں میں نے اس پر واجب کی ہیں یعنی اوامر (یعنی جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے) کی فرمانبرداری اور مناہی (یعنی جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے) سے اجتناب! ان چیزوں کو اختیار کر کے جو بندہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے وہ سب سے زیادہ محبوب ہے، ان چیزوں کے برابر اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کو اختیار کر کے بندہ اس درجہ کا تقرب حاصل کر سکے۔ (مرقات صفحہ مذکور)

''میں اس کا کان بن جاتا ہوں'' اس بارہ میں علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس بندہ پر ان افعال واعمال کو آسان کر دیتا ہوں جن کا تعلق ان اعضاء سے ہے اور اس کو ان اعمال وافعال کے بجالانے کی توفیق دیتا ہوں یہاں تک کہ گویا وہ اعضاء ہی بن جاتا ہوں۔

بعض علماء نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ کے حواس اور اس کے اعضاء کو اپنی رضا وخوشنودی کا وسیلہ بنا دیتا ہے، چنانچہ وہ بندہ اپنے کان سے صرف

وہی بات سنتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے، اسی طرح وہ اپنی آنکھ سے صرف انہیں چیزوں کو دیکھتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔

بعض حضرات اس کا مطلب یہ لکھتے ہیں کہ اللہ رب العزت اس بندہ پر اپنی محبت غالب کر دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر اس چیز کو دیکھتا ہے جس کو اللہ پسند کرتا ہے اور وہ اسی چیز کو سنتا ہے جس کو اللہ پسند کرتا ہے اور اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ اس کا مددگار اور کارساز ہوتا ہے، اور اس کے کان، اس کی آنکھ، اس کے ہاتھ اور اس کے پاؤں کو ان چیزوں سے بچاتا ہے جنہیں وہ پسند نہیں کرتا۔ (مرقاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۵۵)

''مجھے اتنا تردّد نہیں ہوتا الخ'' یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنی اس عنایت کے سبب جو اس بندہ کے شامل حال ہوتی ہے، اس کی زندگی ختم کرنے میں تردّد کرتا ہوں، کیونکہ موت اس کیلئے کوئی پسندیدہ شے نہیں ہوتی، لیکن چونکہ موت سے مفر نہیں اور یہ طے شدہ امر ہے کہ اس دنیا میں جو بھی جاندار آیا ہے اس کو موت کی آغوش میں ضرور ہی جانا ہے اس لیے اس کو موت دیتا ہوں، پھر یہ کہ اس کی موت بھی اس کیلئے خیر و بھلائی کا ہی سبب ہوتی ہے، کیونکہ وہ موت کے بعد ہی عظیم الشان سعادتوں اور بلند درجات کو حاصل کرتا ہے، مثلاً حضورِ باری تعالیٰ اور جنت وغیرہ کی لازوال نعمتیں موت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہیں۔

اس موقع پر یہ بات جان لیجئے کہ ''تردّد'' کے معنی ہیں، ''ایسی دو چیزوں کے درمیان تحیّر اور پس و پیش کرنا جن کے بارہ میں یہ یقینی علم نہ ہو کہ ان دونوں میں سے کون سی چیز زیادہ بہتر ہے'' ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ''تردّد'' کے اس معنی کا اطلاق قطعاً ناممکن اور محال ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد عالی کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے کسی فیصلہ کو پورا کرنے میں اس طرح تاخیر و توقف نہیں کرتا جس طرح کہ کوئی متردّد شخص اپنے کسی کام اور معاملہ میں کرتا ہے، اس بندۂ مومن کی روح قبض کرنے کا معاملہ ایسا ہے کہ میں اس میں کچھ توقف کرتا ہوں تاکہ اس بندۂ مومن پر موت آسان ہو، اس کا دل اس کی طرف مائل ہو جائے اور وہ خود موت کے آنے کا مشتاق ہو جائے، پھر اس کے بعد وہ زمرہ مقربین میں داخل ہو کر اعلیٰ علیّین میں اپنا مقام حاصل کر لے۔ (مظاہر حق ج ۲ ص ۴۸۶ نیز دیکھئے: مجمع بحار الانوار ج ۲ ص ۳۲۰، مرقاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۵۲)

''جو شخص میرے کسی ولی اور دوست سے عداوت رکھتا ہے میں اس کے ساتھ اعلان جنگ کرتا ہوں۔'' مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ میں وہی سلوک کروں گا جو کسی جنگجو دشمن کے ساتھ جنگ کے دوران روا رکھا جاتا ہے، یعنی تکلیف وغیرہ پہنچانا، یہاں اس کا لازمی معنی مراد ہے یعنی ہلاکت و بربادی۔

فاکہانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حدیث کا یہ جملہ دراصل مجازِ بلیغ میں سے ہے اس لیے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے سے نفرت کرتا ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ کا مخالف ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا مخالف ہو وہ اس سے عناد رکھتا ہے اور جو اس سے عناد رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک و برباد کر دیتا ہے، جب عداوت کے متعلق یہ حکم ثابت ہوا تو اس کے بالمقابل پہلو یعنی محبت کا حکم بھی ثابت ہوگا کہ جو اللہ کے ولی کے ساتھ محبت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو عزت عطا فرماتے ہیں اور دونوں جہاں میں سرخرو کرتے ہیں اور اس کا کان، آنکھ اور ہاتھ پاؤں وغیرہ بن جانے سے مراد اس بندے کی امداد، نصرت تائید اور اعانت ہے، یعنی یہ چیز ان امور سے کنایہ ہے، حقیقت پر محمول نہیں ہے۔ گویا کہ اللہ جل شانہ اپنی ذات کو بندے کے حواس کے قائم مقام کر دیتے ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''وہ میرے ذریعہ ہی سنتا ہے، میری وجہ سے ہی دیکھتا ہے اور میری وجہ سے ہی پکڑتا ہے اور میری وجہ سے ہی چلتا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرا ذکر ہی سنتا ہے اور میرے کلام کی تلاوت اور میری کتاب کی قرات سے ہی لطف اندوز ہوتا ہے اور میری مناجات سے ہی اسے انس حاصل ہوتا ہے اور وہ میرے عجائب مخلوقات میں ہی غور و فکر کرتا ہے اور اس کے ہاتھ اور پاؤں میری رضا اور خوشنودی والے کاموں میں ہی اٹھتے ہیں۔ (قالہ الفاکہانیؒ)

اتحادیہ فرقہ اس کو حقیقت پر محمول کرتا ہے اور اس حدیث سے استدلال کرتا ہے جس میں جبریل علیہ السلام کا حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں آنا مذکور ہے۔

شیخ قطب الدین القسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے رد میں ایک عمدہ کتاب لکھی ہے۔

ابو عثمان الحیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میں اس کے حواس سے بھی زیادہ جلدی اس کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

''مجھے کسی کام میں اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا تردد کسی مومن بندے کی جان کے بارے میں ہوتا ہے الخ'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے جتنا تردد کسی مومن آدمی کی جان قبض کرنے میں ہوتا ہے اتنا کسی چیز میں نہیں ہوتا، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ملک الموت کو طمانچہ رسید کرنے کا ذکر ملتا ہے اور آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں مومن کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا لیکن موت ہے ہی ایسی چیز جس سے کسی کو بھی گلوخلاصی نہیں، موت سے تو ہر ایک کو پالا پڑنا ہے، اگر چہ انسان اسے ناپسند کرتا ہے، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ موت کو ناپسند کرنے سے مراد موت کے وقت کی صعوبت اور شدت ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے مومن بندے کے لیے موت کو ناپسند کرتے ہیں، کیونکہ موت سے ہی انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ جب روح جسم سے جدا ہوتی ہے تو اس وقت مومن کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ مومن کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔

نیز اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ تکلیف پہنچانے سے مراد یہ ہو کہ میں مومن بندے کو اس کی پوری زندگی میں تکلیف پہنچانا پسند نہیں کرتا، کیونکہ تکالیف انسان کو رذیل ترین عمر (ناکارہ عمر) تک پہنچا کر اسفل السافلین میں شامل کر دیتی ہیں۔

اس جملے سے اللہ کے اولیاء کرام کا شرف ومقام اور ان کی رفعت ومنزلت معلوم ہوئی، اس لیے کہ یہاں پر ''تردد'' کا لفظ آیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو ایسا اقدام کرنا ہو جو اس کے محبوب کے لیے بہت ضروری ہو لیکن اس عمل اور اقدام سے اس کو سخت تکلیف پہنچتی ہو تو اگر وہ اس کی تکلیف کو دیکھے گا تو ظاہر ہے کہ وہ اس کام سے باز رہے گا اور اگر وہ اس کے فائدے کو پیش نظر رکھے گا تو اس کام کو کر گزرے گا، اس حدیث میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو ان کے عرف کے مطابق تردد کا لفظ استعمال کر کے مخاطب فرمایا اور اسکے ذریعہ اپنے اولیاء اور محبوبین کے شرف ومقام اور رفعت ومنزلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ (شرح القسطلانی ج ۹ ص ۲۸۹)

(۹) خوفِ خدا بھی مغفرت کا ایک ذریعہ ہے

(۸۱) حضرت ربعی بن حراش رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کیا آپ ہم سے وہ حدیث پاک بیان نہیں کریں گے جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جب دجال نکلے گا تو اس کے ساتھ پانی اور آگ ہوگی۔ جس چیز کو لوگ آگ سمجھیں گے وہ حقیقت میں ٹھنڈا پانی ہوگا، اور جس چیز کو لوگ ٹھنڈا پانی سمجھیں گے وہ حقیقت میں جلانے والی آگ ہوگی، لہٰذا تم میں سے جو شخص اس کو پائے اسے چاہیے کہ وہ اس چیز میں گر جائے جسے وہ آگ سمجھ رہا ہو، کیونکہ وہ شیریں ٹھنڈا پانی ہوگا۔''

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کو یہ (بھی) فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں ایک آدمی تھا اس کے پاس (روح قبض کرنے والا) فرشتہ آیا، تاکہ اس کی روح قبض کرے، اس آدمی سے پوچھا گیا کہ کیا تم نے کوئی نیکی کا کام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں، اس سے کہا گیا کہ غور کرو، اس نے کہا کہ اور تو مجھے کچھ معلوم نہیں سوائے اس بات کہ میں دنیا میں لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا کرتا تھا، اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا، مالدار کو مہلت دیتا تھا اور تنگدست سے در گزر کر دیتا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل کر دیا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''ایک شخص کی موت کا وقت آپہنچا، جب وہ زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے اپنے گھر کے لوگوں کو یہ وصیت کی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو بہت سی لکڑیاں اکٹھی کرنا اور اس میں آگ جلانا حتیٰ کہ جب آگ میرے گوشت کو ختم کر کے میری ہڈیوں تک جا پہنچے اور میں جل کر خاکستر ہو جاؤں تو اسے لے کر پیس لینا، پھر تیز ہوا والے دن کا انتظار کرنا اور میری راکھ کو اس میں اڑا دینا، چنانچہ

انہوں نے ایسا ہی کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو جمع کر کے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ تیرے خوف کی وجہ سے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔" حضرت عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ شخص کفن چور تھا۔" (صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل ج ۴ ص ۱۶۹)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو کتاب الانبیاء ج ۴ ص ۱۷۶ پر بھی متعدد روایات کے ساتھ نقل کیا ہے:

(۸۲) عقبہ بن عبد الغافر رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث بیان کی کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "گزشتہ امتوں میں ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے خوب مال و دولت دیا تھا جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میں تمہارے حق میں کس طرح کا باپ ثابت ہوا؟ بیٹوں نے کہا کہ آپ ہمارے بہترین باپ تھے، اس شخص نے کہا کہ لیکن میں نے کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا، اس لیے جب میں فوت ہو جاؤں تو مجھے جلا ڈالنا، پھر میری (باقی ماندہ ہڈیوں) کو پیس لینا اور (راکھ کو) کسی سخت آندھی کے دن اڑا دینا، بیٹوں نے یوں ہی کیا، لیکن اللہ جل شانہ، نے اسے جمع کیا اور اس سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ تیرے ہی خوف و ڈر سے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے سایہ رحمت میں جگہ دی۔"

(۸۳) ربعی بن حراش رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیثیں سنی ہیں وہ ہم سے کیوں نہیں بیان کرتے (یعنی بیان کریں) چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ ایک شخص کی موت کا وقت جب قریب ہوا اور وہ زندگی سے بالکل مایوس ہو گیا تو اپنے گھر کے لوگوں کو وصیت کی کہ جب میری موت ہو جائے تو پہلے میرے لیے خوب زیادہ لکڑیاں جمع کرنا اور اس سے آگ جلانا، جب آگ میرے جسم کو خاکستر بنا چکے اور صرف ہڈیاں باقی رہ جائیں تو ہڈیوں کو پیس لینا اور کسی شدید گرمی کے دن یا (فرمایا کہ) شدید ہوا کے دن اسے دریا میں اڑا دینا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے جمع کیا

اور اس سے دریافت کیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس نے کہا کہ تیری ہی خشیت سے! چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔''

(۸۴) حمید بن عبد الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص تھا جس نے اپنی جان پر بڑی زیادتیاں کر رکھی تھیں، پھر جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا ڈالنا، پھر میری ہڈیوں کو پیس کر ہوا میں اڑا دینا، خدا کی قسم! اگر میرا رب مجھ پر قادر ہوا (مجھے پالیا) تو مجھے اتنا سخت عذاب دے گا جو پہلے کسی کو بھی اس نے نہیں دیا ہوگا، جب وہ مر گیا تو اس کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا اور فرمایا کہ اگر ایک ذرہ بھی کہیں اس کا تمہارے پاس ہے تو اسے جمع کر کے لاؤ، زمین حکم بجالائی اور وہ شخص اب (اپنے رب کے حضور) کھڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا کہ تم ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا: اے رب! تیری خشیت کی وجہ سے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کردی۔'' دوسرے حضرات نے یوں بیان کیا ''مخافتک یا رب'' یعنی اے میرے رب! تیرے خوف کی وجہ سے۔''

(۸۵) اعرج رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ایک شخص نے جس نے کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا، یہ کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا ڈالنا اور میری آدھی راکھ خشکی میں اڑا دینا اور آدھی سمندر میں بہا دینا، اس لیے کہ خدا کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے پکڑ لیا تو مجھے ایسا سخت عذاب دے گا جو دو جہانوں میں کسی کو نہ دیا ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیا تو اس نے اپنے اندر موجود تمام راکھ کو جمع کر دیا اور خشکی کو حکم دیا تو اس نے بھی اس پر موجود ساری راکھ کو جمع کر لیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس شخص سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ آپ کے ڈر کی وجہ سے، اور آپ تو زیادہ باخبر ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔''

(صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب یریدون ان یبدلوا کلام اللّٰہ ج ۹ ص ۱۴۵)

(۸۶) عقبہ بن عبدالغافر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا جو پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں سے تھا یا (فرمایا کہ) جو تم سے پہلے لوگوں میں سے تھا، اس شخص نے ایک بات کہی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو مال و دولت عطا کیا تھا، جب اس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں تمہارا کیسا باپ تھا؟ انہوں نے کہا کہ آپ بہترین باپ تھے، اس نے کہا کہ میں نے اللہ کے ہاں نیک عمل نہیں بھیجا، اور اگر اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہوگیا تو اس کو عذاب دے گا، اس لیے خیال کرنا کہ جب میں مرجاؤں تو مجھے جلا دینا، حتیٰ کہ جب میں (جل کر) کوئلہ ہوجاؤں تو مجھے پیس ڈالنا، پھر جب تیز آندھی والا دن ہو تو مجھے اس میں اڑا دینا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے ان سے اس پر عہد و پیمان لیا، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، پھر تیز آندھی والے دن اس کی راکھ کو اڑا دیا، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ہو جاؤ تو وہ یکا یک آدمی بن کر دربار میں حاضر ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے میرے بندے! تو نے جو کچھ کیا اس پر تجھے کس چیز نے اکسایا؟ اس نے کہا کہ تیرے خوف کی وجہ سے، یا کہا تیرے ڈر کی وجہ سے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے سایہ رحمت میں جگہ دی یا فرمایا کہ پھر اس کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمایا۔'' (صحیح بخاری)

سلیمان التیمی کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ابوعثمان عبدالرحمٰن النہدی ؒ سے بیان کی تو انہوں نے کہا کہ میں نے بھی یہ حدیث سلمان سے سنی ہے، البتہ انہوں نے یہ الفاظ زیادہ نقل کیے۔ ''فی البحر'' یعنی سمندر میں (اڑا دینا)

(۸۷) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ایک شخص نے اپنے اوپر بہت زیادتیاں کی تھیں، جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب میں مرجاؤں تو مجھے جلا ڈالنا، پھر پیس کر مجھے سمندر میں بہا دینا اس لیے کہ خدا کی قسم! اگر میرا رب مجھ پر قادر ہوگیا (میری گرفت کرلی) تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا جو کسی کو نہ دیا ہوگا، چنانچہ بچوں نے اس کے ساتھ ویسا ہی کیا، اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ جو کچھ تم نے لیا ہے اسے واپس کردے، پس وہ شخص یکا یک حاضر ہوگیا، اللہ

تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس چیز نے اس کام پر اکسایا؟ اس نے کہا کہ اے میرے رب! تیرے خوف نے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس بات پر اس کی مغفرت کر دی۔"

(صحیح مسلم ج ۱۰ ص ۱۸۴ حاشیہ القسطلانی)

(۸۸) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: کہ ایک بندے نے اپنے اوپر بہت زیادتیاں کی تھیں، جب اس کی وفات کا وقت آ پہنچا تو اس نے اپنے گھر کے لوگوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا ڈالنا، پھر میری راکھ کو سمندر میں ہوا میں اڑا دینا، خدا کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے پکڑ لیا، تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا جو اس نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہ دیا ہوگا، چنانچہ اس کے گھر والوں نے ایسا ہی کیا، (پھر) اللہ عزوجل نے ہر اس چیز کو جس کے پاس اسکی راکھ کا کچھ حصہ بھی موجود تھا، حکم دیا کہ تم نے جو کچھ لیا ہے اسے واپس کرو، چنانچہ وہ بندہ یکا یک حاضر دربار ہو گیا، اللہ عزوجل نے دریافت کیا کہ تمہیں اس کام پر کس چیز نے آمادہ کیا تھا؟ اس نے کہا کہ تیرے خوف نے، پس اللہ تعالیٰ نے اس کی بخشش فرمادی"۔ (سنن النسائی ج ۴ ص ۱۱۲، ۱۱۳)

(۸۹) حضرت حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "گزشتہ زمانہ میں ایک شخص تھا جو اپنے اعمال کے بارے میں بدگمانی رکھتا تھا، جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے گھر کے افراد سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا، پھر مجھے پیس کر سمندر میں (میری راکھ) بہا دینا، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے میری گرفت فرمائی تو مجھے معاف نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا تو فرشتے اس کی روح سے ملے، اس سے پوچھا کہ تمہیں کس چیز نے اس کام پر ابھارا تھا؟ اس نے کہا کہ اے میرے رب! میں نے یہ کام محض تیرے خوف کی وجہ سے کیا تھا، اس بات پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمائی" (ایضاً)

(۹۰) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ایک آدمی نے اپنے اوپر زیادتیاں کی تھیں جب اس کی موت کا وقت قریب آیا، تو اس نے اپنے بچوں کو وصیت کی اور کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا، پھر مجھے پیس کر ہوا میں سمندر کے

اندر بہادینا، خدا کی قسم! اگر میرے رب نے مجھے گرفتار کرلیا تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا جو اس نے کسی کو نہ دیا ہوگا، چنانچہ بچوں نے اس کے ساتھ ویسا ہی کیا، پھر اللہ عزوجل نے زمین کو حکم دیا کہ جو کچھ بھی تم نے لیا ہے اسے واپس کردو، چنانچہ وہ شخص اچانک حاضر ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس چیز نے اس کام پر آمادہ کیا تھا؟ اس نے کہا کہ تیرے خوف نے (یا کہا کہ) تیرے ڈرنے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔''

(سنن ابن ماجہ ج ۲ص۲۹۲،۲۹۳)

فائدہ:

حضرت ربعی بن حراش رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں جو یہ آیا ہے: ''اس کے ساتھ پانی اور آگ ہوگی'' اس میں ''پانی'' سے مراد اسباب عیش وراحت میں سے وہ چیز ہے جس کا بظاہر بہت قریبی تعلق پانی سے ہوگا اور جس کے ذریعہ وہ لوگوں کو اپنی اتباع اور پیروی کی طرف مائل کرے گا، اسی طرح ''آگ'' سے مراد وہ چیز ہے جو بظاہر اذیت اور تکلیف میں مبتلا کرنے والی ہوگی، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے وہ ان لوگوں کو کوئی اذیت اور تکلیف نہیں پہنچائے گی، جو اس دجال کو جھٹلائیں گے اور اس کی اتباع اور پیروی سے انکار کردیں گے۔ ''لوگ جس چیز کو پانی سمجھیں گے ''الخ'' کا مطلب یہ ہے کہ دجال جن چیزوں کو لوگوں کی نظر میں عیش وراحت کی چیزیں کرکے دکھائے گا یا جن چیزوں کو وہ اذیت اور تکلیف پہنچانے والے اسباب ظاہر کرے گا وہ حقیقت کے اعتبار سے برعکس ہوں گی۔ مثلاً جن کو اپنی اتباع کرنے کے صلہ میں اس پانی سے نوازے گا، آخر کار وہ لوگ ہمیشہ کیلئے آگ میں جلیں گے۔ اسی طرح وہ جن لوگوں کو اپنی نافرمانی کی سزا کے طور پر آگ کے سپرد کرے گا اس آگ کو اللہ تعالیٰ ٹھنڈک اور راحت پہنچانے کے لئے پانی کی تاثیر عطا کردے گا۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے نمرود کی آگ کو ٹھنڈا اور باعث راحت وتسکین بنادیا گیا تھا۔ پس حاصل یہ نکلا کہ جو چیزیں دجال کے ذریعہ ظاہر ہوں گی اور فتنہ و آزمائش کا باعث بنیں گی ان کی حقیقت وہ نہیں ہوگی جو بظاہر نظر آئے گی بلکہ وہ طلسماتی اور

خیالی چیزیں ہوں گی، جیسا کہ طلسم جاننے والے اور شعبدہ باز اپنے کرتب دکھاتے ہیں۔ البتہ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس کے ذریعے ظاہر ہونے والی چیزیں تو حقیقی ہی ہوں گی مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے حکم سے ان کی تاثیر الٹی ہو جائے گی کہ پانی تو جلائے گا اور آگ ٹھنڈک اور راحت پہنچائے گی۔ ''کیونکہ وہ شیریں اور ٹھنڈا پانی ہوگا'' یعنی بظاہر آگ نظر آنے والی چیز یا تو حقیقت کے اعتبار سے یا ماہیت بدل دیئے جانے کے اعتبار سے اور یا مآل وانجام کار کے اعتبار سے پانی ہوگا جو ٹھنڈک اور راحت پہنچانے کا باعث بنے گا۔

واضح رہے کہ اس حدیث میں اس موقع پر اختصار سے کام لیا گیا ہے اور صرف ایک ہی جزء پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں یہاں اس دوسرے جزء کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے کہ اس کو چاہیے کہ وہ اس کے پانی یعنی اس کے اسباب عیش وراحت کی طرف مائل ہو کر اس (دجال) کی تصدیق اور اتباع نہ کرے کیونکہ حقیقت میں وہ پانی نہیں ہوگا بلکہ ایک طرح کا عذاب اور حجاب ہوگا۔

آنحضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ: ''اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ مجھے جلا ڈالنا، اور اس کی راکھ کو سمندر اور خشکی میں اڑا دینا، اگر میرا رب مجھ پر قادر ہو گیا تو مجھے ایسا عذاب دے گا جو کسی کو نہ دیا ہوگا'' اس کی تشریح میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے مفہوم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرنا چاہتا تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کرنے والا کافر ہے، حالانکہ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ اس شخص نے کہا کہ میں نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے کیا تھا، کافر تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہی نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کریں گے۔ لہٰذا ان کا کہنا یہ ہے کہ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے لیے عذاب مقرر کر دیا اور اس کا فیصلہ کر دیا تو پھر میں نہیں بچ سکوں گا۔ (۲) دوسرا یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر تنگی فرما دی تو پھر مجھے سخت عذاب دیں گے۔ یعنی حدیث میں مذکورہ لفظ ''قدر'' یا تو مقرر کرنے اور فیصلہ کرنے

کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یا تنگی کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔جیسا کہ ارشاد باری ہے: ''فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ'' (الفجر:۱۶) ''پھر اس پر اس کا رزق تنگ کر دیا''۔

دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ حدیث کے الفاظ اپنے ظاہر معنی پر محمول ہیں اور یہ الفاظ اس کی زبان سے بلاقصد وارادہ کے نکل گئے، ان الفاظ کے حقیقی معنی اس کی نظر میں مراد نہیں ہیں اور نہ ہی وہ اس کا اعتقاد رکھتا تھا (کہ اللہ تعالیٰ اس کو پکڑنے پر قادر نہیں ہے) بلکہ خوف ودہشت اور بدحواسی کے عالم میں اس کی زبان سے ایسے الفاظ صادر ہو گئے تھے۔ پس گویا وہ شخص غفلت ونسیان میں مبتلا ہو گیا اور یہ ایسی حالت ہے جو قابل مواخذہ نہیں ہوتی۔ یہ اسی طرح ہے جیسے ایک شخص نے اپنی گمشدہ اونٹنی پا کر شدت فرح سے یہ کہہ دیا تھا کہ ''انت عبدی وانا ربک'' ''تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں''۔ لہٰذا وہ شخص ان الفاظ کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا کیونکہ اس کی زبان سے یہ الفاظ خوف ودہشت کے مارے اور بھول کر نکلے تھے۔

جیسا کہ صحیح مسلم کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: ''لعلّی اضلّ اللّٰہ'' ''یعنی شاید کہ میں اللہ تعالیٰ سے چھپ سکوں۔''

لہٰذا معلوم ہوا کہ اس کے یہ الفاظ کہ ''اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر قادر ہو گیا تو الخ'' حقیقت پر ہی محمول ہیں۔

تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ اہل عرب کے کلام بدیع اور استعمالِ مجاز کے مطابق ہے، جس میں شک کو یقین کے ساتھ موسوم اور مخلوط کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: ''وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ'' (سبا:۲۴) ''اور ہم یا تم ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں''۔ یہ الفاظ شک کی صورت میں استعمال ہوئے ہیں، لیکن مراد اس سے یقین ہے۔

چوتھی جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت سے ناواقف تھا، ایسے شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ اسے کافر قرار دیا جائے یا نہیں!

قاضی فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کو جو حضرات کافر قرار دیتے ہیں ان میں امام ابن

جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں اور امام ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ بھی اولاً اس کے قائل تھے۔

بعض دوسرے علماء یہ کہتے ہیں کہ کسی صفت سے ناواقف ہونے کی بناء پر نہ تکفیر کی جائے گی اور نہ ہی دائرہ ایمان سے اخراج کیا جائے گا، ہاں البتہ اگر کوئی شخص کسی صفت کا انکار کر دے تو وہ الگ مسئلہ ہے۔ امام ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ نے بعد میں اسی قول کی طرف رجوع کر لیا تھا اور اسی پر وہ کار بند رہے، اس لیے کہ وہ شخص ایسا کوئی عقیدہ یا مذہب نہیں رکھتا تھا۔ جبکہ تکفیر اسی کی کی جاتی ہے جو یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ اس کا قول حق اور صحیح ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں دریافت کیا جائے تو ان کے جاننے والے بہت کم ملیں گے۔

پانچویں جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ شخص زمانہ فترت میں تھا، جس میں محض توحید خداوندی ہی مفید ہوتی ہے اور صحیح مذہب کی بناء پر احکام شریعت آنے سے قبل کوئی مکلف نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا'' (بنی اسرائیل: ۱۵) ''اور ہم عذاب نہیں دیتے جب تک کہ کوئی پیغمبر نہ بھیجیں۔''

چھٹی جماعت یہ کہتی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ کی شریعت اور دین میں کافر قابل معافی ہو، برخلاف ہماری شریعت و دین کے، اہل السنۃ کے ہاں اگر چہ یہ بات مجوزاتِ عقل میں سے ہے، لیکن ہم اپنے دین میں اسے درست نہیں کہتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ'' (النساء: ۴۸) ''بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے۔''

اس کے علاوہ بھی بہت سے دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں۔

بعض کا قول یہ ہے کہ اس شخص نے صرف اس بناء پر وصیت کی تھی تا کہ اس کے نفس کی تحقیر ہو اور اسے سزا میں مبتلا کرے، کیونکہ اس نے بہت نافرمانیاں اور زیادتیاں کی تھیں اس امید پر کہ شاید اللہ تعالیٰ اس بناء پر اس پر رحم فرما دے، لیکن یہ بات واضح رہے کہ دین اسلام میں یہ بات جائز نہیں ہے۔

تنبیہ:

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''صحیح'' میں اس حدیث کے ساتھ ایک اور حدیث ذکر کی ہے جس میں اس عورت کا ذکر ہے جس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا۔ اس کے بعد امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس پر تعلیق کے طور پر نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ''**ذلک لئلا یتّکل رجل ولا ییأس رجل**'' یعنی یہ اس لیے فرمایا تا کہ کوئی شخص نہ تو بھروسہ کر کے بیٹھ جائے اور نہ ہی نا امید اور مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔'' اور وہ حدیث بایں الفاظ منقول ہے:

معمر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھ سے امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ کیا میں تم سے دو عجیب حدیثیں بیان نہ کروں، زہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھ سے حمید بن عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حدیث بیان کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک شخص نے اپنے اوپر بہت زیادتیاں کی تھیں، جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا کر راکھ بنا دینا پھر ہوا میں اسے اڑا دینا۔ اس لیے کہ خدا کی قسم! اگر میرے رب نے مجھے پکڑ لیا تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا جو اس نے کسی کو نہ دیا ہوگا، چنانچہ بچوں نے اس کے ساتھ ویسا ہی کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ جو کچھ بھی تم نے لیا ہے وہ واپس دو، چنانچہ وہ شخص (زندہ ہو کر) حاضر دربار ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس چیز نے اس عمل پر آمادہ کیا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ اے میرے رب! تیرے خوف نے یا کہا کہ تیرے ڈرنے، پس اللہ تعالیٰ نے اس بات پر اس کی مغفرت کر دی۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے حمید رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ''ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے آتش دوزخ میں داخل ہوئی جسے اس نے باندھ رکھا تھا، نہ اس کو کھانے کو دیا اور نہ ہی اس کو چھوڑ دیا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑے ہی کھا لے، اور اسی حالت میں وہ مر گئی''۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے تا کہ کوئی شخص بھروسہ نہ کر بیٹھے یعنی ایسی حرکت

سے ڈرنا چاہیے جیسی حرکت اس عورت نے اس بلی کے ساتھ روا رکھی اور اسی طرح کوئی شخص مایوس اور نا امید بھی نہ ہو بلکہ اس شخص کی طرح اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی امید بھی رکھے اور اس ذات سے ڈرتا بھی رہے۔''

(شرح النووی علی صحیح مسلم ج ۱۰ ص ۱۸۲ حاشیہ القسطلانی)

(۱۰) تخلیق آدم علیہ السلام

(۹۱) ہمام رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا، ان کی لمبائی ساٹھ گز کی تھی۔ پھر فرمایا کہ جاؤ اور ان فرشتوں کو سلام کرو، پھر سنو کہ وہ تم کو کیا جواب دیتے ہیں! وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا جواب ہے، چنانچہ حضرت آدم نے (ان سے) کہا کہ السلام علیکم، فرشتوں نے جواب دیا، السلام علیک ورحمة اللّٰہ، فرشتوں نے ورحمة اللّٰہ کا لفظ زیادہ کیا، پس جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ آدم کی صورت پر ہوگا، پھر لوگوں کی ساخت برابر کم ہوتی رہی، یہاں تک کہ موجودہ مقدار کو پہنچی''۔

(صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب خلق آدم ج ۴ ص ۱۳۱)

(۹۲) ہمام رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا، ان کی لمبائی ساٹھ گز کی تھی، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو بنایا تو ان سے فرمایا کہ جاؤ، اور اس جماعت کو سلام کرو اور (وہ جماعت) فرشتوں کی تھی جو وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتی ہے، وہ (جو جواب دے گی) وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا جواب ہے، چنانچہ حضرت آدم (اس حکم خداوندی کی تعمیل میں فرشتوں کی اس جماعت کے پاس گئے) اور کہا: السلام علیکم! فرشتوں نے جواب دیا: السلام علیک ورحمة اللّٰہ، فرشتوں ''ورحمة اللّٰہ'' کا لفظ زیادہ کہا، پس جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ آدم کی صورت پر ہوگا، پھر لوگوں کی ساخت برابر کم ہوتی رہی، یہاں تک کہ موجودہ مقدار کو پہنچی''۔ (صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء الاذان ج ۸ ص ۵۰، مشکوٰة المصابیح، کتاب الاداب، باب السلام ص ۳۹۷)

(۹۳) ہمام بن منبہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے چند احادیث مبارکہ نقل کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے آدمؑ کو اپنی صورت پر بنایا، ان کی لمبائی ساٹھ گز کی تھی، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو بنایا تو ان سے فرمایا کہ جاؤ! اور اس جماعت کو سلام کرو، وہ جماعت فرشتوں کی تھی جو وہاں بیٹھی ہوئی تھی، پھر سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتی ہے؟ وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا جواب ہے۔ چنانچہ آدمؑ نے ان سے کہا: **السلام علیکم**! فرشتوں نے جواب دیا: **السلام علیک ورحمة اللّٰہ**، فرشتوں نے ''**ورحمة اللّٰہ**'' کا لفظ زیادہ کیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: پس جو شخص بھی جنت میں داخل ہوگا وہ آدمؑ کی صورت پر ہوگا، اور ان کی لمبائی ساٹھ گز کی تھی، پھر لوگوں کی ساخت مسلسل کم ہوتی رہی یہاں تک کہ موجودہ مقدار کو پہنچی''۔

(صحیح مسلم، صفة الجنة ج ۱۰ ص ۲۹۴، حاشیہ القسطلانی)

فائدہ:

''سلام'' کے معنی ہیں، نقائص اور عیوب سے برأت ونجات پانا۔ ''سلام'' اللہ تعالیٰ کا ایک اسم پاک ہے جس کے معنی ہیں، وہ ذات جو ہر عیب وآفت اور تغیر وفنا سے پاک اور محفوظ ہے۔ ''سلام'' اسلامی تہذیب ومعاشرت کا ایک خاص رکن ہے، اس کیلئے جو الفاظ مقرر کیے گئے ہیں وہ ''**اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ**'' ہے، اس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تیرے حال واحوال سے خوب واقف ہیں، لہٰذا غفلت اختیار نہ کر، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسم پاک کا تجھ پر سایہ ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ تجھ پر سلامتی ہو، یعنی تو مجھ سے سلامتی میں ہے اور مجھ کو بھی اپنے سے سلامتی میں رکھ، اس صورت میں ''سلام'' سلم سے مشتق ہوگا جس کے معنی مصالحت کے ہیں، اور اس کلمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ تو مجھ سے حفظ وامان میں رہ اور مجھ کو بھی حفظ وامان میں رکھ۔

منقول ہے کہ سلام کرنے کا طریقہ اسلام کے بالکل ابتدائی زمانہ میں شروع ہوا تھا اور اس کا مقصد ایک ایسی علامت کو رائج کرنا تھا جس کے ذریعہ مسلمان اور کافر کے درمیان امتیاز کیا جا سکے، تاکہ ایک مسلمان، دوسرے مسلمان سے تعرض نہ کرے، گویا اس

کلمہ کو اپنی زبان سے ادا کرنے والا اس بات کا اعلان کرتا تھا کہ میں مسلمان ہوں، اور پھر یہ طریقہ مستقل طور پر مشروع قرار پایا۔

ان احادیث مذکورہ میں یہ فرمان کہ ''اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر بنایا''۔ اس ارشاد گرامی کے معنی ومفہوم میں علماء کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی دراصل احادیثِ صفات میں سے ہے، جس کے حقیقی معنی ومفہوم تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

اس لیے اس بارے میں کوئی تاویل یا توجیہ کرنے کے بجائے سکوت ہی بہتر ہے، جیسا کہ اس قسم کے ان اقوال اور ارشادات عالیہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے جو ''متشابہات'' کہلاتے ہیں۔ علمائے سلف اسی قول کی طرف مائل ہیں۔ جب کہ بعض دوسرے حضرات اس ارشاد گرامی کی مختلف توجیہات اور تاویلات کرتے ہیں، جن میں سے مشہور تاویل یہ ہے کہ یہاں ''صورت'' صفت کے معنی میں ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح کہ عام طور پر روزمرہ کی بول چال میں کہا جاتا ہے کہ فلاں معاملہ کی صورت مسئلہ یا صورت حال یوں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی مسئلہ یا حال کی کوئی ظاہری صورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ صورت کا لفظ استعمال کر کے حقیقت میں اس مسئلہ یا حال کی صفت اور کیفیت مراد ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں ''اللہ کی صورت'' کے لفظ سے مراد ''اللہ کی صفت'' ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صفت پر بنایا اور ان کو ان صفات کے ساتھ موصوف کیا جو صفات کریمہ باری تعالیٰ کا پرتو ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حی، عالم، قادر، مرید، متکلم اور سمیع وبصیر بنایا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ''صورتہ'' کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف، شرف وعظمت کو ظاہر کرنے کیلئے ہے، جیسا کہ روح اللہ اور بیت اللہ میں روح اور بیت کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اس لطیف وجمیل صورت پر پیدا کیا جو اسرار ولطائف پر مشتمل ہے۔ اور جس کو اس نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعہ اپنے پاس سے عطاء کیا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ''صورتہ'' کی ضمیر حضرت آدمؑ کی طرف راجع

ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو ان ہی کی صورت پر بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ابتداء آفرینش سے ہی اپنی شکل پر تھے، دوسرے انسانوں کی طرح ان کی تخلیق اس تدریجی طور پر نہیں ہوئی تھی کہ پہلے وہ نطفہ تھے، پھر مضغہ ہوئے، پھر جنین، پھر طفل، پھر صبی اور پھر مرد ہوئے، بلکہ وہ ابتداء ہی میں تمام اعضاء وجوارح، کامل شکل وصورت اور ساٹھ گز کے قد کے پورے انسان بنائے گئے تھے۔ لہٰذا ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا'' سے مراد آدمؑ کی تخلیق و پیدائش کی حقیقت کو واضح کرنا ہے اور چونکہ دیگر صفات کے برخلاف قد کی لمبائی ایک غیر معروف چیز تھی اس لیے اس کو خاص طور پر ذکر کیا اسی طرح چونکہ لمبائی پر چوڑائی بھی قیاس کی جا سکتی ہے اور اجمالی طور پر اس کا تصور ذہن میں آ سکتا ہے لہٰذا چوڑائی کو ذکر نہیں کیا۔

''ورحمة اللّٰه کا لفظ فرشتوں نے زیادہ کیا'' اس کے ذریعہ سلام کے جواب کے سلسلہ میں ایک تہذیب وشائستگی اور ادب وفضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے چنانچہ افضل طریقہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص **السلام علیک** کہے تو اس کے جواب میں **وعلیک السلام ورحمة اللّٰه وبرکاته** کہا جائے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص **السلام علیک ورحمة اللّٰه** کہے تو اس کے جواب میں **وعلیک السلام ورحمته اللّٰه وبرکاته** کہا جائے، ایک روایت میں ''**ورحمة اللّٰه**'' کے بعد ''**ومغفرته**'' کا لفظ بھی منقول ہے، اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ سلام کے جواب میں **وعلیک السلام** کے بجائے **السلام علیک** کہنا بھی درست ہے، کیونکہ معنی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک افضل یہی ہے کہ جواب میں **وعلیک السلام** یا **وعلیکم السلام** ہی کہا جائے۔ رہی یہ بات کہ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کے سلام کے جواب میں **وعلیک السلام** کے بجائے **السلام علیک** کیوں کہا؟ تو ممکن ہے کہ فرشتوں نے بھی یہ چاہا ہوگا کہ سلام کرنے میں وہ خود ابتداء کریں جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ جب دو آدمی ملتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک سلام میں پہل کرنا چاہتا ہے تو دونوں ہی ایک دوسرے سے **السلام علیک** یا **السلام علیکم** کہتے ہیں، لیکن یہ

بات واضح رہے کہ جواب کے درست اور صحیح ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ جواب سلام کے بعد واقع ہو نہ کہ دونوں ایک ساتھ واقع ہوں، جیسا کہ ''فاستمع ما یحیّونک'' (پھر سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں) کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے چنانچہ ''فاستمع'' میں حرف فا تعقیب کیلئے ہے جو مذکورہ وضاحت کی دلیل ہے، عام طور پر لوگ اس مسئلہ سے بہت غافل ہیں۔ اس لیے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اگر دو شخص ملیں اور دونوں ایک ہی ساتھ السلام علیکم کہیں تو دونوں میں سے ہر ایک پر سلام کا جواب دینا واجب ہوگا۔

حدیث کا آخری جملہ ''پس جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ آدم کی صورت پر ہوگا اور ان کی لمبائی ساٹھ گز کی تھی الخ'' تقدیم و تاخیر پر دلالت کرتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ گز تھا، ان کے بعد لوگوں کے قد بتدریج کوتاہ ہوتے گئے، اور پھر جب جنت میں داخل ہوں گے تو سب کے قد دراز ہو جائیں گے، جیسا کہ حضرت آدم کا قد تھا۔ (مظاہر حق ج ۴ ص ۴۴۵،۴۴۴)

اور آدم کی صورت پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حسن و جمال اور ڈیل وڈول میں ان کی طرح ہوگا، ایسا نہ ہوگا کہ اگر دنیا میں سیاہ فام یا معذور، اپاہج وغیرہ تھا تو وہاں بھی سیاہ فام، اپاہج اور معذور وغیرہ ہو، ''پھر اس کے بعد لوگوں کی ساخت برابر کم ہوتی گئی'' یعنی پھر حسن و جمال اور طول و عرض کے اعتبار سے مخلوق میں نقص اور کمی آتی گئی اور نوبت اس امت تک پہنچی لہٰذا جب لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرح حسین و جمیل اور طویل و عریض ہو جائیں گے۔

امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کامل الخلقت، تندرست و توانا اور صحیح و سالم بنایا، ان میں کوئی تغیر نہیں آیا، وہ ابتداء خلقت میں نہ نطفہ تھے، نہ علقہ، نہ مضغہ، نہ جنین، نہ بچہ، وہ اپنی اولاد کی طرح ان تمام تغیرات اور اطوار سے نہیں گزرے، اس سے دہریہ کے اس کے قول کی بھی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہر انسان نطفہ سے پیدا ہوا ہے اور نطفہ انسان سے ہی نکلتا ہے۔ ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ذکر کیا

ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو چار طرح سے پیدا فرمایا ہے۔(۱) بغیر ماں باپ کے، جیسے آدم علیہ السلام۔(۲) صرف باب سے، جیسے حواء علیہا السلام (۳) صرف ماں سے جیسے عیسیٰ علیہ السلام (۴) ماں اور باپ دونوں سے جیسے تمام مخلوق، مادہ منویہ کے ذریعہ باپ کی پشت سے منتقل ہو کر شکم مادر میں پرورش پاتی ہے۔ یہ مخلوق بھی چھ مرحلوں کے بعد کامل اور مکمل ہوتی ہے، نطفہ (مادہ منویہ)، علقہ (جما ہوا خون)، مُضغہ (گوشت کا لوتھڑا)، ہڈیاں، پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا جاتا ہے، پھر اس گوشت پوست اور ہڈیوں کے مجموعہ میں روح پھونک دی جاتی ہے اور وہ زندہ انسان بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسری تمام مخلوق سے اعلیٰ اور اشرف بنایا ہے۔ انسان سارے عالم کا ثمرہ، خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ'' (بنی اسرائیل: ۷۰) ''اور ہم نے اولاد آدم کو عزت بخشی''۔ نیز ارشاد فرمایا: ''وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ'' (الجاثیۃ: ۱۳) ''اور اس نے تمہارے لیے مسخر (تابع فرمان) کر دیا جو کچھ بھی آسمان میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس کی خاطر تمام مخلوقات کو پیدا کیا گیا ہے وہ اس بات کے لائق ہے کہ وہ دوسروں سے اعلیٰ اور افضل ہو، انسان کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ مخلوق (فرشتوں) اور ادنیٰ مخلوق (حیوانات) کے درمیان واسطہ بنایا ہے، اس لیے انسان کے اندر دونوں کی قوی موجود ہیں اور یہ دونوں عالم میں رہنے کا اہل ہے۔ انسان میں حیوانات کی طرح شہوت بھی پائی جاتی ہے اور فرشتوں کی طرح عقل، علم اور عبادت بھی، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہی منصب نبوت عطا فرمایا اور اس کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ نبوت کا درخت ایک منفرد اور ممتاز چیز بنے اور انسان اور فرشتہ کے درمیان ایک مخصوص نوع بنے اور ایک اعتبار سے دونوں کے ساتھ شریک بنے، چنانچہ انسان (پیغمبر) زمین و آسمان کے عجائبات وملکوت پر مطلع ہونے کے لحاظ سے فرشتہ کی طرح ہے اور کھانے پینے اور دیگر ضروریات کے اعتبار

سے عام انسانوں کی طرح ہے۔

انسان جب نفسانی اور جسمانی نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک وصاف ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے جوار میں مقیم ہو جائے تو اس وقت وہ فرشتوں سے بھی افضل اور برتر ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (الرعد: ۲۳) ''اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے داخل ہوتے ہوں گے (کہتے ہوئے کہ) سلامتی ہو تم پر اس کے صلہ میں جو تم صبر کرتے رہے۔''

اور حدیث مبارک میں آتا ہے کہ: '' الملائكة خدم اهل الجنة'' یعنی فرشتے اہل جنت کے خادم ہوں گے۔''

تفسیر و تاریخ کے امام حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ قمطراز ہیں کہ:

اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا آدم علیہ السلام کی جنت میں اولاد پیدا ہوئی تھی یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرت کہتے ہیں کہ نہیں ہوئی تھی، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہاں قابیل اور ان کی بہن پیدا ہوئی تھی۔ اور علماء نے یہ بات ذکر کی ہے کہ ہر حمل سے ان کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔'' تاریخ ابن جریر میں ہے کہ حضرت حواؑ نے بیس حمل سے چالیس بچے جنم دیئے تھے، جب کہ بعض کہتے ہیں کہ ایک سو بیس حمل ٹھہرے تھے، جن میں سے ہر حمل سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی، ان میں سب سے پہلے قابیل اور اس کی بہن اقلیماء پیدا ہوئیں، جیسا کہ '' القاموس '' میں ہے'' واقليماء بالكسر بنت آدم عليه السلام ''یعنی اور اقلیماء کسرہ کے ساتھ ہے جو آدم علیہ السلام کی بیٹی ہیں'' اور سب سے آخر میں عبد المغیث اور ان کی بہن امۃ المغیث پیدا ہوئیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کا اس وقت تک انتقال نہیں ہوا جب تک کہ انہوں نے اپنی اولاد اور نسل کے چار لاکھ افراد نہ دیکھ لیے۔ (فاللہ اعلم)

حضرت آدم علیہ السلام نے ایک ہزار سال کی عمر شریف پائی اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق حضرت عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کا انتقال ہوا

توساری مخلوق ان پر سات دن تک روتی رہی۔(حاشیہ القسطلانی ج ۵ ص ۳۲۱)

(۹۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کی پشت پر دستِ قدرت پھیرا تو ان کی پُشت سے وہ تمام مخلوق جھڑی جسے اللہ تعالیٰ قیامت تک پیدا کرنے والے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر انسان کی دو آنکھوں کے درمیان (پیشانی) نور کی ایک چمک رکھ دی، پھر ان کو حضرت آدمؑ کے سامنے پیش کیا، انہوں نے عرض کیا: اے میرے رب! یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا یہ آپ کی اولاد ہے، انہوں نے ان میں سے ایک آدمی کو دیکھا اس کی پیشانی کی چمک انہیں بڑی اچھی معلوم ہوئی، انہوں نے عرض کیا: اے میرے رب! یہ شخص کون ہے؟ فرمایا یہ ایک ایسا شخص ہے جو آپ کی امتوں میں سے آخری اولاد ہے، جس کو داؤد کہا جاتا ہے، آدم علیہ السلام نے عرض کی، پروردگار! آپ نے ان کی عمر کتنی مقرر کی ہے؟ فرمایا ساٹھ سال، انہوں نے عرض کیا: پروردگار میری عمر میں سے چالیس سال ان کی عمر میں مزید بڑھا دیجئے، پھر جب آدم علیہ السلام کی عمر پوری ہوگئی اور موت کا فرشتہ ان کے پاس آیا تو آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا ابھی میری عمر کے چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ فرشتہ نے کہا کہ کیا آپ نے وہ چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دے دیئے تھے؟ فرمایا کہ آدم علیہ اسلام نے انکار کیا، ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے، اور وہ بھول گئے اور ان کی اولاد بھی بھولتی ہے، آدم علیہ السلام سے خطا ہوگئی اور ان کی اولاد سے بھی خطا سرزد ہوتی ہے۔''

(جامع الترمذی، باب سورۃ الاعراف ج ۲ ص ۱۸۰)

فائدہ:

''جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کی پشت پر دستِ قدرت پھیرا'' اس بارے میں علماء کی دو رائیں ہیں: (۱) بعض علماء اس کو حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں اور ہاتھ پھیرنے سے وہ مراد لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہو اور وہ ہے اللہ کا یہ فرمانا: کُنْ فیکون: یا اپنے بعض فرشتوں کو جو اولادِ آدم کی ارواح پر مقرر ہیں،

یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ آدم علیہ السلام کی پشت پر ہاتھ پھیریں اور اس سے ان کی اولاد نکالیں۔

علامہ ابوالسعو رحمۃ اللہ علیہ "اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" (الاعراف: ۱۷۲) کی تفسیر کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں: اس بات کو حقیقت پر محمول کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ، آدم علیہ السلام کو تخلیق فرما چکے تو ان کی پشت پر دست قدرت پھیرا (الخ) پھر مذکورہ حدیث ذکر فرمائی پھر فرماتے ہیں کہ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت سے ساری مخلوق کو بالذات نکالا، بلکہ معنی یہ ہے کہ ان کی صلبی اولاد ان کی پشت سے نکالی اور پھر ان کی پشت سے ان کی صلبی اولاد نکالی، اس طرح آخر تک سلسلہ چلتا رہے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اس طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (الاعراف: ۱۷۲) "اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے انکی نسل کو نکالا۔"

(۴) علامہ ابو السعو رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء خلقت میں ان کی پیدائش کی تمثیل ذکر کی ہے کہ ان کو اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ اگر وہ ان دلائل سے رہنمائی حاصل کریں جو آفاقِ عالم اور خود ان کے نفوس میں موجود ہیں جو توحید و اسلام کی طرف توجہ دلاتے ہیں، جیسا کہ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آتا ہے کہ "ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا کیا جاتا ہے.........(الحدیث) اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی اس کا مؤید ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" (الروم: ۳۰) "اللہ کی اس فطرت کی اتباع کرو جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں" پھر فرماتے ہیں کہ یہ تمثیل اس بات پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی معرفت عطا فرما کر ان میں عقل و بصیرت ودیعت کر کے آفاقِ عالم اور خود ان کے نفوس میں ایسے دلائل پیدا کیے جو وحدانیت اور ربوبیت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، ان کو ربوبیت کے اقرار کا موقع دیا اور اس کو گواہی دینے اور سوال و جواب سے تعبیر فرمایا گیا، ورنہ حقیقت میں وہاں کوئی سوال و جواب نہ تھا۔ جیسا کہ اس فرمانِ خداوندی میں

ہے: فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعاً اَوْ كَرْهاً قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ‘‘(حٰمٓ السجدہ: ۱۱) ’’پھر اس (آسمان) اور زمین سے کہا کہ تم دونوں خوشی سے یا زبردستی آؤ، دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں‘‘

(۹۵) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں ہے ’’پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے ایک ہزار سال مکمل فرمائے اور داؤد علیہ السلام کے بھی سو سال مکمل کر دیئے۔

(الاتحافات السنية في الاحاديث القدسية)

(۹۶) مسلم بن یسار رحمۃ اللہ علیہ الجھنی سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے اس آیت مبارکہ کے بارے میں دریافت کیا گیا: وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ‘‘(الاعراف: ۱۷۲) اور یاد کیجئے جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی نسل کو پیدا فرمایا اور خود ان ہی کو ان کی جانوں پر گواہ بنایا اور (کہا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں، ہم گواہی دیتے ہیں، تا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔‘‘

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس آیتِ مبارکہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا تو آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر ان کی پشت پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا، اور ان سے نسل نکالی، پھر فرمایا میں نے ان کو جنت کے لیے پیدا کیا ہے، اور یہ لوگ جنتیوں جیسے عمل کریں گے، پھر ان کی پشت پر دست قدرت پھیرا اور ان سے نسل نکالی، اور فرمایا کہ میں نے ان کو جہنم کیلئے پیدا کیا اور یہ جہنمیوں جیسے عمل کریں گے، ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر عمل میں کیا رکھا ہے (اس کی کیا ضرورت)؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا کرتے ہیں تو اس سے جنتیوں جیسے عمل کرواتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا انتقال جنتیوں والے اعمال پر ہوتا ہے، چنانچہ اس کو جنت میں داخل فرماتے ہیں اور جب کسی بندے کو جہنم کے لیے پیدا فرماتے ہیں تو اس سے جہنمیوں جیسے عمل

کرواتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا انتقال جہنمیوں والے اعمال پر ہوتا ہے، چنانچہ اس کو جہنم میں داخل فرماتے ہیں۔'' (ایضاً)

فائدہ:

حدیث مذکور کا بقیہ حصہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ذی شان کی طرح ہے ''وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْراً مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (الاعراف: ۱۷۹) اور البتہ تحقیق ہم نے جہنم کے لیے بہت سے جنات اور انسان پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں ہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں۔ اور ان کے کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں ہیں، یہ لوگ چوپاؤں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بڑھ کر بے راہ ہیں، یہی لوگ غافل ہیں۔''

علامہ ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو دوزخ میں داخل ہونے کے لیے پیدا کیا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کیے بغیر دوزخ میں جانے پر مجبور ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ وہ اپنے اختیار سے حق کی طرف قطعی طور پر متوجہ نہ ہوں گے بلکہ کسی تاویل کے بغیر باطل پر مصر ہونگے، کوئی آیات اور انذارات ان کے لیے کارگر نہیں ہونگے، لہٰذا گویا اپنی ہی بداعمالیوں کی وجہ سے انجام کار کے طور پر دوزخ کے مستحق ہیں، جیسا کہ آس آیت کریمہ میں فرمایا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ'' (الذاریات: ۵۶) ''اور میں نے جنات اور انسان کو اسی لیے پیدا کیا ہے تاکہ میری عبادت کریں۔''

معلوم ہوا کہ یہ ان پر جبر نہیں ہوگا بلکہ اپنے کفر کے سبب دوزخ کے اور ایمان کی برکت سے جنت کے مستحق قرار پائیں گے۔ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے، لہٰذا جس کے لیے جنت مقرر فرمائی ہوگی اس کے لئے دخولِ جنت کے اسباب اور جس کے لیے دوزخ مقدر فرمائی ہوگی اس کے لیے دخولِ جہنم کے اسباب مہیا فرمادیتے ہیں۔ ارشاد الٰہی

ہے۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف: ۲۹)
"اور آپ فرما دیں کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا ہے، سو جس کا جی چاہے ایمان لے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔"

اللہ تعالیٰ سے ہم نہایت عجز وانکساری کے ساتھ اعمالِ خیر کی توفیق مانگتے ہیں، تاکہ اکرام واعزاز کے ساتھ جنت الفردوس کے مستحق بنیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔ والحمد للہ رب العالمین (آمین)۔

(۹۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان میں روح پھونک دی تو انہیں چھینک آئی اور انہوں نے کہا الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے اللہ کی تعریف بیان کی تو ان کے رب نے ان سے فرمایا: اے آدم! اللہ تم پر رحم کرے، وہاں فرشتوں کی ایک جماعت بیٹھی تھی، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ان فرشتوں کے پاس جاؤ، ان کو السلام علیکم کہو، فرشتوں نے (جواب میں) کہا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ کہا، پھر آدم علیہ السلام اپنے رب کے پاس حاضر ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ آپ کا اور آپ کی اولاد کا آپس میں ایک دوسرے کو سلام کا طریقہ ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے، درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ بند تھے، آدم علیہ السلام سے فرمایا ان دونوں میں جو تمہیں پسند ہو اسے لے لو، آدم علیہ السلام نے کہا" میں نے اپنے رب کے دائیں ہاتھ کو پسند کیا، اور میرے رب کے دونوں ہاتھ داہنے اور بابرکت ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے کھولا تو اس میں آدم اور ان کی ذریت تھی، اولادِ آدم میں سے ہر ایک کی پیشانی پر اس کی عمر لکھی ہوئی تھی، آدم علیہ السلام نے ان میں ایک آدمی دیکھا جو سب سے زیادہ روشن تھا، پوچھا، اے میرے رب! یہ شخص کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ آپ کے بیٹے داؤد ہیں، میں نے ان کی عمر چالیس سال لکھی ہے۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی پروردگار! ان کی عمر میں اضافہ فرمادے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تو یہی لکھ چکا ہوں، عرض کی کہ اے پروردگار! میں نے اپنی عمر میں سے ساٹھ سال ان کو دے دی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ جانیں اور وہ جانیں (یعنی آپ کی مرضی) پھر اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا انہیں

جنت میں رکھا، پھر انہیں وہاں سے اتار دیا گیا، آدم علیہ السلام اپنی عمر شمار کرتے تھے، پھر موت کا فرشتہ آیا تو آدم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ نے جلدی کی ہے، میری عمر تو ایک ہزار سال لکھی گئی ہے، فرشتہ نے کہا کہ کیوں نہیں، ایسا ہی ہے۔ لیکن آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو ساٹھ سال دے دیئے تھے، انہوں نے انکار کیا، پس ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے اور وہ بھول گئے، پس ان کی اولاد بھی بھول چوک کا شکار ہوتی ہے، فرمایا اس دن سے لکھ لینے اور گواہ بنانے کا حکم دیا گیا۔"

(جامع الترمذی ، کتاب التفسیر ج ۲ ص ۱۴۱ ، مشکوٰۃ المصابیح، باب السلام ص ۴۰۰)

فائدہ:

"درآنحالیکہ اس کے دونوں ہاتھ بند تھے" ان الفاظ سے اس ہیئتِ کذائی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے ہاتھوں میں کوئی چیز بند کرکے اس کو چھپا لیتا ہے۔

"اور میرے رب کے دونوں ہاتھ داہنے اور بابرکت ہیں" یہ جملہ یا تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا تھا، جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل کیا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے، بہر صورت اللہ تعالیٰ کی طرف ہاتھ اور داہنے ہاتھ کی نسبت کرنا متشابہات میں سے ہے، البتہ علماء نے ان الفاظ کے کئی معنی اور تاویلات بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ید (ہاتھ) کی صفت تو ثابت ہے لیکن ظاہری اور جسمانی ہاتھ ثابت نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ عبارت جسمانی ہاتھ کی نفی کی طرف اشارہ کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے جسمانی ہاتھ ثابت ہوتے تو یمین وشمال (دایاں اور بایاں) بھی ہوتا اور "دونوں ہاتھ داہنے اور بابرکت ہیں" سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہاں "خیر و برکت کا وجود" مراد ہے، جو یدِ یمین (داہنے ہاتھ) اور یمین کے لفظ کے مادۂ اشتقاق (یمن بمعنی برکت) کا تقاضا ہے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح قوت اور گرفت میں مخلوقات کا بایاں ہاتھ کمزور اور ناقص ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں کوئی کمزوری نہیں ہے، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ یکساں زور وقوت رکھتے ہیں، اس اعتبار سے اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہوئے، یہ بات اس طرح گویا سمجھانے کے لئے بیان کی گئی ہے۔ ورنہ اس عبارت کی اصل مراد یہ بیان کرنا ہے

کہ اللہ جل شانہٗ کی کسی صفت میں کسی طرح کی کوئی کمزوری اور نقص نہیں ہے اور اس کی تمام صفات کامل ہیں۔

اور تیسرے یہ کہ ان الفاظ کا مقصد اللہ تعالیٰ کے جود وکرم اور احسان وانعام کی صفت کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرنا ہے، چنانچہ اہل عرب جب کسی ایسے شخص کی توصیف کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ نفع پہنچانے والا ہے تو اس کے حق میں یہ کہتے ہیں کہ، کلتا یدیہ یمین، یعنی اس شخص کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔

''جو سب سے زیادہ روشن تھا'' اس عبارت سے ذہن میں ایک خلجان پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے تمام انبیاء علیہم السلام پر حضرت داؤد علیہ السلام کی فضیلت لازم آتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک طرح امتیازی شکل وصورت میں ظاہر کیا تاکہ اس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام ان کے بارے میں سوال کریں اور اس سوال پر وہ صورتِ حال مرتب ہو جو آگے پیش آئی، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کا حضرت داؤد کو اپنی عمر میں سے ساٹھ سال دینا اور پھر ملک الموت کے آنے پر اس کا انکار کرنا۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے روشن ترین ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تمام صفات کمالیہ میں سب سے ترجیح رکھتے تھے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ مذکورہ بالا مصلحت کے پیش نظر اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی شکل وصورت میں ایک طرح کی خاص نورانیت ودیعت فرمائی ہو، بلکہ وہ اس عالم میں بھی اس نورانیت سے متصف رہے ہوں، چنانچہ پیغمبروں میں سے ہر ایک نبی کسی نہ کسی خاص صفت سے موصوف رہا ہے اور اس صفت میں ان کو امتیازی حیثیت وخصوصیت حاصل رہی ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ محض اس خاص صفت کی بناء پر اس نبی کو دیگر تمام انبیاء پر فضیلت اور فوقیت کا درجہ حاصل ہو۔

''میری عمر تو ایک ہزار سال لکھی گئی ہے'' ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ بات بالکل صحیح کہی تھی کیونکہ واقعتہً اللہ تعالیٰ نے ان کی عمر ایک ہزار سال مقرر کی تھی، البتہ اس بات کے ضمن میں ان کا مذکورہ انکار پوشیدہ تھا، انہوں نے صراحۃً یہ بات نہیں کہی کہ میں نے اپنی عمر سے داؤد علیہ السلام کو کچھ نہیں دیا ہے اور صراحۃً انکار ممکن بھی نہیں تھا، کیونکہ انبیاء

علیھم السلام کی زبان سے کوئی جھوٹ قصداً اور صریحاً صادر نہیں ہوتا۔ لہٰذا کہا جائے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ انکار بطورِ تعریض تھا جیسا کہ اس طرح کی بعض صورتیں دیگر انبیاء علیھم السلام سے بھی صادر ہوتی ہیں یا یہ کہا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مذکورہ انکار بطریقہ نسیان تھا، یعنی انہیں یہ یاد نہیں رہا تھا کہ وہ اپنی عمر میں سے ساٹھ سال داؤد علیہ السلام کو دے چکے ہیں، اس لیے انہوں نے ملک الموت کے سامنے اس کا انکار کر دیا۔

(مظاہر حق ج ۴ ص ۳۶۴، ۳۶۵)

(۹۸) عبدالحمید بن عبدالرحمٰن بن زید بن خطاب رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اس آیت مبارکہ کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ " (الاعراف: ۱۷۲)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے کہ آپؐ سے بھی اس آیت کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا، پھر اپنا داہنا ہاتھ ان کی پشت پر پھیرا، یہاں تک کہ اس سے ایک ذریت نکالی، پھر فرمایا کہ میں نے ان کو جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جنتیوں والے اعمال کریں گے، پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے ایک ذریت نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ جہنمیوں والے عمل کریں گے، ایک آدمی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر عمل میں کیا رکھا ہے؟ (اس کی کیا ضرورت ہے) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا کرتے ہیں تو اس سے جنتیوں والے عمل کراتے ہیں یہاں تک کہ اس شخص کا انتقال جنتیوں والے عمل پر ہوتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرماتے ہیں، اور جب کسی بندے کو جہنم کے لیے پیدا فرماتے ہیں تو اس سے جہنمیوں والے عمل کرواتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا انتقال جہنمیوں والے عمل پر ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کی وجہ سے جہنم میں داخل فرما دیتے ہیں۔" (موطأ الامام مالکؒ باب النهي عن القول بالقدر)

(۱۱) ﴿شکمِ مادر میں ابنِ آدم کی تخلیق﴾

(۹۹) زید بن وہب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو صادق و مصدوق ہیں، بیان فرمایا کہ ''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن اور چالیس رات یا چالیس رات میں جمع کیا جاتا ہے، پھر وہ اتنی ہی مقدار جمے ہوئے خون کی طرح بن جاتا ہے، پھر اتنی ہی مقدار گوشت کے لوتھڑے کی طرح ہو جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ کو بھیجتے ہیں۔ اور اس کو چار باتوں (کے لکھنے) کا حکم دیا جاتا ہے، چنانچہ وہ اس کا رزق، اس کی مدتِ عمر اور اس کا عمل اور بد بخت یا نیک بخت ہونے کے بارے میں لکھ دیتا ہے، پھر اس میں روح پھونک دیتا ہے، تم میں سے کوئی شخص جنتیوں والے عمل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا ہی فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر نوشتہ تقدیر اس پر سبقت لے جاتا ہے اور وہ جہنمیوں والے عمل کرنے لگتا ہے اور جہنم میں داخل ہو جاتا ہے، اور تم میں سے کوئی شخص جہنمیوں والے عمل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر نوشتہ تقدیر اس پر سبقت لے جاتا ہے اور وہ جنتیوں والے عمل شروع کر دیتا ہے، چنانچہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ (صحیح البخاری، بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ ج ۴ ص ۱۱۱ باب خلق آدم ج ۴ ص ۱۳۳، باب القدر ج ۸ ص ۱۲۲، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ تعالیٰ ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین ج ۹ ص ۱۳۵)

(۱۰۰) بعض روایات میں یہ الفاظ زائد ہیں ''خدا کی قسم! تم میں سے ایک شخص یا ایک آدمی'' اور بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں۔ ''سوائے ایک ہاتھ یا دو ہاتھ کے'' اور بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں ''سوائے ایک باع کے (دو ہاتھوں کے پھیلاؤ کے بقدر) اور بعض روایات میں جنت کا ذکر مقدم ہے۔

(۱۰۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ جو کہ صادق و مصدوق ہیں، کہ تم میں سے ہر شخص کی تخلیق اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک جمع کی جاتی ہے، پھر اتنے ہی دن جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے، پھر اتنے ہی دن گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتہ کو بھیجتے ہیں اور اسے چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے: چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس کا عمل اس کی مدت عمر اور اس کا رزق اور بد بخت ہونا یا نیک بخت ہونا لکھ دو، پس قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی شخص جنتیوں والے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر تقدیر کا لکھا اس پر سبقت لے جاتا ہے اور وہ جہنمیوں والے عمل کرنے لگتا ہے اور جہنم میں داخل ہوتا ہے اور تم میں سے کوئی شخص جہنمیوں والے عمل کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر نوشتہء تقدیر اس پر سبقت لے جاتا ہے اور وہ جنتیوں والے عمل کرنے لگتا ہے اور بالآخر جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔''

(سنن ابن ماجه، باب في القدر ج ا ص ۲۰، ۲۱، مشكوٰة المصابيح، باب الايمان بالقدر ص ۲۰)

(۱۰۲) زید بن وھب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، جو کہ صادق و مصدوق ہیں، کہ تم میں سے ہر شخص کی تخلیق کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک جمع رکھا جاتا ہے، پھر اتنے ہی عرصہ تک جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے، پھر اتنے ہی عرصہ تک گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرشتہ کو بھیجتے ہیں، پس وہ اس میں روح کو پھونک دیتا ہے اور اسے چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے، اس کے رزق اور اس کی عمر اور اس کے عمل اور اس کے بد بخت یا نیک بخت کے لکھنے کا، پس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، بے شک تم میں سے ایک شخص جنتیوں والے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر نوشتہء تقدیر اس پر غالب آتا ہے اور وہ جہنمیوں والے عمل کرنے لگتا ہے، اور وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے اور بے شک تم میں سے ایک شخص جہنمیوں

والے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر نوشتہ تقدیر اس پر غالب آجاتا ہے اور وہ جنتیوں والے عمل کرنے لگتا ہے، چنانچہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔''

(صحیح مسلم، باب کیفیة خلق الادمی فی بطن امه ج ۱۰ ص ۹۱ حاشیه القسطلانی)

(۱۰۳) وکیع رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس رات تک جمع رکھا جاتا ہے۔'' اور جریر اور عیسیٰ کی حدیث میں ''چالیس دن'' کا ذکر ہے۔

(۱۰۴) اسی طرح شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے حدیث معاذ رضی اللہ عنہ میں بھی چالیس دن کی بجائے چالیس رات کے الفاظ ہیں۔

(۱۰۵) ابوالطفیل رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت حذیفہ بن ابی اَسید الغفاری رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث منقول ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''رحمِ مادر میں نطفہ کے چالیس یا پینتالیس رات ٹھہر جانے کے بعد فرشتہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب! یہ بد بخت ہے یا نیک بخت؟ پس اس کو لکھ دیا جاتا ہے، پھر کہتا ہے کہ اے میرے رب! لڑکا ہے یا لڑکی؟ اور اس کا عمل، اس کی مدّت، اس کی اجل (موت) اور رزق بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ پھر صحیفوں کو لپیٹ دیا جاتا ہے، پھر نہ تو اس میں اضافہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی کمی۔''

(۱۰۶) ابوالزبیر المکی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عامر بن واثلہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے بیان کیا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: بد بخت شخص وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ میں بد بخت ہو اور نیک بخت وہ ہے جو دوسرے سے نصیحت حاصل کرے، پھر وہ (عامر) ایک صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم (جنہیں حذیفہ بن اسید الغفاری رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے) کے پاس آئے اور انہیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذکورہ قول بتایا تو انہوں نے فرمایا کہ عمل کے بغیر کوئی آدمی بھلا کیسے بد بخت ہو سکتا ہے؟ ان سے ان صاحب نے کہا کہ کیا آپ کو اس پر تعجب ہے؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جب نطفہ پر بیالیس راتیں گزر جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ کو بھیجتا ہے جو اس کی

صورت بناتا ہے اور اس کے کان، آنکھیں، اس کی کھال اور گوشت اور ہڈیاں بناتا ہے، پھر کہتا ہے کہ اے پروردگار! کیا یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ پس آپ کا رب جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور فرشتہ لکھ دیتا ہے، پھر کہتا ہے کہ اے پروردگار! اس کی عمر کی مدت کتنی ہے؟ پس آپ کا رب جو چاہتا ہے کہتا ہے، اے پروردگار! اس کی عمر کی مدت کتنی ہے؟ پس آپ کا رب جو چاہتا ہے کہتا ہے اور فرشتہ لکھ لیتا ہے، پھر وہ فرشتہ اس صحیفہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر نکل جاتا ہے۔ چنانچہ وہ نہ کسی امر میں اضافہ کرتا ہے اور نہ ہی کمی''

(صحیح مسلم ج ۱۰ ص ۷۴ از حاشیہ القسطلانی)

(۱۰۷) ابو الطفیل رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں ابو سَریحہ حذیفہ بن اسید الغفاری رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ان دو کانوں سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''نطفہ چالیس رات تک رحم مادر میں رہتا ہے پھر فرشتہ اس کی صورت بناتا ہے۔ زہیر (راوی) کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ وہ فرشتہ جو اس کی دیکھ بھال کرتا ہے وہ کہتا ہے۔ اے پروردگار! کیا یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو لڑکا یا لڑکی بنا دیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اے پروردگار! کیا مکمل بچہ یا ناتمام؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ مکمل یا ناتمام بنا دیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے، اے پروردگار! اس کا رزق کیا ہوگا؟ اس کی مدت کا وقت کیا ہوگا؟ اس کے اخلاق کیسے ہوں گے، پھر اللہ تعالیٰ بد بخت یا نیک بخت بنا دیتے ہیں۔ (ایضاً)

(۱۰۸) ایک روایت میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک فرشتہ رحم مادر پر مقرر ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے کوئی چیز پیدا کرنا چاہتا ہے تو چالیس سے کچھ زیادہ'' الخ پھر اسی طرح کی حدیث ذکر کی۔

(۱۰۹) حضرتِ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ رحم مادر پر مقرر کیا ہے وہ فرشتہ کہتا ہے کہ پروردگار! اب یہ نطفہ کی شکل میں ہے، اے پروردگار! اب یہ جمے ہوئے خون کی شکل میں ہے، پروردگار! اب یہ گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ جب کوئی مخلوق پیدا کرنے کا فیصلہ کرنا

چاہتا ہے، تو فرشتہ کہتا ہے لڑکا ہے یا لڑکی؟ بد بخت ہے یا نیک بخت؟ اس کا رزق کیا ہے، اس کی موت کا وقت کیا ہے؟ چنانچہ اسی طرح اس کی ماں کے پیٹ میں ہی لکھ دیا جاتا ہے۔ (ایضاً)

فائدہ:

مطلب یہ ہے کہ ہر چیز جس سے وہ آئندہ فائدہ اٹھائے گا، خواہ وہ علم ہو یا رزق، حلال ہو یا حرام، کم ہوگا زیادہ۔ اسی طرح عمر کے بارے میں لکھ دیا جاتا ہے کہ وہ طویل ہوگی یا مختصر، نیک اعمال کرے گا یا بُرے اعمال، اور یہ کہ بد بخت بنے گا یا نیک بخت، اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اعمال خواہ نیک ہوں یا بد یہ صرف نشانیاں اور علامات ہیں۔ انجام کا اصل مدار اللہ تعالیٰ کے اس ازلی فیصلے پر ہے جو پہلے سے نوشتہ تقدیر بن چکا ہے۔

(از شرح القسطلانی)

اور نووی شرح صحیح مسلم میں ہے کہ حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ کو ایک سو بیس دن کے بعد بھیجا جاتا ہے اور اس کی بعد والی روایت میں ہے کہ نطفہ کے رحم مادر میں چالیس یا پنتالیس دن بعد فرشتہ آتا ہے۔ اور ایک روایت میں بیالیس دن کا ذکر ہے۔ اور حذیفہ بن اسید کی روایت میں ہے کہ نطفہ رحم مادر میں چالیس رات رہتا ہے، پھر فرشتہ اس کی صورت بناتا ہے، اور ایک روایت میں چالیس سے کچھ زیادہ راتوں کا ذکر ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحم مادر پر ایک فرشتہ کو مقرر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اے پروردگار! اب یہ نطفہ ہے، اے پروردگار! یہ جما ہوا خون ہے۔ اے پروردگار! یہ گوشت کا لوتھڑا بن گیا ہے۔ ان مختلف روایات میں علماء نے یوں تطبیق دی ہے کہ فرشتہ رحم مادر پر مقرر ہے اور وہ احوال کی دیکھ بھال اور اس پر نظر رکھتا ہے۔ اور ہر موقع پر اللہ تعالیٰ سے اس کے نطفے، جما ہوا خون اور لوتھڑے وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ روح چار ماہ بعد ہی پھونکی جاتی ہے۔ اور مذکورہ احادیث میں رزق، عمر، نیک بختی، بد بختی لڑکا یا لڑکی اور حمل وغیرہ سے مراد یہ ہے کہ فرشتے کو اس وقت یہ چیزیں بتائی جاتی ہیں اور اسے ان چیزوں کے لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے علم

میں یہ چیزیں ازل سے موجود ہیں۔

نیز ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابدی نجات اور عذاب کا دارومدار خاتمہ پر ہے، اگر کسی کی پوری زندگی گناہ ومعصیت یا کفر وشرک میں گزری لیکن اس نے آخری وقت میں صدقِ دل سے اپنی بداعمالیوں اور گمراہی پر نادم اور شرمسار ہو کر سعادت ونیک بختی کے راستے کو اختیار کر لیا تو وہ نجات پا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص تمام عمر نیکی وبھلائی کرتا رہا اور اس کی تمام زندگی خُدا اور خُدا کے رسول ﷺ کی اطاعت وفرماں برداری میں گزری لیکن آخری وقت میں وہ شیطان کی گمراہی یا اپنے نفس کی شرارت سے گمراہ ہو گیا اور اس نے اپنی حیات کے آخری لمحوں کو برائی وبدبختی کے بھینٹ چڑھا دیا تو وہ اپنی زندگی بھر کی نیکیوں کے باوجود عذاب خداوندی میں مبتلا کیا جائے گا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ بھلائی وبہتری اور اخروی نجات اسی میں ہے کہ بندہ ہمیشہ اطاعت الٰہی اور فرمان نبوی کی بجا آوری میں مصروف رہے، اس کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی حدود شریعت سے تجاوز کرنے نہ پائے اور ہر آنے والے لمحہ کو یہ سوچ کر کہ شاید میری زندگی کا یہ آخری لمحہ نیکی اور بھلائی میں صرف کرتا رہے، تاکہ خاتمہ بالخیر کی سعادت سے نوازا جائے۔

اس موقع پر یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جو لوگ قضاوقدر کے مسئلوں کو دیکھ کر یہ نظریہ قائم کر بیٹھیں ہیں کہ عذاب، نیک بختی وبدبختی، اور جنت ودوزخ کا ملنا تقدیری چیز ہے تو عمل کی کیا ضرورت؟ وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہیں، چنانچہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی جو مسئلہ کی حقیقت کو نہیں سمجھ پائے تھے۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کے سامنے اس قسم کی بات کہی تو آنحضرت ؐ نے فرمایا: کہ تم عمل کیے جاؤ کیونکہ جس کے مقدر میں جو کچھ لکھا ہے اس پر اس کو اختیار بھی دیا گیا ہے یعنی قضاوقدر پر بھروسہ کر کے تمہارا عمل میں توقف کرنا یا عمل سے انکار کرنا کوئی کارآمد نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ احکام شارع کی جانب سے وارد ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی تم کو سوچنے سمجھنے کی قابلیت اور نیکی وبدی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت بھی دی گئی ہے، نیز تمہارے اندر وہ قصد وجہد کا مادہ بھی پیدا کیا گیا ہے تاکہ ان اسباب کے

ذریعہ عمل کرسکو۔

لہٰذا اب اگر تم قضا وقدر کا سہارا لے کر اسباب سے قطع نظر کر دو گے اور اعمال کو چھوڑ دو گے تو تباہی و بربادی کے غار میں جا گرو گے، ہاں یہ خدا کی یقیناً کوئی مصلحت ہوگی جس کی حقیقت اور حکمت کو تو وہی جانتا ہے کہ ایک طرف تو اس نے قضا وقدر کے مسئلہ کو سامنے کر دیا، دوسری طرف اعمال وافعال کے کرنے کا حکم دیا، اور پھر اس مسئلہ میں تحقیق وتفتیش کرنے سے بھی منع فرما دیا اور پھر قضا وقدر کے سہارے اعمال کی ضرورت سے انکار کر دیا جائے تو اس کا کیا جواب ہوگا کہ خدا کی جانب سے شریعت کا اتارنا، احکام بھیجنا اور رسولوں کی بعثت جن کا مقصد احکامِ خداوندی پر عمل کرنے کی ترغیب دینا ہوتا تھا بلا وجہ ہوئی، کیونکہ جب محض تقدیر پر بھروسہ ہوگا کہ جس کے مقدر میں جنت میں جانا لکھا ہوگا وہ جنت میں یقیناً جائے گا اور جس کے مقدر میں دوزخ لکھی ہوگی وہ دوزخ میں یقیناً جائے گا، تو ان رسولوں کی بعثت اور احکام واعمال کی بجا آوری کی تاکید کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ لہٰذا اس حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو یہ خیال غلط ثابت ہوگا۔

بہر حال! جس طرح اور بہت سے اسرار الٰہی ہیں کہ ان کی بندوں کو خبر نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی ایک راز ہے جو بندوں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے، اس لیے کسی کے ظاہری عمل کو دیکھ کر اس کے جنتی یا دوزخی ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا بلکہ یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے کہ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ یعنی وہ جس کو چاہے بداعمالیوں کی بناء پر عذاب میں مبتلا کر دے اور جس کو چاہے اپنے فضل وکرم سے بخش دے۔ (مظاهر حق ج ۱ ص ۱۵۹)

(۱۲) ﴿رشتہ داری سے اللہ ربّ العزت کا خطاب﴾

(۱۱۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا، پھر جب اللہ تعالیٰ اس سے فارغ ہوئے تو رحم یعنی رشتہ داری نے کھڑے ہوکر اللہ تعالیٰ کے دامن کو پکڑا، اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ کیا ہے؟ عرض کیا قطع رحمی سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ جو تجھ کو جوڑے میں اس کو جوڑوں اور جو تجھ کو توڑے میں اس کو توڑوں، اس نے کہا ''کیوں نہیں'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ایسا ہی ہوگا'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تمہارا جی چاہے تو یہ آیت پڑھ لو۔ **فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ** (محمد: ۲۲) (صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورة القتال، باب وتقطعوا ارحامکم ج ٦ ص ١٣٤، مشکوٰة المصابیح، باب البر والصلة ص ٤١٩)

(۱۱۱) صحیح بخاری کے اس باب کی ایک روایت میں، جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یہ الفاظ ہیں کہ ''پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: **فَهَلْ عَسَيْتُمْ**......''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث کتاب التوحید اور کتاب الادب میں اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے الادب میں اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے التفسیر میں نقل کی ہے۔

فائدہ:

''جب اللہ تعالیٰ مخلوق کی پیدائش سے فارغ ہوئے'' کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ مخلوقات کو پیدا کر چکا، اگر چہ ظاہری طور پر ان دونوں جملوں میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن اس میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ لغوی طور پر فراغت کا حقیقی مفہوم اپنے تحقق کے لیے پہلے اشتغال کا متقاضی ہوتا ہے، یعنی فراغت کا مفہوم اس صورت پر صادق آتا ہے جب کسی کام میں مشغولیت رہی ہو، اور اس کام کے علاوہ دیگر امور سے وہ باز رکھتی ہو، اس لیے کہا جائے

گا کہ یہاں پر فراغت اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ومنزہ ہیں کہ اس کو ایک کام دوسرے کام سے باز رکھے، جیسا کہ ایک دعائے ماثورہ میں یوں آیا ہے۔ "**سبحان من لایشغله شان عن شأن**"۔

حدیث ہذا میں مذکورہ لفظ "**حقو**" دراصل اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ازار باندھتے ہیں اور چونکہ ازار کو باندھنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دونوں کناروں کو ملا کر باندھا جاتا ہے، اس اعتبار سے یہاں اس لفظ کا تثنیہ استعمال کرتے ہوئے "**بحقوی الرحمن**" کہا گیا ہے۔ یعنی وہ جگہ جہاں ازار کے دونوں کنارے باندھے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی چیزوں سے پاک ومنزہ ہے، اس لیے یہ بات ملحوظ ذہنی چاہیے کہ یہ جملہ اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے بلکہ اہل عرب کے ایک مخصوص ادائے بیان کا مظہر ہے، اور یہاں جس بات کو بیان کرنا مقصود تھا اس کو انہی کے طرزِ کلام کی مثالی صورت میں واضح کیا گیا ہے، چنانچہ اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کی پناہ میں آنا چاہتا اور اس کی مدد کا خواہاں ہوتا جو اس کو سخت اضطراب وپریشانی میں ڈالنے والی ہوتی اور وہ پناہ اور مدد چاہنے کی اپنی ضرورت کو زیادہ اہمیت اور تاکید کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا تو جس کی پناہ یا مدد درکار ہوتی اس کے حقوِ ازار پر دونوں ہاتھ مارتا، تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور یہ پوچھنے پر مجبور ہو کہ تیرا مقصد کیا ہے اور مجھ سے کیا چاہتا ہے! چنانچہ رشتے ناتے کا اپنے کاٹے جانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کے مفہوم کو بطور استعارہ (تمثیل کے طور پر) مذکورہ عبارت کے ذریعہ بیان کیا گیا، ورنہ لغوی طور پر یہاں نہ تو "**حقو**" کے حقیقی معنی ومفہوم ہیں اور نہ اس کو پکڑنے کا وہی مفہوم ہے جو کسی انسان کے پکڑنے کا ہوتا ہے، یہ ایسا ہے جیسا اہل عرب کے ہاں جب کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "**یداہ مبسوطتان**" (یعنی اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں) تو اس سے مراد اس کی نہایت سخاوت وفیاضی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، خواہ وہ واقعتہً ہاتھوں والا ہو یا خلقی طور پر سرے سے اس کے ہاتھ ہی نہ ہوں۔ اور خواہ وہ ایسی ذات ہو جس کے لیے ہاتھوں کا وجود ہی محال ہو جیسے اللہ جل شانہ کی ذات۔

حاصل یہ کہ اس طرح کے طرزِ کلام اہل عرب میں محاورہ کے طور پر بہت مستعمل ہیں جن کے الفاظ اپنے حقیقی مفہوم کو ادا کرنے کی بجائے دوسرے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور چونکہ قرآن کریم کا نزول اور احادیث نبوی کا صدور اہل عرب ہی کے طرزِ کلام پر اور اسلوبِ بیان کے مطابق ہوا ہے اس لیے قرآن وحدیث کے ایسے مقام کو جہاں اس طرح کے جملے آتے ہیں اور جن پر متشابہات کا اطلاق ہوتا ہے ان کی تاویل اور وضاحت کے لیے یہ بات ایک بڑی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، ویسے اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ رحم یعنی رشتہ وناتا کوئی ذات وجسم تو ہے نہیں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر اللہ تعالیٰ سے پناہ کا طلب گار ہو، بلکہ حقیقت میں وہ ایک معنی ہے، لہٰذا اس کے لیے کھڑے ہونے اور پناہ چاہنے کے الفاظ استعمال کرنا بطور تشبیہ وتمثیل ہی ہوسکتا ہے۔ جس سے اس بات کو واضح کرنا مقصود ہے کہ رحم گویا ایک ہستی یا ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو کھڑا ہو اور اللہ تعالیٰ کی عزت وعظمت اور اس کی کبریائی کا دامن پکڑ کر پناہ کا طلب گار ہو۔

اسی طرح کی بات امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان کی ہے کہ رحم جس کو جوڑا جاتا ہے یا کاٹا جاتا ہے (کوئی ذات یا جسم نہیں ہے بلکہ) معانی میں سے ایک معنی ہے جو (کسی ذات جسم کی طرح) نہ کھڑا ہوسکتا ہے اور نہ اس سے کلام وگفتگو کا صدور ہوتا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں مذکورہ ارشاد کی مراد دراصل رحم یعنی رشتے ناتے کی اہمیت کو ظاہر کرنا، ناتے کو جوڑنے والے کی فضیلت کو بیان کرنا اور ناتے توڑنے والے کی مذمت کرنا ہے، کیونکہ ناتے کو جوڑنا فی الجملہ واجب ہے اور اس کو توڑنا کبیرہ گناہ ہے، اگرچہ صلہ رحمی کے درجات متعین کردیئے گئے ہیں، جن میں سے بعض کو زیادہ اہمیت اور برتری حاصل ہے اور سب سے ادنیٰ درجہ ترکِ مہاجرت یعنی میل ملاقات کو اختیار کرنا ہے، کیونکہ صلہ رحمی کا ایک ذریعہ کلام وملاقات بھی ہے، اگرچہ وہ محض سلام کی حد تک ہو۔

واضح رہے کہ صلہ رحمی کے ان درجات کے درمیان تفاوت واختلاف کی بنیاد مواقع وحالات اور ضرورت وقدرت کے مختلف ہونے پر ہے، چنانچہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں رشتہ داری کے تعلق کی رعایت اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کی زیادہ

اہمیت وضرورت ہوتی ہے، اور بعض صورتوں میں اس کی اہمیت وضرورت زیادہ نہیں رہتی، علاوہ ازیں بعض مواقع پر رشتہ داری کا لحاظ اور نیک سلوک کرنے کی قدرت واستطاعت حاصل ہوتی ہے اور بعض مواقع پر قدرت واستطاعت کا فقدان ہوتا ہے، اسی اعتبار سے صلہ رحمی کا حکم بھی عائد ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض میں مستحب ہے، لہٰذا اگر کسی شخص نے ناتا جوڑنے کے حق کو جزوی طور پر ادا کیا اور اسکو پورے طور پر ادا نہ کر سکا تو اس کو ناتا توڑنے والا نہیں کہیں گے، لیکن اگر کسی شخص نے رشتہ داری کے حقوق میں سے کسی ایسے حق کو پورا کرنے میں کوتاہی کی جس کو پورا کرنے پر وہ قادر تھا نیز اس حق کو پورا کرنا اس کے لیے مناسب بھی تھا تو اس شخص کو ناتا جوڑنے والا نہیں کہا جائے گا۔(مظاہر حق ج ۴ ص ۵۱۵، ۵۱۶، نیز دیکھیے شرح الطیبی ۹/ ۱۵۳، باب البر والصلة، عمدة القاری ۱۹/ ۱۷۳)

روایت کے آخر میں یہ آیت ہے۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (محمد:۲۲)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے "تولیتم" کا ترجمہ حکومت مل جانے سے کیا ہے، چنانچہ فرمایا کہ "پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو خرابی ڈالو ملک میں اور قطع کرو اپنی قرابتیں۔"

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے تحت رقمطراز ہیں "یعنی حکومت واقتدار کے نشہ میں لوگ عموماً اعتدال وانصاف پر قائم نہیں رہا کرتے، دنیا کی حرص اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، پھر جاہ ومال کی کشمکش اور غرض پرستی میں جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں جن کا آخری نتیجہ ہوتا ہے عام فتنہ وفساد اور ایک دوسرے سے قطع تعلق۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "جان سے تنگ ہو کر جہاد کی آرزو کرتے ہو اور اگر اللہ تعالیٰ تم ہی کو غالب کر دے تو فساد نہ کرنا۔"

دوسرے علماء "تولی" کو بمعنی اعراض لے کر یوں مطلب لیتے ہیں کہ اگر تم اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے اعراض کرو گے تو ظاہر ہے دنیا میں امن وانصاف قائم نہیں ہو سکتا اور جب دنیا میں امن وانصاف نہیں رہے گا تو ظاہر ہے فساد، بدامنی اور حق ناشناسی کا

دور دور ہوگا۔ اور بعض نے اس طرح تفسیر کی ہے کہ اگر تم ایمان لانے سے اعراض کرو گے تو زمانہ جاہلیت کی کیفیت عود کر آئے گی، جو خرابیاں اور فساد اس وقت تھے اور ادنیٰ ادنیٰ بات پر رشتے ناتے قطع ہو جاتے تھے، وہ ہی سب نقشہ پھر قائم ہو جائے گا۔

اور اگر آیت میں خاص منافقین سے خطاب مانا جائے تو ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر جہاد سے اعراض کرو گے تو تم سے یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ اپنی منافقانہ شرارتوں سے ملک میں خرابی مچاؤ گے اور جن مسلمانوں سے تمہاری قرابتیں ہیں ان کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے کھلے کافروں کے مددگار بنو گے'' (تفسیر عثمانی ص ۶۶۰، فائدہ نمبر ۶)

(۱۱۲) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ''میں اللہ ہوں اور میں رحمٰن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے، اور میں نے اس کے نام کا لفظ اپنے نام کے لفظ سے نکالا ہے، لہٰذا جو شخص رحم کو جوڑے گا، میں بھی اس کو جوڑوں گا اور جو شخص رحم کو توڑے گا میں بھی اس کو جدا کر دوں گا۔'' (سنن الترمذی)

(۱۱۳) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''میں رحمٰن ہوں اور یہ رحم (قرابت) ہے میں نے اپنے نام سے اس کا نام نکالا ہے، جو اس کو جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو جدا کر دوں گا'' (سنن ابی داود، باب صلۃ الرحم ج ۲ ص ۷۷)

فائدہ:

''جو شخص رحم کو جوڑے گا'' یعنی جو رشتہ داری کے حقوق ادا کرے گا میں بھی اس کو اپنی رحمت کے ساتھ منسلک کروں گا اور ''جو شخص رحم کو توڑے گا'' یعنی اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا تو میں بھی اسے اپنی رحمت سے دور کر دوں گا۔

''میں اللہ ہوں'' یعنی میں واجب الوجود ہوں کہ میری ذات پاک اپنے وجود اور اپنے حکم و فیصلہ کے نفاذ میں کسی کی محتاج نہیں ہے، یہ جملہ دراصل آگے ارشاد ہونے والے

کلام کی اہمیت کو ظاہر کرنے کیلئے بطور تمہید ہے اور اس تمہید میں پہلے اسمِ خاص کا ذکر کیا اور پھر اپنی صفتِ رحمٰن کو ذکر کیا جس کا لفظی مادہ اشتقاق وہی ہے جو رحم کا ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے کہ کوئی گناہ اس بات کے زیادہ لائق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مرتکب کو دنیا میں بھی اس کی سزا دے اور (مرتکب) کو آخرت میں بھی بدلہ دینے کے لیے (اس سزا کو) اٹھا رکھے، ہاں دو گناہ بے شک اس بات کے لائق ہیں، ایک تو امامِ وقت کے خلاف بغاوت کرنا اور دوسرے رشتہ ناتا توڑنا''۔

رواہ الترمذی و ابو داود، دیکھیے: شرح القسطلانی ج ۷ ص ۸۴۲ شرح النووی علی مسلم)

نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں آتا ہے کہ ''جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت و فراخی اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے (یعنی اس کی عمر دراز ہو) تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔ (متفق علیہ)

(۱۳) ﴿نماز کا ذکر﴾

واقعہ معراج سے متعلق احادیث مبارکہ:

(۱۱۴) ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے گھر کی چھت کھول دی گئی اس وقت میں مکہ میں تھا، پھر جبرائیل آئے، اور انہوں نے میرا سینہ چاک کیا، اور اسے زمزم کے پانی سے دھویا، پھر سونے کا طشت لائے جو حکمت اور ایمان سے لبریز تھا، اس کو میرے سینے میں ڈال دیا اور سینے کو بند کر دیا، پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھے آسمان کی طرف لے چلے، جب میں آسمان دنیا پر پہنچا تو جبرائیل نے آسمان کے داروغہ سے کہا کہ کھولو، انہوں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں، جواب دیا کہ جبرائیل پھر انہوں نے پوچھا کیا تمہارے ساتھ اور کوئی بھی ہے؟ جبرائیل نے کہا: ہاں! میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، داروغہ نے پوچھا: کیا ان کو بلوایا گیا ہے؟ جبرئیل ؑ نے کہا: ہاں! چنانچہ دروازہ کھولا گیا، جب ہم آسمانِ دنیا پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ انکے دائیں اور کچھ بائیں بیٹھے ہوئے ہیں، جب وہ اپنی دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں اور جب بائیں جانب دیکھنے لگتے ہیں تو رونے لگتے ہیں، انہوں نے کہا: پیغمبر صالح اور نیک بخت بیٹے کو میں خوش آمدید کہتا ہوں، میں نے جبرائیل سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ جبرائیل نے کہا: یہ آدم ہیں اور یہ لوگ جوان کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں ان کی اولاد کی روحیں ہیں، ان میں جو لوگ ان کے دائیں بیٹھے ہیں وہ جنتی ہیں اور جو لوگ ان کے بائیں بیٹھے ہیں وہ دوزخی ہیں۔ اسی لیے یہ اپنی دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں۔ اور جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔ اس کے بعد جبرائیل مجھ کو لے کر دوسرے آسمان پر چڑھے اور انہوں نے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو اس کے داروغہ نے بھی وہی سوال کیا جو پہلے آسمان کے داروغہ نے کیا تھا، راوی کہتے ہیں کہ غرضیکہ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام آسمانوں پر پہنچے اور

وہاں حضرت آدمؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات کا ذکر فرمایا، لیکن ان کے منازل ومقامات کی کیفیت واحوال کو بیان نہیں کیا، حضرت آدمؑ سے پہلے آسمان پر اور حضرت ابراہیمؑ سے چھٹے آسمان پر ملنے کا ذکر فرمایا۔

ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو حبہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' پھر مجھ کو اور اوپر لے جایا گیا، یہاں تک کہ میں ایک ہموار اور بلند مقام پر پہنچا جہاں قلموں سے لکھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔'' ابن حزم اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں، چنانچہ انہیں لے میں واپس ہوا، لیکن جب حضرت موسیٰؑ کے پاس سے گزرا تو انہوں نے پوچھا کہ پروردگار نے تمہارے ذریعہ تمہاری امت پر کیا چیز فرض کی ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ پچاس نمازیں فرض کی ہیں، انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ، کیونکہ تمہاری امت اتنی نمازیں ادا نہیں کر سکے گی، اس طرح حضرت موسیٰؑ نے مجھ کو بارگاہ رب العزت میں واپس کیا اور ان میں سے کچھ نمازیں (یعنی دس نمازیں) کم کردی گئیں، میں پھر حضرت موسیٰ کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا کچھ حصہ معاف کر دیا ہے، حضرت موسیٰ نے کہا: اپنے پروردگار کے پاس پھر جاؤ، کیونکہ تمہاری امت اتنی نمازیں ادا کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھے گی۔

میں پھر واپس گیا، چنانچہ ان میں سے کچھ اور نمازیں کم کردی گئیں، اس کے بعد پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ پھر اپنے پروردگار کے پاس جاؤ، کیونکہ تمہاری امت اتنی نمازیں ادا کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھے گی، چنانچہ میں پھر گیا، پس پروردگار نے فرمایا کہ فرض تو یہ پانچ نمازیں ہیں لیکن (اجر وثواب کے اعتبار سے) پچاس نمازوں کے برابر ہیں، میرا قول تبدیل نہیں ہوتا، میں حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا (اور ان کو بتایا تو) انہوں نے پھر مجھ کو بارگاہِ رب العزت میں واپس جانے کا مشورہ دیا، لیکن میں نے کہا کہ اب مجھ کو اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے، اس کے بعد (آپؐ نے فرمایا) مجھ

کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا جس پر اس طرح کے رنگ چھائے ہوئے تھے جن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز تھی، اس کے بعد مجھ کو جنت میں پہنچایا گیا وہاں میں نے موتیوں کے گنبد دیکھے اور یہ بھی دیکھا کہ جنت کی مٹی مشک تھی" (صحیح البخاری، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء ج ۱ ص ۷۸، ۷۹، مشکوٰۃ المصابیح، باب فی المعراج ص ۵۲۹)

فائدہ:

سفر معراج کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ اس سلسلہ میں روایات بظاہر مختلف ومتعارض منقول ہیں، بعض روایتوں میں حطیم، بعض میں حجر کا ذکر ہے (جیسا کہ آنے والی احادیث سے معلوم ہوگا) اور بعض روایتوں میں شعب ابی طالب کا ذکر ہے اور بعض روایتوں میں یہ مذکور ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کو لینے آئے تو اس وقت آپ حضرت ام ھانی رضی اللہ عنہا کے مکان میں بستر استراحت پر آرام فرما رہے تھے اور یہی روایت زیادہ مشہور ہے، ان تمام روایتوں میں بہترین تطبیق وہ ہے جو صاحب فتح الباری نے لکھی ہے، یعنی اس شب میں کہ اسراء اور معراج کا واقعہ پیش آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ھانی رضی اللہ عنہا کے مکان میں سوئے ہوئے تھے جو شعب ابی طالب میں واقع تھا، چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام مکان کی چھت پھاڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور آپ کو جگا کر مسجد حرام میں خانہ کعبہ کے پاس لائے جہاں حطیم او حجر ہے، آپ حطیم میں لیٹ گئے اور چونکہ نیند کا اثر باقی تھا، اس لیے آپ وہاں پھر سو گئے، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پھر آپ کو جگایا اور شق صدر کے مراحل سے گزرنے کے بعد آپ کو مسجد حرام کے دروازہ پر لائے جہاں آپ کو براق پر سوار کر کے مسجد لے جایا گیا، پس اسراء اور معراج کے سفر کی ابتداء دراصل حضرت ام ھانی رضی اللہ عنہا کے گھر سے ہوئی جس کو آپؐ نے "اپنا گھر" اس اعتبار سے فرمایا کہ آپ اس شب میں اسی گھر میں مقیم تھے۔

"اور سینہ کو بند کر دیا" اس شق صدر کے سلسلہ میں وضاحت اگلی حدیث کے تحت آرہی ہے۔

وہاں حدیث کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے قلبِ مبارک کو سونے کے طشت میں دھویا گیا اور اس کے بعد علم وایمان سے بھرا گیا، لیکن یہاں حدیث کے الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے سینہ مبارک کو زمزم کے پانی سے دھویا گیا اور پھر ایمان وحکمت سے بھرا ہوا سونے کا طشت لایا گیا اور اس کو سینہ مبارک میں الٹ دیا گیا، تاہم ان دونوں میں کوئی زیادہ تضاد نہیں ہے، صورتِ واقعہ کی ترتیب یہ تھی کہ آپؐ کے سینۂ مبارک کو چاک کیا گیا، پھر قلبِ مبارک نکال کر اس کو زمزم کے پانی سے دھویا گیا اور پھر ایمان وحکمت سے بھرا ہوا طشت لایا گیا اور اس ایمان وحکمت کو آپؐ کے قلبِ مبارک میں بھر دیا گیا۔

''میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور مجھے آسمان کی طرف لے چلے۔'' یہاں نہ تو براق لائے جانے اور اس پر آنحضرت ﷺ کو سوار کرنے کا ذکر ہے اور نہ مسجد اقصیٰ میں لے جانے کا ذکر ہے، اسی بناء پر بعض حضرات نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اسراء اور معراج دو واقعہ الگ الگ واقعہ ہیں اور دونوں واقعے الگ الگ شب میں پیش آئے۔ نیز براق کی سواری اسراء کی شب میں تھی جبکہ معراج کی شب میں سیڑھی کے ذریعہ آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

''اور یہ لوگ جو ان کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں ان کی اولاد کی روحیں ہیں۔'' اس جملہ کے تحت شارحین نے لکھا ہے کہ چونکہ منقول یہ ہے کہ مومنوں کی روحیں تو ''علیین'' میں چین کرتی ہیں اور کافروں کی روحیں ''سجین'' میں محبوس ہیں۔ لہٰذا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ سب روحیں ایک مقام میں (یعنی آسمان پر حضرت آدمؑ کے دائیں بائیں) کیسے جمع ہوئیں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ شاید ایک وقت معین میں یہ روحیں حضرت آدم کے سامنے پیش ہوتی ہوں گی اور آنحضرت ﷺ جب آسمانِ دنیا پر پہنچے اور حضرت آدمؑ سے ملاقات ہوئی تو وہی وقت تھا جب تمام روحیں حضرت آدمؑ کے سامنے پیش تھیں۔ اور یہ

احتمال بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں حضرت آدمؑ کے دائیں بائیں جو روحیں دیکھی تھیں وہ ان لوگوں کی تھیں جو اس وقت تک دنیا میں پیدا نہیں ہوئے تھے اور وہ روحیں اپنے اپنے اجسام میں نہیں گئی تھیں، اور ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے رہنے کی جگہ حضرت آدمؑ کے دائیں بائیں ہو، نیز حضرت آدمؑ ان روحوں کا انجام جانتے تھے کہ جو روحیں دائیں جانب ہیں وہ دنیا میں اچھے عقائد واعمال اختیار کر کے جنت میں جائیں گی اور جو روحیں بائیں طرف ہیں وہ دنیا میں برے عقائد واعمال اختیار کر کے دوزخ میں جائیں گی۔

متعارض روایات میں تطبیق:

''اور حضرت ابراہیمؑ سے چھٹے آسمان پر ملنے کا ذکر کیا'' حضرت ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شب معراج میں حضرت ابراہیم سے آنحضرت ﷺ کی ملاقات چھٹے آسمان پر ہوئی تھی، گویا یہ اس روایت کے مطابق ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسرے راوی حضرت شریک رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔ ان روایتوں کے علاوہ دیگر تمام روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ساتویں آسمان پر ہوئی تھی، اگر یہ کہا جائے کہ معراج کا واقعہ ایک سے زائد مرتبہ پیش آیا تھا تو اس صورت میں ان متضاد روایتوں سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوگا، ہاں اشکال اس وقت پیدا ہوگا جب یہ کہا جائے کہ جسمانی معراج کا واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا تھا، جیسا کہ معتمد ومشہور قول ہے، تو دریں صورت اس اشکال کا جواب یہ ہوگا کہ معراج کے سلسلہ میں سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ صحیح روایت وہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شب معراج میں حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا تو وہ بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے، اور یہ بات کسی اختلاف کے بغیر ثابت ہے کہ بیت المعمور ساتویں آسمان پر ہے، علاوہ ازیں یہاں راوی نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ تمام آسمانوں پر پہنچے اور وہاں حضرت آدمؑ اور حضرت ادریسؑ وغیرہ سے ملاقات کا ذکر فرمایا، لیکن ان کے منازل ومقامات کو بیان نہیں فرمایا، اس سے یہ خود ثابت ہو جاتا ہے کہ راجح اور زیادہ قابل اعتماد روایت وہی قرار پائے گی جس میں ہر نبی

ﷺ اور رسولؐ کے بارے میں وضاحت کے ساتھ ذکر ہے کہ کس نبی سے کس آسمان پر ملاقات ہوئی۔

حاصل یہ کہ آسمانوں کے تعین اور انبیاء سے ملاقات کے بارے میں احادیث کے الفاظ میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ اختلاف راویوں کے اشتباہ کی وجہ سے ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کو چھٹے آسمان پر بھی دیکھا ہو اور ساتویں آسمان پر بھی، اس لیے کسی روایت میں چھٹے آسمان پر ملاقات کو بیان کیا گیا، اور کسی روایت میں ساتویں آسمان پر ملاقات کا ذکر ہے۔

''جہاں قلموں کے لکھنے کی آوازیں آرہی تھیں'' یہ مقامِ صریف الاقلام کا ذکر ہے۔ ''صریف الاقلام'' قلم کی اس آواز کو کہتے ہیں جو لکھنے کے وقت پیدا ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو اور عروج حاصل ہوا تو آپ اس بلند مقام پر پہنچے جہاں قضا وقدر کے قلم مشغولِ کتابت تھے، ملائکۃ اللہ امورِ الٰہی کی کتابت اور احکامِ خداوندی کو لوحِ محفوظ سے نقل کرنے میں مصروف تھے، کتابت اور قلم سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی اسکو آپؐ نے سنا۔ بعض علماء محققین نے حدیث کے اس جملے کی وضاحت میں لکھا ہے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اس عروج کے دوران میں اس مقام تک لے جایا گیا جہاں رفعت ومرتبہ کے سبب اس جگہ تک پہنچنا بھی نصیب ہوا جو کائنات کے نظامِ قدرت، احکامِ خداوندی کے صدور اور مخلوق کے تمام خدائی نظم ونسق بلاتشبیہ وتمثیل مرکزی مقام ہے۔

اس طرح اس جگہ پر پہنچ کر گویا مجھ پر کائنات سے متعلق نظامِ قدرت کے رموز کا انکشاف ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ ﷺ سے پہلے کسی اور کو پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ رہی یہ بات کہ وہ قلم کیسے تھے اور ان کی شکل وصورت کیا تھی تو اس کا علم اللہ اور اللہ کے رسول کے سوا کسی کو نہیں۔ اس بارہ میں تحقیق وجستجو بیکار ہے، ویسے قلم کی حقیقت کے بارے میں اتنا بتادینا ضروری ہے کہ وہ اس چیز کا نام ہے جس سے نقوش وحروف پیدا ہوں اور اس کی حقیقت وحیثیت کچھ بھی ہوسکتی ہے، کسی دھات کا ہو ہولڈر یا نب وغیرہ قلم کی حقیقت میں داخل نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے یہاں قلم کی وضاحت میں تاویل کا طریقہ اختیار کیا ہے اور اس کے ظاہری معنی مراد نہیں لیے، لیکن یہ غیر مناسب بات ہے، خالص اعتقادی نقطہ نظر سے تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، قلم کو اس کے ظاہر معنی پر ہی محمول کیا جائے اور وجودِ قلم کا عقیدہ رکھنا چاہیے اور یہ کہ اس قلم کی حقیقت و کیفیت کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

''میرا قول تبدیل نہیں ہوتا'' ان الفاظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ میں نے اجر و ثواب کے اعتبار سے پانچ نمازوں کو پچاس نمازوں کے برابر کر دیا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، اور دوسرے یہ کہ تمہارے بار بار کہنے پر میں نے پچاس نمازوں کی جگہ پانچ نمازیں کر دی ہیں اور اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

''اب مجھ کو اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے۔'' آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی تو پھر اس بارگاہ میں حاضر ہونا اور مزید تخفیف کی درخواست کرنا حیاو شرم کے خلاف ہے، علاوہ ازیں اس بات سے بھی آنحضرت ﷺ کو شرم محسوس ہوئی کہ اب تک اتنی مرتبہ تخفیف کی درخواست لے کر جا چکا ہوں اور ہر مرتبہ رخصتی سلام کر کے واپس آجاتا ہوں اور پھر درخواست لے کر پہنچ جاتا ہوں، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے حضرت موسیٰ سے صاف کہہ دیا کہ اب میں تخفیف کی درخواست لے کر نہیں جاؤں گا۔

''وہاں میں نے موتیوں کے گنبد دیکھے'' صحیح مسلم کی ایک روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ میں جنت کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک ایک نہر دیکھی جس کے دو کناروں پر مجوف موتیوں کے گنبد تھے۔

''جنت کی مٹی مشک تھی'' یعنی جنت کی مٹی سے ایسی خوشبو پھوٹ رہی تھی جیسے مشک مہک رہی ہو یا یہ کہ جنت کی جو مٹی ہے وہ دراصل مشک ہے اور اس کی خوشبو اتنی زیادہ ہے کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ جنت کی خوشبو کی لپٹ پانچ سو سال کی مسافت کی دوری تک پہنچتی ہے۔ (مظاہر حق: ج۵ ص ۴۴۲ تا ۴۴۵)

''صلوٰۃ'' کے لغوی وشرعی معنی کی تحقیق

لغت میں '' صلوٰۃ'' دُعا کو کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا لغوی معنی ''تعظیم'' ہے۔ (مجمع البحار ج ۳ ص ۳۴۷)اور اصطلاح شریعت میں '' صلوٰۃ'' چند مخصوص اقوال وافعال کو کہتے ہیں جن کی ابتداء تکبیر سے اور انتہاء سلام پر ہوتی ہے۔

'' صلوٰۃ'' کے مادۂ اشتقاق کے بارہ میں کئی اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔

(۱) امام نووی رحمہ اللہ نے'' شرح صحیح مسلم ''میں کہا ہے کہ'' صلوٰۃ'' کا مادّۂ اشتقاق'' صلوین '' ہے جو سرین کی دونوں ہڈیوں کو کہتے ہیں، چونکہ نماز میں ان دونوں ہڈیوں کو رکوع وسجود کے وقت زیادہ حرکت ہوتی ہے اس لیے اس مناسبت سے نماز کو ''صلوٰۃ'' کہا گیا ہے۔

(۲) بعض حضرات کہتے ہیں کہ'' صلوٰۃ'' کا لفظ مصلّی سے مشتق ہے، مُصلّی اس گھوڑے کو کہا جاتا ہے جو گھوڑ دوڑ میں دوسرے نمبر پر ہوتا ہے، اور اس کو مصلّی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس گھوڑے کا سر اپنے آگے والے گھوڑے کے سرین پر ہوتا ہے اور یہ بتایا ہی جا چکا ہے کہ سرین کی دونوں ہڈیوں کو صَلَوین کہا جاتا ہے۔

(۳) عوارف میں مذکور ہے کہ''صلوٰۃ'' کا لفظ دراصل صَلْیٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ٹیڑھی لکڑی کو آگ سے سینک کر سیدھا کرنا۔ چنانچہ نماز کو'' صلوٰۃ''اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کے مزاج میں نفس لمّارہ کی وجہ سے ٹیڑھا پن ہے لہٰذا جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو خداوند قدوس کی عظمت وبزرگی کی گرمی، جو اس عبادت میں انتہائی قرب خداوندی کی بناء پر حاصل ہوتی ہے، اس کے ٹیڑھے پن کو ختم کر دیتی ہے، گویا مصلّی (نمازی) اس مادّۂ اشتقاق کی رو سے اپنے نفس امّارہ کو عظمت خداوندی اور ہیبت ربانی کی تپش سے سینکنے والا ہوا۔

لہٰذا جو شخص نماز کی حرارت سے سینکا گیا اور اس کا ٹیڑھا پن نماز کی وجہ سے دور کیا گیا تو اس کو آخرت کی آگ یعنی آتش دوزخ سے سینکنے کی ضرورت نہیں رہے گی، کیونکہ خدا

کی ذات سے امید ہے کہ وہ اپنے اس بندے کو جس نے دنیا میں نماز کی پابندی کی اور کوئی ایسا فعل نہ کیا جو عذاب خداوندی کا موجب ہو تو اسے جہنم کی آگ میں نہ ڈالا جائے گا۔

(۴) امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''صلوٰۃ'' کے معنی دعا، تبریک اور تمجید کے ہیں۔ نماز کو صلوٰۃ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ ان امور کو شامل ہوتی ہے، گویا وہ از قسم تسمیۃ الشیء باسم البعض (کسی چیز کو اس نام سے پکارنا جو اس کے حصہ کا ہے) ہے۔ (مفردات القرآن)

(۵) بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ ''صلوٰۃ'' کی اصل ''صِلاءٌ'' (ایندھن، آگ) ہے، اسی سے صَلَّی الرَّجُلُ (آدمی نے آگ کو اپنے نفس سے دور کیا) فعل ماخوذ ہے، جیسے کہ مَرَّضَ کے معنی ہیں، اس نے اپنے نفس سے مرض کو دور کیا، چونکہ صلوٰۃ آتش دوزخ سے بچاتی ہے اسی لیے اسے ''صلوٰۃ'' کہا گیا۔

اس لغوی و اصطلاحی تعریف کے بعد یہ بات سمجھ لیجئے کہ نماز اسلام کا وہ عظیم رکن اور ستون ہے جس کی اہمیت و عظمت کے بارہ میں امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کا یہ تاثر منقول ہے کہ: ''جب نماز کا وقت آتا تو ان کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا، لوگوں نے پوچھا کہ ''امیر المؤمنین! آپ کی یہ کیا حالت ہے؟'' فرماتے کہ: ''اب اس امانت کے ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، پہاڑوں اور زمین پر پیش فرمایا تھا اور وہ سب اس امانت کے لینے سے ڈر گئے اور انکار کر دیا''۔ (احیاء علوم الدین)

نماز کی تاکید اور اس کے فضائل سے قرآن مجید کے مبارک صفحات مالا مال ہیں، نماز کو ادا کرنے اور اس کی پابندی کرنے کیلئے جس سختی سے حکم دیا گیا ہے وہ خود اس عبادت کی اہمیت و فضیلت کی دلیل ہے، ایمان کے بعد شریعت مطہرہ نے سب سے زیادہ نماز ہی پر زور دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی یہ چند آیتیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا''۔ ''بے شک نماز ایمان والوں پر وقت وقت سے فرض ہے''۔

(۲) ''حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ والصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی''۔ ''نمازوں کی خصوصاً درمیانی

نماز (عصر) کی پابندی کرو"۔

(۳) "اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ"۔ "بیشک نیکیاں برائیوں کو معاف کرادیتی ہیں"۔

(۴) "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ"۔ "بیشک نماز برے اور خراب کاموں سے انسان کو بچاتی ہے"۔

بہرحال! نماز ایک ایسی محبوب اور پسندیدہ عبادت ہے جس کی برکتوں اور سعادتوں سے خداوند کریم نے کسی بھی پیغمبر کی شریعت کو محروم نہیں رکھا ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخرالزمان سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام رسولوں کی امت پر نماز فرض تھی۔

ہاں البتہ نماز کی کیفیت اور تعینات میں ہر امت کیلئے تغیر ہوتا رہا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر ابتداء رسالت میں دو وقت کی نماز فرض تھی۔ ایک آفتاب کے نکلنے سے قبل اور ایک آفتاب ڈوبنے سے قبل، ہجرت سے ڈیڑھ برس پہلے جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں حق تعالیٰ مجدہ کی قربت حقیقی کا عظیم وافضل ترین شرف واعزاز پایا تو اس مقدس اور باسعادت موقع پر پانچ وقت کی نماز کا عظیم واشرف ترین تحفہ بھی عنایت فرمایا گیا، چنانچہ، فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء، ان پانچ وقتوں کی نماز کا فریضہ صرف اسی امت کی امتیازی خصوصیت ہے، اگلی امتوں پر صرف فجر کی نماز فرض تھی، نیز کسی پر ظہر کی اور کسی پر عصر کی۔

اسلام کی تمام عبادات میں صرف نماز ہی وہ عبادت ہے جس کو سب سے افضل اور اعلیٰ مقام حاصل ہے، چنانچہ اس پر اتفاق ہے کہ "نماز" اسلام کا رکن اعظم ہے، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اسلام کا دارومدار اسی عبادت پر ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

ہر مسلمان عاقل بالغ پر ہر روز پانچ وقت نماز فرض عین ہے، امیر ہو یا فقیر، تندرست ہو یا مریض اور مقیم ہو یا مسافر، ہر ایک کو پانچوں وقت ان آداب وشرائط اور طریقوں کے ساتھ جو خدا اور خدا کے رسولؐ نے نماز کے سلسلہ میں بتائے ہیں، خدا کے

دربار میں حاضری دینا اور خداوند قدوس کی عظمت و بڑائی اور اپنی بے کسی ولاچاری اور عجز وانکساری کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے، یہاں تک کہ جب میدان کارزار میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں اور عورت سب سے زیادہ اور شدید ترین تکلیف دردزہ میں مبتلا ہوتب بھی نماز کا چھوڑنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کی ادائیگی میں دیر کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر کسی عورت کے بچہ کی پیدائش کے وقت بچہ کا کوئی جز ونصف سے کم اس کے خاص حصہ سے باہر آگیا ہو خواہ خون نکلا ہو یا نہ نکلا ہو اس وقت بھی اس کو نماز پڑھنے کا حکم ہے اور نماز میں توقف (تاخیر) کرنا جائز نہیں ہے۔ (مظاهر حق ج ۱ ص ۴۱۵)

امام العصر علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''ہر وہ عبادت جس میں مخلوق کی طرف سے خالق کی عظمت اور اپنی عاجزی و بیچارگی اور خشیت کا اظہار ہو اسے ''صلوٰۃ'' کہیں گے، اس معنی کے اعتبار سے ''صلوٰۃ' تمام مخلوق کا وظیفہ بندگی قرار پائے گا، اگر چہ اس کی صورتیں مختلف ہوں، ہر چیز کی ''صلوٰۃ'' اس کے مناسب حال ہوگی، اسی طرف اشارہ ہے اس آیت کریمہ میں: ''كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ''۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سجدہ تمام مخلوق میں مشترک ہے، لیکن ہر چیز کے سجدہ کرنے کا انداز اپنی حالت کے مطابق ہے، سایہ کا زمین پر پڑنا اور گھٹنا بڑھنا ہی اس کا سجدہ ہے: ''وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ''۔ اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ پچھلی امتوں کی نمازوں میں رکوع تھا یا نہیں؟ بعضوں نے مسند ابی یعلیٰ کی ایک روایت کی بناء پر انکار کیا ہے اور بعضوں نے وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ سے استدلال کرتے ہوئے اس کا اثبات کیا ہے، میں نے ایک عیسائی کی کتاب میں دیکھا ہے کہ ان کے ہاں منفرد کی نماز بصورت سجدہ اور جماعت کی بصورت رکوع ہے اور یہودیوں کی نماز کھڑے ہوکر (قیام) ہے اور بعض حالتوں میں سجدہ میں پڑکر، تاہم صف بندی کا التزام اس امت کے خصائص میں سے ہے۔

(فیض الباری شرح صحیح البخاری ج ۲ ص ۲)

حقیقت یہ ہے کہ دین کا مفہوم اور اصل مقصود اللہ تبارک وتعالیٰ کی کامل اطاعت وفرماں برداری ہے اور نماز کا ہر قول اور عمل اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے، مثلاً جب تم دونوں

ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہتے ہو تو تم زبان سے اس کا اقرار اور دل میں اس کا شعور پیدا کرتے ہو کہ عظمت و کبریائی اللہ ہی کیلئے ہے۔اس کا حکم سب کے حکموں سے بالا اور اس کی اطاعت ہر طاقت کی اطاعت سے مقدم ہے، پھر جب تم سورۂ فاتحہ پڑھتے ہو تو تمام محامد کا منبع اسی کی ذات والا صفات کو قرار دیتے ہو، سب جہانوں کا پالنہار، رحم و کرم کا دریائے ناپیدا کنار، روز جزا کا مالک ومختار اسی کو تسلیم کرتے ہو، پھر عہد کرتے ہو کہ تمہاری عبادت واستعانت اسی کیلئے مخصوص ہے، تمہارا سر اسی کی چوکھٹ پر جھک سکتا ہے اور تمہارا ہاتھ اس کے آگے پھیل سکتا ہے، پھر ہزار عجز وانکسار کے ساتھ تم اس سے التجاء کرتے ہو کہ وہ تمہیں دین کی وہ سیدھی اور صاف راہ دکھائے جس پر چل کر تم سے پہلے اس کے نیک بندے مستحق انعام واکرام واجر وثواب ہوئے اور باطل کے اس ٹیڑھے راستے سے بچائے جس پر پڑ کر تم سے پہلے اس کے نافرمان بندے مستوجب عتاب وعذاب ہوئے، وغیرہ ذلک۔

کیا جو شخص دن میں پانچ مرتبہ اس عبادت کو اس کی اصل حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے ادا کرے وہ خداوند قدوس کی نافرمانی کر سکتا ہے؟ ملت سے غداری کر سکتا ہے؟ اس کے بندوں کے حقوق تلف کر سکتا ہے؟ زنا کاری، شراب خواری، قمار بازی جیسے فواحش اور ظلم، بددیانتی، سرقہ، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹنگ، اور رشوت ستانی جیسے منکرات اس سے سرزد ہو سکتے ہیں؟! یہی وہ نماز ہے جس کے متعلق رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''کہ نماز اس صاف وشفاف چشمہ کی طرح ہے جو کسی کے گھر کے سامنے بہہ رہا ہو'' کیا جو شخص اس چشمہ میں دن میں پانچ مرتبہ نہائے اس کے بدن پر کسی قسم کا میل رہ سکتا ہے؟''۔

افسوس آج ہمارا دین محض رسوم وروایات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور ان رسوم وظواہر پر عمل کرنے والے بھی بہت تھوڑے ہیں۔

بر زباں تسبیح و در دل گاؤخر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

(بحوالہ قاموس القرآن ص ۳۱۷، ۳۱۸ اختصاراً)

جو شخص نماز کی فرضیت سے انکار کرے وہ کافر ہے اور اس کو ترک کرنے والا گناہ

کبیرہ کا مرتکب اور فاسق وفاجر ہے، بلکہ بعض جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم مثلاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نماز ترک کرنے والے کو کافر قرار دیتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ نماز ترک کرنے کو گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اگر چہ اس کے کفر کے قائل نہیں تاہم ان کے نزدیک بھی نماز ترک کرنے والے کیلئے سخت تعزیر ہے۔

فائدہ: ''اس کا عرش پانی پر تھا'' اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ عرش اور پانی کی تخلیق، زمین وآسمان کی تخلیق سے پہلے ہوئی ہے، نیز شروع میں عرش کے نیچے پانی کے علاوہ زمین وآسمان کی کوئی بھی چیز نہیں تھی، پس ''عرش کا پانی پر ہونے'' کا مطلب یہ ہے کہ عرش اور پانی کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی، یہ مطلب نہیں ہے کہ عرش، پانی کی سطح پر قائم تھا، نیز اس پانی سے مراد وہ پانی نہیں ہے جو سمندروں اور دریاؤں میں موجود ہے بلکہ عرش کے نیچے کا وہ پانی قدرت اور مشیت الٰہی کا مظہر کوئی اور ہی پانی تھا۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ جملہ کی تشریح میں لکھا ہے کہ ''عرش پانی پر تھا، پانی ہوا کی پشت پر تھا، اور ہوا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے قائم تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور پانی کی تخلیق، زمین وآسمان کی تخلیق سے پہلے ہوئی ہے، بعض حضرات کے نزدیک ''پانی'' سے مراد قلم ہے، نیز اس میں ان لوگوں کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عالم میں سب سے پہلے پانی کو پیدا کیا ہے، پھر اس پانی سے دیگر اجسام کو ایجاد کیا۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا گیا اس بارہ میں روایات مختلف ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ نور پیدا کیا گیا جس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تخلیق ہوئی، پھر پانی کو پیدا کیا گیا اور اس کے بعد عرش کو پیدا کیا گیا ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۱۴۶)

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ عرش اور پانی کی تخلیق زمین وآسمان سے پہلے ہوئی، پھر اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پانی سے اس طرح پیدا فرمایا کہ پانی پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ موجیں مارنے لگا اور اس میں زبردست اتھل پتھل ہوئی جس کے سبب سے اس میں

جھاگ پیدا ہوا اور وہ جھاگ جمع ہو کر اس جگہ قائم ہوا جہاں خانہ کعبہ ہے اور اس طرح زمین کا سب سے پہلا ٹکڑا عالم وجود میں آیا، اور پھر اسی ٹکڑے سے چاروں طرف زمین پھیلائی گئی اور اس کائنات کا تختۂ ارض قائم ہوا۔ پھر اس تختۂ ارض پر پہاڑوں کو پیدا کیا گیا تاکہ زمین ہلنے اور ڈولنے نہ پائے اور پہاڑوں کے دباؤ سے ساکن اور جامد رہے، اور جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ، سب سے پہلے جو پہاڑ پیدا کیا گیا وہ جبلِ ابو قُبَیْس ہے، نیز اس پانی میں تموج اور اضطراب سے دھوئیں کی شکل میں جو بخارات اوپر کی طرف بلند ہوئے ان سے آسمان پیدا ہوئے۔ (مظاهر حق ج ۵ ص ۲۶۰)

(۱۱۵) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضرت مالک ابن صعصعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراء اور معراج کی رات کے احوال وواردات کی تفصیل صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیان کرتے ہوئے فرمایا'' اس رات میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا، اور بعض موقعوں پر آپ نے ''حِجر'' میں لیٹنے کا ذکر فرمایا کہ اچانک آنے والا فرشتہ میرے پاس آیا اور اس نے یہاں سے یہاں تک کے حصے کو چاک کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد گردن کے گڑھے سے زیر ناف بالوں تک کا پورا حصہ تھا۔ میرے دل کو نکالا، اس کے بعد میرے سامنے سونے کا ایک طشت لایا گیا، جو ایمان سے بھرا ہوا تھا اور اس میں میرے دل کو دھویا گیا، پھر دل میں بھری گئی اور پھر دل کو سینے میں اس کی جگہ رکھ دیا گیا۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ میرے پیٹ کو زمزم کے پانی سے دھویا گیا اور پھر اس میں ایمان وحکمت بھرا گیا اس کے بعد سواری کا ایک جانور لایا گیا، جو خچر سے نیچا اور گدھے سے اونچا تھا، یہ جانور سفید رنگ کا تھا۔ اور اس کا نام براق تھا، جہاں تک اس کی نظر جاتی تھی وہاں تک ایک قدم بڑھاتا تھا۔ مجھے اس پر سوار کیا گیا۔ اور جبرائیل مجھے لے کر چلے یہاں تک کہ میں آسمان دنیا، پر پہنچا جبرائیل نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو پوچھا گیا کہ کون ہے؟ جبرائیل نے کہا: میں جبرائیل ہوں پھر پوچھا گیا: اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبرائیل نے جواب دیا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کے بعد سوال کیا گیا! ان کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرائیل نے جواب دیا: بلائے ہوئے آئے ہیں۔ تب ان

فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں آنے والے کو آنا مبارک ہو۔ اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا۔ اور جب میں آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت آدمؑ سامنے کھڑے ہیں، جبرائیلؑ نے کہا: یہ تمہارے باپ آدمؑ ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے حضرت آدمؑ کو سلام کیا، انہوں نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: میں نیک بخت بیٹے اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس کے بعد جبرائیل مجھ کو لے کر دوسرے آسمان پر آئے، انہوں نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو پوچھا گیا کون ہے؟ جبرائیل نے کہا: میں جبرائیل ہوں، پھر پوچھا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد ﷺ ہیں، پھر سوال کیا گیا، ان کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرائیلؑ نے کہا: ہاں، تب (دربان) فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو، اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا، اور جب میں آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کھڑے ہیں جو ایک دوسرے کے خالہ زاد بھائی تھے، جبرائیل نے کہا، یحییٰ اور عیسیٰؑ ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے دونوں کو سلام کیا اور دونوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا، نیک بخت بھائی اور پیغمبر صالح کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں، اس کے بعد جبرائیل مجھ کو لے کر اوپر چلے اور تیسرے آسمان پر آئے، انہوں نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو پوچھا گیا کون ہے؟ جبرائیلؑ نے کہا میں جبرائیل ہوں، پھر پوچھا گیا، تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا، محمد ﷺ ہیں، پھر سوال کیا گیا ان کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرائیلؑ نے کہا: ہاں، تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو، اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں تیسرے آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت یوسفؑ سامنے کھڑے ہیں، جبرائیل نے کہا: یہ یوسفؑ ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: میں نیک بخت اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں، اس کے بعد جبرائیل مجھ کو لے کر اوپر چلے، اور چوتھے آسمان پر آئے، انہوں نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو پوچھا گیا کون ہے؟ جبرائیل نے کہا: میں جبرائیل ہوں، پھر پوچھا گیا، اور تمہارے ساتھ

کون ہے؟ انہوں نے کہا محمدؐ ہیں، پھر پوچھا گیا، ان کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرائیل نے کہا ہاں، تب ان فرشتوں نے کہا، ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو، اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں چوتھے آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ادریسؑ سامنے کھڑے ہیں، جبرائیلؑ نے کہا کہ یہ ادریسؑ ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا، میں نیک بخت بھائی اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں، اس کے بعد جبرائیل مجھ کو لے کر اوراوپر چلے اور پانچویں آسمان پر آئے، انہوں نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا، تو پوچھا گیا کون ہے؟ جبرائیل نے کہا: میں جبرائیل ہوں، پھر پوچھا گیا اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا: محمدؐ ہیں، پھر پوچھا گیا کہ ان کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرائیل نے کہا: ہاں، تب ان فرشتوں نے کہا، ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو، اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں پانچویں آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ہارونؑ سامنے کھڑے ہیں، جبرائیلؑ نے کہا یہ ہارون علیہ السلام ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے ان کو سلام کیا، اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: میں نیک بخت اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں، اس کے بعد جبرائیل مجھ کو لے کر اور اوپر چلے، اور چھٹے آسمان پر آئے اور انہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا: تو پوچھا گیا کہ کون ہے؟ جبرائیل نے کہا میں جبرئیل ہوں، پھر پوچھا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد ﷺ ہیں، پھر سوال کیا گیا، ان کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیل نے کہا، ہاں، تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو، اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا، اور جب میں چھٹے آسمان میں داخل ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت موسیٰ میرے سامنے کھڑے ہیں، جبرائیل نے کہا، یہ موسیٰؑ ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا، میں نیک بخت اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں، اس کے بعد جب میں آگے بڑھا تو حضرت موسیٰ رونے لگے، پوچھا گیا، آپ کیوں روتے ہیں؟ حضرت موسیٰ نے کہا:

ایک نو جوان جس کو میرے بعد رسول بنا کر دنیا میں بھیجا گیا اس کی امت کے لوگ میری امت کے لوگوں سے کہیں زیادہ جنت میں داخل ہوں گے، بہر حال! جبرئیل مجھ کو لے کر اور اوپر چلے اور ساتویں آسمان پر آئے، انہوں نے آسمان کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا، تو پوچھا گیا کہ کون ہے؟ جبرئیل نے کہا: میں جبریلؑ ہوں، پھر پوچھا گیا: اور تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا: محمدؐ ہیں، پھر سوال کیا گیا؟ ان کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجا گیا تھا؟ جبرئیلؑ نے کہا: ہاں، تب ان فرشتوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو خوش آمدید کہتے ہیں، آنے والے کو آنا مبارک ہو، اس کے بعد آسمان کا دروازہ کھولا گیا اور جب میں ساتویں آسمان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ سامنے کھڑے ہیں، جبرئیل نے کہا: یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا: میں نیک بخت بیٹے اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں، اس کے بعد مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا، میں نے دیکھا کہ اس کے پھل مقام ہجر کے مٹکوں کے برابر تھے اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر تھے، جبرئیل نے کہا: یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے، میں نے وہاں چار نہریں دیکھیں، دو نہریں تو باطن کی تھیں اور دو نہریں ظاہر کی تھیں، میں نے پوچھا، جبرئیل! یہ دو طرح کی نہریں کیسی ہیں؟ جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ باطن کی دو نہریں جنت کی ہیں، اور یہ ظاہر کی دو نہریں نیل اور فرات ہیں، پھر مجھ کو بیت المعمور دکھلایا گیا، اور اس کے بعد ایک پیالہ شراب کا، ایک پیالہ دودھ کا اور ایک پیالہ شہد کا میرے سامنے لایا گیا، چنانچہ میں نے دودھ کا پیالہ لے لیا، جبرئیلؑ نے کہا: دودھ فطرت ہے، اور یقیناً تم اور تمہاری امت کے لوگ اسی فطرت پر قائم رہیں گے، اس کے بعد (وہ مقام آیا جہاں) مجھ پر شب و روز میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں، پھر میں واپس ہوا تو حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا تو انہوں نے پوچھا کہ تمہیں کس عبادت کا حکم دیا گیا ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ (ہر شب و روز میں) پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا ہے، حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ تمہاری امت رات دن میں پچاس نمازیں ادا نہیں کر سکے گی، خدا کی قسم! میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں اور بنی اسرائیل کی اصلاح کی سخت ترین کوشش کر چکا ہوں، لہٰذا تم اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ، اور

اپنی امت کے حق میں تخفیف اور آسانی کی درخواست کرو، چنانچہ میں دوبارہ حاضر ہوا تو میرے پروردگار نے دس نمازیں کم کر دیں، میں پھر حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا، لیکن انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا، چنانچہ میں پھر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں کم کر دی گئیں، میں پھر حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا، چنانچہ میں پھر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا اور دس نمازیں کم کر دی گئیں، میں پھر حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا، تو انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا، چنانچہ میں بارہ گاہ خداوندی میں حاضر ہوا اور مجھ کو دس نمازوں کا حکم دیا گیا، میں پھر حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا تو انہوں نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا، چنانچہ میں پھر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا، اور مزید پانچ نمازوں کی تخفیف کر کے مجھ کو ہر شب و روز میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا گیا، میں پھر حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا تو انہوں نے پوچھا اب تمہیں کیا حکم ملا ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ اب مجھے رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت موسیٰؑ نے کہا حقیقت یہ ہے کہ تمہاری امت کے (اکثر) لوگ رات دن میں پانچ نمازیں بھی نہیں پڑھ پائیں گے، حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں، اور بنی اسرائیل کی اصلاح کی سخت کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں، لہٰذا تم پھر اپنے پروردگار کے پاس جاؤ اور اپنی امت کے لیے تخفیف کی درخواست کرو، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں بار بار اپنے پروردگار سے تخفیف کی درخواست کر چکا ہوں، اب مجھ کو شرم آتی ہے، میں اپنے پروردگار کے اس حکم کو قبول کرتا ہوں اور (یہ معاملہ اس کے) سپرد کرتا ہوں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو یہ ندائے غیبی آئی، میں نے اپنے فرض کو جاری کیا اور پھر اپنے بندوں کے حق میں تخفیف کر دی۔" (متفق علیه، وسنن النسائی، کتاب الصلوٰة، ج ۱ ص ۲۱۷، مشکوٰة المصابیح، باب فی المعراج ص ۵۲۶)

فائدہ:

"حطیم" خانہ کعبہ کی شمالی دیوار سے ڈیڑھ دو گز کے فاصلے پر ایک ہلالی شکل کی

دیوار ہے، اس دیوار کے اندر کا حصہ حطیم کہلاتا ہے اور حِجر (حؔ کی زیر کے ساتھ) بھی اسی حطیم کو کہا جاتا تھا۔ یہ اصلاً خانہ کعبہ کا حصہ ہے، معراج کی رات میں جبکہ حضرت جبرائیلؑ آپ ﷺ کو لینے کے لئے آئے آپ اس جگہ استراحت فرماتے تھے۔

''یہاں سے یہاں تک کے حصہ کو چاک کیا'' شقِ صدر کا یہ واقعہ اس واقعہ کے علاوہ ہے جو بچپن میں پیش آیا تھا، اس وقت (بچپن میں) آپ کے سینہ مبارک کے چاک کیے جانے کا مقصد آپ کے اندر سے وہ مادہ نکالنا تھا جس کے ذریعے انسان کو گمراہ کرنے کا موقع شیطان کو ملتا ہے، یا جس کے سبب خود انسان کا نفس گمراہی اور برائی میں مبتلا ہوتا ہے، اور اس موقع پر شق صدر کا مقصد آپؐ کے قلبِ مبارک میں علم و معرفت کا کمال بھرنا تھا۔

''سونے کا ایک طشت لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا'' یہ کنایہ اور تمثیل کے طور پر کہا گیا ہے۔ یا یہ کہ ایمان کو ظاہری جسم دے کر واقعتہً اس طشت میں بھر دیا گیا، جیسا کہ قیامت کے دن اعمال کو مجسّم کیا جائے گا تا کہ ان کو میزانِ عمل میں تولا جا سکے۔

''اس کا نام بُراق تھا'' آنحضرت ﷺ کی سواری کے لیے مخصوص اس جانور کا نام ''براق'' اس مناسبت سے رکھا گیا کہ وہ برق (بجلی) کی طرح تیز رفتار اور روشنی کی طرح چمکدار تھا، اس کی تیز رفتاری کے بارے میں جو یہ فرمایا کہ اس کا ایک قدم حدِ نظر پر پڑتا تھا تو اس سے بعض حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ وہ بُراق ایک ہی قدم میں آسمان پر پہنچ گیا ہوگا۔ کیونکہ زمین سے اس کی حدِ نظر آسمان ہی تھا، اس اعتبار سے ساتویں آسمان تک وہ سات قدموں میں پہنچا ہوگا۔ اس براق کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ بُراق تمام انبیاء کی سواری کے لیے متعین تھا اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہر نبی کے لیے اس کی حیثیت و مرتبہ کے مطابق الگ الگ براق تھے۔ جیسا کہ آخرت میں ہر نبی کے لیے اس کے مرتبہ و مقام کے مطابق الگ الگ حوض بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ حدیث کے اس جملہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ براق آنحضرت ﷺ کی سواری کے لیے مخصوص و متعین تھا۔ (لمعات التنقیح، مرقات المفاتیح)

''مجھے اس پر سوار کیا گیا'' اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس بُراق پر

آنحضرت ﷺ کا سوار ہونا محض اللہ تعالیٰ کی مدد اور قدرت سے ممکن ہوا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے اپنی قوتِ ملکیت کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کو اس براق پر سوار کرایا تھا، اور یہ بات بعید از امکان اس لیے نہیں ہوسکتی کہ آنحضرتؐ پر وحی اترنے اور آپؐ تک فیضِ الٰہی پہنچنے کا اصل ذریعہ حضرت جبرئیلؑ ہی تھے اور اس سفر معراج میں بھی ان کی حیثیت اس رفیق سفر اور خادم کی تھی جس کا مقصد ہر طرح کی راحت و مدد پہنچانا ہوتا ہے، چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت جبریلؑ نے آنحضرت ﷺ کی رکاب پکڑ رکھی تھی اور میکائیلؑ، براق کی باگ تھامے ہوئے تھے۔

معراج کے وقت آپؐ براق پر سوار تھے یا سیڑھی کے ذریعہ عروج ہوا

''یہاں تک کہ میں آسمان دنیا پر پہنچا''۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ براق کی سواری ہی کے ذریعہ آسمان میں داخل ہوئے، نیز جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ معراج کا واقعہ اس شب سے الگ ایک دوسری شب میں پیش آیا تھا جس میں صرف اسراء یعنی بیت المقدس تک کا سفر پیش آیا تھا اور جس کو "لیلۃ الاسراء'' کہا جاتا ہے وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس روایت میں بیت المقدس تک کے سفر کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ مسجدِ حرام سے براق پر سوار ہو کر روانہ ہونے کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اسراء یعنی بیت المقدس تک کا سفر ایک دوسری شب میں پیش آیا تھا، اور اس حدیث میں جس شب کا ذکر کیا جا رہا ہے اس میں صرف معراج پیش آئی تھی، معراج کا وقت جب آپؐ آسمان پر تشریف لے گئے تو براق پر سوار تھے یا سیڑھی کے ذریعے عروج وصعود فرمایا؟ اس میں بھی علماء کے مختلف اقوال ہیں، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ براق پر سوار ہو کر آپ ﷺ آسمان پر تشریف لے گئے، جبکہ دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان تک آپ ﷺ کا عروج وصعود سیڑھی کے ذریعہ ہوا، چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایتوں کے اس اختلاف کو دور کرنے کے لیے لکھا ہے کہ یہاں اس روایت میں راوی نے اختصار سے کام لیا ہے، اور واقعہ کی تفصیل ذکر کرنے کے بجائے

اجمال پر اکتفاء کیا گیا، تفصیلی روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ براق پر سوار ہو کر بیت المقدس پہنچے اور آپ نے براق کو اس حلقہ سے باندھ دیا جس سے انبیائے کرامؑ اپنے براقوں کو باندھتے تھے، بیت المقدس کے مشاغل سے فارغ ہو کر آپ نے آسمان کی طرف عروج وصعود فرمایا، اور یہ عین ممکن ہے کہ سیڑھی کے ذریعہ آپؐ آسمان پر تشریف لے گئے ہوں اور براق بدستور مسجد اقصیٰ کے دروازہ پر بندھا رہا ہو۔ پس راوی نے اس درمیانی تفصیل کو حذف کر کے بس آسمان پر پہنچنے کا ذکر کر دیا اور یہ بھی ممکن ہے آپ براق پر سوار ہو کر ہی سیڑھی کے ذریعہ آسمان پر تشریف لے گئے ہوں، جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے، اس وضاحت کی روشنی میں تمام روایات متفق ہو جاتی ہیں۔(مرقاۃ المفاتیح)

''پوچھا گیا کہ کون ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ آسمان میں حقیقۃً دروازے ہیں اور ان دروازوں پر دربان مقرر ہیں۔ نیز کہا جاتا ہے کہ وہ دروازے بیت المقدس کے محاذات میں ہیں، حدیث کے اس جملہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کسی کے گھر جا کر دروازے پر آواز یا دستک دی جائے اور گھر کے اندر سے پوچھا جائے کہ کون ہے؟ تو اس کے جواب میں صرف یہ نہ کہا جائے کہ ''میں ہوں'' جیسا کہ عام طور پر لوگوں کی عادت ہے۔ اور اس کی ممانعت بھی منقول ہے، بلکہ اپنا نام لے کر جواب دیا جائے مثلاً یوں کہا جائے ''میں حسان ہوں''۔

آپ ﷺ کو سلام میں سبقت کا حکم کیوں دیا گیا؟

''ان کو سلام کرو''؟ اس جملہ کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ حضرت جبریلؑ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو سلام میں سبقت کا حکم اظہار تواضع وشفقت کی تعلیم کے طور پر تھا، کیونکہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ کو عالی مرتبہ ومقام حاصل ہوا تھا جس سے بلند وبرتر مرتبہ ومقام کا تصور بھی کسی اور کے لیے نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا آپؐ پر لازم تھا کہ تواضع وانکساری اور شفقت ومحبت کا اظہار کریں اور اسلام میں سبقت اس کا بہترین ذریعہ تھا، نیز بعض حضرات (امام تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ ان

انبیائے کرامؑ کے پاس سے گزر رہے تھے اور اس اعتبار سے آپؐ اس شخص کے حکم میں تھے جو کھڑا ہوا اور انبیائے کرامؑ اپنی اپنی جگہ پر پہلے سے موجود برقرار تھے، اور اس اعتبار سے وہ اس شخص کے حکم میں تھے جو بیٹھا ہوا ہو۔ اور اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کھڑا ہوا اور ایک شخص بیٹھا ہوا ہو تو کھڑا ہوا شخص پہلے سلام کرے، اگرچہ وہ بیٹھے ہوئے شخص سے افضل ہو، لہٰذا ان انبیائے کرامؑ کو آنحضرت ﷺ کا پہلے سلام کرنا اس اشکال کو لازم نہیں کرتا کہ آنحضرت ﷺ چونکہ تمام انبیاءؑ سے افضل ہیں، اس لیے سلام میں آپ ﷺ کو سبقت کا حکم کیوں دیا گیا؟

''میں نیک بخت بیٹے اور پیغمبر صالح کو خوش آمدید کہتا ہوں'' نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام بلکہ حدیث میں مذکور تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے آپ ﷺ کا استقبال کرتے ہوئے آپؐ کی مدح وتعریف میں ''صلاح'' یعنی نیک بختی کا ذکر کیا، اس سے معلوم ہوا کہ نیک بختی وہ عظیم مرتبہ اور بلند ترین مقام ہے جو تمام انسانی واخلاقی خوبیوں اور بھلائیوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ صالح یعنی نیک بخت وہ شخص ہے جو اللہ اور اللہ کے بندوں کے تمام لازمی حقوق کی ادائیگی پر عامل وقائم ہو۔

نیز اللہ تعالیٰ نے بھی قرآنِ مجید میں انبیاء کا اصل وصف ''صلاح'' ہی بیان کیا ہے: جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَكُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ'' ''وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِيْنَ''

''اس کی امت کے لوگ میری امت کے لوگوں سے کہیں زیادہ جنت میں داخل ہوں گے''

ایک اشکال اور اس کا جواب

اس جملہ کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے رونے کا جو یہ سبب بیان کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی امت کی فضیلت کی بناء پر حضرت موسیٰؑ کے دل میں حسد جیسی کوئی چیز تھی، کیونکہ حسد اور جلن تو وہ بُرا جذبہ ہے جس سے عام مومنین کو بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور اس جہاں (آخرت) میں تو معمولی درجہ کے اہل ایمان کے دلوں میں سے بھی یہ بُرا جذبہ نکال باہر کیا جائے گا، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ

حضرت موسیٰ جیسی عظیم ہستی اس بُرے جذبے میں مبتلا ہوتی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا برگزیدہ بنایا، منصبِ نبوت پر فائز کیا اور شرفِ تکلم سے سرفراز فرمایا؟ لہٰذا کہا جائے گا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰؑ کا رونا اس حسرت و افسوس کے سبب تھا کہ ان کی امت کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی مخالفت کر کے اور نافرمانی کے راستہ پر جمے رہ کر اپنی مجموعی اور ملی حیثیت کو زبردست نقصان پہنچایا، جس کا اثر یہ ہوا کہ خود حضرت موسیٰؑ کا وہ اجر و انعام جاتا رہا جس سے ان کے مراتب و درجات کی ترقی کا راستہ کھلا رہتا، اس طرح ان کی امت کے لوگوں نے خود اپنا ہی نقصان نہیں کیا، بلکہ اپنے پیغمبر (حضرت موسیٰؑ) کے اجر و ثواب کے نقصان کا سبب بھی بنے، کیونکہ ہر پیغمبر کو اس شخص کا ثواب ملتا ہے جو اس کی متابعت کرتا ہے اور جن لوگوں کو خود اجر و ثواب نہ ملتا ہو وہ اپنے پیغمبر کے اجر و ثواب میں اضافہ و ترقی کا باعث کیسے بن سکتے ہیں؟ جو ایک طرح سے اس پیغمبرؑ کے حق میں نقصان ہے، پس قومِ موسیٰ کی سرکشی اور نافرمانی سے حضرت موسیٰ کو ملنے والا یہ اجر و ثواب جاتا رہا، اس کے برخلاف جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور آپؐ کے ان بلند مراتب و درجات کو دیکھا جو آپ کی امت کی اطاعت و فرمانبرداری کے سبب آپ کو ملنے والے تھے تو وہ اپنے اجر و ثواب کی محرومی پر ازراہِ تأسف رو پڑے۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کا رونا دراصل اپنی قوم کی قابلِ رحم حالت پر حسرت و افسوس اور شفقت و محبت کا بے ساختہ اظہار تھا، جب انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو میری امت کے لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی عمریں دیں، مضبوط قُویٰ سے نوازا، کارگاہِ حیات میں زیادہ طویل عرصہ تک مصروفِ عمل رہنے کا موقع دیا، لیکن انہوں نے نہ تو میری اتباع سے وہ فائدہ اٹھایا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لوگ چھوٹی چھوٹی عمریں اور کمزور قویٰ رکھنے کے باوجود اپنے پیغمبر کی اتباع کی صورت میں اٹھائیں گے اور نہ میری امت کے لوگ اس کثرت کو پہنچ سکے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لوگوں کو نصیب ہوگی تو اس شفقت کے تحت کہ جو کسی بھی دوسرے تعلق اور رشتہ سے کہیں زیادہ اپنی امت کے تئیں ایک پیغمبر کے دل میں ہوتی ہے، حضرت موسیٰؑ رونے لگے، ان کا خیال تھا یہ ایک ایسی

مبارک ساعت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا دریائے رحم وکرم جوش میں ہے، شاید اللہ تعالیٰ اس مبارک ساعت کی برکت سے اس وقت میری امت پر بھی رحم فرمادے اور ان کے ساتھ وہ سخت معاملہ نہ کرے جس کے وہ مستوجب ہو چکے ہیں۔

اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰ ؑ کے رونے کا مقصد ہمارے حضرت ﷺ کے دل کو خوش کرنا تھا، یعنی انہوں نے آنحضرت ؐ کے سامنے زبانِ حال سے گویا یہ اعتراف واظہار کیا کہ آپ کے تابعداروں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی اور جنت میں جتنے لوگ دوسری امتوں کے داخل ہوں گے ان میں سب سے زیادہ آپ کے امتی جنت میں جائیں گے۔

واضح رہے کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ ؑ نے یہ جو کہا کہ ’’ایک نوجوان جس کو میرے بعد رسول بنا کر دنیا میں بھیجا گیا‘‘ ’’الخ‘‘ اس سے آنحضرت ﷺ کی حقارت یا توہین مقصود نہیں تھی، بلکہ یہ جملہ (جس میں غلام کا لفظ استعمال ہوا) اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت اور کمالِ کرم پر اظہارِ تعجب کے طور پر تھا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کہتے ہیں کہ: پروردگار کی قدرت کی بڑائی کے کیا کہنے!

اس نے اس نوجوان کو اس چھوٹی سی عمر میں وہ مرتبہ وفضل عطا فرمایا جو پہلے نبیوں اور رسولوں کو بڑی بڑی عمروں میں بھی نصیب نہیں ہوا (شرح الطیبی)، اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ’’غلام‘‘ (نوجوان) کا لفظ آنحضرت ﷺ کی عمر کے اعتبار سے ہی استعمال کیا ہو، کیونکہ اس وقت انبیائے کرام ؑ کی ان عمروں کی بہ نسبت کہ جو وہ دنیا میں گزار کر آئے تھے اور پھر جتنا طویل عرصہ ان کو عالمِ برزخ میں گزارتے ہوگیا تھا، آنحضرت ﷺ کی عمر یقیناً بہت چھوٹی تھی اور ان کے سامنے آپ ؐ بالکل نوعمر تھے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

آسمانوں میں جن انبیائے کرام ؑ سے آنحضرت ﷺ کی ملاقات کرائی گئی وہ جسم وروح کے ساتھ وہاں موجود تھے یا ان کی موجودگی محض روحانی تھی؟ اگر وہ جسم وروح کے

ساتھ وہاں موجود تھے تو پھر یہ اشکال لازم آتا ہے کہ ان کے اجسام تو قبروں میں ہیں۔ آسمانوں میں ان کی موجودگی کیسے تھی؟ اس سلسلہ میں علماء نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ ان انبیائے کرامؑ کے اجسام اصلیہ تو قبروں میں ہی رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو اجسامِ مثالیہ کے ساتھ متمثل کر کے آپؐ کی ملاقات کے لئے جمع کیا، البتہ آپؐ نے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر جسمِ اصلی کے ساتھ دیکھا، کیونکہ وہ اسی جسم کے ساتھ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے، اسی طرح حضرت ادریسؑ کو جسمِ اصلی کے ساتھ دیکھا کہ وہ بھی زندہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔

یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے اعزاز واکرام کے لیے ان انبیائے کرامؑ کو مع اجسام عنصریہ کے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور آسمانوں میں جمع کیا، اس طرح آنحضرت ﷺ نے تمام ہی انبیاء کو ان کے اجسامِ اصلی کے ساتھ دیکھا، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آگے کچھ محال نہیں تھا کہ ایک شب کے لیے ان انبیاء کے اجسامِ عنصریہ ان کی قبروں سے بیت المقدس اور پھر آسمانوں پر جمع کیے گئے، اور پھر ان کو ان کی قبروں میں واپس کر دیا۔

آسمانوں پر انبیاءؑ سے ملاقات میں حکمت:

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آسمانوں میں ان ہی چند حضرات انبیاء کو آنحضرت ﷺ کی ملاقات کیلئے کیوں مخصوص کیا گیا اور یہ کہ انبیاء میں سے ہر نبیؑ کو ایک آسمان کے ساتھ کس سبب سے مخصوص کیا گیا اور اس میں کیا حکمت تھی؟ اس بارے میں علماء نے یہ لکھا ہے کہ ان ہی چند حضرات انبیاءؑ سے آنحضرت ﷺ کی ملاقات کرانے اور ان میں سے ہر نبی کو تفاوت و درجات کی ترتیب سے ایک ایک آسمان کے ساتھ مخصوص کرنے میں ان خاص حالات کی طرف اشارہ مقصود تھا جو حضور ﷺ کو بعد میں وقتاً فوقتاً پیش آئے۔ چنانچہ پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرت آدمؑ ہی سب سے پہلے نبی ہیں۔ اور ہر انسان کے پہلے باپ ہیں، اس لئے سب سے پہلے ان ہی سے ملاقات کرائی گئی

اور اس ملاقات میں ہجرت کی طرف اشارہ تھا کہ جس طرح حضرت آدمؑ نے اپنے دشمن ابلیس کی وجہ سے آسمان اور جنت سے زمین کی طرف ہجرت فرمائی اسی طرح آپؐ بھی اپنے دشمن کی وجہ سے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائیں گے، اور حضرت آدمؑ کی طرح آپؐ کو بھی وطن مالوف کی مفارقت طبعاً شاق ہوگی۔ دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰؑ سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ تمام انبیائے میں جس نبی سے آنحضرت ﷺ کو سب سے زیادہ زمانی قرب حاصل ہے وہ حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ نیز حضرت عیسیٰؑ اخیر زمانے میں دجال کے قتل کے لئے آسمان سے اتریں گے اور امتِ محمدیہ میں ایک مجدد ہونے کی حیثیت سے شریعت محمدیہ کو جاری فرمائیں گے اور قیامت کے دن تمام لوگوں کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں وہی حاضر ہوں گے اور آپ سے شفاعت کی درخواست کریں گے۔ ان وجوہ سے حضرت عیسیٰؑ سے ملاقات کرائی گئی اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حضرت یحییٰؑ کی معیت محض ان کی نسبی قرابت کی وجہ سے تھی۔

تیسرے آسمان پر حضرتِ یوسفؑ سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ کے بعد آنحضرت ﷺ کو حضرت یوسفؑ کے ساتھ اس بناء پر سب سے زیادہ مخصوص قرب حاصل ہے کہ جب آنحضرتؐ کی امت جنت میں داخل ہوگی تو حضرتِ یوسفؑ کی شکل وصورت کے حسن وجمال کی حامل ہوگی۔ نیز اس ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ حضرت یوسفؑ کی طرح آپ ﷺ کو بھی اپنے خاندانی بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں سے سخت تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں گی اور بالآخر آپؐ ان پر غالب آکر ان سے در گزر فرمائیں گے۔

چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کے بارے میں فرمایا: وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا اور چونکہ ساتوں آسمانوں میں معتدل اور درمیانہ چوتھا آسمان ہی ہے اس لیے ان کو چوتھے آسمان پر رکھا گیا۔ نیز اس ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ آنحضرت ﷺ سلاطین عالم کو دعوت اسلام کے خطوط روانہ فرمائیں گے، کیونکہ خط وکتابت کے اول موجد حضرت ادریسؑ ہی ہیں۔

پانچویں آسمان پر حضرت ہارونؑ سے ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ کے بھائی ہونے کی حیثیت سے ان سے بہت قریب بھی تھے اور دعوتِ حق کے راستے میں ان کے معتمد اور مددگار بھی، اس اعتبار سے ان کو حضرت موسیٰؑ کے آسمان سے قریب پانچویں آسمان پر رکھا گیا۔ اور ان کے اوپر چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ کو رکھا گیا۔ کیونکہ وہ کلیم اللہ کی فضیلت رکھنے کے سبب دوسرے نبیوں سے اوپر چھٹے آسمان ہی سے موزونیت رکھتے تھے۔ نیز اس ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ ملک شام میں جبارین سے جہاد وقتال کے لئے گئے اور ان کو اللہ نے فتح دی، اسی طرح آنحضرتؐ بھی دشمنانِ دین سے جہاد وقتال کے لئے ملک شام میں داخل ہوں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ شام میں غزوہ تبوک کے لئے تشریف لے گئے اور دومۃ الجندل کے رئیس نے جزیہ دے کر صلح کی درخواست پیش کی جسے آنحضرت ﷺ نے منظور فرمالیا، اور جس طرح ملک شام حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت یوشع کے ہاتھ پر فتح ہوا، اسی طرح حضورِ اکرم ﷺ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر پورا مُلکِ شام فتح ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل ہیں، اس اعتبار سے ہمارے نبی ﷺ کے بعد تمام نبیوں میں وہ سب سے افضل واشرف ہیں، لہٰذا ان کو تمام انبیائے کرامؑ کے اوپر ساتویں آسمان پر رکھا گیا، حضرت ابراہیمؑ چونکہ بانی کعبہ بھی ہیں، اس لیے اس آخری ملاقات میں اس طرف اشارہ تھا کہ آنحضرت ﷺ وفات سے پہلے حج بیت اللہ فرمائیں گے اور آخر کار مکہ معظمہ آپ کے ہاتھوں فتح ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہاں یہ احتمال ہے کہ اس شب میں آسمان پر تمام انبیائے کرامؑ کو جمع کرنے کے بجائے ان چند مخصوص انبیاء کو جمع کرنا کافی سمجھا گیا ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ باقی تمام انبیاءؑ بھی جمع کئے گئے ہوں اور اس موقع پر وہ سب اپنی اپنی حیثیت اور مقام کے مطابق آسمانوں میں موجود ہوں، لیکن ذکر میں صرف ان مخصوص اور مشہور انبیاءؑ کے اسماء گرامی پر اکتفا کیا گیا ہو اور ”باقی انبیاءؑ کے ذکر کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی ہو۔

''اس کے بعد مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا'' سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ایک بیری کا درخت ہے جس کی جڑ چھٹے آسمان میں ہے، سدرہ کے معنی بیر کے درخت کے ہیں اور منتھیٰ کے معنی ہیں، وہ جگہ جہاں پر ہر چیز پہنچ کر رک جاتی ہے، چنانچہ زمین سے بھی جو چیز اوپر جاتی ہے وہ سدرۃ المنتہیٰ پر جا کر منتہی ہو جاتی ہے اور پھر اوپر اٹھائی جاتی ہے، اس طرح ملاء اعلیٰ سے جو چیز اترتی ہے وہ سدرۃ المنتہیٰ پر آکر ٹھہر جاتی ہے، پھر نیچے لائی جاتی ہے، یہ وہ مقام ہے جس کے آگے فرشتے بھی نہیں جا سکتے، یہ سعادت صرف ہمارے نبی ﷺ کو حاصل ہوئی کہ آپؐ اس مقام سے بھی آگے تشریف لے گئے، آپؐ کے علاوہ اور کوئی اس مقام سے آگے نہیں گیا۔

''اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر تھے'' سدرۃ المنتہیٰ کے پھلوں کو بڑے بڑے مٹکوں کے برابر اور اس کے پتوں کو ہاتھی کے کانوں کے برابر کہنا عوام کو سمجھانے اور قیاس عقل میں لانے کیلئے ہے، حقیقت یہ ہے کہ لفظی طور پر نہ تو خود اس درخت کی لمبائی موٹائی حد حصر میں آسکتی ہے اور نہ اس کے پھل اور پتوں کے بڑے پن کا کوئی ٹھیک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''جبریل نے کہا: یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے'' حضرت جبریلؑ کا یہ کہنا یا تو آنحضرت ﷺ کو اس مقام سے متعارف کرانا اور اس بات کی مبارک باد دینا تھا کہ آپ ﷺ اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جو تمام خلائق کے علم و عقل کا منتہیٰ ہے اور جس کے آگے آپ ﷺ کے علاوہ اور کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ یا پھر حضرت جبرئیلؑ کے اس کہنے کا مقصد یہ عذر بیان کرنا تھا کہ اب وہ مقام آ گیا ہے جس کے آگے مجھے بھی جانے کی اجازت اور تاب نہیں ہے۔ اس لیے میں یہاں سے آگے آپؐ کی رفاقت و مصاحبت میں نہیں رہ سکوں گا۔

''یہ باطن کی دو نہریں جنت کی ہیں'' اس کے بارے میں امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جنت کی ان دونوں نہروں میں سے ایک نہر تو سلسبیل تھی اور دوسری نہر کوثر تھی۔ نیز ان دونوں نہروں کو ''باطن'' (پوشیدہ) اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ جنت میں بہتی ہیں، وہاں سے باہر نہیں نکلتیں۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ جنت کی ان نہروں کو ''باطن'' اس اعتبار

سے کہا گیا ہے کہ عقل وخرد ان کے اوصاف وخصوصیات کی حقیقت اور کنہ کا ادراک نہیں کر سکتی۔

''اور یہ ظاہر کی دونہریں نیل اور فرات ہیں'' اس کے بارے میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نہروں سے مراد مصر کا دریائے نیل اور عراق کا دریائے فرات ہے۔ جن کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ یہ دونوں اصل میں سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے نکل کر زمین تک آئے ہیں۔ اور روئے زمین کے ان علاقوں میں بہتے ہیں۔ اور بعض علماء لکھتے ہیں کہ ان دونوں نہروں کو نیل اور فرات سے تعبیر کرنا یا تو تشبیہ اور استعارہ کے طور پر ہے کہ دریائے نیل اور دریائے فرات کا پانی شیرینی، لطافت اور فوائد ومنافع کے اعتبار سے جنت کے پانی کے مشابہ ہے اور یا پھر محض اسمی اشتراک ہے کہ جیسے زمین کے دو دریاؤں کے نام نیل اور فرات ہیں ایسے ہی جنت کی دونہروں کے نام بھی نیل اور فرات ہیں۔

''پھر مجھ کو بیت المعمور دکھلایا گیا'' بیت المعمور بھی اللہ کا گھر ہے، جو قبلہء ملائک ہے، اور ساتویں آسمان پر واقع ہے، اس کا محلِ وقوع ٹھیک خانہء کعبہ کے محاذات میں ہے، اس کا تفصیلی ذکر آگے حدیث میں آرہا ہے۔

''دودھ فطرت ہے الخ'' فطرت سے مراد دین اسلام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی پیدائش اور خلقت کی بنیاد بنایا ہے، دودھ اور فطرت (دین اسلام) میں مماثلت اور مناسبت یہ ہے کہ جس طرح دین اسلام انسان کی روحانی اور اعتقادی تخلیق کی خشتِ اول ہے، اسی طرح دودھ انسان کی جسمانی پرورش اور اٹھان کا بنیادی عنصر ہے۔ یہ دودھ ہی ہوتا ہے جس سے آدمی کی پیدائش ہوتے ہی پرورش شروع ہوجاتی ہے اور پھر دودھ میں جو فطری خوبیاں لطافت وپاکیزگی، شیرینی ومنفعت اور خوشگواری ہے اس سے دینِ فطرت کو بہت مناسبت حاصل ہے، اسی لیے عالمِ بالا میں دین اور علم کی مثال دودھ کو قرار دیا گیا ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ وہ دودھ پی رہا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اس شخص کو دین اور علم سے حصہ وافر اور بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔

''تم اور تمہاری امت کے لوگ اسی فطرت پر رہیں گے'' یہ حضرت جبریلؑ کی

طرف سے بشارت اور خوشخبری تھی کہ آپ ؐ نے چونکہ دودھ کے پیالہ کو اختیار فرمایا، اس لیے ثابت ہوگیا کہ آپ ؐ اور آپ ؐ کی امت کے لوگ دین وعلم کی راہ پر گامزن رہیں گے۔ اور دودھ کے مقابلہ میں شراب ہے جو ہر برائی کی جڑ بتائی گئی ہے اور آپ ؐ نے اس کو ترک کر کے گویا اپنی امت کے لوگوں کو بالعموم برائی کے راستہ پر جانے سے روک دیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے یہ بھی کہا تھا: اگر آپ شراب کا پیالہ لے لیتے تو پھر آپ ؐ کی امت میں فتنہ وفساد کی جڑ پڑ جاتی ہے۔

واضح رہے کہ معراج کا واقعہ جس زمانہ کا ہے اس وقت شراب پینا مباح تھا، خصوصاً شرابِ جنت جو آپ ؐ کو اس موقع پر پیش کی گئی، اس کی حیثیت جداگانہ تھی، لیکن اس کے باوجود عالمِ بالا میں جس چیز کو برائی اور خرابی کی مثال قرار دیا گیا وہ شراب ہی ہے، اب رہ گئی شہد کی بات، تو اگرچہ شہد بھی ایک لطیف اور پاکیزہ چیز ہے اور اس کو شفاء کا ذریعہ بھی بتایا گیا ہے، لیکن اس کی لطافت وپاکیزگی اور خوشگواری چونکہ دودھ سے بڑھ کر نہیں، بلکہ اس سے کم ہی ہے اور اس کی حیثیت بھی دودھ کی بہ نسبت غیر اہم ہے اس لیے آپ ﷺ نے دودھ کے مقابلہ میں شہد کو بھی ترجیح نہیں دی۔

نیز اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ چیزوں کے پیالے آپ کے سامنے اس وقت پیش کیے گئے جب آپ ﷺ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تھے جبکہ آگے آنے والی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پیالے آپ ﷺ کے سامنے بیت المقدس میں پیش کیے گئے، لہٰذا علماء نے لکھا ہے کہ یہ پیالے آپ کے سامنے دو مرتبہ پیش کیے گئے تھے، ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ میں نماز سے فارغ ہونے کے بعد، اس وقت صرف دو پیالے پیش کیے گئے، ایک دودھ کا اور ایک شراب کا، جیسا کہ اگلی حدیث میں مذکور ہے اور دوسری مرتبہ آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تین پیالے پیش کیے گئے تھے، جن میں ایک دودھ کا، ایک شہد کا اور ایک شراب کا تھا۔

''تم اپنے پروردگار کے پاس جاؤ اور اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کرو'' اس جملہ کے تحت امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا آنحضرت ﷺ کو

بار بار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھیجنا اور ان کے مشورہ پر آنحضرت ﷺ کا اللہ تعالیٰ سے تخفیف کی درخواست کرنا، اس بات کی علامت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمازوں کی فرضیت کا جو ابتدائی حکم صادر ہوا ہے وہ وجوب قطعی کے طور پر نہیں ہے، اس میں تبدیلی کی گنجائش موجود ہے۔ اگر حضرت موسیٰؑ کو یہ بات معلوم نہ ہوتی تو وہ بار بار تخفیف کی درخواست کا مشورہ نہ دیتے۔ نیز آنحضرت ﷺ کی طرف سے بار بار درخواست پیش کرنا اور ہر بار درخواست کا منظور ہو جانا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پہلا حکم وجوب قطعی کے طور پر نہ تھا، کیونکہ جو حکم وجوب قطعی کے طور پر جاری ہوتا ہے اس میں تخفیف کی گنجائش نہیں ہوتی۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ (صاحب مرقاۃ المفاتیح) نے اس قول کو امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ: تخفیف کی درخواست کرنا اصل میں علامت ہی اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم وجوب کے طور پر تھا، کیونکہ جو چیز واجب نہ ہو اس میں تخفیف کی درخواست کی ضرورت پیش نہیں آتی، (یعنی علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بات وزن دار نہیں ہے)، لہٰذا اس سلسلہ میں صحیح بات وہی ہے جو بعض علماء نے نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے پچاس نمازوں کی فرضیت کا حکم دیا تھا، پھر اپنے بندوں کے حال پر رحم کرتے ہوئے تخفیف کی درخواست قبول فرمائی اور پچاس نمازوں کے حکم کو منسوخ کرکے پانچ نمازوں کا حکم جاری فرمایا۔ جیسا کہ اور بعض احکام میں بھی منسوخی یا تبدیلی کا عمل ہوا ہے۔

(مظاہر حق ج ۵ ص ۴۲۷ تا ص ۴۳۴)

(۱۱۶) حضرت ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ (تابعی) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے سامنے براق لایا گیا جو ایک سفید رنگ کا دراز جانور تھا، گدھے سے اونچا اور خچر سے نیچا تھا۔ جہاں تک اس کی نگاہ جاتی تھی وہاں اس کا ایک قدم ، اس پر میں سوار ہوا اور بیت المقدس میں آیا اور میں نے اس براق کو اس حلقہ سے دیا جس سے انبیاءؑ باندھتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل اور دو رکعت نماز پڑھی، پھر میں مسجد سے باہر آیا تو جبریلؑ میرے سامنے ایک پیالہ شراب

کا اور ایک پیالہ دودھ کا لائے، میں نے دودھ کا پیالہ لے لیا تو جبریلؑ نے کہا: آپ ﷺ نے فطرت کو اختیار کر لیا اور پھر ہمیں آسمان کی طرف چڑھایا۔ اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حدیث کا وہی مضمون بیان کرتے ہوئے جو سابق حدیث میں گزرا، فرمایا کہ (آنحضور ﷺ نے فرمایا) میں نے حضرت آدم کو دیکھا۔ انہوں نے مجھ کو مرحبا کہا اور میرے لیے دعائے خیر کی، پھر آپ ﷺ نے تیسرے آسمان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہاں میں نے حضرت یوسفؑ کو دیکھا جن کو آدھا حسن عطا کیا گیا تھا۔ انہوں نے بھی مجھ کو مرحبا کہا اور میرے لیے دعائے خیر کی، راوی نے حضرت موسیٰؑ کے رونے کا ذکر نہیں کیا (جیسا کہ سابق حدیث میں تھا) اور آنحضرت ﷺ نے ساتویں آسمان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہاں میں نے حضرت ابراہیم کو دیکھا جو بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے۔ اور بیت المعمور میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جن کو دوبارہ داخل ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے بعد مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لے جایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر اور اس کے پھل مٹکوں کے برابر تھے، پھر جب سدرۃ المنتہیٰ کو اللہ کے حکم سے ڈھانکنے والی چیز نے ڈھک دیا تو اس کی حالت بدل گئی اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس کی خوبی کو بیان نہیں کر سکتا، پھر اللہ تعالیٰ نے جو وحی چاہی میری طرف بھیجی، پھر مجھ پر دن رات میں پچاس نمازیں فرض کی گئیں، پھر میں اس بلند مقام سے نیچے اترا اور حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارے پروردگار نے تمہاری امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا، دن رات میں پچاس نمازیں، حضرت موسیٰؑ نے کہا: اپنے پروردگار کے پاس جاؤ اور تخفیف کی درخواست کرو، کیونکہ تمہاری امت اتنی طاقت نہیں رکھتی، میں بنی اسرائیل کو آزما کر اور ان کا امتحان لے کر پہلے دیکھ چکا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں بارگاہ خداوندی میں پھر حاضر ہوا اور کہا، میرے پروردگار! میری امت کے حق میں آسانی فرما دیجئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے حق میں پانچ نمازیں کم کر دیں، پھر میں حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ میری درخواست پر پانچ نمازیں کم کر دی گئی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا، تمہاری امت اتنی طاقت نہیں رکھتی، تم پھر اپنے

پروردگار کے پاس جاؤ اور مزید تخفیف کی درخواست کرو، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں اسی طرح اپنے پروردگار اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان آتا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ پروردگار نے فرمایا: اے محمدؐ! رات دن میں فرض تو یہ پانچ نمازیں ہیں لیکن ان میں سے ہر نماز کا ثواب دس نمازوں کے برابر ہے، اس طرح یہ پانچ نمازیں اجروثواب میں پچاس نمازوں کے برابر ہیں۔ جس شخص نے نیکی کا ارادہ کیا اور اس کو پورا نہ کرسکا تو اس کے حساب میں ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر ارادے کے بعد اس نے اس نیکی کو کرلیا تو اس کے حساب میں وہ نیکی دس گنا لکھی جاتی ہے اور جس شخص نے برے کام کا ارادہ کیا اور پھر اس برے کام کو نہ کرسکا تو اس کے حساب میں وہ برائی نہیں لکھی جائے گی اور اگر اس نے اپنے ارادے کے مطابق اس برے کام کو کرلیا تو اس کے حساب میں وہی ایک برائی لکھی جائے گی۔

پھر میں بارگاہِ خداوندی سے نیچے واپس آیا اور حضرت موسیٰؑ کو صورتحال بتائی تو انہوں نے پھر وہی مشورہ دیا کہ اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ اور تخفیف کی درخواست کرو، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا: میں بار بار اپنے پروردگار کے پاس جاچکا ہوں، اب مجھ کو اس کے پاس جاتے شرم آتی ہے‘‘۔

(صحیح مسلم، باب الاسراء برسول اللّٰہ وفرض الصلوات، ج ۲ ص ۵۴ حاشیہ القسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب فی المعراج ص ۵۲۸)

فائدہ:

’’پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا‘‘ اس جملہ کے تحت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اسراء یعنی مسجد اقصیٰ تک کے سفر پر تمام علماء کا اتفاق ہے اور کسی نے اس کی واقعیت سے اختلاف نہیں کیا، البتہ مسجد اقصیٰ سے آسمان تک کے سفر یعنی معراج میں معتزلہ نے اختلاف کیا ہے اور ان کا یہ اختلاف بھی علمائے قدیم (حکماء حمقاء) کے اس نظریہ کو ماننے کی وجہ سے ہے کہ آسمان میں خرق والتیام محال ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

''اور دو رکعت نماز پڑھی'' یہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں تھیں جو آپ ﷺ نے مسجد اقصیٰ میں داخل ہونے کے بعد پڑھیں، اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ اس نماز کا ذکر ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے امامت فرمائی اور دوسرے انبیاء کرامؑ نے جن کو آنحضرت کے اعزاز میں بیت المقدس میں جمع کیا گیا تھا، آپ ﷺ کی اقتداء کی تھی، راوی نے اس موقع پر آنحضرت ﷺ کی امامت کا ذکر یا تو اختصار کے پیش نظر نہیں کیا یا وہ اس حصہ کو ذکر کرنا بھول گئے۔(مرقاۃ المفاتیح)

''جبریلؑ میرے سامنے ایک پیالہ شراب کا اور ایک پیالہ دودھ کا لائے'' ممکن ہے کہ راوی نے یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف دو پیالوں کا ذکر کیا، اور تیسرے پیالے یعنی شہد کے پیالہ کے ذکر کی ضرورت نہ سمجھی، جیسا کہ سابق حدیث میں بیان ہوا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسجدِ اقصیٰ میں تو آپ ﷺ کے سامنے دو پیالے یعنی ایک پیالہ شراب کا اور ایک پیالہ دودھ کا لایا گیا تھا اور آسمان پر تین پیالے پیش کئے گئے جن میں ایک پیالہ شہد کا بھی تھا۔

''پھر ہمیں آسمان کی طرف چڑھایا'' یہاں پر لفظ عَرَجَ عین اور راء کے فتح (زبر) کے ساتھ ہے، جیسا کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، اس صورت میں عرج کا فاعل یا تو حضرت جبریلؑ ہوں گے یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے چونکہ اس کے بعد ''بِنا'' کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اس لیے عَرَج کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اور جبریلؑ کو اوپر آسمان تک پہنچایا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''بِنَا'' کا لفظ محض اظہارِ تعظیم کے لیے ہو تو اس صورت میں عَرَجَ کا فاعل حضرت جبریلؑ ہی ٹھہریں گے۔

نیز ایک نسخہ میں ''عُرِجَ'' کا لفظ بصیغہ مجہول نقل ہوا ہے، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ پھر ہمیں اوپر آسمان تک لے جایا گیا۔''

''حضرت یوسفؑ کو دیکھا جن کو آدھا حُسن عطا کیا گیا تھا'' آدھے حُسن سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں زیادہ صحیح اور تحقیقی قول یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گویا یہ ظاہر

فرمایا کہ حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں جتنا حسن و جمال تمام لوگوں میں تھا اس کا آدھا حصہ تنہا حضرت یوسفؑ کو دیا گیا تھا اور بعض علماء نے اس جملہ کی مراد یہ بیان کی ہے کہ حضرت یوسفؑ کو میرے حسن کا آدھا حصہ عطا کیا گیا، یعنی آنحضرت ﷺ کو جو حسن و جمال عطا کیا گیا تھا اس کا آدھا حصہ حضرت یوسفؑ کو ملا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت یوسفؑ حسن و جمال میں ہمارے نبی ﷺ سے بڑھ کر نہیں تھے بلکہ متعدد علماء محققین نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ، حضرت یوسفؑ سے زیادہ حسن و جمال کے مالک تھے اور اس کی ایک دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بارے میں یہ کہیں منقول نہیں ہے کہ ان کی صورت کے جمال کا عکس آئینہ کی طرح دیوار پر پڑتا ہو اور سامنے کی چیزیں اس میں نظر آتی ہوں، جبکہ ہمارے پیغمبر ﷺ کے بارے میں ثابت ہے کہ آپ کے روئے انور کا جمال اسی درجہ کا تھا، یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس روشن جمال کے ایک بڑے حصہ کو آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں پوشیدہ رکھا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا اور آپ کے رخ روشن کا جمال پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ ریز رہا کرتا تو نہ کسی کو تابِ نظارہ ہوتی اور نہ کسی کو روئے انور کے دیدار کی سعادت حاصل ہو سکتی، حضرت یوسفؑ کا حسن و جمال سب کی نظروں کے سامنے تھا، اس میں کوئی حصہ پوشیدہ نہیں رکھا گیا تھا۔

اس سلسلہ میں شیخ عبدالحق محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری بات لکھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں اور ان کے حسن و جمال کی تعریف میں جو باتیں منقول اور ثابت ہیں ان میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کا حسن و جمال بے مثال تھا۔ جیسا کہ اسی واقعہ معراج سے متعلق ایک روایت میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (اس شب میں ایک ایسے شخص (حضرت یوسفؑ) کو بھی دیکھنا اور ملنا ہوا جو قدرت کی سب سے حسین تخلیق تھی، جس طرح تمام ستاروں میں چاند سب سے زیادہ روشن دکھائی دیتا ہے۔‘‘

لیکن دوسری طرف وہ حدیث بھی ہے جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی نبی اور رسول مبعوث نہیں کیا جو خوب رو اور خوش

آواز نہ ہو اور سب سے زیادہ خوب رو اور خوش آواز تمہارے پیغمبر ﷺ تھے۔"

جہاں تک شب معراج سے متعلق اس حدیث کا تعلق ہے جس کو شیخ عبدالحق محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود اپنی ذات کو الگ کر کے یہ بات فرمائی تھی، یعنی آپ کا مطلب یہ تھا کہ ذات رسالت مآب ﷺ کو چھوڑ کر باقی تمام مخلوقِ خدا میں سب سے زیادہ حسین و جمیل حضرت یوسفؑ تھے، اور اس تاویل کی گنجائش یوں بھی موجود ہے کہ کلام کرنے والا عموماً خطاب میں داخل نہیں ہوتا۔

شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے "شرح شمائلِ ترمذی" میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر کامل ایمان میں سے ایک چیز یہ اعتقاد رکھنا بھی ہے کہ جتنا حسن و جمال آنحضور ﷺ کی ذات اقدس اور ظاہری شکل وصورت کو عطا ہوا اتنا حسن و جمال کسی بھی انسان کی ذات اور ظاہری شکل وصورت کو نہیں دیا گیا، جیسا کہ جتنا فضل و کمال آنحضرت ﷺ کے باطن میں رکھا گیا اتنا فضل وکمال کسی اور انسان کے باطن کو نصیب نہیں ہوا، اور چونکہ کسی انسان کا ظاہر، اس کے باطن کا غماز اور مظہر ہوا کرتا ہے اس لیے جس طرح آپ ﷺ کا باطن بے مثال، اسی طرح آپ ﷺ کا ظاہر بھی بے مثال، نیز آنحضرت ﷺ کے ظاہری و باطنی حسن و جمال کی مدح وتعریف میں بس یہی بات اصول کا درجہ رکھتی ہے کہ مرتبہ الوھیت کے علاوہ فضل وکمال اور جتنے بھی مرتبے اور درجے ہو سکتے ہیں وہ سب آنحضرت ﷺ کے لیے ثابت ہیں، اور آپ ﷺ سے بڑھ کر ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کے برابر بھی کوئی کامل انسان نہ آج تک پیدا ہوا اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہو سکتا ہے۔

اسی حقیقت کو دوسرے انداز میں ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

یا صاحب الجمال ویاسیّد البشر

من وجھک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

"سدرۃ المنتہیٰ کو اللہ کے حکم سے ڈھانکنے والی چیز نے ڈھک دیا" اس بارے

میں مختلف اقوال ہیں کہ کس چیز نے سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھک دیا تھا؟ بعض علماء کہتے ہیں کہ جو بے شمار فرشتے اس سدرۃ المنتہیٰ کو گھیرے ہوئے تھے ان کے پروں کی روشنی اور چمک نے گویا پورے درخت پر نور و جمال کی چادریں ڈال دی تھیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اللہ کے جلال وعظمت کا نور سونے کے پروانوں کی طرح اس پر گر رہا تھا جس کے نیچے پورا درخت چھپ سا گیا تھا۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ سونے کے پتنگے اور پروانے اور دوسری رنگ برنگ کی عجیب وغریب چیزوں نے جن کی حقیقت وکیفیت کوئی نہیں جانتا، سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھک دیا۔ (مرقاۃ المفاتیح)

"پھر اللہ تعالیٰ نے جو وحی چاہی میری طرف بھیجی" یہ وہ موقع تھا جب آنحضرت ﷺ بارگاہِ بے نیاز کے حریمِ قرب میں پہنچے اور نورِ ارض وسماء کے جمال بے مثال کو حجاب کبریائی سے دیکھا اور بلا واسطہ کلامِ خداوندی اور براہ راست وحی الٰہی سے شرف یاب ہوئے، وہ کلام کیا تھا اور اس وحی کے الفاظ کیا تھے؟ یہ ایک رمز ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور ادب واحتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو مبہم اور مجمل ہی رکھا جائے اور اس کی توضیح وتشریح کی جسارت نہ کی جائے۔

ایک تعارض اور اس کا جواب:

"چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے حق میں پانچ نمازیں کم کر دیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پچاس نمازوں میں جو تخفیف ہوئی وہ ہر مرتبہ پانچ پانچ کم ہونے کی صورت میں ہوئی، جبکہ سابق حدیث میں ہر مرتبہ دس دس اور آخر میں پانچ نمازیں کم ہونے کی صورت بیان کی گئی ہے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ یہاں اصل عبارت اس طرح ہو کہ "...........میری امت کے حق میں پانچ اور پھر پانچ نمازیں کم کر دیں۔" گویا ہر دفعہ پانچ پانچ کر کے دس نمازیں کم کی گئی ہیں، اور اس طرح اس کی سابق حدیث سے مطابقت ہو جائے گی۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر مرتبہ پانچ پانچ نمازوں ہی کی تخفیف ہوتی رہی اور سابق حدیث میں طوالت سے بچنے کے لیے ہر مرتبہ پانچ پانچ کا ذکر کرنے کی بجائے دس

دس کا ذکر کر کے کلام میں اختصار سے کام لیا گیا، اس کی تائید اسی حدیث کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ ”(آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ) پھر میں حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا اور ان کو بتایا کہ میری درخواست پر پانچ نمازیں کم کردی گئی ہیں۔“

”اس کے حساب میں وہ نیکی دس گنا لکھی جاتی ہے“ یعنی نیکی تو وہ ایک ہی کرے گا مگر اس کے نامہ اعمال میں اجر و ثواب دس نیکیوں کا لکھا جائے گا، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کی بشارت یوں دی ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا“ یعنی جو کوئی ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو ایسی دس نیکیاں ملیں گی۔“

اور غیرِ حرم میں تضاعف کا یہ سب سے ادنیٰ درجہ ہے، یعنی حرم شریف کے علاوہ دوسری جگہوں پر کیے جانے والے کسی ایک نیک عمل پر جو کئی کئی گنا زیادہ ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے اس میں ”دس گنا“ سب سے ادنیٰ درجہ ہے، چنانچہ دوسری حدیثوں سے ثابت ہے۔ بعض صورتوں میں ایک عمل پر دس گنا سے بھی زائد یہاں تک کہ سات سو گنا تک ثواب ملتا ہے، بلکہ صدقِ دل اور اخلاصِ نیت کی حیثیت و کیفیت کے بقدر سات سو گنا سے بھی زیادہ اجر و ثواب مل سکتا ہے۔

”پھر اس برے کام کو نہ کر سکا تو اس کے حساب میں وہ برائی نہیں لکھی جائے گی“ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی برا کام کرنے کا ارادہ کیا اور پھر کسی وجہ کے بغیر یا کسی ایسے سبب سے کہ جو مباح میں سے ہو، اس نے وہ بُرا کام نہیں کیا تو اس کے نامہء اعمال میں کوئی برائی نہیں لکھی جائے گی، بشرطیکہ وہ ارادہ محض سطحی طور پر پیدا ہوا ہو، دل میں پختگی اور مضبوطی کے ساتھ نہ رہا ہو۔ اور اگر اس نے برے کام کا ایسا ارادہ کیا تھا جو دل میں پختگی اور مضبوطی کے ساتھ تھا اور پھر اس نے وہ برا کام نہیں کیا تو دیکھا جائے گا کہ اس نے پختہ ارادہ کے باوجود وہ برا کام کس وجہ سے نہیں کیا؟ اگر یہ وجہ تھی کہ اس ارادے کے بعد اس کے دل پر خدا کا خوف غالب آگیا اور اس نے محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر اس برے کام سے اجتناب کیا تو اس صورت میں اس کے نامہء اعمال میں ایک برائی لکھ دی جائے گی۔

''تو اس کے حساب میں صرف وہی ایک برائی لکھی جائے گی'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ایک نیکی کرنے پر نامہ ءاعمال میں وہ نیکی دس گنا لکھی جاتی ہے، اس طرح ایک برائی کرنے پر نامہ ءاعمال میں وہ برائی دس گنا نہیں لکھی جاتی، بلکہ ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔ کیونکہ کمیت کے اعتبار سے برائی مضاعف نہیں ہوتی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰىٓ اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ''اور جو کوئی ایک برائی لے کر آئے گا اسے ویسا ہی بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اس آخری جملہ سے واضح ہوا کہ برائی کا مضاعف نہ ہونا عدل خداوندی کا اظہار ہے جبکہ نیکی کا مضاعف ہونا فضلِ خداوندی کا مظہر ہے۔ (مظاہرہ حق ج ۵ ص ۴۳۷ تا ۴۴۰)

(۱۱۷) ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک اور ابن جزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں، جب میں اس کا حکم لے کر واپس ہوا اور حضرت موسیٰ ؑ کے پاس سے گزرا تو انہوں نے پوچھا کہ تمہارے رب نے تمہاری امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ان پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں ہیں، حضرت موسیٰ ؑ نے مجھ سے فرمایا: اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ، کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، پس میں اپنے رب کے پاس واپس گیا، تو پروردگارِ عالم نے اس کا ایک حصہ کم کر دیا، پھر جب میں حضرت موسیٰ ؑ کے پاس واپس آیا اور انہیں خبر دی تو انہوں نے کہا، اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ، آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں اپنے رب کے پاس واپس گیا، تو پروردگار نے فرمایا: اب وہ (ادائیگی میں تو) پانچ ہیں اور (اجر وثواب میں) پچاس ہیں، میرے ہاں کوئی بات تبدیل نہیں ہوتی، میں حضرت موسیٰ ؑ کے پاس واپس آیا تو انہوں نے پھر کہا: اپنے رب کے پاس واپس جاؤ، میں نے کہا کہ اب مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے'' (سنن النسائی ج ۱ ص ۲۲۱)

(۱۱۸) یزید بن ابی مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ہم سے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے پاس ایک چوپایہ لایا گیا جو گدھے

سے اونچا اور خچر سے نیچا تھا، اس کا قدم حدِ نگاہ پر پڑتا تھا، میں سوار ہوا اور میرے ساتھ جبریلؑ تھے، پھر میں چلا، پھر جبرئیلؑ نے کہا کہ اتریئے اور نماز پڑھئے، میں نے ایسا ہی کیا، پھر کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے کہاں نماز پڑھی ہے؟ آپ نے طیبہ میں نماز پڑھی ہے اور یہی جگہ آپ کی ہجرت گاہ ہے، پھر فرمایا، اتریئے اور نماز پڑھیئے، میں نے نماز پڑھی، پھر پوچھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے کہاں نماز پڑھی ہے؟ آپ نے طورِ سینا میں نماز پڑھی ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کلام فرمایا تھا، پھر فرمایا، اتریئے اور نماز پڑھیئے! چنانچہ میں اترا اور میں نے نماز پڑھی، پھر پوچھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے کہاں نماز پڑھی ہے؟ آپ نے بیت اللحم میں نماز پڑھی ہے جہاں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، پھر میں بیت المقدس میں داخل ہوا، تمام نبیوں کو میرے لئے جمع کیا گیا، جبرائیلؑ نے مجھے آگے کر دیا، حتیٰ کہ میں نے ان سب کی امامت کی، پھر مجھے آسمان دنیا پر لے جایا گیا، وہاں میں نے حضرت آدمؑ کو دیکھا، پھر مجھے دوسرے آسمان پر لے جایا گیا، وہاں میں نے خالہ زاد بھائی عیسیٰ علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام دیکھے، پھر مجھے تیسرے آسمان پر لے جایا گیا، وہاں میں نے یوسفؑ کو دیکھا، پھر مجھے چوتھے آسمان پر لے جایا گیا، وہاں میں نے ہارون علیہ السلام کو دیکھا، پھر مجھے پانچویں آسمان پر لے جایا گیا، وہاں میں نے ادریس علیہ السلام کو دیکھا، پھر مجھے چھٹے آسمان پر لے جایا گیا وہاں میں نے موسیٰؑ کو دیکھا، پھر مجھے ساتویں آسمان پر لے جایا گیا، وہاں میں نے ابراہیمؑ کو دیکھا، پھر مجھے ساتوں آسمانوں کے اوپر لے جایا گیا تو ہم سدرۃ المنتہیٰ کے پاس پہنچے تو یکایک ایک کہر نے مجھے ڈھک دیا، پھر میں سجدہ ریز ہو گیا، پھر مجھ سے کہا گیا: میں نے زمین و آسمان کی تخلیق کے دن سے ہی تم پر اور تمہاری امت پر پچاس نمازیں فرض کی تھیں، لہٰذا تم اور تمہاری امت ان نمازوں کو قائم کرو، پھر میں ابراہیم علیہ السلام کے پاس واپس آیا تو انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں پوچھی، پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پوچھا کہ تمہارے پروردگار نے تم پر اور تمہاری امت پر کتنی (نمازیں) فرض کی ہیں؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں، انہوں نے کہا: تم اور تمہاری امت اتنی نمازیں قائم نہیں کر سکے گی! لہٰذا اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ اور اس سے تخفیف کی درخواست کرو، پس

میں اپنے پروردگار کے پاس واپس آیا تو پروردگار نے دس نمازوں کی تخفیف کر دی، پھر میں موسیٰ ؑ کے پاس آیا تو انہوں نے پھر مجھے واپس جانے کا حکم دیا، میں واپس گیا تو مزید دس نمازوں کی تخفیف ہوگئی، پھر (بار بار آنے جانے کے بعد) پانچ نمازیں رہ گئیں، میں پھر جب موسیٰ ؑ کے پاس آیا تو انہوں نے کہا: اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ اور اس سے تخفیف کی درخواست کرو، کیونکہ بنی اسرائیل پر دو نمازیں فرض تھیں مگر وہ ان کو بھی قائم نہیں کر سکے، میں پھر اپنے پروردگار کے پاس واپس گیا، اور تخفیف کی درخواست پیش کی تو فرمایا، میں نے زمین و آسمان کی تخلیق کے دن سے ہی تم پر اور تمہاری امت پر پچاس نمازیں فرض کر دی تھیں، لہٰذا وہ پانچ پچاس کے بدلہ میں ہیں، اور تم اور تمہاری امت ان کو قائم کریں، میں نے پہچان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قطعی حکم ہے، میں پھر موسیٰ ؑ کے پاس آیا تو انہوں نے پھر فرمایا، واپس جاؤ (لیکن) میں جان گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قطعی حکم ہے اس لیے میں دوبارہ واپس نہیں گیا۔" (ایضاً)

(۱۱۹) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں تو میں اسے لے کر واپس ہوا، یہاں تک کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو موسیٰ نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں، انہوں نے کہا اپنے رب کے پاس واپس جائیں، آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، میں اپنے رب کے پاس واپس ہوا تو پروردگار نے اس کا ایک حصہ کم کر دیا، پھر میں موسیٰ ؑ کے پاس آیا اور انہیں بتایا تو انہوں نے پھر کہا: اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ، آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، پس میں دوبارہ اپنے رب کے پاس گیا تو اللہ نے فرمایا: وہ (ادائیگی میں تو) پانچ ہیں اور (ثواب میں) پچاس ہیں، میرے ہاں بات تبدیل نہیں ہوتی، پھر میں موسیٰ کے پاس واپس آیا تو انہوں نے پھر یہی کہا: اپنے پروردگار کے پاس واپس جائیں، میں نے کہا اب مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے" (سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۲۰)

(۱۲۰) امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابو قتادہ بن ربعی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت نقل کی ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' میں نے آپ کی امت پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اور یہ عہد کیا ہے کہ جو شخص ان نمازوں کی وقت پر پابندی کرے گا اس کو جنت میں داخل کروں گا، اور جو شخص ان کی پابندی نہیں کرے گا، اس سے میرا کوئی عہدو پیاں نہیں ہے۔'' (سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۲۱)

(۱۲۱) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''میں نے آپ کی امت پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں اور یہ عہد کیا ہے کہ جو شخص ان نمازوں کی وقت پر پابندی کرتے ہوئے آئے گا میں اسے جنت میں داخل کردوں گا اور جو شخص ان کی پابندی نہیں کرے گا اس کے لیے میرا کوئی عہد نہیں ہے''

(سنن ابی داود، باب المحافظة علی وقت الصلوات ج ۱ ص ۱۲۳)

(۱۲۲) علاء بن عبدالرحمٰن اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' جو شخص کوئی نماز پڑھے اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو وہ نماز ناقص ہے۔، تین مرتبہ فرمایا، ناتمام ہے، کسی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو (اس وقت کیا کریں)؟ انہوں نے فرمایا: اس کو اپنے دل میں پڑھو، کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ عزوجل نے فرمایا'' میں نے نماز (فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ مانگے گا، لہٰذا جب بندہ کہتا ہے'' **الحمد للّٰہ رب العالمین** تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری تعریف کی، اور جب بندہ کہتا ہے'' **الرحمن الرحیم** '' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری ثناء کی ہے، اور جب بندہ کہتا ہے،'' **مالک یوم الدین** '' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، اور ایک مرتبہ فرمایا کہ میرے بندے نے میرے سپرد کردیا اور جب بندہ کہتا ہے '' **ایاک نعبد و ایاک نستعین** '' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جو وہ مانگے، پھر جب بندہ کہتا ہے: **اهدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب**

علیهم و لاالضآلین" تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جو وہ مانگے"

(صحیح مسلم، باب وجوب قرأة الفاتحة ج ۳ ص۱۲)

(۱۲۳) ابوالسائب مولیٰ ہشام بن زہرہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ انہوں نے فرمایا: کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "جو شخص کوئی نماز پڑھے اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو وہ نماز ناقص ہے، ناقص ہے، نامکمل ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! میں بسا اوقات امام کے پیچھے ہوتا ہوں (تو کیا کروں)؟ انہوں نے میرا بازو دبایا، پھر فرمایا کہ اس کو اپنے دل میں پڑھو، اے فارسی! کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "میں نے نماز (فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا ہے، پس اس کا نصف میرے لیے ہے اور نصف میرے بندے کے لیے ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جو وہ مانگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پڑھو، بندہ کہتا ہے، "الحمد للّٰہ رب العالمین" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد بیان کی، اور بندہ کہتا ہے: الرحمن الرحیم" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری ثناء بیان کی ہے،" بندہ کہتا ہے: "مالک یوم الدین" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، اور بندہ کہتا ہے" ایاک نعبد و ایاک نستعین "تو یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جو وہ مانگے، بندہ کہتا ہے، اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم و لاالضَّالین "تو یہ کلمات بندے کے لیے ہیں اور میرے بندے کو وہ کچھ ملے گا جو وہ مانگے"

(موطاء الامام مالک، باب القرأة خلاف الامام، ج ۱ ص ۴۳، حاشیہ مصابیح السنّة)

(۱۲۴) علاء بن عبدالرحمٰن اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جو شخص کوئی نماز پڑھے اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ

پڑھے، تو وہ ناقص ہے، وہ ناقص ہے، ناتمام ہے، راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا، اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! میں بعض اوقات امام کے پیچھے ہوتا ہوں (تو کیا کروں)؟ فرمایا کہ اے ابنِ فارسی! اس کو اپنے دل میں پڑھو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا ہے، پس اس کا نصف میرے لیے ہے اور نصف میرے بندے کے لیے ہے، اور میرے بندے کے لئے وہ کچھ ہے جو وہ مانگے، بندہ پڑھتا ہے، ''**الحمد للّٰہ رب العالمین**'' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری حمد بیان کی ہے، بندہ کہتا ہے، ''**الرحمن الرحیم**'' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری ثناء بیان کی، بندہ کہتا ہے، ''**مالک یوم الدین**'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی اور یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے: **ایاک نعبد و ایاک نستعین**'' اور سورت کا آخری حصہ میرے بندے کیلئے ہے اور اسے وہ ملے گا جو وہ مانگے، بندہ کہتا ہے **اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضّالین**''

(صحیح الترمذی، باب سورۃ الفاتحۃ من ابواب تفسیر القرآن ج۲ ص ۱۵۷)

(۱۲۵) ابوالسائب مولیٰ ہشام بن زہرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جو شخص کوئی نماز پڑھے اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو وہ ناقص ہے، وہ ناقص ہے، وہ ناقص ہے، ناتمام ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: ابو ہریرہ! میں بعض اوقات امام کے پیچھے ہوتا ہوں (تو کیا کروں) (یہ سُن کر) میرا بازو دبایا اور فرمایا: اے فارسی! اس کو اپنے دل میں پڑھو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا ہے، پس اس کا نصف میرے لیے ہے اور نصف میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' پڑھو! بندہ کہتا ہے: **الحمد للّٰہ رب العالمین**'' اللہ

تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد بیان کی بندہ کہتا ہے: الرحمن الرحیم" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے نے میری ثناء بیان کی، بندہ کہتا ہے، "مالک یوم الدین" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، بندہ کہتا ہے، ایاک نعبد وایاک نستعین" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کو وہ کچھ ملے گا جو وہ مانگے، بندہ کہتا ہے: اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضّالین " اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، یہ کلمات میرے بندے کے لیے ہیں اور میرے بندے کو وہ کچھ ملے جو وہ مانگے۔"

(سنن ابی داود، باب من ترک القراءۃ فی الصلواۃ ج۱ص۲۲۸)

(۱۲۶) علاء بن عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: "میں نے نماز (فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے، پس اس کا نصف میرے لیے ہے اور نصف میرے بندے کے لیے ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جو وہ مانگے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پڑھو، بندہ کہتا ہے "الحمد للّٰہ رب العالمین" تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری حمد بیان کی، اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے، پھر بندہ کہتا ہے "الرحمٰن الرحیم" تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری ثناء بیان کی اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگے، بندہ کہتا ہے، مالک یوم الدین" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، پس یہ میرے لیے ہے اور یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے، بندہ کہتا ہے، "ایاک نعبد وایاک نستعین" یعنی یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے، اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا ہے۔ اور سورت کا آخری حصہ میرے بندے کے لیے ہے، بندہ کہتا ہے" اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا

الضّالین '' یہ کلمات میرے بندے کے لیے ہیں اور میرے بندے کو وہ کچھ ملے گا جو اس نے مانگا ہے۔'' (سنن ابن ماجه، باب ثواب القرآن ج ۲ ص ۲۱۷)

(۱۲۷) ابوالسائب مولیٰ ہشام بن زہرہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص کوئی نماز پڑھے اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو وہ نماز ناقص ہے، وہ ناقص ہے، وہ ناقص ہے، ناتمام ہے۔ میں نے پوچھا کہ اے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ! میں بعض اوقات امام کے پیچھے ہوتا ہوں (تو کیا کروں)؟ یہ سن کر انہوں نے میرا بازوں دبایا اور فرمایا کہ اے فارسی! اس کو اپنے دل میں پڑھو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ عزوجل فرماتے ہیں ''میں نے نماز (فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے، اس کا نصف میرے لیے ہے اور نصف میرے بندے کے لیے ہے، اور میرے بندے کو وہ کچھ ملے گا جو اس نے مانگا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پڑھو! بندہ کہتا ہے ''الحمد للّٰہ رب العالمین'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے نے میری حمد بیان کی، بندہ کہتا ہے الرحمن الرحیم'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے نے میری ثناء بیان کی، بندہ کہتا ہے ''مالک یوم الدین'' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، بندہ کہتا ہے: ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' تو یہ آیت میرے بندے کے درمیان ہے، اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا ہے، بندہ کہتا ہے ''اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضّآلین '' یہ کلمات میرے بندے کے لیے ہیں اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا ہے''

(سنن النسائی، باب من ترک القراۃ بسم الله الرحمن الرحیم، فی فاتحة الکتاب ج ۲ ص ۱۳۵، ۱۳۶، مشکوٰۃ المصابیح، باب القرأۃ فی الصلوٰۃ ص ۷۸)

فائدہ:

''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا ہے''

اس جملے میں نماز سے مراد سورۂ فاتحہ ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مقتدی کو بھی سورۂ فاتحہ پڑھنے کے لیے کہا اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال کیا کہ جب سورۂ فاتحہ کی ایسی فضیلت ہے تو مقتدی کو بھی سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہیے۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں، تین آیتیں یعنی **الحمد** سے **مالک یوم الدین** تک تو خالص اللہ تعالیٰ کی مدح و ثناء میں ہیں۔ اور ایک آیت یعنی **ایاک نعبد و ایاک نستعین** خدا اور بندے کے درمیان مشترک ہے کہ آدھی آیت یعنی **ایاک نعبد** میں خدا کی عبادت اور بندگی کا اقرار ہے اور آدھی آیت یعنی **و ایاک نستعین** میں بندے کی جانب سے حاجت کی طلب اور مدد کی درخواست ہے۔ اور بعد کی جو تین آیتیں ہیں وہ صرف بندے کی دعا پر مشتمل ہیں۔

بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں ہے:

مذکورہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بَسْمله یعنی **بسم اللہ الرحمن الرحیم** داخل فاتحہ اور اس کا جزو نہیں ہے، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے، کیونکہ اگر بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزو قرار دے کر بجائے سات کے آٹھ آیتیں شمار کی جائیں تو تقسیم صحیح نہیں ہوگی، ایک طرف تو ساڑھے چار آیتیں ہو جائیں گی اور ایک طرف ساڑھے تین رہ جائیں گی، لہٰذا اس صورت میں نصف نصف کی تقسیم صحیح نہیں رہے گی۔ نیز یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیتوں میں سے ''**صراط الذین انعمت علیھم**'' بھی آیت ہے۔

سورۃ فاتحہ کے متعلق ائمہ کرام کے مسالک اور ان کے دلائل:

سورۂ فاتحہ کے سلسلہ میں ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کے ہاں دو بحثیں چلتی ہیں، اوّل تو یہ کہ مطلقاً سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے یا نہیں اور دوسری بحث یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ مقتدی کو پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے، انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت

رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لاصلوٰۃ لمن لم یقراء بفاتحۃ الکتاب'' (متفق علیہ) وفی روایۃ لمسلمٍ لمن لم یقراء بام القرآن فصاعداً (رواہ مسلم) یعنی جس شخص نے (نماز میں) سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔'' اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ اور کچھ اور نہ پڑھے'' اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے، اگر کوئی شخص سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز نہیں ہوگی، کیونکہ اس حدیث نے صراحت کے ساتھ ایسے شخص کی نماز کی نفی کی ہے جس نے نماز میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں ہے بلکہ واجب ہے، اس حدیث کے بارے میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں نفی کمال مراد ہے، نفی ذات مراد نہیں ہے، یعنی سورہ فاتحہ کے بغیر نماز ادا تو ہو جاتی ہے مگر مکمل طور پر ادا نہیں ہوتی، ان کی دلیل قرآنِ کریم کی یہ آیت ہے۔'' فَاقْرَءُ وْامَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ'' یعنی قرآن میں سے جو کچھ پڑھنا آسان ہو وہ پڑھو، اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا فرض نہیں ہے بلکہ مطلق قرآن کی کوئی بھی سورت یا آیتیں پڑھنا فرض ہے، اس کے علاوہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک اعرابی کی نماز کے سلسلہ میں یہ تعلیم فرمائی تھی کہ

فاقرء واماتیسر معک من القرآن'' یعنی تمہارے لیے قرآن میں سے جو کچھ پڑھنا آسان ہو وہ پڑھا کرو۔''

بہر حال! حنفیہ مسلک کے مطابق نماز میں فرض کہ جس کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، قرآن کریم کی ایک آیت یا تین آیتوں کا پڑھنا ہے، خواہ سورۂ فاتحہ ہو یا دوسری کوئی سورت و آیت، اور سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، اس کے بغیر نماز ناقص ادا ہوتی ہے۔

اور دوسری بحث کہ سورۂ فاتحہ مقتدی کو پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ مذکورہ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس قول سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہیے، چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح روایت میں منقول ہے کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا

فرض ہے، خواہ بلند آواز کی نماز ہو یا آہستہ آواز کی، اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی مسلک ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فرض نہیں ہے، مگر آہستہ آواز کی نماز میں مستحب ہے، ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین یعنی امام محمد اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ بلند آواز اور آہستہ آواز دونوں قسم کی نمازوں میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مقتدی پر فرض نہیں ہے، بلکہ فقہاء حنفیہ تو اس کو مکروہ تحریمی لکھتے ہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی تحقیق:

ابھی ہم نے اوپر یہ لکھا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کا متفقہ طور پر مسلک یہ ہے کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض نہیں ہے۔ مگر اس سلسلہ میں بعض لوگوں کو کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے، جس کی بناء پر ان کا خیال ہے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ مختلف ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح میں اور بعض دیگر علماء نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام محمدؒ اس بات کے قائل ہیں کہ آہستہ آواز کی نماز میں مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ امام محمدؒ کی طرف اس قول کی نسبت کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ امام محمدؒ کی کتابوں سے بالکل صاف طریقہ پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں حضرات شیخینؒ یعنی امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ سے بالکل متفق ہیں۔ چنانچہ امام محمدؒ اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں۔'' **لا قراءۃ خلف الامام فیما جہر فیہ ولا فیما لم یجہر بذلک جاء ت عامۃ الاثار وھو قول ابی حنیفۃ**''یعنی نماز خواہ بلند آواز کی ہو یا آہستہ آواز کسی حال میں بھی امام کے پیچھے قرأت نہیں ہے، اسی کے مطابق ہمیں بہت سی احادیث پہنچی ہیں اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔'' نیز امام موصوفؒ نے اپنی دوسری تصنیف ''کتاب الآثار'' میں قرأت خلف الامام کے عدمِ اثبات میں احادیث و آثار کو نقل کرتے ہوئے یوں تحریر فرمایا ہے۔ **وبہ ناخذ لا نری القرأۃ خلف الامام فی شیء من الصلوٰۃ یجہر فیہ او لا یجہر فیہ**''یعنی یہی ہمارا مسلک ہے کہ ہم قرأت خلف الامام کو کسی بھی نماز میں خواہ وہ

بلند آواز کی نماز ہو یا آہستہ آواز کی نماز ہو روا نہیں رکھتے۔"

بہر حال! مذکورہ بالا مذہب کو دیکھتے ہوئے یہ بات ظاہر ہوئی کہ سورۂ فاتحہ کے سلسلہ میں حنفیہ دو چیزوں کے قائل ہیں: اوّل تو یہ کہ مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا کسی بھی حال میں فرض نہیں، خواہ وہ نماز بلند آواز کی ہو یا آہستہ آواز کی۔ اور دوسرے یہ کہ اگر کوئی مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے تو گویا وہ مکروہ تحریمی کا ارتکاب کرتا ہے، اس موقع پر ہم صرف اتنی بات صاف طور پر کریں گے کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض کیوں نہیں ہے اور اس کے دلائل کیا ہیں؟

تو جاننا چاہیے کہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ **"لا صلوٰة الابفاتحة الکتاب"** ان حضرات کے نزدیک امام کا پڑھنا مقتدی کے حق میں کافی نہیں ہے، بلکہ ہر ایک شخص کو بذاتِ خود پڑھنا ضروری ہے، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام کا پڑھنا مقتدی کے لیے کافی ہے، جب امام نے پڑھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پوری جماعت نے پڑھا۔ چنانچہ وہ اپنے اس قول کی تائید میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں: **"من كان له إمام فقرأة الامام قرأة له"** یعنی جو شخص کسی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس امام کی قرأت اس (مقتدی) کی بھی قرأت سمجھی جائے گی۔"

اگر چہ اس حدیث کی صحت میں کلام ہے مگر حقیقت میں ان کا کلام صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ حدیث بہت سی اسناد سے ثابت ہے، جس میں سے بعض اسناد تو اس درجہ کی صحیح ہیں کہ اس میں کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں۔

بہر حال! اس حدیث سے یہ بات بصراحت ثابت ہوتی ہے کہ مقتدی کو قرأت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ تو سورۃ فاتحہ کی اور نہ کسی اور سورت کی، اس موقع پر یہ احتمال پیدا نہیں کیا جا سکتا ہے کہ شاید اس حدیث کا تعلق بلند آواز کی نماز سے ہو، کیونکہ یہ بات بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی عصر کی نماز کے وقت تھا، جو آہستہ آواز کی نماز ہے، اور جب آہستہ آواز والی نماز میں یہ حکم ہے تو بلند آواز کی نماز میں تو بدرجہ

اولیٰ یہی حکم ہوگا۔(مظاہر حق ج ۱ص ۵۶۴ تاص ۵۶۶)

(۱۲۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ کے برابر کوئی چیز نہ تورات میں نازل فرمائی ہے اور نہ انجیل میں، اور وہ سات آیتیں ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور وہ میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم شدہ ہیں اور میرے بندے کو وہ کچھ ملے گا جو اس نے مانگا''۔

(سنن النسائی، باب تاویل قول اللّٰہ عزوجل "لقد اٰتیناک سبعاً من المثانی، ج ۲ ص ۱۳۹)

فائدہ:

امام قرطبی رحمہ اللہ تفسیر قرطبی میں مذکورہ حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس حدیث کو جسے ابوسعید بن المعلی رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں، ذکر کیا ہے کہ ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا، (بعد میں) میں نے عرض کیا یارسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا:

''اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ''

(سورہ الانفال: ۲۴)

پھر فرمایا کہ میں تمہیں ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن کی عظیم سورتوں میں سے ایک ہے، اس سے پہلے کہ ہم مسجد سے باہر نکلیں، پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا، پھر جب (مسجد سے) باہر نکلنے لگے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا تھا کہ میں تجھے قرآن کی عظیم سورت سکھاؤں گا؟ آپ نے فرمایا: وہ ''الحمد لِلّٰہِ رب العالمین'' ہے وہ سات آیات ہیں جو بار بار دھرائی جاتی ہیں اور قرآنِ عظیم جو مجھے عطا کیا گیا ہے: (تفسیر قرطبی)

سورہ فاتحہ کے کئی نام ہیں، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاتقان'' میں سورہ فاتحہ کے پچیس نام نقل کیے ہیں۔

(۱) فاتحة الکتاب (۲) فاتحة القران (۳) ام الکتاب

(۴) ام القرآن (۵)القرآن العظیم (۶) السبع المثانی

(۷) الوافیة (۸) الکنز (۹) الاساس

(۱۰) الکافیة (۱۱)النور (۱۲) سورۃالحمد

(۱۳) سورۃالشکر (۱۴) سورۃ الحمد الاولی

(۱۵) سورۃ الحمد القصریٰ(۱۶) المراقیة

(۱۷) الشفاء (۱۸) الشافیة (۱۹) سورۃ الصلوٰۃ

(۲۰) الصلاۃ (۲۱) سورۃ الدعاء (۲۲) سورۃ السؤال

(۲۳) سورۃ تعلیم المسئلة(۲۴) سورۃ المناجاۃ (۲۵) سورۃ التفویض.

(الاتقان فی علوم القرآن ۱/ ۷۰،۷۱)

اس بات پرتو اتفاق ہے کہ اگر حضور اکرم ﷺ کسی شخص کو پکاریں اور وہ نماز کی حالت میں ہوتو اسے آپ کی پکار میں لبیک کہنا چاہیے، لیکن اس لبیک کہنے سے اس شخص کی نماز باطل ہوجائے گی یا نہیں؟ اس میں حنفیہ، مالکیہ اور حضرات شافعیہ کے دودوقول ہیں، مالکیہ اور شافعیہ کا راجح قول عدم الفساد کا ہے اور یہی حنابلہ کا مسلک ہے۔(اوجز المسالک ۲/ ۸۸) حنفیہ کے ہاں مشہور قول فسادِ صلوٰۃ کا ہے، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔(ایضاً)

بعض حضرات کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوگی اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے جیسا کہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ صاحب التوضیح نے فرمایا کہ ہمارے اصحاب نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ بات ہمارے نبی ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے کہ اگر وہ کسی شخص کو پکاریں اور وہ حالت نماز میں ہوتو اس پر واجب ہے کہ وہ لبیک کہے، اور اس کی نماز باطل نہیں ہوگی۔(اوجز المسالک الی موطاء الامام مالکؒ ۲/ ۸۹)

سورۂ فاتحہ کو سبع مثانی بھی کہتے ہیں، سبع تو اس لیے کہتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کی آیتیں سات ہیں: سات آیات ہونے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ ان کی تعیین میں اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک صراط الذین انعمت علیھم مستقل ایک آیت ہے اور بسم اللہ، سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے، شوافع کے نزدیک صراط الذین انعمت

علیهم" مستقل آیت نہیں بلکہ **صراط الذین** سے لے کر "**ولاالضآلین**" تک ساتویں آیت ہے اور سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت "**بسم اللّٰہ**" ہے۔ (عمدة القاری ۱۸/۸۱)

اور "**مثانی**" **مثنٰی** کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں دو دو۔

مثانی کی مختلف وجوہِ تسمیہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) اس کا نزول دو مرتبہ ہوا، ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں اور دوسری بار مدینہ منورہ میں۔

(۲) **لا نها تثنی فی کل رکعة**، یعنی ہر رکعت میں اس کو دوہرایا جاتا ہے۔

(۳) **لا نها یثنی بها علی اللّٰہ تعالٰی** یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی گئی ہے۔

(۴) **لا نها استثنیت لهذه الامة لم تنزل علی من قبلها**، یعنی یہ سورت امتِ محمدیہ کی استثنائی اور خصوصی طور پر عطا کی گئی ہے، اس سے پہلے کسی امت پر نازل نہیں ہوئی۔ (الاتقان فی علوم القرآن ۱/۷۱)

بہر حال! ان وجوہِ تسمیہ میں کوئی تعارض نہیں ہے، ان تمام وجوہات کی بنیاد پر اس سورت کو "**مثانی**" کہا جاتا ہے۔

سورۂ فاتحہ کو "**قرآن عظیم**" بھی کہا گیا ہے، چونکہ قرآنِ کریم کے بنیادی مضامین اس سورت میں اجمالی طور پر آ گئے ہیں، اس لیے عظمت واہمیت کو واضح کرنے کیلئے **تسمیة الکل باسم الجزء** کے طور پر سورۂ فاتحہ کو "**القرآن العظیم**" کہتے ہیں۔

(۱۴۹) اعرج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فرشتے یکے بعد دیگرے آتے جاتے ہیں، کچھ فرشتے رات کو اور کچھ فرشتے دن کو آتے ہیں اور نمازِ فجر اور نماز عصر میں اکٹھے ہو جاتے ہیں، پھر وہ فرشتے اوپر کو چلے جاتے ہیں، جنہوں نے تمہارے ساتھ رات بسر کی ہوتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ (حالانکہ وہ جانتا ہے) ان سے پوچھتا ہے، فرماتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کو اس حال میں چھوڑ آئے کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس گئے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔"

(صحیح البخاری، باب فضل صلوٰة العصر وکتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ ج۴ص۱۱۳، مشکوٰة المصابیح باب فضائل الصلوٰة ص۶۲)

(۱۳۰) اعرج رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے تمہارے پاس باری باری آتے جاتے ہیں، اور عصر کی نماز اور فجر کی نماز میں اکٹھے ہو جاتے ہیں، پھر وہ فرشتے اوپر کو چلے جاتے ہیں جنہوں نے تمہارے ساتھ رات گزاری ہوتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ (حالانکہ وہ تم کو خوب جانتا ہے) ان سے دریافت کرتا ہے، فرماتا ہے کہ تم میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟ فرشتے کہتے کہ ہم ان کو اس حال میں چھوڑ آئے ہیں کہ وہ نماز میں مشغول تھے اور جب ہم ان کے پاس آئے تھے تب وہ نماز میں مشغول تھے''۔

(صحیح البخاری، کتاب التوحید ج ۱۰ ص ۴۴۱، باب کلام الرب مع جبریل)

(۱۳۱) امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صحیح البخاری کی دوسری روایت کی طرح الفاظ نقل کیے ہیں، مگر یہ فرمایا ہے: (اور وہ ان کو خوب جانتا ہے) اور اس میں انہوں نے فجر کی نماز کو عصر کی نماز سے پہلے ذکر کیا ہے۔ (سنن النسائی، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ ج ۱ ص ۲۴۰)

(۱۳۲) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو ''الموطاء'' میں بایں الفاظ نقل کیا ہے'' اور وہ ان کو خوب جانتا ہے اور فرمایا کہ'' وہ عصر کی نماز اور مغرب کی نماز میں اکٹھے ہوتے ہیں''

(الموطاء، باب جامع الصلوٰۃ)

فائدہ:

مذکورہ ارشادِ گرامی کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے اعمال کو لکھنے اور انہیں اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کیلئے فرشتوں کی دو جماعتیں بندوں کے ہمراہ رہتی ہیں، ایک جماعت تو دن کے اعمال لکھتی ہے اور پھر عصر کے بعد واپس جا کر بارگاہ ایزدی میں اپنی رپورٹ پیش کر دیتی ہے، اور دوسری جماعت رات کے اعمال لکھتی ہے، یہ فجر کی نماز کے بعد واپس جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو بندوں کے رات کے اعمال کی رپورٹ دیتی ہے، چنانچہ دن اور رات میں دو وقت ایسے ہوتے ہیں جبکہ یہ یہ دونوں جماعتیں جمع ہو جاتی ہیں، ایک مرتبہ تو فجر کے وقت، جبکہ رات کے فرشتے واپس جاتے ہیں، اور دن کے فرشتے اپنی ڈیوٹی پر آتے ہیں، اسی طرح

دوسری مرتبہ ان دونوں جماعتوں کا اجتماع عصر کے وقت ہوتا ہے، جبکہ دن کے فرشتے اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس جاتے ہیں اور رات کے فرشتے اپنے کام پر حاضر ہوتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اور اس کا علم زمین و آسمان کے ذرّہ ذرّہ کو محیط ہے اور وہ زمین و آسمان کے باسیوں کے ایک ایک عمل کو جانتا ہے، مگر جب فرشتے بندوں کے اعمال کی رپورٹ لے کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں وہ ان سے پوچھتا ہے کہ جب تم اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس لوٹ رہے تھے تو بتاؤ اس وقت میرے بندے کیا کر رہے تھے؟ اور اس کا یہ پوچھنا (نعوذ باللہ) علم حاصل کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس سوال سے اس کا مقصد فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں کی فضیلت و عظمت کا اظہار ہوتا ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو بھیجنا چاہا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا تو فرشتوں نے کہا کہ پروردگار! کیا تو ایسی مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو دنیا میں فتنہ و فساد اور خون ریزی اور غارتگری کا بازار گرم کرے گی! اور پھر انہوں نے اپنی برتری اور بڑائی ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ تیرے عبادت و بندگی کے لیے تو ہم ہی کافی ہیں، اور ہم ہی تیری عبادت و پرستش کر سکتے ہیں! چنانچہ اللہ تعالیٰ ان سے یہ سوال کر کے ان پر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دیکھو! جس مخلوق کے بارے میں تمہارا یہ خیال تھا کہ وہ دنیا میں سوائے فتنہ و فساد پھیلانے کے اور کوئی کام نہیں کرے گی، اب تم خود دیکھ آئے ہو کہ وہ میری عبادت اور میری پرستش کس پابندی اور کس ذوق و شوق سے کرتی ہے؟

بہر حال! اس حدیثِ مبارک کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو رغبت دلا رہے ہیں کہ ان دونوں اوقات میں ہمیشہ پابندی سے نماز پڑھتے رہو تا کہ وہ فرشتے خدا تعالیٰ کے سامنے تمہارے اچھے اور بہتر اعمال ہی پیش کرتے رہیں اور خدائے برتر تمہاری فضیلت اور بڑائی اسی طرح فرشتوں کے سامنے ظاہر کرتا رہے۔ (مظاهر حق ج ۱ ص ۴۵۳)

نیز امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ حدیث میں مذکور فرشتوں سے حفاظت کرنے والے فرشتے مراد ہیں، وہ لکھنے والے فرشتوں کی نگرانی کرتے ہیں، لیکن اس پر یہ تعقب کیا گیا ہے کہ حفاظت کرنے والے فرشتے تو بندوں سے جدا نہیں

ہوتے اور یہ بات بھی ثابت نہیں ہے کہ رات کی حفاظت کرنے والے اور ہیں اور دن کی حفاظت کرنے والے اور ہیں''۔

نمازِ چاشت کی فضیلت:

(۱۳۳) حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ عزوجل کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ''اے ابن آدم! تو میرے لیے دن کے اول حصہ میں چار رکعت نماز پڑھ لے میں دن کے آخری حصہ تک تیری کفایت کروں گا''

(سنن الترمذی، باب صلوٰة الضحیٰ ج ۱ ص ۹۵)

(۱۳۴) کثیر بن مرہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت نعیم بن ھماز رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ عزوجل فرماتے ہیں: اے ابنِ آدم! تو دن کے ابتدائی حصہ میں چار رکعت نماز پڑھنے سے عاجز نہ ہو، میں تیرے لیے دن کے آخر تک کفایت کروں گا۔ (سنن ابی داود، باب صلوٰة الضحیٰ ج ۱ ص ۲۵۷، مشکوٰة المصابیح، باب صلوٰة الضحی ص ۱۱۶)

فائدہ:

خداوندِ قدوس کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ''اے بندے! تو دن کے ابتدائی حصہ میں محض میری رضا اور خوشنودی کے لیے چار رکعت نماز پڑھ لیا کر جس کے بدلہ میں میں دن کے آخری حصہ یعنی شام تک تیری حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کرتا رہوں گا، اور تیرے دل میں جو پریشانی اور تنگی ہے میں اسے ختم کروں گا، گویا دن کے ابتدائی حصہ میں میری عبادت و بندگی کے لیے اپنا دل فارغ رکھ، میں دن کے آخر حصہ تک تیری حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کر کے تیرے دل کو اطمینان اور فراغت بخشوں گا، من کان للہ کان اللہ لہٗ یعنی جو شخص خدا کا ہو جاتا ہے خدا اس کا ہو جاتا ہے۔

''دن کے اول حصہ میں چار رکعت سے نمازِ اشراق بھی مراد لی جا سکتی ہے اور نمازِ چاشت بھی مراد ہو سکتی ہے۔ (مظاہر حق ج ۱ ص ۸۵۵)

ان حدیثوں سے نمازِ چاشت کا استحباب معلوم ہوتا ہے، نمازِ چاشت سنتِ مؤکدہ ہے، اس کی کم از کم دو رکعتیں ہیں عند الشافعیہ اور آٹھ رکعتیں پڑھنا افضل ہے، بارہ رکعات بھی پڑھنا جائز ہے، اس کا وقت سورج بلند ہونے سے زوال تک رہتا ہے، البتہ جب دن کا چوتھائی حصہ گزر جائے تو تب پڑھنا افضل ہے، تا کہ دن کے چوتھائی حصوں میں سے ہر حصہ میں ایک نماز ہو۔

قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کے متعلق حساب ہوگا:

(۱۳۵) حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت حُریث بن قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ آیا، میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میرے لیے نیک ساتھی میسر فرما دیجئے، چنانچہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا اور میں نے ان سے کہا: میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ میرے لیے کوئی نیک وصالح ساتھی میسر فرما دیجئے، آپ مجھے کوئی ایسی حدیثِ رسول بیان کیجئے جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نفع پہنچائے؟ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''بندے سے سب سے پہلے جس چیز کا محاسبہ ہوگا وہ اس کی نماز ہوگی، اگر وہ ٹھیک نکلی تو وہ شخص فلاح یاب اور کامران ہوگا اور اگر وہ خراب نکلی تو وہ ناکام اور نامراد ہوگا'' ہمام رحمۃ اللہ علیہ (راوی) کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ یہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا کلام ہے، یا روایت کا حصہ ہے؟ اگر اس کی فرض نماز میں کوئی کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھو! کیا میرے بندے کے کچھ نوافل ہیں؟ چنانچہ ان نوافل سے فرائض کی کمی کو پورا کیا جائے گا، پھر اس کے دیگر تمام اعمال کا بھی اسی طرح محاسبہ ہوگا۔''

(سنن النسائی، باب المحاسبة علی الصلوٰة ج ا ص ۲۳۲)

(۱۳۶) نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قیامت کے دن سب سے پہلے بندے سے جس چیز کا حساب ہوگا وہ اس کی نماز ہوگی، اگر وہ مکمل نکلی تو اسے مکمل ہی لکھا جائے گا اور اگر اس میں کوئی کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ

فرمائیں گے دیکھو! اس کے کچھ نوافل ہیں جن کے ذریعہ اس نقصان کی تلافی کی جائے جو اس نے فرائض میں کی ہے؟ پھر دیگر اعمال کا اسی طرح محاسبہ ہوگا۔''

(۱۳۷) مذکورہ حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس طرح بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندے سے جس چیز کا سب سے پہلے حساب ہوگا وہ اس کی نماز ہوگی، اگر اس نے اس کو کامل ادا کیا ہوگا تو ٹھیک ورنہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، دیکھو! کیا میرے بندے کے کچھ نوافل ہیں؟ اگر اس کے نوافل پائے گئے تو فرمائیں گے کہ ان کے ذریعہ فرائض کی کمی وکوتاہی کو پورا کردو۔''

(۱۳۸) حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: قیامت کے روز سب سے پہلے بندے کا نماز کے متعلق حساب ہوگا، اگر اس نے اسے مکمل ادا کیا ہوگا تو اس کے لیے زائد اجر لکھا جائے گا اور اگر اس نے مکمل طور پر ادا نہیں کیا ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے، دیکھو! کیا میرے بندے کے کچھ نوافل ہیں؟ انکے ذریعہ اس کے فرائض کی کمی کوتاہی کو پورا کردو، پھر دوسرے اعمال کا بھی اسکے مطابق محاسبہ ہوگا۔'' (سنن ابن ماجه، باب ماجاء في اوّل مايحاسب به العبد الصلوٰة)

(۱۳۹) امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اپنی سنن میں دو طریق سے نقل کیا ہے، ایک حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور دوسرے حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے، دونوں روایتیں ''باب كل صلوٰة لم يتمها صاحبها تتم من تطوعه'' میں مذکور ہیں۔

چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں فرمایا: حضرت انس بن حکیم الضبی (جو زیاد یا ابن زیاد سے خائف تھے) سے مروی ہے کہ وہ مدینہ منورہ آئے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات ہوئی، انہوں نے مجھ سے میرا سلسلہ نسب پوچھا، میں نے اپنا نسب بیان کیا، پھر فرمایا کہ اے نوجوان! کیا میں تم سے ایک حدیث بیان نہ کروں؟ میں نے کہا ضرور بیان کیجئے! اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے، (راوی) یونس رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ حدیث انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے بیان کی ہے، فرمایا: قیامت کے روز لوگوں کے اعمال میں سے سب سے پہلے جس چیز کا حساب ہوگا وہ نماز ہوگی، فرمایا: ہمارے

پروردگار فرشتوں سے فرمائیں گے (حالانکہ وہ خوب جانتا ہے): میرے بندے کی نماز کو دیکھو! اس نے اس کو مکمل طور پر ادا کیا ہے یا اس میں کوئی کمی کوتاہی کی ہے؟ اگر اس نے نماز مکمل ادا کی ہوگی تو مکمل ہی لکھی جائے گی اور اگر اس میں کچھ کمی کوتاہی کی ہوگی تو فرمائیں گے: دیکھو! کیا میرے بندے کے کچھ نوافل ہیں؟ اگر اس کے نوافل پائے گئے تو فرمائیں گے: میرے بندے کے فرائض کی تکمیل اس کے نوافل سے کردو، پھر اسی طرح دیگر اعمال کا مؤاخذہ (محاسبہ) ہوگا۔"

(۱۴۰) حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی روایت میں فرمایا: زُراہ بن ابی اوفیٰ، حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس روایت کے معنیٰ کی حدیث ذکر کی اور اس میں یہ الفاظ بھی زائد ہیں "پھر زکوٰۃ کا حساب بھی اسی طرح ہوگا، پھر دیگر اعمال کا بھی اسی طرح مؤاخذہ ہوگا۔"

فائدہ:

مذکورہ احادیث میں "اعمال" سے بظاہر اعمالِ ظاہری مراد ہے، جو اسلام کے ارکان ہیں، اس لیے کہ سب سے پہلے بندے کا حساب اس کے ایمان کے بارے میں ہوگا، جو عملِ قلب ہے، اگر ایمان ہوا تو پھر بقیہ ارکانِ اسلام کے بارے میں حساب کتاب ہوگا، اور ان میں سب سے پہلے نماز کے متعلق باز پرس ہوگی، اس لیے کہ نماز دین کا ستون ہے، جس نے اسے قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اس کو ترک کیا اس نے دین کو ڈھا دیا۔" (الحدیث)

نیز نماز زندگی میں دن و رات میں پانچ مرتبہ پڑھی جاتی ہے، برخلاف دیگر ارکانِ اسلام کے کہ زکوٰۃ مثلاً بہت سے لوگوں پر واجب نہیں ہوتی اور روزے سال میں صرف ایک مہینہ میں رکھے جاتے ہیں۔ اور حج ساری عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے اور وہ بھی صاحبِ استطاعت پر۔

ان احادیث مبارکہ سے اصل مقصود اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام کو بیان کرنا ہے کہ

اللہ تعالیٰ فرائض میں ہونے والی کمی وکوتاہی کونوافل کے ذریعہ پورا فرمادیتے ہیں۔

نیز اس سے معلوم ہوا کہ فرائض کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے، اور انکی پابندی کرنی چاہیے اور اس کے علاوہ نفلی عبادات بھی کثرت سے ادا کرنی چاہئیں، خواہ نماز ہو یا زکوٰۃ، روزہ ہو یا حج، تاکہ یہ نفلی عبادات، فرائض میں ہونے والے نقصان کی تلافی کا سامان بن سکیں۔

ایک تعارض اور اس کا جواب:

ایک دوسری روایت میں بتایا گیا ہے کہ "قیامت کے روز بندہ سے سب سے پہلے جس چیز کے بارہ سوال کیا جائے گا وہ "خون" ہوگا، اور یہاں فرمایا جارہا ہے کہ سب سے پہلے "نماز" کا محاسبہ ہوگا، لہٰذا ان دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ حقوق اللہ میں سے تو سب سے پہلے "نماز" کا مؤاخذہ ہوگا اور حقوق العباد میں سب سے پہلے "خون" کا حساب لیا جائیگا۔

حدیث کے آخری الفاظ "پھر اسی طرح دیگر اعمال کا محاسبہ ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح فرض نماز کی کوئی کمی سنت ونفل سے پوری کی جائے گی، اسی طرح دوسرے فرائض اعمال میں بھی کوئی کوتاہی ہوگی تو اسے نفلی اعمال کے ذریعہ پورا کیا جائے گا۔ مثلاً اگر فرض روزوں میں کوئی نقصان (کمی) واقع ہوگا تو وہ نقصان نفل روزوں سے پورا کیا جائیگا، اگر زکوٰۃ میں کچھ نقصان ہوگا تو صدقہ نفلی سے اسے پورا کیا جائیگا، اگر فرض حج میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی تو نفلی حج یا عمرہ سے اسے پورا کردیا جائے گا اور اگر کسی پر کسی کا کوئی حق (مطالبہ) ہوگا تو اس کے نامہ اعمال صالحہ سے اس حق ومطالبہ کے بقدر حصہ لے کر صاحب حق کو دے دیا جائے گا، اس طرح تمام اعمال کے بارے میں پورا پورا مؤاخذہ اور محاسبہ کیا جائیگا۔

(۱۴۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے پاس میرے رب بہترین صورت میں آئے، میرا خیال ہے کہ خواب میں آئے، فرمایا: حدیث میں اسی طرح آیا ہے، پھر فرمایا، اے محمدؐ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہے کہ

ملاء اعلیٰ کس چیز کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں؟ فرمایا: میں نے عرض کیا نہیں، فرمایا: پھر انہوں نے اپنا دستِ مبارک میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھا، یہاں تک کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے سینہ کے درمیان محسوس کی، یا فرمایا کہ اپنے گلہ کے پاس محسوس ہوئی۔ پھر مجھے زمین وآسمان میں جو کچھ تھا سب معلوم ہوگیا، فرمایا: اے محمدؐ! کیا آپ ﷺ کو معلوم ہے کہ ملاء اعلیٰ کس چیز کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں، فرمایا: کفارہ بننے والی چیزوں کے بارے میں، اور کفارہ بننے والی چیزیں یہ ہیں، فرض نمازوں کے بعد مسجد میں ٹھہرنا، جماعت کی نمازوں کے لیے پیدل جانا، تکلیف کے باوجود وضو کامل کرنا، اور جو شخص یہ کام کرے گا وہ خیر کے ساتھ زندگی بسر کرے گا اور خیر کے ساتھ ہی مرے گا اور گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہوجائے گا جیسے آج ہی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہو اور فرمایا: اے محمدؐ! جب آپ ﷺ نماز پڑھیں تو کہیں: اے اللہ! میں آپ سے اچھے کام کرنے اور بُرے کام ترک کرنے اور مسکینوں سے محبت کرنے کی توفیق مانگتا ہوں اور آپ جب اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالنا چاہیں تو مجھے بغیر کسی آزمائش کے اپنے پاس بلا لیجیے، فرمایا: اور درجات یہ ہیں، سلام کو رواج دینا، کھانا کھلانا اور رات کو نماز پڑھنا جب لوگ سو رہے ہوں۔'' (جامع الترمذی، باب سورۃ صٓ ج ۲ ص ۲۱۴، ۲۱۵)

(۱۴۲) ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''میرے پروردگار میرے پاس بہترین صورت میں آئے، اور فرمایا: اے محمدؐ! میں نے کہا کہ اے میرے رب! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، فرمایا: یہ ملاء اعلیٰ کس چیز کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ اے میرے رب! مجھے نہیں معلوم، پھر انہوں نے میرے دونوں کندھوں کے درمیان اپنا دستِ اقدس رکھا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینہ کے درمیان محسوس کی، پھر مشرق ومغرب کے درمیان جو کچھ ہے اسے میں جان گیا، فرمایا: اے محمدؐ! میں نے کہا اے میرے رب! میں حاضر ہوں، فرمایا: ملاء اعلیٰ کس چیز کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ درجات اور کفارات کے بارے میں، اور جماعت کی نمازوں کے لیے پیدل چل کر جانا اور تکلیف کے دقت (بھی) وضو کامل کرنا، نماز کے بعد

(دوسری) نماز کا انتظار کرنا اور جو شخص ان امور کی پابندی کرے گا وہ خیر کے ساتھ زندہ رہے گا اور خیر کے ساتھ ہی اسے موت آئے گی اور وہ گناہوں سے ایسا پاک ہو جائے گا جیسے آج ہی اس کی ماں نے اس کو جنم دیا ہو" (ایضاً)

(۱۴۳) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت بھی نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ فجر کے لیے تشریف نہ لائے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ہم سورج کی ٹکیہ کو دیکھ لیتے، پھر آپ جلدی سے باہر تشریف لائے اور نماز کے لیے اقامت کہی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور نماز مختصر پڑھائی، پھر جب سلام پھیرا تو آواز دی، پھر ہم سے فرمایا: جہاں ہو اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہو، پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مجھے صبح کی نماز میں آنے سے کس چیز نے روکے رکھا؟ میں رات کو اٹھا، وضو کیا اور جتنا اللہ کو منظور تھا نماز پڑھی، پھر مجھے نماز میں اونگھ آ گئی، یہاں تک کہ گہری نیند آ گئی، پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں اپنے رب کے سامنے ہوں اور وہ بہترین صورت میں ہیں، انہوں نے فرمایا! اے محمدؐ! میں نے عرض کیا: پروردگار! میں حاضر ہوں، فرمایا کہ ملاء اعلیٰ کس چیز کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے کہا: میں نہیں جانتا، تین مرتبہ یہ بات عرض کی، فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی یہاں تک کہ میں نے ان کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینہ کے درمیان محسوس کی، پھر ہر چیز میرے سامنے روشن ہو گئی، اور میں نے اسے پہچان لیا، پھر فرمایا کہ اے محمدؐ! میں نے عرض کی، پروردگار! میں حاضر ہوں، فرمایا کہ ملاء اعلیٰ کس چیز کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ کفارہ بننے والی چیزوں کے بارے میں، فرمایا کہ وہ چیزیں کیا ہیں؟ فرمایا کہ نیکیوں کی جانب پیدل چل کر جانا، نمازوں کے بعد مسجدوں میں بیٹھنا، تکلیف کے وقت کامل وضو کرنا، فرمایا اور کس چیز میں؟ میں نے کہا: کھانا کھلانا، نرم گفتگو کرنا، رات کو نماز پڑھنا جب لوگ سو رہے ہوں، فرمایا کہ مانگو، میں نے عرض کیا، اے اللہ! میں آپ سے نیک کام کرنے اور برے کام نہ کرنے اور مسکینوں سے محبت کا سوال کرتا ہوں، اور یہ کہ آپ میری مغفرت فرما دیں اور مجھ پر رحم فرمائیں اور جب آپ کسی قوم کو

آزمائش میں ڈالنا چاہیں تو مجھے بغیر کسی آزمائش کے وفات دینا، میں آپ سے آپ کی محبت اوراس کی محبت مانگتا ہوں جو آپ سے محبت کرتا ہواور ایسے عمل کی محبت کا جو مجھے آپ کی محبت کے قریب کردے، آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ کلمات برحق ہیں، لہٰذا ان کو یاد کرو اور پھر ان کو سیکھو۔''

فائدہ:

ایک صاحب ایمان شخص کو سب سے پہلے یہ اعتقاد رکھنا لازم ہے کہ اللہ جل شانہ، اپنی مخلوق کی مشابہت (جسمیت وغیرہ) سے منزہ اور پاک ہیں، ارشادِ خداوندی ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ'' (الشوریٰ: ۱۱) کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔'' نیز فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ o اَللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ o وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص ۱-۴) ''آپ فرمادیں کہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کا ہم سر (برابر) ہے'' اس کے خلاف اعتقاد رکھنا ایمان میں خلل اندازی کا باعث بنتا ہے، مسلمانوں کے تمام ائمہ اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں ایسے جو کلمات وارد ہوئے ہیں جن کے ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض مخلوق سے مشابہت رکھتے ہیں، ان کے متعلق یہ ایمان رکھنا واجب اور ضروری ہے کہ ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں اور اللہ جل شانہٗ کو ان ظاہری اوصاف سے متصف کرنا درست نہیں ہے، ایسے کلمات متشابہہ کہلاتے ہیں۔ جن کے بارے میں علماء کے دو مذہب ہیں: (۱) اسلاف کا مذہب (۲) اخلاف کا مذہب۔

(۱) اسلاف کا مذہب یہ ہے کہ ان کلمات کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں، انکا صحیح علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور اللہ تعالیٰ مخلوق کی مشابہت سے منزہ اور پاک ہیں، یہ حضرات ان کلمات کے کوئی خاص معنی متعین نہیں کرتے بلکہ ان کے علم کو بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں، تاکہ اس آیت پر عمل ہو: ''وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ'' (آل عمران: ۷) ''اور کوئی اس کا مطلب

نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے''۔آیت کے اگلے حصہ کی یوں ابتداء کرتے ہیں:
وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران: ۷) ''اور پختہ علم والے یوں کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان لے آئے، سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے اور عقل والے ہی نصیحت کو قبول کرتے ہیں۔''

(۲) اخلاف کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی مشابہت سے اگرچہ منزہ اور پاک ہیں، لیکن متشابہ کلمات کے ایسے معنی کیے جائیں گے جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو سکے مثلاً اس حدیث میں کہ''میرے پاس میرے پروردگار بہترین صورت میں آئے''، یہاں ''صورت'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جلالیہ وکمالیہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہیں، ان ہی صفات کے تجلّی اللہ جل شانہ نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے کی تھی۔

نیز یہ حضرات کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے کندھوں کے درمیان ہاتھ رکھنے سے مراد وہ علوم ومعارف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو عطا فرمائے تھے، اور آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر ان کا فیضان کیا تھا، اور سینہ میں دستِ مبارک کی ٹھنڈک محسوس ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان علوم ومعارف الٰہیہ سے حضور اکرم ﷺ کا قلبِ مبارک لبریز ہو گیا، دل کو قوتِ یقین اور اطمینان کی وجہ سے سکون حاصل ہوا، اس بات کی تائید اس فرمانِ رسالت ﷺ سے ہوتی ہے کہ ''پھر میں جان گیا کہ جو کچھ زمین وآسمان کے درمیان تھا''

جبکہ ایک روایت میں یہ ہے کہ'' جو کچھ مشرق ومغرب کے درمیان تھا اسے جان گیا'' اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ'' ہر چیز میرے سامنے روشن ہو گئی اور میں نے اسے پہچان لیا۔''

پھر ان علوم ومعارفِ الٰہیہ سے آنحضور ﷺ کے بہرہ یاب ہونے کا ثمرہ یہ نکلا آپ ﷺ نے اللہ جل شانہ، کے سوالات کا جواب عنایت فرمایا۔

ان احادیثِ مبارکہ میں ''ملاء اعلیٰ'' سے مراد فرشتے ہیں جو آسمان پر رہتے ہیں، اور عرش وکرسی وغیرہ اس کے آس پاس موجود ہیں، اور ملاءِ اعلیٰ کے جھگڑنے سے دو امر مراد ہو سکتے ہیں۔(۱) وہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ان امور

کا اجر وثواب لکھ سکیں یا ان کے اجر وثواب کی حقیقت تک پہنچنے میں جھگڑ رہے ہیں، ان کا مرتبہ ومقام بعض فرشتے بعض سے زیادہ بتلا رہے ہیں۔ (۲) وہ یہ تمنا اور خواہش کرتے ہیں کہ وہ دنیا والے ہوتے اور ان اعمال صالحہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے، اس لیے کہ انہیں معلوم ہے کہ ان کا اجر وثواب کس قدر عظیم اور انجام کس قدر اچھا ہے!۔

تمام روایات کو سامنے رکھ کر جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ملاءِ اعلیٰ دو چیزوں کے بارے میں جھگڑتے ہیں (۱) کفارہ بننے والی چیزوں کے بارے میں یعنی ایسے اعمال جو گناہوں اور برائیوں کا کفارہ بنتے ہیں اور وہ یہ ہیں: فرض نماز ادا کرنا، علم اور بیمار کی عیادت کے لیے پیدل چل کر جانا، مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنا اور سخت سردیوں میں یا تکلیف میں کامل وضو کرنا (اچھی طرح وضو کرنا) (۲) بلندی درجات کا ذریعہ بننے والے اعمال: مثلاً کھانا کھلانا، نرم انداز میں گفتگو کرنا، رات کو تہجد کی نماز پڑھنا جب لوگ سو رہے ہوں۔

(۱۴۴) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، پھر واپس جانے والے واپس چلے گئے اور رکنے والے وہیں رکے رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی سے تشریف لائے، سانس پھول رہا تھا، اور چادر گھٹنے سے اٹھ رہی تھی، (پھر) فرمایا کہ خوشخبری سنو! دیکھو، تمہارے رب نے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھولا ہے اور تمہاری وجہ سے فرشتوں سے فخر فرما رہے ہیں، فرما رہے ہیں کہ میرے بندوں کو دیکھو کہ وہ ایک فریضہ کو ادا کر کے دوسرے فریضہ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' (سنن ابن ماجہ، باب لزوم المساجد وانتظار الصلوٰۃ ج ۱ ص ۱۳۸)

فائدہ:

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نماز ادا کر کے دوسری نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنا، بہت عظیم کام اور باعثِ اجر وثواب ہے۔ مساجد، روئے ارض پر بہترین جگہیں ہیں، وہاں ٹھہرنا گویا اللہ تعالیٰ کے در پر ڈیرہ ڈالنا ہے، البتہ مساجد میں قیام کے دوران مساجد کا احترام اور تقدس ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے، فضول اور بے مقصد باتیں کرنا اور لہو ولعب میں مشغول ہونا انتہائی نامناسب ہے۔

(۱۴) ﴿خرچ کرنے کی فضیلت﴾

(۱۴۵) اعرج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابن آدم! تو خرچ کر میں تمہارے اوپر خرچ کروں گا۔'' (صحیح البخاری، کتاب النفقات وفضل النفقة ج۷ ص ۴۲)

(۱۴۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ عزوجل نے فرمایا: ''تو خرچ کر، میں تم پر خرچ کروں گا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرپور ہے، رات دن کا مسلسل خرچ کرنا اس میں کمی اور نقصان واقع نہیں کرسکتا، اور فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے! اللہ تعالیٰ نے جب سے زمین وآسمان کو پیدا فرمایا اس وقت سے اب تک کتنا خرچ کیا ہوگا! لیکن اس مسلسل خرچ نے بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اسے کم نہیں کیا اور اللہ کا عرش پانی پر ہے اور اس کے ہاتھ میں میزان ہے۔''

(صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ ھود، باب قوله تعالیٰ'' وکان عرشه علی الماء ج ۷ قسطلانی ص ۱۲۹)

فائدہ: ''صوم'' کے لغوی وشرعی معنی:

صوم اور صیام کا لغوی معنی ہے ''امساک'' یعنی مطلقاً رکنا، خواہ وہ کھانے پینے سے ہو یا کلام سے ہو یا کسی اور چیز سے ہو، اور اصطلاح شریعت میں صوم کا مفہوم یہ ہے کہ ''فجر سے غروب آفتاب تک روزہ کی نیت کے ساتھ کھانے پینے، جماع کرنے اور جسم وبدن کے اس حصہ میں کہ وہ ''اندر'' کے حکم میں ہو، کسی چیز کے داخل کرنے سے رکے رہنا، نیز روزے دار کا مسلمان اور حیض ونفاس سے پاک ہونا، اس کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ہے''۔

روزے کب فرض ہوئے؟

ماہ رمضان کے روزے ہجرت کے اٹھارہ ماہ بعد شعبان کے مہینہ میں تحویل قبلہ

کے دس روز بعد فرض کیے گئے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے قبل کوئی روزہ فرض نہیں تھا، جبکہ بعض حضرات کا قول ہے کہ اس سے قبل بھی کچھ ایام کے روزے فرض تھے جو اس ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد منسوخ ہو گئے، چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک تو عاشوراء محرم کا روزہ فرض تھا، اور بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ ایام بیض (قمری مہینہ کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں راتوں کے دن) کے روزے فرض تھے۔

(تفصیل وتوضیح کیلئے دیکھئے! اللباب ج ۱ ص ۱۶۲، ۱۶۵، الجوهرة ج ۱ ص ۱۶۶، تاریخ ابن جریر، البداية والنهاية ج ۳ ص ۲۵۴، ۳۴۷، معارف السنن ج ۲، ص ۱، ص ۲، فتح الباری ج ۴ ص ۸۷، تهذيب ابن القيم في ذيل "المختصر" للمنذری، المعالم للخطابی ج ۳ ص ۳۲۵ تا ص ۳۲۹)

رمضان کے روزوں کی فرضیت کے ابتدائی دنوں میں بعض احکام بہت سخت تھے، مثلاً غروب آفتاب کے بعد سونے سے پہلے کھانے پینے کی اجازت تھی مگر سونے کے بعد کچھ بھی کھانے پینے کی اجازت نہیں تھی، چاہے کوئی شخص بغیر کھائے پیئے ہی کیوں نہ سو گیا ہو، اسی طرح جماع کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں جائز نہ تھا، مگر جب یہ احکام مسلمانوں پر بہت شاق گزرے اور ان احکام کی وجہ سے کئی واقعات بھی پیش آئے تو یہ احکام منسوخ کر دیئے گئے اور کوئی سختی باقی نہ رہی۔

روزے کی اہمیت وفضیلت:

اسلام کے جو پانچ بنیادی ارکان ہیں۔ ان میں روزے کا تیسرا درجہ ہے، گویا روزہ، اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ اس اہم رکن کی جو تاکید اور بیش از بیش اہمیت ہے، اسے ماہرین شریعت ہی بخوبی جان سکتے ہیں، روزے کا انکار کرنے والا کافر اور اس کا تارک فاسق اور اشد گنہگار ہوتا ہے۔

چنانچہ درمختار کے "**باب مایفسد الصوم**" میں یہ مسئلہ اور حکم نقل کیا گیا ہے کہ "جو شخص رمضان کے مہینہ میں بلا عذر علی الاعلان کھاتا پیتا نظر آئے اسے قتل کر دیا

جائے“۔

روزے کی فضیلت کے بارہ میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ بعض علماء نے اس اہم ترین اور باعظمت رکن کے بے انتہاء فضائل دیکھ کر اس کو نماز جیسی عظیم الشان عبادت پر ترجیح اور فضیلت دی ہے، اگر چہ یہ بعض ہی علماء کا قول ہے جبکہ اکثر علماء کا مسلک یہی ہے کہ نماز، تمام اعمال سے افضل ہے، اور اسے روزے پر بھی ترجیح وفضیلت حاصل ہے، مگر بتانا تو صرف یہ ہے کہ جب اس بات میں علماء کے ہاں اختلاف ہے کہ نماز افضل ہے یا روزہ؟ تو اب ظاہر ہے کہ نماز کے علاوہ اور کوئی بھی دوسرا عمل اور دوسرا رکن روزہ کی ہمسری نہیں کرسکتا۔

روزے کے فوائد اور اس کی حکمتیں:

کسی بھی عبادت اور کسی بھی عمل کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ اس سے اللہ رب العزت کی رضا وخوشنودی حاصل ہو جائے، اور پروردگار کی رحمت کاملہ اس عمل اور عبادت کے کرنے والے کو دین ودنیا، دونوں جگہ اپنی آغوش میں چھپالے۔

ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے روزہ کا فائدہ بھی بڑا ہی عظیم الشان ہوگا، مگر اس کے علاوہ روزے کے کچھ اور بھی روحانی اور دینی فوائد وحکمتیں ہیں جو اپنی اہمیت وعظمت کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں، لہٰذا ان میں سے کچھ فائدے بیان کیے جاتے ہیں۔

(۱) روزہ کی وجہ سے خاطر جمعی اور قلبی سکون حاصل ہوتا ہے، نفس امارہ کی تندی وتیزی جاتی رہتی ہے، اعضاء جسمانی اور بطور خاص وہ اعضاء جن کا نیکی اور بدی سے براہ راست تعلق ہوتا ہے، جیسے ہاتھ، زبان، کان اور ستر وغیرہ، سست ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے گناہ کی خواہش کم ہو جاتی ہے، اور معصیت کی طرف رجحان ہلکا پڑ جاتا ہے چنانچہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ”جب نفس بھوکا ہوتا ہے تو تمام اعضاء سیر ہوتے ہیں، یعنی انہیں اپنے کام کی طرف رغبت نہیں ہوتی اور جب نفس سیر ہوتا ہے تو تمام اعضاء بھوکے ہوتے ہیں، یعنی انہیں اپنے کام کی طرف رغبت ہوتی ہے“۔ اس قول کو وضاحت کے ساتھ یوں سمجھ لیجئے کہ جسم

کے جتنے اعضاء ہیں، قدرت نے انہیں اپنے مخصوص کاموں کیلئے پیدا کیا ہے، مثلاً آنکھ کی تخلیق دیکھنے کے لئے ہوئی ہے، گویا آنکھ کا کام دیکھنا ہے، لہٰذا بھوک کی حالت میں کسی بھی چیز کو دیکھنے کی طرف راغب نہیں ہوتی، ہاں جب پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے تو آنکھ اپنا کام بڑی رغبت کے ساتھ کرتی ہے، اور وہ ہر جائز و ناجائز چیز کو دیکھنے کی خواہش کرتی ہے، اسی پر بقیہ اعضاء کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(۲) روزہ کی وجہ سے دل، کدورتوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے، کیونکہ دل کی کدورت آنکھ، زبان اور دوسرے اعضاء کے فضول کاموں کی وجہ سے ہوتی ہے، یعنی زبان کا ضرورت سے زیادہ کلام کرنا، آنکھوں کا بلاضرورت دیکھنا، اسی طرح دوسرے اعضاء کا ضرورت سے زیادہ اپنے کام میں مشغول رہنا افسردگی دل اور رنجش قلب کا باعث ہے، اور ظاہر ہے کہ روزہ دار فضول گوئی اور فضول کام سے بچا رہتا ہے، اس طرح اس کا دل صاف اور مطمئن رہتا ہے اور پاکیزگی دل اور اطمینان قلب اچھے اور نیک کاموں کی طرف میلان و رغبت اور بلند درجات کے حصول کا سبب اور ذریعہ بنتا ہے۔

(۳) روزہ، مساکین و غرباء کے ساتھ حسن سلوک اور ترحم کا سبب ہوتا ہے، کیونکہ جو شخص کسی وقت بھوک کا غم جھیل چکا ہوتا ہے اسے اکثر و بیشتر وہ کربناک حالت یاد آتی ہے، چنانچہ جب وہ کسی شخص کو بھوکا دیکھتا ہے تو اسے خود اپنی بھوک کی وہ حالت یاد آ جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا جذبہ ترحم امنڈ آتا ہے۔

(۴) روزے دار اپنے روزے کی حالت میں گویا فقراء و مساکین کی حالت بھوک کی مطابقت کرتا ہے، بایں طور کہ جس اذیت اور تکلیف میں وہ مبتلا ہوتے ہیں، اسی تکلیف اور مشقت کو روزے دار بھی برداشت کرتا ہے، اس وجہ سے اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے، جیسا کہ ایک بزرگ بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں منقول ہے کہ ایک شخص ان کی خدمت میں سردی کے موسم میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ بیٹھے ہوئے کانپ رہے ہیں، حالانکہ ان کے پاس اتنے کپڑے موجود تھے جو ان کو سردی سے بچا سکتے تھے، مگر وہ کپڑے الگ رکھے ہوئے تھے، اس شخص نے یہ صورت حال دیکھ کر ان سے بڑے تعجب سے پوچھا

کہ ''آپ نے سردی کی اس حالت میں اپنے کپڑے الگ رکھ چھوڑے ہیں؟!'' انہوں نے فرمایا کہ: ''میرے بھائی! فقراء ومساکین کی تعداد بہت زیادہ ہے، مجھ میں اتنی استطاعت نہیں ہے کہ میں ان کے کپڑوں کا انتظام کروں، لہٰذا جو چیز میرے اختیار میں ہے اسی کو غنیمت جانتا ہوں کہ جس طرح وہ لوگ سردی کی تکلیف برداشت کررہے ہیں، اسی طرح میں بھی سردی کی تکلیف برداشت کررہا ہوں اور اس طرح میں ان کی مطابقت کررہا ہوں''۔

یہی جذبہ ہمیں ان اولیاء عارفین کی زندگیوں میں بھی ملتا ہے جن کے بارہ میں منقول ہے کہ وہ کھانے کے وقت ہر ہر لقمہ پر یہ دعائیہ کلمات کہا کرتے تھے کہ:

''اَللّٰھُمَّ لاَ تُؤَا خِذْنِیْ بِحَقِّ الْجَائِعِیْنَ''۔ ''یعنی اے اللہ! مجھ سے بھوکوں کے حق کے بارہ میں مواخذہ نہ کیجئے''۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہ میں منقول ہے کہ جب قحط سالی نے پورے ملک کو اپنے مہیب سایہ میں لے لیا، باوجودیکہ خود ان کے پاس بے انتہاء غلہ کا ذخیرہ تھا مگر وہ صرف اس لیے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتے تھے، کہ کہیں بھوکوں کا خیال دل سے اتر نہ جائے، نیز یہ کہ انہیں اس طرح بھوکوں اور قحط زدہ عوام کی تکلیف ومصیبت سے مشابہت اور مطابقت حاصل رہے۔ (مظاہر حق ج ۲ ص ۲۹۲ تا ۶۹۴)

مزید برآں لفظ ''رمضان'' کی وجہ تسمیہ اور اس کو بغیر لفظ ''شھر'' (مہینہ) کے استعمال کے جواز اور عدم جواز اور دیگر بہت سے علمی افادات ونکات کے لئے مطالعہ کیجئے:

(فتح الملھم بشرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۰۶، قاموس القرآن ص ۲۵۵، شرح النووی علی صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۴۶، الکامل لابن عدیؒ، فتح الباری ج ۴ ص ۹۶، عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۳۶۵)

(۱۴۷) ہم سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرپور ہے، خرچ کرنا اس میں نقصان واقع نہیں کرتا، تمہارا کیا خیال ہے کہ اس نے زمین وآسمان کے پیدا کرنے سے اب تک کتنا خرچ کیا ہوگا، لیکن اس سے اس میں کوئی کمی نہیں آئی جو اس کے داہنے ہاتھ میں ہے اور اس کا عرش پانی پر ہے اور اس کے

دوسرے ہاتھ میں فیض ہے، یا فرمایا: قبض کرنا ہے، بلند کرتا ہے اور پست کرتا ہے۔(صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی الماء ج ۱۰ قسطلانی ص ۳۷۲)

(۱۴۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے ابن آدم! تو خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کا داہنا ہاتھ بھر پور ہے، خوب عطا کرنے والا ہے، رات دن خرچ کرتا ہے، اسے کوئی چیز کم نہیں کر سکتی۔''

(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الحث علی النفقۃ وتبشیر المنفق بالخلف، حاشیہ القسطلانی ج ۴ ص ۳۵۹)

صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں آتا ہے، چنانچہ فرمایا:

(۱۴۹) ہم سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ پھر آپ نے چند احادیث ذکر کیں، جن میں سے ایک حدیث یہ بھی ذکر کی کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا داہنا ہاتھ بھر پور ہے، اسے کوئی چیز کم نہیں کرتی، رات دن خوب عطا کرنے والا ہے، تمہارا کیا خیال ہے کہ اس نے جب سے زمین وآسمان کو پیدا کیا ہے اس وقت سے کتنا خرچ کیا ہوگا، لیکن پھر بھی اس کے داہنے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، فرمایا: اس کا عرش پانی پر ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں روکنے کی قوت ہے جسے چاہتا ہے بلند کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے جھکا دیتا ہے''

فائدہ:

''تو خرچ کر، میں بھی تم پر خرچ کروں گا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا عوض اور بدل عطا فرماتے ہیں۔ حدیث میں مذکورہ لفظ'' لا تغیضھا'' کا معنی ہے کم ہونا اور کم کرنا، یہ لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔(عمدۃ القاری: ۱۸/۲۹۳) اور ''سَحَّآء'' کا معنی ہوتا ہے مسلسل بہنے والا۔(ایضاً)

''اور اللہ کا عرش پانی پر ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے سمندر ہے جس کی

مسافت پانچ سو میل کے برابر ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے مراد دنیا کا سمندر ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے پائے اس زمین کے سمندر میں ہیں۔

(تفسیر فتح البیان ۴/۳۲۷)

اگر چہ وہ نظر نہیں آتے لیکن نظر نہ آنا، عدم کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ اور ''میزان'' سے یا تو میزانِ عدل مراد ہے اور یا میزانِ رزق مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتے ہیں اسے اوپر کردیتے ہیں اور جس کے لیے چاہتے ہیں جھکا دیتے ہیں۔ (عمدۃ القاری ۱۸/۲۹۳)

(۱۵۰) حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' جب اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کی تو وہ ہلنے لگی، پھر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا فرما کر انہیں زمین پر کھڑا کیا، چنانچہ زمین ٹھہر گئی، فرشتوں کو پہاڑوں کی سختی سے بڑا تعجب ہوا، وہ کہنے لگے کہ ''ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ پروردگار نے فرمایا! ہاں، لوہا ہے'' انہوں نے پوچھا کہ ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے؟ پروردگار نے فرمایا، ہاں! آگ ہے'' پھر انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز آگ سے بھی زیادہ سخت ہے؟ پروردگار نے فرمایا! ہاں! پانی ہے'' پھر انہوں نے پوچھا کہ ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز پانی سے بھی زیادہ سخت ہے؟، پروردگار نے فرمایا: ہاں، ہوا'' پھر انہوں نے عرض کیا کہ: ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز ہوا سے بھی زیادہ سخت ہے؟ پروردگار نے فرمایا: ہاں! وہ ابنِ آدم کا صدقہ دینا ہے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنے دائیں ہاتھ سے مال خرچ کرتا ہے کہ اسے بائیں ہاتھ سے بھی چھپاتا ہے۔

(جامع الترمذی ج۲ ص ۲۴۱، ۲۴۲)

فائدہ:

''ابنِ آدم کا صدقہ دینا'' اس عمل کو سب سے زیادہ اس لیے سخت فرمایا ہے کہ انتہائی پوشیدگی کے ساتھ کسی کو صدقہ دینے میں نفس امارہ کی مخالفت، طبیعت ومزاج پر جبر

اور شیطان ملعون کی مدافعت لازم آتی ہے، جبکہ اس کے علاوہ مذکورہ بالا چیزوں یعنی پہاڑ، لوہا اور آگ وغیرہ میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ چھپا کر صدقہ دینے میں نفس کی مخالفت اور شیطان کی مدافعت بایں طور پر لازم آتی ہے کہ فطری طور پر نفس یہ چاہتا ہے کہ جب میں کسی کو مال دوں تو لوگ دیکھیں اور میری تعریف کریں تا کہ مجھے دوسرے لوگوں پر فخر و امتیاز حاصل ہو، لہٰذا جب اس نے عام نظروں سے چھپا کر اپنا مال کسی کو دیا تو اس نے گویا نفسِ امارہ کی مخالفت کی اور شیطان کو اپنے سے دور کیا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ زیادہ سخت اس لیے ہے کہ اس کی وجہ سے رضائے مولیٰ حاصل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ رضائے مولیٰ سب سے بڑی چیز ہے۔

(مظاہر حق ج۲ ص ۲۷۷)

(۱۵۱) حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیجی کہ ان تین جگہوں میں سے آپ جہاں ٹھہر جائیں گے وہی جگہ آپ کیلئے دارالہجرت (مقام ہجرت) قرار دی جائے گی: مدینہ منورہ، بحرین یا قنسرین۔ (جامع الترمذی، باب فضل المدینۃ ج ۲، ص ۲۲۷)

ظلم اور رشوت ستانی پر وعید:

(۱۵۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر وہ حاکم جو لوگوں پر اپنا حکم و فیصلہ جاری اور نافذ کرتا ہے قیامت کے روز اس طرح پیش کیا جائے گا کہ ایک فرشتہ اسکی گدی پکڑے ہوگا، پھر وہ فرشتہ اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے گا (یہاں تک کہ) اگر اللہ تعالیٰ یہ حکم دے گا کہ اس کو (دوزخ میں) ڈال دو تو وہ اس کو (دوزخ کے) گڑھے میں ڈال دے گا جو چالیس برس (کی مسافت) کے برابر گہرا ہوگا۔''

(سنن ابن ماجہ ج۲ ص ۲۶، مشکوٰۃ المصابیح، باب العمل فی القضاء والخوف منہ ص ۳۲۵)

فائدہ:

''پھر وہ فرشتہ آسمان کی طرف اپنا سر اٹھائے گا'' سے فرشتہ کی اس حالت کو بیان

کرنا ہے جس میں وہ حکمِ خداوندی کا منتظر ہوگا، یعنی جس طرح بادشاہ کے ہاں یہ درباری آداب میں سے ہے کہ جب وہاں کوئی ملزم پیش کیا جاتا ہے تو بادشاہ خود بلند جگہ پر متمکن ہوتا ہے اور اس کا خادم اس ملزم کو اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور پھر اس بادشاہ کی طرف نگاہ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ انتظار کرتا ہے کہ بادشاہ و حاکم کی طرف سے کیا حکم اور فیصلہ صادر ہوتا ہے، اسی طرح وہ فرشتہ بھی اس حاکم کو بارگاہِ رب العزت میں پیش کر کے اس انتظار میں کھڑا رہے گا کہ اس کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے!۔

''چالیس برس کے بقدر'' سے مراد اس گڑھے کی گہرائی کو زیادہ سے زیادہ کر کے بیان کرنا ہے، نہ کہ اس سے مدت کی تحدید و تعیین مراد ہے۔ اس حدیث میں جس حاکم کا انجام بیان کیا گیا ہے وہ ظالم حاکم ہے، عادل و انصاف پرور حاکم کے بارے میں یہ حکم دیا جائے گا کہ اس کو بہشت میں پہنچا دیا جائے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ المصابیح کی کتاب الامارۃ و القضاء میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے واضح ہوتا ہے۔ (مظاہر حق ج ۳ ص ۶۹۲)

(۱۵۳) حضرت بُسر بن جَحّاش رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہتھیلی پر اپنا لعاب دھن ڈالا، پھر اپنی انگشتِ شہادت اس پر رکھ کر فرمایا ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں'' ابن آدم مجھے کہاں عاجز کر سکتا ہے حالانکہ میں نے اسے اس جیسی چیز سے پیدا کیا ہے، پھر جب تمہارا سانس یہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ (یہ کہہ کر آپؐ نے گلہ کی طرف اشارہ فرمایا) تو تم یہ کہنے لگتے ہو میں صدقہ کرتا ہوں، لیکن اب صدقہ کا وقت کہاں رہا؟''

(رواہ النسائی)

(۱۵۴) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے ابن آدم! دو چیزیں ایسی ہیں کہ تیرے اختیار میں ان میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ میں نے جب تمہارے سانس کی نالی کو پکڑا تو میں نے مال کا ایک حصہ تمہارے لیے مخصوص کر دیا تھا تا کہ اس کے ذریعہ تمہیں پاک کروں اور پاکیزہ بناؤں اور تمہاری عمر پوری ہونے پر تمہارے اوپر اپنے بندوں کی نماز (جنازہ) کو لازم کر دیا''

(رواہ النسائی فی باب الوصیۃ)

(۱۵) روزوں کی فضیلت

(۱۵۵) اعرج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''روزہ ایک ڈھال ہے، لہٰذا وہ (روزے دار) نہ بے ہودہ بات کرے اور نہ جاہلوں جیسے کام کرے، اور کوئی شخص اس سے جھگڑنے لگے یا اسے برا بھلا کہنے لگے تو اسے یہ کہہ دے کہ میں روزے دار ہوں، دو مرتبہ فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے، وہ اپنا کھانا پینا اور خواہشات میری خاطر ترک کرتا ہے، روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور ایک نیکی کا بدلہ دس گناہ ملتا ہے''۔

(صحیح البخاری، کتاب الصوم، فضل الصوم ج ۲ ص ۲۴)

(۱۵۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کے تمام اعمال اس کے لیے ہیں سوائے روزے کے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کی ہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے''۔

(صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب ما یذکر فی المسک ج ۷ ص ۱۶۴)

(۱۵۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، وہ اپنی خواہشات اور کھانا پینا میری خاطر چھوڑتا ہے، اور روزہ ایک ڈھال ہے اور روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی اس وقت ہوتی ہے جب وہ افطار کرتا ہے اور ایک خوشی اس وقت جب وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرے گا، اور روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں مُشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے''۔ (صحیح البخاری، کتاب التوحید ج ۹ ص ۱۴۳)

(۱۵۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے روزے دار کے منہ کی بو اللہ جل شانہٗ کے ہاں

مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے۔" (موطاء الامام مالک، باب جامع الصیام ج ص ۱۲۴)

(۱۵۹) ایک روایت میں اس طرح آتا ہے: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ (روزدار) اپنی خواہشات اور کھانا پینا میرے لیے چھوڑتا ہے، لہٰذا روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا سے (لے کر) سات سو گنا تک ہے سوائے روزے کے، کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔"

(۱۶۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انسان کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزے کے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے"۔ (صحیح مسلم، کتاب الصوم، باب فضل الصیام ج۵ ص ۳۲)

(۱۶۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے کہ: انسان کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزے کے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور روزہ ایک ڈھال ہے، لہٰذا جب تم میں سے کسی کے روزے کا دن ہو تو اسے چاہیے کہ نہ تو بے ہودہ باتیں کرے اور نہ شور و شغب کرے، پھر اگر کوئی شخص اسے برا بھلا کہے یا اس سے لڑے تو اسے کہہ دینا چاہیے کہ میں روزے دار ہوں اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، روزدار کے منہ کی بو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے اور روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں جن کی وجہ سے وہ خوش ہوگا، ایک خوشی جب وہ افطار کرے گا، اور جب وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرے گا تو اپنے روز کی وجہ سے خوش ہوگا" (ایضاً)

(۱۶۲) ایک روایت میں فرمایا ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا تو اللہ تعالیٰ اسے روزہ کا بدلہ عطا فرمائیں گے جس سے وہ خوش ہو جائے گا۔"

(۱۶۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "ہر نیکی کی اجر دس گنا

سے سات سو گنا تک ملتا ہے، اور روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، روزہ دوزخ سے بچانے کے لیے ڈھال ہے اور روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے اور اگر کوئی جاہل شخص تم میں سے کسی روزے دار کے سامنے جہالت کا اظہار کرے تو اسے چاہیے کہ کہہ دے میں روزے دار ہوں۔''

(جامع الترمذی، باب فضل الصوم ج ۱ ص ۱۴۷)

(۱۶۴) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، میرے ہاں میرے بندوں میں سے سب سے محبوب وہ ہیں جو زیادہ جلدی افطار کرتے ہیں''۔ (ایضاً)

(۱۶۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن آدم کے ہر عمل کا ثواب بڑھتا رہتا ہے، ایک نیکی کا اجر دس گنا سے سات سو گنا تک اور اس سے زیادہ جتنا اللہ کو منظور ہو، ملتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سوائے روزے کے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا، روزے دار اپنی خواہشات اور کھانا میری خاطر چھوڑتا ہے، روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی افطار کے وقت اور ایک خوشی اس وقت جب وہ اپنے رب سے ملاقات کرے گا اور روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں مُشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے۔''

(سنن ابن ماجه، باب فضل الصیام، ج ۱ ص ۲۵۸، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الصوم ص (۱۷۳)

(۱۶۶) امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مختصراً بھی نقل کیا ہے مگر اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ ''وہ اپنی خواہشات اور کھانا چھوڑتا ہے۔'' (باب فضل العمل ج ۲ ص ۲۲۳)

(۱۶۷) امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے متعدد روایات کے ساتھ نقل کیا ہے: چنانچہ پہلی روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، اور روزے دار کے لئے دو خوشیاں ہیں، ایک اس وقت جب وہ افطار کرتا ہے اور ایک اس وقت جب وہ اپنے رب سے ملے گا اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے،

روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے۔"

(سنن النسائي، باب فضل الصيام ج ۴ ص ۱۵۸)

(۱۶۸) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔" روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں، جب وہ افطار کرتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور جب وہ اپنے پروردگار سے ملے گا اور وہ اسے روزے کا بدلہ عطا کرے گا تو خوش ہوگا اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے"۔(ایضاً)

(۱۶۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:" اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا: ابنِ آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزے کے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، روزہ ایک ڈھال ہے لہٰذا جب تم میں سے کسی شخص کے روزے کا دن ہو تو اسے چاہیے کہ فحش گوئی نہ کرے اور نہ ہی شور وشغب کرے، پھر اگر کوئی شخص اسے برا بھلا کہے یا اس سے لڑے تو اسے چاہیے کہ یہ کہہ دے کہ میں روزے دار آدمی ہوں، اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے، روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے۔(ایضاً)

فائدہ:

نیک عمل کے اجر وثواب کے سلسلہ میں ادنیٰ درجہ دس کا ہے کہ نیکی تو ایک ہو مگر اجر وثواب اس کا دس گنا ملے، پھر اس کے بعد نیک عمل کرنے والے کے صدق وخلوص پر انحصار ہوتا ہے کہ اس کی ریاضت ومجاہدہ اور اس کے خلوص اور صدقِ نیت میں جتنی پختگی اور کمال بڑھتا رہتا ہے اسی طرح اس کے اجر وثواب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ بعض حالات میں ایک نیکی پر سات سو گنا ثواب ملتا ہے گویا یہ آخری درجہ ہے لیکن بعض مقامات اور اوقات ایسے بھی ہیں جہاں کی جانے والی ایک نیکی پر اس سے بھی زیادہ اجر وثواب عطا

کیا جاتا ہے، چنانچہ منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک نیک عمل کے بدلہ میں ایک لاکھ نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ کہ ''سوائے روزہ کے'' اس سے روزہ کے ثواب کی اہمیت و فضیلت کی طرف اشارہ ہے کہ روزے کا ثواب بے انتہاء اور لامحدود ہے جس کی مقدار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

روزے کی یہ بے انتہاء فضیلت کیوں ہے؟ اس کے دو سبب ہیں: اوّل یہ کہ روزہ دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے، برخلاف دوسری عبادتوں کے کہ ان میں یہ وصف نہیں ہے، جتنی بھی عبادات ہیں وہ کسی نہ کسی طرح دوسرے لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں جبکہ روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ صرف روزے دار ہی کو ہوتا ہے، لہٰذا ''روزہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے'' کہ اس میں ریا کاری، نمود و نمائش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد کہ ''روزہ میرے لیے ہے'' کے ذریعہ اسی طرف اشارہ فرمایا کہ روزہ خاص میرے ہی لیے ہے، کیونکہ روزہ تو صورۃً اپنے لیے وجود نہیں رکھتا جبکہ دوسری عبادتیں صورۃً اپنے لیے وجود رکھتی ہیں۔ دوم یہ کہ روزہ میں نفس کشی اور جسم و بدن کا ہلکان و نقصان ہوتا ہے، نیز روزہ کی حالت میں انتہائی کرب و تکلیف کی صورتیں بھوک پیاس پیش آتی ہیں اور ان پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ دوسری عبادتوں میں نہ اتنی تکلیف و مشقت ہوتی ہے اور نہ اپنی خواہش و طبیعت پر اتنا جبر، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد کہ ''اپنی خواہش کو چھوڑتا ہے'' کے ذریعہ اسی طرف اشارہ فرمایا کہ روزے کی حالت میں جو چیزیں ممنوع ہیں وہ ان سب سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔

افطار کے وقت روزے دار کو خوشی دو وجہ سے ہو سکتی ہے، یا تو اس لیے کہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب روزے دار اپنے آپ کو اللہ رب العزت کے حکم اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ محسوس کرتا ہے یا پھر یہ کہ وہ عبادت کی توفیق اور اس کی نورانیت کی وجہ سے اپنے آپ کو مطمئن اور مسرور محسوس کرتا ہے جو ظاہر ہے کہ خوشی کا سبب ہے۔

اس کے علاوہ دنیاوی اور جسمانی طور پر بھی یوں خوشی محسوس ہوتی ہے کہ دن بھر کی

بھوک و پیاس کے بعد اسے کھانے پینے کو ملتا ہے۔

حدیث کے آخری جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص روزے دار کو برا بھلا کہے یا اس سے لڑنے کا ارادہ کرے تو وہ اس شخص کو انتقاماً برا بھلا نہ کہے اور نہ اس سے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو جائے بلکہ اس شخص سے یہ کہے کہ میں روزے دار ہوں، اور یہ بات یا تو زبان سے کہے تاکہ دشمن اپنے ناپاک ارادوں سے باز رہے، کیونکہ جب روزے دار اپنے مقابل سے یہ کہے گا کہ میں روزے دار ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں چونکہ روزے دار ہوں، اس لیے میرے لیے تو جائز نہیں ہے کہ میں تم سے لڑوں، جھگڑوں، اور جب میں خود لڑنے جھگڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں تو تمہارے لیے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ ایسی صورت میں تم مجھ سے لڑائی جھگڑے کا ارادہ کرو، کیونکہ یہ اصول و مروّت کے خلاف ہے، ظاہر ہے کہ یہ انداز دشمن کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے غلط ارادہ سے باز رہے۔ یا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں چونکہ روزے دار ہوں اس لیے اس وقت تمہارے لیے زبان درازی مناسب نہیں ہے، کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے حفظ وامان میں ہوں۔ یا پھر یہ کہ ایسے موقع پر روزے دار اپنے دل میں یہ کہے کہ میں تو روزے دار ہوں، میرے لیے یہ بات نامناسب ہے کہ میں روزہ کی حالت میں کسی سے لڑائی جھگڑا کروں یا کسی کو اپنی زبان سے برا بھلا کہوں۔

حدیث میں مذکورہ لفظ ''الا الصوم'' (سوائے روزے کے) کے سلسلہ میں شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حدیث کے بعض شارحین اس موقع پر کہتے ہیں کہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ روزے کی یہ خصوصیت کس بناء پر ہے؟ تاہم ہمارے اوپر یہ بات واجب اور لازم ہے کہ بغیر کسی شک وشبہ کے ہم اس کی تصدیق کریں، البتہ بعض علماء محققین نے اس خصوصیت کے کچھ اسباب بیان کیے ہیں: چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ روزہ ہی وہ عبادت ہے جو ایامِ جاہلیت میں بھی اہل عرب کے ہاں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے مخصوص تھی، یعنی جس طرح کفار ومشرکین سجدہ وغیرہ اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کے لیے بھی کرتے تھے اس طرح وہ روزہ میں بھی اللہ کے علاوہ کسی کو شریک نہیں کرتے تھے بلکہ

روزہ صرف اللہ ہی کے لیے رکھتے تھے۔

اس طرح اس نکتہ کے ذریعہ بھی اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ درحقیقت جو شخص روزہ رکھتا ہے اور وہ اس طرح محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر اپنا کھانا پینا اور دوسری خواہشات کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ ایک طرح کی لطافت اور پاکیزگی حاصل کرتا ہے اور گویا وہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے اوصاف و خُلق کے ساتھ مشابہت اختیار کرتا ہے، جس طرح اللہ رب العزت کھانے پینے سے منزہ اور پاک ہیں اسی طرح وہ بھی دن میں اپنے آپ کو دنیاوی خواہشات و علائق سے منزہ رکھتا ہے، لہٰذا اس سبب سے روزہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔

ابھی اوپر گزرا کہ عرب کے مشرکین بھی روزہ میں کسی کو اللہ کا شریک نہیں کرتے تھے، لیکن آج روزہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہیں رہ گیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اب بعض بزرگوں کے نام پر اور ان کے لیے بھی روزہ رکھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ضلالت و گمراہی کے اس راستے سے بچائے اور صرف اپنی مرضیات کا تابع اور پابند بنائے۔ (آمین)

(مظاہر حق ج ۲ ص ۲۹۶ تا ص ۲۹۸)

(۱۶) مزدلفہ میں آنحضرت ﷺ کی دُعا کی قبولیت اور ابلیس لعین کا واویلا

(۱۷۰) حضرت عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عرفہ کی شام کو اپنی امت کے لیے بخشش کی دُعا مانگی جو قبول کر لی گئی اور (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) میں نے آپ ﷺ کی امت کو بخش دیا، علاوہ بندوں کے حقوق کے کہ میں ظالم سے مظلوم کا حق لوں گا۔

آنحضور ﷺ نے عرض کیا کہ میرے پروردگار! اگر تو چاہے تو مظلوم کو جنت کی نعمتیں عطا فرمادے اور ظالم کو بھی بخش دے، مگر عرفہ کی شام کو یہ دُعا قبول نہیں کی گئی، جب مزدلفہ میں صبح ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے پھر وہی دُعا مانگی۔" اور آپ ﷺ نے جو چیز مانگی وہ عطا فرمادی گئی" (راوی) کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہنسے، یا (راوی نے) یہ کہا کہ آپ ﷺ مسکرائے، (یہ دیکھ کر) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، یہ ایسا وقت ہے جس میں آپ ہنستے نہیں تھے، پھر کس چیز نے آپ ﷺ کو ہنسایا؟ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ ﷺ کے دانتوں کو ہنستا رکھے۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "دشمن خدا ابلیس کو جب یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی ہے اور میری امت کو بخش دیا ہے تو اس نے مٹی لی اور اسے اپنے سر پر ڈالنے لگا اور واویلا کرنے چیخنے چلانے لگا، چنانچہ اس کی بدحواسی اور اضطراب نے مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔"

(سنن ابن ماجه، باب الدعاء بعرفة ج ۲ ص ۲۲۳، مشكوٰة المصابيح، باب الوقوف بعرفة ص ۲۲۹)

فائدہ:

چونکہ اس حدیثِ مبارک کے ظاہری مفہوم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امت کو مغفرت عام سے نوازا گیا ہے کہ حقوق اللہ بھی بخش دیئے اور حقوق العباد بھی، اس لیے بہتر یہ ہے کہ حدیث کے مفہوم میں یہ قید لگائی جائے کہ اس مغفرتِ عام کا تعلق ان لوگوں کے

ساتھ ہے جو اس سال حج کے موقع پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے یا یہ بات اس شخص کے حق میں ہے جس کا حج مقبول ہو، بایں طور کہ اس کے حج میں فسق و فجور کی کوئی بات نہ ہوئی ہو۔

یا پھر یہ کہ یہ مفہوم اس ظالم پر محمول ہے جس کو توبہ تائب ہونے کی توفیق نصیب ہوئی اور اس نے صدقِ نیت اور اخلاص دل کے ساتھ توبہ تو کی ہو مگر حق کی واپسی سے عاجز اور معذور رہا ہو، پھر یہ کہ رحمتِ خداوندی جسے چاہے اپنے دامن میں چھپا سکتی ہے، جیسا کہ فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ"

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے ہاں شرک کے علاوہ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔''

حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ، آنحضرت ﷺ کی شفاعت اور مغفرتِ عام کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت ہر مسلمان کو حاصل ہوگی خواہ وہ صالح اور نیک ہو یا گنہگار، اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے جنت میں صالح اور نیک کار لوگوں کے درجات بلند کرے گا اور اکثر گنہگاروں کو بخش کر جنت میں داخل کرے گا، اب رہ گئے وہ لوگ جو دوزخ میں ہوں گے تو ان کے حق میں آنحضرت ﷺ کی شفاعت کا اثر یہ ہوگا کہ ان کے عذاب میں تخفیف اور مدتِ عذاب میں کمی کردی جائے گی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش بھی ان شاء اللہ ہر مسلمان کو حاصل ہوگی خواہ وہ صالح ہو یا گنہگار، اس کی صورت یہ ہوگی کہ جنت میں صالح اور نیک کار لوگوں کے درجات اس جزاء اور انعام سے زیادہ بلند ہوں گے جس کا وہ اپنے نیک اعمال کی وجہ سے مستحق ہوگا اور فاجر و گنہگاروں کے حق میں اس کی مغفرت یہ ہوگی کہ یا تو انہیں اپنے فضل و کرم سے بغیر عذاب ہی کے جنت میں داخل کردے گا یا پھر ان کے عذاب کی شدت میں کمی کردے گا، جو مغفرت ہی کی ایک نوع ہے۔ (مظاہر حق ج ۲ ص ۷۰۹)

(۱۷۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ''ایسا کوئی دن نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ بندہ کو عرفہ کے دن سے زیادہ آگ سے آزاد کرتا ہو اور بلاشبہ (اس

دن) اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت اور مغفرت کے ساتھ) بندوں کے قریب ہوتا ہے، پھر فرشتوں کے سامنے ان (حج کرنے والوں) پر فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ (یہ جو کچھ بھی چاہتے ہیں میں انہیں دوں گا)'' (رواہ النسائی)

(۱۷۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ عرفات میں اپنی مُخضرمہ اونٹنی (قصوا نامی اونٹنی) پر سوار تھے کیا تم جانتے ہو، یہ کون سا دن ہے؟ اور یہ کون سا مہینہ ہے؟ اور یہ کون سا شہر ہے؟ انہوں نے عرض کیا: یہ بلدِ حرام ہے، یہ شہرِ حرام (حرمت والا مہینہ) ہے اور یومِ حرام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سنو! تمہارے مال اور خون تم پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے اس مہینہ کی حرمت، تمہارے اس شہر میں، تمہارے اس دن میں، سنو! میں حوضِ کوثر پر تمہارا میر ساماں ہوں گا اور تمہاری کثرت کی وجہ سے اور امتوں پر فخر کروں گا، لہٰذا تم میرا چہرہ سیاہ نہ کرنا، سنو! میں کچھ لوگوں کو بچانا چاہوں گا اور کچھ لوگ مجھ سے چھڑائے جائیں گے، میں کہوں گا کہ اے میرے پروردگار! یہ میرے ساتھی ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ آپ کو کیا معلوم کہ ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کیا کیا بدعات ایجاد کیں''۔

(سنن ابن ماجه، باب الخطبة يوم النحر ج ۲ ص ۱۲۹)

فائدہ:

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس دن، مہینہ اور شہر کا سوال اس لیے کیا تا کہ ان چیزوں کی حرمت و عظمت خوب اچھی طرح ان کے ذہنوں میں جاگزیں بھی ہو جائے اور آنے والے ارشاد کو خوب توجہ سے سن سکیں۔

''میں حوضِ کوثر پر تمہارا میر ساماں ہوں گا'' یہ اس لیے فرمایا تا کہ تمہارے لیے تیاری کروں اور تم اس حوضِ کوثر سے سیراب ہو سکو اور دیگر امتوں پر تمہاری کثرت کی بناء پر فخر کروں، لہٰذا گناہ اور نافرمانی کر کے حوضِ کوثر سے محروم ہو کر مجھے روسیاہ نہ کرو، پھر میں کچھ لوگوں کی سفارش کر کے بچالوں گا، لیکن کچھ لوگوں نے بہت سی بدعات اور خرافات کی ہوں

گی جس کی وجہ سے میں ان کی سفارش نہ کروں گا، لہٰذا میرے نقشِ قدم پر چلو اور میری اتباع اور پیروی کرو اور میرے بعد الٹے پاؤں پھر کر کفر اور ضلالت کے گڑھے میں نہ جا پڑنا۔ (واللہ اعلم)

(۱۷) جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت

اور شہداء کا مقام ومرتبہ

(۱۷۳) ابوزرعہ بن عمرو رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو ضمانت دی ہے جو اس کے راستہ میں نکلتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان اور اس کی رسولوں کی تصدیق ہی (اللہ کی راہ میں) نکالتی ہو اور کوئی غرض نہ ہو کہ یا تو اسے اجر وثواب اور مالِ غنیمت دے کر واپس لوٹائیں گے یا اسے جنت میں داخل فرمائیں گے اور اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا خوف نہ ہوتا تو میں کسی غزوہ سے پیچھے نہ رہتا اور میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں''

(صحیح البخاری، باب الجهاد من الایمان، ج ۱ ص ۱۲، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجهاد ص ۳۲۹)

فائدہ: (جہاد کا لغوی وشرعی معنیٰ)

جُهد اور جِهاد کے لغوی معنیٰ ہیں مشقت اٹھانا اور طاقت سے زیادہ بوجھ لادنا، امام راغب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ الجهاد استفراغ الوسع فی مدافعة العدو یعنی جہاد کا مطلب ہے، انتہائی قوت سے حملہ آور دشمن کی مدافعت کرنا، اصطلاح شریعت میں ''جہاد'' کا مفہوم ہے، ''کفار کے ساتھ لڑی جانے والی لڑائی میں اپنی طاقت خرچ کرنا، بایں طور کہ خواہ اپنی جان کو پیش کیا جائے یا اپنے مال کے ذریعہ مدد کی جائے اور خواہ اپنی عقل وتدبیر کا تعاون دیا جائے یا محض اسلامی لشکر میں شامل ہو کر اس کی نفری میں کثرت اور اضافہ کیا جائے اور یا ان کے علاوہ کسی بھی طریقہ سے دشمنان اسلام کے مقابلہ میں اسلامی لشکر کی معاونت اور حمایت کی جائے۔'' (مفردات القرآن للامام الراغب الاصفهانی، تفسیر المنارج ۱ ص ۱۵۶، مجمع بحار الانوار ج ۱ ص ۴۱۰)

اور جہاد کا نصب العین یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ خدا کا بول بالا رہے، خدا کی اس

سرزمین پر اسی کا جھنڈا سر بلند اور اس کے باغی منکروں کا دعویٰ سرنگوں رہے“۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”جہاد کی دو قسمیں ہیں“ (۱) جہاد مع النفس اور (۲) جہاد مع اہل الکفر، جہاد مع النفس سے انسان اپنے آپ کو اللہ کے احکام کا تابع بنالیتا ہے اور اسی جہاد مع النفس پر جہاد کی دوسری قسم موقوف ہے، انسان اپنے سب سے بڑے دشمن ”نفس“ کو جب مرضیات الٰہی کا تابع بنائے تو جہاد مع الکفار سے بھی اس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہوتا ہے اور حُسنِ مقصد کی وجہ سے مال و زر کے لالچ، عصبیت، انتقام، خونریزی اور اس قسم کے اور اندیشے ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے جہادِ حقیقی (جہاد مع الکفار) اور اس کے موقوف علیہ (جہاد مع النفس) کو اسی ترتیب سے ذہن نشین کر دیا ہے۔)

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ“ [النساء: ۷۷]

”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ اُن سے یہ کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو تھامے رکھو اور نمازوں کی پابندی کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو“۔

مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے کافر، مسلمانوں کو بہت ستاتے تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے، مسلمان آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور رخصت مانگتے کہ ہم کفار سے مقابلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں، آپ ﷺ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے کہ مجھ کو ابھی مقابلہ کا حکم نہیں ہوا، بلکہ صبر اور درگزر کرنے کا حکم ہے، اور فرماتے کہ نماز اور زکوٰۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے۔ اس کو برابر کیے جاؤ، کیونکہ جب تک آدمی اطاعتِ خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد کرنے کا اور تکالیف جسمانی کا خوگر نہ ہو اور اپنے مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کو جہاد کرنا اور اپنی جان کا دینا بہت دشوار ہے، تعلیم کا یہ حصہ ”جہاد مع النفس“ پر مشتمل ہے جو جہاد بالکفار سے پہلے تلقین کیا گیا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں، ”**یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ**“ [المائدۃ: ۳۵] ”اے ایمان والو! اللہ

سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا کرو‘‘۔ ’’وسیلہ‘‘ کی تفسیر ابن عباسؓ، مجاہد، ابو وائلؒ، حسنؒ، وغیرہم اکابر سلف نے ’’قربت‘‘ سے کی ہے تو وسیلہ ڈھونڈنے کے معنی یہ ہوں گے کہ فرماں برداری، اطاعت اور پسندیدہ اعمال سے اس کا قرب و وصول حاصل کرو اور یہ تمام ’’جہاد مع النفس‘‘ کی صورتیں ہیں، جن سے انسان کو قربت حاصل ہوتی ہے اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ ’’وسیلہ‘‘ جنت میں ایک نہایت ہی اعلیٰ منزل ہے جو دُنیا میں کسی ایک بندہ کو ملے گی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اذان کے بعد میرے لیے خدا سے وہی مقام طلب کیا کرو، تو اس مقام کا نام بھی ’’وسیلہ‘‘ اس لئے رکھا گیا کہ جنت کی تمام منزلوں میں وہ سب سے زیادہ عرشِ رحمان کے قریب ہے، اور حق تعالیٰ کے مقامات میں سب سے بلند واقع ہے۔

’’اِتَّقُوا اللّٰهَ‘‘ کے بعد ’’وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ‘‘ فرمایا، یعنی اس کی ناخوشی اور بُعد و ہجر سے ڈر کر قرب و وصول حاصل کرنے کی کوشش کرو اور ظاہر ہے کہ کسی چیز سے قریب ہم اسی وقت ہو سکتے ہیں جبکہ درمیانی راستہ قطع کر لیں جس پر چل کر اس کے پاس پہنچ سکتے ہوں، اس کو فرمایا، وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ ‘‘ اس آیت سے پہلے دو رکوع میں یہود کی حالت ذکر کی گئی ہے کہ آپس میں خونریزی اور بیرونی مقابلہ سے تقاعد پر اُتر آئے ہیں، مگر مخالفوں کے روبرو نہیں ہو سکتے اور لڑنے کی قوت اپنے اندر صرف کرتے ہیں۔

اب اس آیت میں مسلمانوں کو خاص طور پر متنبہ کیا جاتا ہے کہ ہر ایک اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اقرب الی اللہ بننے کو نصب العین بنائے اور اجتماعی زندگی میں اقرب الی اللہ کو تلاش کیا جائے اور اسے ہی امام بنایا جائے جو حق کے راستہ میں ہر طرح کی قربانی اور شہوات ورذائل سے پاک رہ کر ’’جہاد مع النفس‘‘ کے میدان میں امامت وراہنمائی کر سکے، اس ترتیب کے ساتھ جب تم آگے بڑھو گے تو اِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا‘‘ جیسے بزدلانہ جملے نہیں کہو گے، چنانچہ سردرِ کائنات ﷺ جب ’’جہاد مع الکفار‘‘ کے فضائل ارشاد فرماتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کرتے تھے، چونکہ اس اجازت سے پہلے وہ نماز، زکوٰۃ کی پابندی اور شہوات ورذائل

سے اجتناب کے خوگر بن چکے تھے، اس لئے جہاد بالسیف اور جہاد مع الکفار کے قریب ایک مثالی شجاعت، استقامت، اسلامی حمیت اور سرفروشی کا مظاہرہ انہوں نے کیا۔

مزید فرماتے ہیں کہ (حدیث میں مذکور جملہ) ''**انتدب اللّٰہ لمن خرج فی سبیلہ لا یخرجہ الا ایمان بی وتصدیق برسلی** ''اللہ نے یہ بات اپنے ذمہ لی ہے کہ جو شخص میرے راستے میں جہاد کیلئے نکلے اور اس کے نکلنے کا باعث مجھ پر ایمان اور میرے رسولوں کی تصدیق کے سوا اور کوئی چیز نہ ہو۔''

''اِنتدبَ'' بمعنی ''تَکَفَّلَ'' ہے، دوسری روایت میں ''تکفّل'' کا لفظ بھی آیا ہے۔ ''انتداب'' کہتے ہیں سرعت کے ساتھ اجابت کو، مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کا خروج محض ایمان باللہ اور تصدیق بالرسل کے نتیجہ میں ہو اور نکلنے والے کا اعلاء کلمۃ اللہ کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہو، اللہ پر ایمان اور بشارتِ پیغمبرؐ پر اعتقاد رکھتے ہوئے نہ سلطنت کا طالب نہ مال و جاہ کی غرض، بلکہ خالصاً لوجہ اللہ نکلے۔

(حدیث میں مذکور جملہ) '' **اَنْ ارجعہ بما نال من اجر أو غنیمۃ**'' اس کو اجر دے کر واپس لوٹا دوں گا یا اس کو جنت میں داخل کر دوں گا۔

اس حدیث میں اجر کی مقدار کا ذکر نہیں ہوا، ابو داؤد میں ایک روایت ہے کہ اگر اللہ کے لیے جہاد کرنے والے کو غنیمت ملی اور وہ واپس آ گیا تو اسے دو تہائی اجر مل گیا اور ایک ثلث آخرت کے لئے محفوظ ہو گیا اور اگر اس مجاہد فی سبیل اللہ کو غنیمت نہیں ملی تو اس کا پورا اجر محفوظ رہے گا۔

شبہ ءتعارض اور اس کا حل:

ابو داؤد کی روایت کا بظاہر بخاری کی اس حدیث سے کچھ تعارض معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہاں غنیمت اور اس کے ساتھ پورا اجر سمجھ میں آتا ہے۔ اور ابو داؤد کی حدیث سے دو تہائی اجر کا دنیا ہی میں مل جانا معلوم ہوتا ہے؟

سمجھ میں یہی آتا ہے کہ ابو داؤد کی روایت صحیح ہے، کیونکہ یہاں تو صرف یہ بیان

کرنا مقصود ہے کہ مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے بہر صورت کامیابی ہے کسی صورت ناکامی نہیں، شہادت مل جائے تو عظیم منصب پر فائز ہو گئے اور اگر سلامت رہ گئے تو اجر وغنیمت دونوں ہاتھ آ گئے، یا غنیمت نہیں ملی تو اجرِ آخرت محفوظ ہے، یہ وہی مضمون ہے جو قرآن میں آیا ہے۔

''قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ.

(التوبہ: ۵۲)

''آپ فرما دیں کہ تم تو ہمارے حق میں دو بہتریوں میں سے ایک کے منتظر رہتے ہو اور ہم تمہارے حق میں اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہاں سے تم پر عذاب نازل کرے یا ہمارے ہاتھوں سے، تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔''

اس آیت سے پہلے کی آیتوں کا مضمون یہ ہے کہ ''یہ اسلام کے دشمن مسلمانوں کی مصیبت پر خوش اور ان کی راحت پر مغموم ہوتے ہیں، اے پیغمبرؐ! انہیں کہہ دیجئے کہ ہمارا عقیدہ اللہ پر ہے، ہمیں جو چیز پہنچے گی وہ اللہ کے حکم سے پہنچے گی اور اس میں ہمارے لیے کوئی نہ کوئی بہتری ہوگی۔'' اب اس آیت میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی راحت اور رنج دونوں ہمیں محبوب ہیں، اور ہم تو اس بات کے منتظر ہیں کہ تم پر کب عذاب نازل ہوتا ہے یا ہمیں کب حکم دیا جاتا ہے کہ تمہیں سزائیں دیں، سختی یا نرمی جو جس وقت کیلئے مقدر ہے وہ تو ٹل نہیں سکتی، ہماری گردنیں اس کے حکم اور فیصلے کے سامنے پست ہیں، کوئی سختی ہمیں اس کی فرماں برداری سے باز نہیں رکھ سکتی۔

یقین ہے کہ وہ عارضی سختی کو آخرت میں بالیقین اور بسا اوقات دنیا میں بھی راحت وخوشی سے بدل دے گا، اندریں صورت تم ہماری نسبت دو بھلائیوں میں سے ایک کی ضرور امید کر سکتے ہو، اگر خدا کے راستے میں مارے گئے تو شہادت وجنت اور واپس آئے تو اجر یا غنیمت ضرور مل کر رہے گی، اللہ نے مجاہد کیلئے اس کا ''انتداب وتکفل'' فرمایا ہے۔

شبہ:

اس حدیث میں مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِیْمَۃٍ (کالفظ) آیا ہے۔ اجر و غنیمت میں کوئی منافات نہیں ہے، بلکہ مجاہد کو تو اجر ہر حالت میں ملتا ہے، مالِ غنیمت اسے ملے یا نہ ملے، پھر "اَوْ" (یا) کا کیا موقع ہے جو دو مقابل چیزوں میں بیان منافات کیلئے ہے؟

جواب:

مولانا سیّد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اَوْ" کے استعمال کیلئے دو چیزوں کا ایک جگہ جمع نہ ہو سکنا یا خارج میں منافات ضروری نہیں ہے بلکہ صرف اتنا کافی ہے کہ ان دونوں کا مصداق و حقیقت الگ ہو، اگرچہ خارج میں جمع ہو سکیں، اسی لئے "اَوْ" کا استعمال تابع و متبوع میں بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ غنیمت، اجر کے تابع ہے اور غنیمت اور اجر میں مغائرت ہے، "اَوْ" کا استعمال بھی درست ہو گیا۔

قرطبی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ کلام اصل میں "مِنْ اَجْرٍ فقط اَوْ اَجر غنیمۃ" تھا اس میں چونکہ تکرار تھی اس لیے معطوف والا "اجر" حذف کر دیا گیا۔ ایسے مواقع میں اختصار کیلئے حذف اکثر ہو جاتا ہے، کیونکہ حصولِ اجر مفروغ عنہ ہے، جو سب کو معلوم ہے۔

(حدیث میں مذکور جملہ) "ولو لا ان اشق علی امتی ماقعدت خلف سریۃ" (یعنی) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میری امت تعب و مشقت میں پڑ جائے گی تو میں کسی سریہ میں جانے سے نہ رُکتا "سریہ" ہر چھوٹی جماعت کو کہتے ہیں جس میں زائد از زائد آدمی ہوں، اس کے بعد جیش وغیرہ ہے، مشقت امت پر یہ تھی کہ بہت سے امور وغیرہ جو مدینہ میں پورے ہوتے تھے وہ معطل ہو جاتے، یا یہ کہ میرے بعد جو خلفاء آئیں گے وہ سمجھیں گے کہ خلیفہ کا نکلنا ضروری ہے، اس صورت میں کام معطل ہوں گے اور اس میں کچھ بے سہارا لوگوں کی تسلی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر ہوتی تھی کہ ہم نہ جا سکے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں گئے۔

قرآنِ حکیم میں ان لوگوں کی حالت یوں بیان کی گئی ہے۔ "وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ

تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (التوبۃ ۹۲)'' اوران لوگوں پر بھی کوئی گناہ نہیں کہ جب وہ پیغمبر کے پاس آئیں کہ تو انہیں سواری دے، تو نے کہا میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ تمہیں اس پر سوار کروں تو وہ لوٹ گئے اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ موجود نہیں ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔''

سبحان اللہ! نبی کریم ﷺ کی صحبت نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں عشق الٰہی کا وہ نشہ پیدا کیا تھا جس کی مثال کسی قوم وملت کی تاریخ میں موجود نہیں، مستطیع اور مقدور والے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھو تو جان و مال سب کچھ خدا کے راستے میں لٹانے کو تیار ہیں اور سخت سے سخت قربانی کے وقت بڑے ولولہ اور اشتیاق سے آگے بڑھتے ہیں، جن کو مقدور نہیں وہ اس غم میں رو رو کر جان کھوئے لیتے ہیں کہ ہم میں اتنی استطاعت کیوں نہ ہوئی کہ اس محبوبِ حقیقی کی راہ میں قربان ہونے کیلئے اپنے آپ کو پیش کر سکتے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے مجاہدین کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم مدینہ میں ایک ایسی قوم کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہر قدم پر تمہارے اجر میں شریک ہے، تم جو قدم خدا کے راستے میں اٹھاتے ہو یا کوئی جنگل قطع کرتے ہو یا کسی پگڈنڈی پر چلتے ہو، وہ قوم برابر ہر موقع پر تمہارے ساتھ ساتھ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں واقعی مجبوریوں نے تمہارے ہمراہ چلنے سے روکا۔

حسن کے ''مرسل'' میں ہے کہ یہ مضمون بیان فرما کر آپؐ نے یہی آیت وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ'' تلاوت فرمائی۔

نہ ان کے پاس اسلحہ ہے اور نہ اتنی دولت ہے کہ سامانِ جنگ خرید سکیں اور نہ ہی بیت المال میں گنجائش ہے کہ ان کیلئے اسلحہ خرید سکے، اور دل میں جہاد کی تڑپ رکھتے ہیں، جب یہ دیکھیں گے کہ آنحضرت ﷺ تو معرکہ جنگ میں موجود ہیں اور ہم اپنے گھروں میں پڑے ہیں تو ان پر کیا گزرے گی اور ان کو اپنے گھروں میں کس طرح قرار آ سکتا ہے۔؟

پھر جوں ہی آنحضرت ﷺ سفرِ جہاد کا عزم و اعلان فرماتے تو حضورؐ کی معیت کی وجہ سے بڑی سرعت کے ساتھ لوگ چلنے کو تیار ہو جاتے، غزوات میں حضور کے ساتھ شرکت حاصل کرنے کیلئے وہ بڑی بڑی قربانیاں بھی پیش کرتے اور اس طرح سارے مدینہ

طیبہ میں بجز معذور مریض کے کوئی باقی نہ رہتا۔ ان وجوہ کی بناء پر آپؐ نے بعض معرکوں میں شرکت نہیں فرمائی اور اپنے نفس پر جبر فرمایا۔ آنحضرت ﷺ نے جہاد کے جتنے معرکوں میں شرکت فرمائی وہ سب ''غزوات'' کہلاتے ہیں اور جن میں حضور ﷺ نے بذاتِ خود شرکت نہیں فرمائی وہ ''سرایا'' کہلاتے ہیں۔

(حدیث میں مذکور جملہ) ''لوددت انّي اقتل في سبيل اللّٰه'' یہاں شبہ ہو سکتا ہے کہ ہر نبی، شہداء سے افضل ہے، آپ سید الانبیاء ہو کر مفضول کے مرتبہ کی تمنا کیوں فرماتے ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ کبھی کبھی بعض وجوہات کی بناء پر افضل رہتے ہوئے بھی مفضول کی خواہش رہتی ہے اور اسکی تمنا کی جاتی ہے، جیسا کہ کسی کے سامنے پلاؤ قورمہ سے بھرے ہوئے برتن رکھے ہیں، وہ اس میں سے کھا رہا ہے، بطورِ تفنن ذائقہ بدلنے کیلئے اس کو چٹنی کی خواہش اور تمنا ہوتی ہے، یہ کوئی بے جا نہیں، ہر ایک کو ایسا پیش آتا ہے۔

علاوہ ازیں یہاں شبہ کرنے والے کو ایک غلطی ہو رہی ہے، حضور ﷺ، شہداء کے مرتبہ اور اجر کی وجہ سے یہ تمنا نہیں فرما رہے، تاکہ اشکال لازم آئے، بلکہ قتل فی سبیل اللہ میں ایک لذت ہے، اسی لئے تو تکرار کی خواہش و تمنا فرماتے ہیں۔

(حدیث میں مذکور جملہ) ''اقتل في سبيل اللّٰه ثم اُحي ثم اقتل ثم احي ثم اقتل'' (یعنی) اگر فقط شہادت کا رتبہ اور درجہ حاصل کرنا تھا تو تکرار کی کیا ضرورت! ایک دفعہ شہادت حاصل کر لینا کافی ہے، کیا خوب کہا ہے:

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنہیں ملتی ہے لذت
یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

آنحضرت ﷺ کے درجات بلند اور بہت بلند ہیں، لیکن شہادت کا درجہ بھی اپنی بلندی کے اعتبار سے اور درجات پر فوقیت رکھتا ہے، اگر حضور ﷺ اس درجہ کی تمنا کریں تو کوئی ایسی بات نہیں جو مستبعد ہو! نبوت کے مدارج عالیہ کتنے ہی بلند سہی، شہادت، اللہ کو اس قدر پیاری ہے کہ سید الانبیاء ﷺ کو بھی اس کی تمنا کرنا پڑی، اس قسم کی چیزوں کو محض مراتب کی اونچ نیچ کے پیمانوں سے ناپنا صحیح نہیں۔

شہادت کے ساتھ ہی پروانۂ جنت

مرتبہ شہادت کی اہمیت پر سب سے بڑی دلیل خود نبی کریم ﷺ کی تمنا ہے، شہید حور کی گود میں گرتا ہے، بغیر حساب وکتاب جنت میں داخل ہوتا ہے، دن بھر جنت کی سیر کرتا ہے اور اس کے میوے کھاتا ہے، اور رات کے اوقات میں عرشِ الٰہی کے ساتھ معلق قندیلوں میں آرام کرتا ہے، جنت مومن کا وطنِ اصلی ہے جس کی طرف یہ لوٹ کر جائے گا، مگر شہید کیلئے یہ خصوصیت ہے کہ اس کا جنت میں جانا یوم آخرت تک موقوف ومؤخر نہیں، شہادت کے ساتھ ہی اسے جنت کا پروانہ مل جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ایک مردِ مومن کا قصہ بیان کیا ہے، جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے: "وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ"

(یٰس: ۱۳، ۱۴)

"ان سے بستی والوں کا حال مثال کے طور پر بیان کر جبکہ ان کے پاس رسول آئے، جب ہم نے ان کے پاس دو کو بھیجا انہوں نے ان کو جھٹلایا پھر ہم نے تیسرے سے مدد کی پھر انہوں نے کہا کہ ہم تیری طرف بھیجے گئے ہیں۔"

اکثر مفسرین کے نزدیک اس شہر کا نام "انطاکیہ" ہے لیکن ابن کثیرؒ نے تاریخی حیثیت سے اور سیاقِ قرآن کے لحاظ سے مفسرین کی اس رائے پر کچھ اعتراضات کئے ہیں، بہرحال! اس واقعہ میں مومن کیلئے بشارت اور مکذب کیلئے عبرت ہے۔ "اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ" کا متبادر ترجمہ یہی ہے کہ اس قریہ کی طرف بھیجنے والے پیغمبر تھے، ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ کسی پیغمبر کے نائب ہوکر اہل قریہ تک اللہ کا پیغام پہنچانے گئے ہوں، اوّل دو گئے پھر ان کی تائید کیلئے تیسرا بھیجا گیا۔ تینوں نے مل کر کہا ہم خود نہیں آئے، اللہ کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ لہٰذا جو کچھ ہم کہیں اسی کا پیغام سمجھو، اہل قریہ نے بات ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا: مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ (یٰس: ۱۵) "تم کچھ اور نہیں ہو مگر ہماری طرح انسان ہو اور رحمٰن نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم اور

کچھ نہیں ہو مگر جھوٹ بول رہے ہو''

یعنی تم میں کوئی سرخاب کا پر نہیں جو اللہ تمہیں بھیجتا، ہم سے کس بات میں تم بڑھ کر تھے، بس رہنے دو خواہ مخواہ خدا کا نام نہ لو، اس نے کچھ نہیں اتارا، تینوں نے سازش کر کے ایک جھوٹ بنا لیا، اسے خدا کی طرف منسوب کر دیا۔

مسئلہ رسالت:

مفسرین لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کو مسئلہ توحید اور مسئلہ رسالت سمجھانے کیلئے یہ واقعہ سنانے کا حکم ہوا، اہلِ انطاکیہ نے تکذیب مرسلین کیلئے جو برہان پیش کی وہ ہے: ''مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بشریت اور رسالت کا تضاد مکذبینِ رسالت کے ذہنوں میں رہا ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آسکی کہ تاجِ نبوت ورسالت سے نوعِ انسانی کے افراد ہی مشرف ہوتے ہیں، کیونکہ ہم جنسی کی بناء پر ان کی بات کا سمجھنا اور ان کے اسوۂ زندگی پر عمل پیرا ہونا آسان ہوتا ہے۔ جو چیز مقامِ رسالت کے سمجھنے میں معاون ہونی چاہیے بدقسمتی سے اسی کو وجہ تکذیب بنا بیٹھے، مراتب ومدارج اور خصوصیات کی وجہ سے یہ دوسرے انسانوں کی نسبت ممتاز ہوتے ہیں اور اسی وہبی امتیاز وخصوصیات کا انکار بھی ویسا ہی کفر ہے۔

ایک اس شہر کے کونے سے ان کی بات سمجھ کر دوڑتا ہوا آیا، اگلی آیت میں اس کا حال ہے۔ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ'' (یٰسٓ: ۲۰) ''اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا، کہنے لگا اے میری قوم! رسولوں کی پیروی کرو۔''

حبیب نجّار کی شہادت:

کہتے ہیں کہ اس مردِ صالح کا نام، حبیب نجار تھا، اس کی فطری صلاحیت نے چپ نہ بیٹھنے دیا، قصہ سنتے ہی مرسلین کی تائید وحمایت اور مکذبین کی نصیحت وفہمائش کیلئے دوڑتا ہوا آیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرسلین کی آواز کا اثر شہر کے دور دراز حصوں تک پہنچ گیا

تھا، اس کے بعد اس مردِ صالح نے ان بزرگوں کی بے لوثی، بے غرضی اور جذبہ خیر خواہی کا تذکرہ کیا، جوان کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل تھی، قرآن نے اس اعلان کا بھی ذکر کیا ہے جو مجمع عام کے اندر اس نے کیا تھا۔ اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ (یٰسٓ: ۲۵) ”میں ایمان لایا تمہارے رب پر مجھ سے سُن لو“ اس اللہ کے بندے نے خود توحید کا پابند ہونے کے بعد اپنی قوم کو مسئلہ توحید سمجھانے کی پوری کوشش کی، مرسلین کو اس لئے گواہ بناتا ہے کہ وہ اللہ کے ہاں اس کے ایمان کی گواہی دیں، اور قوم کو اس لئے کہ سن کر کچھ متاثر ہوں یا کم از کم دنیا ایک مومن کی قوتِ ایمان کا مشاہدہ کرنے کی طرف متوجہ ہو، قوم نے اس کو نہایت بے دردی سے شہید کر ڈالا۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ”حبیب نجار“ کو پیروں سے یہاں تک کچلا کہ ان کی انتڑیاں باہر نکل آئیں، اس قوم پر اللہ کا عذاب آیا، جبریلؑ نے ایک چنگھاڑ ماری جس سے سب کے کلیجے پھٹ گئے۔

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّۃَ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۙ بِمَاغَفَرَلِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ (یٰسٓ: ۲۷) ”ارشاد ہوا جا جنت میں داخل ہو جا۔ کہنے لگا کہ کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے رب نے مجھ کو بخش دیا اور مجھے عزت داروں میں کر دیا“، یعنی فوراً ہی بہشت کا پروانہ مل گیا۔ ادھر شہادت واقع ہوئی ادھر انہیں حکم ملا کہ فوراً بہشت میں داخل ہو جا۔ جیسا کہ ارواح شہداء کی نسبت احادیث سے ثابت ہے کہ وہ قبل از محشر جنت میں داخل ہوتی ہیں۔

تمنائے شہادت کی تعلیم:

آنحضرت ﷺ اس تمنائے شہادت کی راہ سے امت کو تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ شہادت کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ جب حضورؐ کا تمنائے شہادت کے بارے میں یہ عالم ہے تو امت کا کیا عالم ہونا چاہیے۔ تمنائے شہادت بھی شہادت ہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے کہ بہت سے لوگ بستر پر جان دیتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں۔ اور حضور ﷺ کی حیات

دوسروں کی شہادت سے لاکھوں مراتب بڑھ کر ہے اور شہادت سے آپ ﷺ کے کمال میں اضافہ نہ ہوتا۔ آپ ﷺ نے اس تمنا سے امت میں شہادت کا شوق اور ولولہ پیدا فرمایا ہے۔ ان کی جان اللہ کی خریدی ہوئی ہے۔ **اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ**" (التوبة: ۱۱۱) "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے کہ ان کیلئے جنت ہے۔"

ایک سوال:

تمنائے شہادت کا مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ کفر بقائے عالم تک قائم رہے، کیونکہ قتال و جہاد کے لئے کفر ضروری ہے ورنہ شہادت کس طرح حاصل ہوگی؟

جواب:

یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاد قیامت تک قائم رہے گا۔ ارشاد ہے۔ **اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ** (ابو داود شریف: ج ۱ ص ۳۵) "جہاد قیامت تک جاری اور قائم رہے گا۔"

آنحضرت ﷺ کی تمنائے شہادت سے یہ اشکال پیدا کرنا ایک بے معنی سی بات ہے، کیونکہ بار بار زندگی دیئے جانے کی تمنا ایک تمنا ہے جو پوری ہونے والی نہیں ہے۔ یہ اسلوب تمنا شرفِ جہاد کیلئے ہے اور یہ بتانا مقصد ہے کہ ہزار جانیں بھی ملیں تو سب کو قربان کر دینا چاہیے۔

(فضل الباری شرح صحیح البخاری: ج ۱ ص ۴۴۷ تا ۴۵۲ بتصرف یسیر)

"اور کوئی غرض نہ ہو الخ" مطلب یہ ہے کہ اخلاصِ نیت اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے حصول کی خاطر جہاد میں نکلا ہو، اللہ تعالیٰ کے وعدے پر کامل یقین رکھتا ہو اور اس کے حکم کی تعمیل مقصود ہو، اور اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعہ شہداء سے جو وعدہ کیا ہے اس کی تصدیق کرتا ہو اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے نکلا ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کا ضامن بنتا ہے اور اس کو شہادت کی صورت میں جنت عطا فرماتا ہے یا پھر اجر وثواب

اور مالِ غنیمت کے ساتھ غازی بنا کر واپس لاتا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ مخلص مجاہد کو ہر حال میں اجر وثواب ملتا ہے، خواہ اسے مالِ غنیمت ملے یا نہ ملے۔ مطلب یہ ہے کہ غازی یا صرف اجر وثواب لے کر لوٹتا ہے یا اجر وثواب کے ساتھ مالِ غنیمت بھی حاصل کرتا ہے، بہر حال اجر وثواب دونوں صورتوں میں حاصل ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر مالِ غنیمت نہ ملے تو اجر وثواب کامل ملتا ہے اور اگر مالِ غنیمت بھی ملے تو اس صورت میں اجر کم ہو جاتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی راہ میں شہید ہونے پھر زندہ ہو کر پھر شہید ہونے کی بار بار تمنا اور خواہش کا اظہار کر کے شہادت کے عظیم اجر کو بیان فرمایا ہے اور نیز یہ کہ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اللہ کے راستہ میں حصولِ شہادت کی تمنا کیا کرے۔

(۱۷۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی مثال (اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون اس کے راستہ میں جہاد کرتا ہے) اس شخص کی طرح ہے جو روزے دار اور عبادت ونماز میں مشغول ہو اور اللہ تعالیٰ نے اپنے راستہ میں جہاد کرنے والے کیلئے یہ ضمانت لی ہے کہ اگر اس کو موت دے دی تو اسے جنت میں داخل فرمائیں گے یا اجر وثواب اور مالِ غنیمت دے کر اسے کامیاب لوٹائیں گے''

(صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب افضل الناس مؤمن یجاهد بنفسه وماله ج ۵ ص ۳۶،۳۵ از شرح القسطلانی)

(۱۷۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے راستہ میں جہاد کرنے والے کے لیے جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کے کلمات کی تصدیق کے لیے اس کے راستہ میں جہاد میں نکلا ہوں، یہ ضمانت لی ہے کہ اسے جنت میں داخل فرمائیں گے یا اسے گھر تک اجر وثواب اور مالِ غنیمت دے کر لوٹائیں گے جہاں سے وہ گیا تھا۔'' (صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، احلت لکم

الغنائم ج ۴ص ۸۵،۸۶)

(۱۷۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی ضمانت لی ہے جو اس کے راستہ میں جہاد کے لئے نکلے تو میں اس کا ضامن ہوں، یہاں تک کہ میں اسے جنت میں داخل کروں گا، چاہے کسی راستہ سے ہو یا تو شہادت کے ذریعہ یا وفات دے کر یا میں اسے اس کے ٹھکانہ تک لوٹاؤں گا جہاں سے وہ نکلا تھا اس اجر وثواب اور مالِ غنیمت کے ساتھ جو اس نے حاصل کیا تھا''۔(سنن النسائی ج ۱ ص ۱۲)

(۱۷۷) ایک روایت کے مطابق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی ضمانت لی ہے جو اس کے راستہ میں جہاد کے لیے نکلے اور نکلنا کا مقصد صرف اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اس کے کلام کی تصدیق کرنا ہو تو اسے میں جنت میں داخل کروں گا یا پھر اسے اجر وثواب اور مالِ غنیمت سے نواز کر جو اس نے حاصل کیا ہے، اس کے گھر تک واپس پہنچا دوں گا۔''

(۱۷۸) نسائی کی ایک اور روایت میں یوں آتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار عالم سے نقل کیا ہے کہ فرمایا ''میں نے اس کے لیے یہ ضمانت دی ہے کہ اگر واپس لوٹایا تو اجر وثواب یا مالِ غنیمت دے کر واپس لوٹاؤں گا اور اگر اس کی روح قبض کر لی تو اس کی مغفرت کر دوں گا اور اس پر رحم کروں گا۔''

(۱۷۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ اس شخص کو جو اس کی راہ میں جہاد کرنے نکلتا ہے، جس کا مقصد صرف اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اس کے کلمہ کی تصدیق کرنا ہو یا تو جنت میں داخل فرماتے ہیں یا پھر اجر ثواب اور مالِ غنیمت دے کر واپس لوٹاتے ہیں۔(صحیح مسلم)

(۱۸۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہوئے اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ضامن بن جاتے ہیں کہ وہ اسے جنت میں داخل فرمائیں گے، اور یا پھر اسے اجر وثواب اور مالِ غنیمت دے کر اسے اس کے گھر

واپس لوٹائیں گے جہاں سے وہ جہاد کے لیے نکلا تھا اور اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! کوئی زخم ایسا نہیں جو اللہ کے راستہ میں آئے مگر یہ کہ قیامت کے دن وہ ویسا ہی آئے گا جیسا اس دن تھا جس دن وہ زخم لگا، اس کا رنگ خون کا سا ہوگا اور خوشبو مشک کی سی ہوگی اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اگر مجھے امت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں کسی لشکر سے کبھی پیچھے نہ رہتا، لیکن میرے پاس اتنی وسعت نہیں کہ میں انہیں سواری پر سوار کرسکوں اور نہ ان کے پاس اتنی وسعت ہے، ان پر مجھ سے پیچھے رہنا بہت شاق گزرے گا، اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کروں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر لڑوں پھر قتل کیا جاؤں''

(۱۸۱) یہ غزوۂ فتح مکہ والی حدیث ہے، حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے اہل مکہ کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ حضور ﷺ ان سے جنگ کر کے مکہ کو فتح کرنا چاہتے ہیں، اس حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے حاطب! یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے متعلق عجلت نہ فرمائیں، میں قریش کے ساتھ وابستہ تھا، یعنی میں ان کا حلیف تھا اور قریش میں سے نہ تھا، آپ کے ہمراہ جو مہاجرین ہیں ان کے رشتہ دار موجود ہیں، جن کے ذریعہ وہ اپنے اہل وعیال اور مال ومتاع کی حفاظت کرتے ہیں، اس لیے میں نے سوچا کہ چونکہ ان سے میرا رشتہ داری کا تعلق نہیں ہے اس لیے میں ان پر کچھ احسان کروں جس کی وجہ سے وہ میرے رشتہ داروں کا خیال رکھیں، میں نے یہ خط اس وجہ سے نہیں لکھا کہ میں (نعوذ باللہ) دین سے پھر گیا ہوں یا اسلام قبول کرنے کے بعد پھر کفر پر راضی ہوگیا ہوں۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اس نے سچ کہا ہے'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے چھوڑ دیئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں! آپ ﷺ نے فرمایا! یہ تو غزوہ بدر میں شریک تھے، تمہیں کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو دیکھ کر یہ فرمایا ہو: تم جو چاہو کرو میں تمہیں بخش چکا ہوں۔''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا

تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ'' ''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ سمجھو الخ۔(صحیح البخاری، باب غزوۃ الفتح ج۵ ص۱۴۵ ،مشکوٰۃ المصابیح، باب جامع المناقب ص ۵۷۷)

فائدہ:

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس حرکت بے جا سے میری اصل غرض وغایت اپنے قرابت داروں کا تحفظ حاصل کرنا تھی، میں اتنی مفید معلومات فراہم کر کے قریش مکہ کو خوش کرنا چاہتا تھا تا کہ وہ میری اس خوشامد کے سبب مکہ میں میرے رشتہ داروں کی دیکھ بھال رکھ سکیں۔

واضح رہے کہ حاطب رضی اللہ عنہ نے اہل مکہ کو جو خط بھیجنا چاہا تھا ان کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زک اور ایذاء پہنچانا ہرگز نہیں تھا، اگر ان کا مقصد یہ ہوتا تو پھر ان کے کافر ہو جانے میں کوئی شبہ ہی نہ رہ گیا تھا، حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنے طور پر یہ خیال کر کے کہ میرے اس خط لکھنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، اس حرکت کے ارتکاب کی نادانی کر بیٹھے تھے، چنانچہ جب انہوں نے اپنا اصل مقصد بیان کیا جو ان کے خط لکھنے کا محرک بنا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی، اگر ان کی نیت اور مقصد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف یا نقصان پہنچانے کا ارادہ شامل ہوتا تو لسانِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بیان کی تصدیق ہرگز نہ کرتی۔

ہاں البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک بڑے اجتہادی قصور میں مبتلا ہوئے، بایں طور پر کہ انہوں نے اپنے اس معاملہ کو چھپایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لئے بغیر ایسا کام کیا۔

''اس منافق کی گردن اڑا دوں'' اس عبارت کے تحت ملا علی قاریؒ نے تو یہ لکھا ہے کہ اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے حاطب رضی اللہ عنہ کے بیانِ عذر کی تصدیق فرمائی لیکن اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو یہ بات کہی تو اس کا محرک

دین کے بارے شدت اور سخت گیری تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات کا خاصہ تھا، وہ دین ومذہب کے معاملات میں ذرا بھی نرمی اور رعایت کے قائل نہیں تھے، پھر حاطب رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو ویسے بھی بڑی سنگین نوعیت کا تھا، دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں بعض لوگ تھے بھی اس طرح کے کہ ان کی طرف نفاق کی نسبت کی جاتی تھی، چنانچہ انہوں نے یہی سوچا کہ جس شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی ہے وہ قتل کا مستوجب ہوگیا لیکن اس سوچ میں چونکہ خود ان کے نزدیک بھی یقین کا پہلو غالب نہیں تھا اس لیے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاطب رضی اللہ عنہ کے قتل کی اجازت مانگی۔

رہی یہ بات کہ انہوں نے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ پر ''منافق'' کا اطلاق کس وجہ سے کیا؟ تو ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں بھی یہ سوچا ہو کہ حاطب رضی اللہ عنہ نے شاید صحیح بات نہیں بتائی ہے، ان کے دل میں کچھ اور ہے اور بیان انہوں نے کچھ اور دیا ہے! ان کا مذکورہ عذر محض بات بنانے کیلئے ہے۔

اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ کو بیان کرنے میں کچھ تقدیم وتاخیر ہوگئی ہو، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ بات کہنا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔'' گویا حضرت شیخؒ کے نزدیک اس بات کا قوی احتمال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات پہلے ہی کہی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کا جزو بعد کا ہو۔

''تم جو چاہو کرو'' یہ اہل بدر کو ہی خطاب ہے، اور اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ عملی زندگی میں تمہیں پوری طرح آزادی دے دی گئی ہے کہ اچھا برا جو بھی عمل چاہو کرو، اور فرائض وارکان دین کی بجا آوری میں بھی ہر تقصیر وکوتاہی تمہارے لیے معاف ہے، بلکہ اس ارشاد قدسی کی اصل مراد اہل بدر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی کرم اور اس کی خصوصی عنایت کو ظاہر کرنا اور ان کی اس خصوصی مقام ومرتبہ کی نشاندھی کرنا ہے، غزوہ بدر میں شرکت کے عوض تمہیں آخرت کے تمام بلند مراتب ودرجات حاصل ہوگئے ہیں، وہاں کی تمہاری اعلیٰ حیثیت متعین ہوگئی ہے۔ اب تمہیں اجازت ہے کہ اعمال صالحہ اور افعال

نافلہ میں سے چاہے تھوڑا کرو چاہے زیادہ کرو، جو بھی کرلو گے کافی ہو جائے گا۔

''میں تم کو بخش چکا ہوں'' یعنی میں نے تم لوگوں کو اپنی نظرِ رحمت و مغفرت سے نواز دیا ہے۔ اہل بدر کے حق میں یہ جملہ زیادہ موثر ہے۔ اور یہاں نوویؒ نے لکھا ہے کہ اہل بدر کے حق میں اس عفو و مغفرت کا تعلق صرف آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا سے بھی۔ مطلب یہ کہ ان میں سے اگر کوئی شخص کسی ایسے فعل کا مرتکب ہو جائے جس پر حد وغیرہ جاری ہوتی ہے تو وہ مستوجب مواخذہ ہوگا۔ چنانچہ ایک صحابی مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ حالانکہ اہل بدر میں سے تھے، لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر افتراء باندھا اور قرآن کریم نے ان کے افتراء کا پردہ چاک کر کے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی پاکدامنی کی تصدیق کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسطح کو مستوجب مواخذہ گردانا اور ان پر حدِ افتراء قائم فرمائی۔

''یہ آیت نازل ہوئی'' اس سے سورۃ ممتحنہ کی وہ ابتدائی آیتیں مراد ہیں، جن کا شانِ نزول حاطب رضی اللہ عنہ کا یہی قصہ ہے۔

یہ آیات کریمہ اگرچہ حاطب رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھیں لیکن خطاب عمومی طور پر ہے، تاکہ حاطب رضی اللہ عنہ جیسے لوگ بھی اس کے تحت آجائیں، جیسا کہ اصول ہے "العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب" یعنی اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے۔ نہ کہ خصوص سبب کا۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی آیت مثلاً کسی خاص واقعہ کے سلسلہ میں یا کسی خاص شخص کے متعلق نازل ہوئی تھی تو یہ نہیں کہ وہ آیت بس اسی واقعہ یا اسی شخص کے ساتھ مخصوص سمجھی جائے گی بلکہ اس کا مصداق و محمول عمومی نوعیت کا ہوگا کہ جو بھی شخص اس آیت کے مفہوم و مضمون سے مطابقت رکھے گا وہ اس آیت کے تحت آئے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ گویا یہ آیت اسی شخص کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ (مظاہر حق ملخصاً ج ۵ ص ۸۳۹ تا ص ۸۴۱)

(۱۸۲) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے میری ملاقات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جابر رضی اللہ عنہ کیا بات ہے کہ میں تم کو افسردہ اور غمگین دیکھ رہا ہوں؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے والد کو غزوۂ احد میں شہید

کر دیا گیا اور وہ (ایک بڑا) کنبہ اور قرض چھوڑ گئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کیا میں اس معاملہ کی خبر دے کر تمہیں خوش نہ کر دوں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے والد کے ساتھ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا، کیوں نہیں (ضرور بتائیے) یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب بھی کسی سے کلام کیا ہے، حجاب کے پیچھے سے کیا ہے، مگر تمہارے والد کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا اور پھر ان سے رو در رو کلام فرمایا اور فرمایا: اے میرے بندے! میرے فضل وکرم کے سہارے آرزو کر، میں تجھ کو عطا کروں گا، (یہ سن کر) تمہارے والد گویا ہوئے: میرے پروردگار! مجھے کو زندہ کر کے دنیا میں پھر بھیج دے، تاکہ تیری راہ میں لڑتا ہوا ایک مرتبہ پھر مارا جاؤں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلاشبہ میرا یہ حکم پہلے سے نافذ ہے کہ جو مر چکے ہیں دنیا میں لوٹ کر نہیں آئیں گے' اور پھر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ فَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتاً (آلِ عمران: ۱۶۹) "یعنی اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں ان کو مردہ مت خیال کرو۔"

(جامع الترمذی، باب سورۃ آل عمران، مشکوٰۃ المصابیح، باب جامع المناقب ص ۵۷۹)

فائدہ:

"اور تمہیں خوش نہ کردوں" آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ دنیا کی جو بھی پریشانی آتی ہے اور جو بھی غم پڑتا ہے وہ دیر سویر زائل ہو جاتا ہے اور آسانی کی راہ نکل ہی آتی ہے۔ تمہارے والد نے جو بڑا کنبہ چھوڑا ہے اللہ تعالیٰ اس کے تکفل کا انتظام کرا دے گا، اور جو قرض وہ چھوڑ گئے ہیں اللہ کے فضل وکرم سے اس کی ادائیگی بھی ہو جائے گی، لہٰذا اس وقت جس دنیاوی غم واندوہ کا تمہیں سامنا ہے اس کو صبر وشکر کے ساتھ انگیز کرنا چاہیے، اور محض اس کی وجہ سے اپنے آپ کو غمگین اور دل گیر نہ رکھنا چاہیے، بلکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا اور اس سعادت سے مشرف فرمایا جو مولیٰ کی رضا وقرب اور اس کے کرم کو ظاہر کرتی ہے۔

پس اس ارشادِ گرامی میں ایک تو اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اولاد سیدھی راہ پر ہو تو

باپ کی فضیلت و بزرگی اس میں بھی سرایت کرتی ہے اور دوسرے اس طرف اشارہ ہے کہ باپ کو حاصل ہونے والی خوشی اور سعادت پر اولاد کو بھی خوش ہونا چاہیے۔

''اللہ تعالیٰ نے جب بھی کسی سے کلام کیا ہے'' یعنی تمہارے والد سے پہلے جس کسی سے بھی اللہ تعالیٰ نے کلام کیا تو روبرو کلام نہیں کیا بلکہ پردہ کے پیچھے سے کیا، ان الفاظ میں گویا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ (حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد) بالخصوص ان تمام شہیدوں سے افضل ہیں جو ان سے پہلے شہید ہوئے، کیونکہ ان میں سے جس کسی سے بھی اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ہوگا پردہ کے پیچھے سے کیا ہوگا۔

واضح ہو کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْمِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (الآیۃ) تو اس کا تعلق صرف اس دنیا سے ہے، آخرت سے نہیں ہے۔

''تمہارے والد کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا'' یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب شہیدوں کے بارے میں یہ فرمایا کہ ''بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ'' (بلکہ وہ شہداء اپنے رب کے پاس زندہ ہیں) تو پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے شہید والد کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ: ان کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا'' کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کا جواب ایک شارح نے یوں دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو سبز پرندے کے قالب میں منتقل کیا اور پھر اس پرندے کو اس روح کے ذریعہ حیات عطا کی جیسا کہ ہر شہید کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرح کی حیات عطا کئے جانے کو ''زندہ کیا'' سے تعبیر فرمایا۔

اور ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں ''زندہ کرنے'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو اتنی قوت عطا فرمائی جس سے انکو روبرو کلام میں دیدارِ الٰہی کا تحمل حاصل ہوا۔

''دنیا میں لوٹ کر نہیں آئیں گے'' مطلب یہ ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے کہ جو مر چکے ہیں ان کو اس دنیا میں اس طرح دوبارہ زندگی نہیں ملے گی کہ پھر وہ مدتِ دراز تک جیتے رہیں اور اس مدت میں نیکیاں کرتے رہیں۔ اس وضاحت کی روشنی میں یہ ارشاد

گرامی اس بات کے منافی نہیں ہوگا کہ بعض مُردوں کا دوبارہ اسی دنیا میں جی اٹھنا ثابت ہے۔ جیسا کہ مثلاً حضرت عیسیٰ کا یہ اعجاز منقول ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کچھ عرصہ کے لئے مُردوں کو دوبارہ زندہ کر دیتے تھے اور اس سے بھی زیادہ وضاحت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے کہ جو لوگ ایک مرتبہ مر چکے ہیں وہ درخواست یا آرزو کر کے اس دنیا میں دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں شہیدِ دجال والی روایت کے تحت بھی اس ارشادِ گرامی پر کوئی اشکال لازم نہیں آئے گا۔

نیز سید جمال الدینؒ نے یوں لکھا ہے کہ حدیث ہذا میں مذکور جملہ ''انھم لا یرجعون'' (وہ دنیا میں لوٹ کر نہیں آئیں گے) میں ''ھُم'' ضمیر کا مرجع صرف شہداء ہیں، اور ''شہداء'' سے بھی چاہے غزوہ احد کے شہید مراد لئے جائیں یا مطلق شہداء، اور یہ خاص مرجع متعین کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ کی بناء پر اس ارشادگرامی میں اشکال واقع نہ ہو۔ (مظاھر حق ج۵ ص ۸۶۱)

(۱۸۳) حضرت عبداللہ بن مرۃؓ سے مروی ہے کہ حضرت مسروقؒ نے فرمایا ''ہم نے یا میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت مبارکہ ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتاً الخ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: ہم نے (بھی) اس کے بارے میں دریافت کیا تھا تو آپ نے فرمایا: ان (شہیدوں) کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹ میں ہوں گی، ان کے لئے عرش سے لٹکی ہوئی قندیلیں ہوں گی، وہ جنت میں جہاں چاہیں گے پھریں گے، پھر وہ دوبارہ ان ہی قندیلوں میں واپس آجائیں گے، ایک مرتبہ ان کا پروردگار ان کی طرف جھانک کر دیکھے گا اور فرمائے گا کہ: کیا تم (مزید) کچھ چاہتے ہو؟ وہ کہیں گے ہم کس چیز کی خواہش کریں جبکہ ہم جنت میں جہاں چاہتے ہیں گھومتے پھرتے ہیں! اللہ تعالیٰ تین مرتبہ ان سے اس طرح پوچھیں گے، جب وہ دیکھیں گے کہ وہ سوال کئے بغیر چھوڑے نہیں جا رہے، تو عرض کریں گے: اے پروردگار ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں دوبارہ لوٹا دیا جائے تا کہ ہم آپ کی راہ میں دوبارہ مارے جائیں، اللہ تعالیٰ جب یہ دیکھیں گے کہ انہیں کسی چیز کی حاجت وخواہش

نہیں ہے تو پھر انہیں چھوڑ دیا جائے گا''۔

(صحیح مسلم، باب فی بیان ان ارواح الشہداء فی الجنۃ ، مشکوۃ المصابیح، کتاب الجہاد ص ۳۳۰)

فائدہ:

''اللہ تعالیٰ جب یہ دیکھیں گے کہ انہیں کسی چیز کی حاجت وخواہش نہیں ہے۔''
کیونکہ انہوں نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے اس کو پورا کرنا اللہ کے ارادہ اور مصلحت کے خلاف ہے، دوسرے یہ کہ ان کو پہلی بار ہی جو عظیم ثواب اور اجر ملا ہے اور اسی وجہ سے ان کی کوئی حاجت وخواہش نہیں ہے، اگر وہ دوبارہ دنیا میں بھیج دیئے جائیں تو وہی اجر وانعام انہیں دوبارہ بھی ملے گا اور اس کی انہیں حاجت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ شہداء کا اجر وثواب ایک ہی ہے جو انہیں حاصل ہے۔

اعتراض:

کسی کے ذہن میں یہ اعتراض پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر دوسری بار بھی پہلی ہی بار جیسا اجر وثواب ملے تو پھر ان شہداء کی خواہش کا کیا فائدہ کہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں واپس کر کے دنیا میں بھیج دیا جائے تا کہ ہم دوبارہ خدا کی راہ میں مارے جائیں؟

جواب:

علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس خواہش کے اظہار سے اس کی مراد حقیقت میں اپنی روحوں کو جسموں میں واپس کئے جانے کی درخواست کرنا نہیں ہے، بلکہ ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کے ان انعامات واکرامات کا شکر ادا کرنا ہے جس سے ان کو نوازا گیا ہے۔ گویا اپنی (اس) خواہش کے ذریعہ وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ اے اللہ! تو نے ہمیں اپنی جو نعمتیں عطا کی ہیں اور ہمیں جن عظیم درجات سے نوازا ہے اور ان کی وجہ سے ہم پر جو تیرا شکر ادا کرنا واجب ہے اس کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر دنیا میں واپس آئیں اور تیری راہ میں اپنی جان قربان کردیں۔

یا پھر وہ اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے گمان کے مطابق کرتے ہیں کہ ہم چونکہ دوسری مرتبہ میں اور زیادہ مستعدی، ہمت اور جان نثاری کے فزوں تر جذبے کے ساتھ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کریں گے، اس لئے کیا عجب کہ دوسری مرتبہ میں ہمیں اور زیادہ بہتر اور کامل تر جزا ملے۔

لیکن نظامِ قدرت اور جاری معمول چونکہ اس کے خلاف ہے، اور حق تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہے کہ ان کو دوسری مرتبہ میں بھی وہی اجر ملے گا جو پہلی مرتبہ مل چکا ہے اور اس کی انہیں حاجت نہیں ہے تو ان سے پوچھنا چھوڑ دیا جاتا ہے۔

تنبیہ:

علماء نے یہ لکھا ہے کہ شہداء کی ارواح کو پرندوں کے قالب میں رکھنا ان ارواح کی عزت وتوقیر اور تکریم کی بناء پر ہے، جیسا کہ جواہرات کو ان کی حفاظت اور احتیاط کیلئے صندوق میں رکھا جاتا ہے، اور ساتھ ہی یہ مقصد ہوتا ہے کہ ان ارواح کو ان کے دنیاوی جسم کے بغیر اس صورت (یعنی پرندوں کے قالب) میں جنت میں داخل کیا جائے، چنانچہ وہ ارواح ان پرندوں کے قالب میں جنت کے مرغزاروں میں بسیرا کرتی ہیں، وہاں کی فضاؤں میں گھومتی ہیں، جنت کی پاکیزہ ترین خوشبوؤں اور کیف آور ہواؤں سے لطف اندوز ہوتی ہیں، وہاں کے انوار وبرکات کا مشاہدہ کرتی ہیں، وہاں کی نعمتوں اور لذتوں سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں، اور ان کو صرف ان ہی چیزوں کے ذریعہ ہمہ وقت کی خوش طبعی اور آسودہ خاطری حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ جل شانہ، کے قرب اور ملائکہ مقربین کے جوار کی عظیم ترین سعادت بھی میسر ہوتی ہے، جو بجائے خود سب سے بڑی نعمت اور فرحت وانبساط کا سبب ہے۔

چنانچہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی یہی مراد ہے کہ: "یُرْزَقُوْنَ، فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰـھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ" وہ رزق دیئے جاتے ہیں اور جو کچھ خدا نے ان کو اپنے فضل سے بخش رکھا ہے اس سے خوش ہیں۔"

اس موقع پر یہ بات بھی بطورِ خاص ملحوظ رہنی چاہئے کہ اس حدیث سے تناسخ (آواگون) کا نظریہ ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو لوگ تناسخ کے قائل ہیں، ان کے نزدیک تناسخ اس کو کہتے ہیں کہ ''اسی عالم میں روح کا کسی قالب وبدن میں لوٹنا'' گویا ان کے نزدیک کسی قالب وبدن میں روح کے لوٹنے کا نظریہ آخرت سے متعلق نہیں ہے، اور یہ یوں بھی ممکن نہیں ہے کہ ان کے نزدیک آخرت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، بلکہ وہ آخرت کے منکر ہیں۔

نیز اس حدیثِ مبارک سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنت مخلوق ہے اور موجود ہے، جیسا کہ اہلِ سنت والجماعت کا مسلک ہے۔

(مظاهر حق ج ۳ ص ۷۳۲، ۷۳۳)

(۱۸۴) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اہل جنت میں سے ایک آدمی کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، اے ابن آدم! تم نے اپنے ٹھکانہ کو کیسا پایا؟ وہ کہے گا، اے پروردگار! بہترین ٹھکانہ ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، آرزو کرو اور سوال کرو: وہ کہے گا، میں یہ سوال کرتا ہوں کہ آپ مجھے دنیا میں لوٹا دیں تاکہ میں آپ کی راہ میں دس مرتبہ مارا جاؤں۔ (وہ یہ سوال اس لیے کرے گا کہ) وہ شہادت کے مقام ومرتبہ کو دیکھ رہا ہوگا'' (سنن النسائي، باب مايتمنى اهل الجنة)

(۱۸۵) حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شہید اور بستر پر وفات پانے والے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان لوگوں کے بارے میں جھگڑیں گے جو طاعون کی وجہ سے وفات پا گئے ہوں گے، شہید کہیں گے: یہ ہمارے بھائی ہیں، جیسے ہم قتل کئے گئے تھے، اسی طرح انہیں بھی قتل کیا گیا ہے، اور بستر پر مرنے والے کہیں گے، یہ ہمارے بھائی ہیں، جیسے ہم مرے ہیں یہ بھی اسی طرح مرے ہیں، ہمارے پروردگار فرمائیں گے: ان کے زخموں کو دیکھو، اگر ان کے زخم مقتولوں کے زخموں کی طرح ہیں تو یہ شہداء میں سے ہیں اور ان ہی کے ساتھ ہوں گے، دیکھا گیا تو ان کے زخم شہیدوں کے زخموں کے مشابہ تھے''۔ (سنن النسائي ، باب مسألة الشهادة ج ۱ ص ۳۷، مشكوة

المصابیح، باب عیادۃ المریض ص ۱۳۹)

فائدہ:

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ طاعون کے مرض میں وفات پانے والوں کو ہماری طرح شہید شمار کیا جائے اور انہیں وہ عظیم اجر وثواب حاصل ہو جو ہمیں ملا ہے، اس لیے کہ جس طرح ہم نے میدانِ کارزار میں صبر سے کام لیا، اسی طرح انہوں نے بھی آپ کے حکم وفیصلہ پر صبر کیا اور اس طاعون کے مرض کے سبب وفات پا گئے جو آپ ہی کی طرف سے پیش آتا ہے۔ اور بستر پر طبعی موت مرنے والے عرض کریں گے کہ جس طرح ہم اپنے بستروں پر مرے ہیں اسی طرح یہ بھی اپنے بستروں پر مرے ہیں، لہٰذا انہیں ان شہیدوں والا اجر وانعام کیوں حاصل ہو جنہوں نے اپنی جانیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں اور جامِ شہادت نوش کیا!۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے فیصلہ کے بعد جب ان کے زخم دیکھے جائیں گے تو وہ بالکل شہیدوں کے زخموں کی طرح ہوں گے، ان کو اخروی احکام کے اعتبار سے شہید کہا جاتا ہے، البتہ میدانِ جنگ میں شہید ہونے والے پر جو دنیوی احکامات جاری اور نافذ ہوتے ہیں کہ انھیں غسل نہیں دیا جاتا تو یہ میدانِ جنگ میں شہید ہونے والے کے ساتھ مخصوص ہے۔

بعض علماء اس حدیث کی تشریح میں یوں لکھتے ہیں کہ

بارگاہِ رب العزت میں مرضِ طاعون میں مرنے والوں کے بارہ میں شہداء کی اس دلیل کہ ''جس طرح ہم قتل کیے گئے اسی طرح یہ بھی قتل کیے گئے ہیں۔'' کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم دشمنانِ دین اور کفار کے ہاتھوں زخمی ہو کر مرے ہیں، اسی طرح یہ بھی جنات کے ہاتھوں زخمی ہو کر مرے ہیں، کیونکہ علماء نے لکھا ہے کہ بسا اوقات طاعون زدہ شخص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اسے کوئی نیزے مار رہا ہو، اسی لئے اس مرض کو ''طاعون'' کا نام دیا گیا ہے، جو ''طعن'' سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ''نیزہ مارنا''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص طاعون میں مبتلا ہو کر مرے گا وہ شہیدوں

میں سے ہے، اس لئے قیامت کے روز وہ ان کے ساتھ ہوگا۔ (مظاہر حق ج ۲ ص ۲۴)

(۱۸۶) حضرت سلیمان بن بریدہؒ اپنے والد حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جہاد میں نہ جانے والوں کے لیے لازم ہے کہ وہ جہاد پر جانے والوں کی بیویوں کا ایسا احترام کریں جیسے ان کی ماؤں کا احترام ہے، اور جب کوئی مجاہد کسی شخص کو اپنے اہل وعیال کے بارے میں اپنا نائب اور خلیفہ بنائے اور وہ ان کے بارے میں خیانت کرے گا تو قیامت کے دن اس سے کہا جائے گا کہ اس شخص نے تمہارے گھر والوں کے بارے میں خیانت کی تھی اس لیے اس کی جتنی نیکیاں تم لینا چاہتے ہو اس سے لے لو، پس تمہارا کیا خیال ہے؟'' ۔ (سنن النسائی، باب من خان غازیا فی اهله ، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجهاد ص ۳۲۹)

فائدہ:

مجاہدین اسلام کے اہل وعیال کا احترام اور ان کی عزت وآبرو کا خیال رکھنا چاہیے، ان کی بیویوں کی عزت وحرمت کو ماں کی عزت وحرمت کی طرح قرار دیا گیا، لہٰذا اگر کوئی شخص مجاہد کی بیوی سے فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، قیامت کے روز اسے سب کے روبرو شرمندہ کیا جائے گا، اور مجاہد سے یہ کہا جائے گا کہ اس شخص نے تمہارے گھر والوں سے خیانت کا ارتکاب کیا تھا اس لیے تم اس کے بدلہ میں اس کی جتنی نیکیاں لینا چاہو لے لو، ایسی صورت میں ایسے مرتکب خیانت سے بدلہ وانتقام لینے کے سلسلہ میں اس مجاہد کی کیا کیفیت ہوگی؟ کیا وہ اس کی کوئی نیکی چھوڑے گا؟ غور کیجئے کہ ایسے خائن کی کیا حالت ہوگی؟ ایک طرف تو ذلت ورسوائی اور دوسری طرف نیکیوں سے تہی دست ہو جانا! اور پھر آخر کار گناہوں کا بوجھ۔ لے کر جہنم میں داخل ہونا، اللہ تعالیٰ اس ذلت ورسوائی اور گناہوں سے محفوظ فرمائے اور دنیا وآخرت میں ہمارے تمام عیوب کی پردہ پوشی فرمائے۔ (آمین)

''پس تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس کا ایک مطلب علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ اس شخص نے اس مجاہد کے حق میں جو خیانت کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے بارے

میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ خیانت کرنے والے کی نیکیوں کی صورت میں مجاہد کو جو عوض و بدلہ دے گا اس میں تمہیں کوئی شک ہے؟ اگر تمہیں کوئی شک نہیں ہے اور تم یہ یقین رکھتے ہوئے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ قطعی طور پر سچ ہے تو پھر تم پر لازم ہے کہ تم مجاہدین اسلام کی عورتوں کی عزت و آبرو میں خیانت کرنے سے احتراز کرو کہ مبادا اس کی وجہ سے تمہیں آخرت میں اپنی ساری نیکیوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجاہد کو جو یہ مرتبہ عظیم عطا فرمایا ہے اور اس کو اس فضیلت کے ساتھ جو مخصوص کیا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا اس مجاہد کو بس یہی مرتبہ ملے گا؟ نہیں، بلکہ اس مرتبہ اور اس مخصوص فضیلت کے علاوہ بھی اس کو اور بہت عظمتیں اور بزرگیاں ملیں گی اور اس سے بھی بڑے بڑے درجات و مراتب اس کو نصیب ہوں گے۔ (مظاہر حق ج ۳ ص ۴۳۰)

(۱۸۷) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک شخص ایک شخص کا ہاتھ پکڑے آئے گا، اور عرض کرے گا: اے پروردگار! اس نے مجھے قتل کیا تھا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: تو نے اس کو کیوں قتل کیا؟ وہ کہے گا: میں نے اس کو اس لیے قتل کیا تھا تاکہ عزت و غلبہ صرف آپ کے لیے ہو جائے، فرمائیں گے: وہ تو میرے لیے ہی ہے، ایک اور شخص ایک شخص کا ہاتھ پکڑے آئے گا اور عرض کرے گا: اس نے مجھے قتل کیا، اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے: تم نے اسے کیوں قتل کیا تھا؟ وہ کہے گا اس لیے تاکہ عزت و غلبہ فلاں شخص کے لیے ہو جائے، فرمائیں گے وہ تو فلاں شخص کے لیے نہیں ہے، چنانچہ وہ شخص اس کے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ واپس لوٹے گا۔''

(سنن النسائی : باب تعظیم الدم ، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب القصاص ص ۳۰۲)

فائدہ:

اس حدیث کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اس لیے لڑتا ہے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور دین سربلند ہو تو ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم اور بلند درجات پائے گا، اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے دین و کلمہ کی سربلندی کے لیے قتل کیا تھا اور ایسا کرنے

میں وہ حق بجانب تھا، لیکن جو شخص کسی کو حاکم یا بادشاہ کی وجہ سے قتل کرتا ہے تو ایسا شخص ناحق قتل کرنے والا، راہِ راست سے ہٹنے والا اور ظالم ہے، اس نے ایسے شخص کی عزت وسربلندی کو مقصود بنایا جس کے لیے حقیقت میں یہ چیز تھی ہی نہیں۔ اس نے راہِ راست کو چھوڑ دیا ہے، لہٰذا ایسا شخص اپنے گناہوں کے ساتھ ہلاک وبرباد ہوگا، اور اللہ تعالیٰ اسے سخت عذاب اور سزا دیں گے۔

جبکہ ایک روایت میں یوں ہے کہ: میں نے اس کو فلاں کی سلطنت میں قتل کیا تھا؟ اس صورت میں بظاہر مقتول کے سوال اور قاتل کے جواب میں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی، کیونکہ قاتل سے تو قتل کا سبب پوچھا گیا تھا نہ کہ قتل کی جگہ کو دریافت کیا گیا تھا؟ اس بارہ میں شارحین لکھتے ہیں کہ قاتل کے جملہ "میں نے اس کو فلاں کی سلطنت میں قتل کیا تھا" کی مراد یہ ہے کہ میں نے فلاں حاکم یا فلاں بادشاہ یا فلاں دنیا دار کے زمانہ میں اسکی مدد سے یا اس کے ایماء پر اس قتل کا ارتکاب کیا تھا، لیکن یہ معنی اس صورت میں ہوں گے جبکہ روایت میں لفظ "**ملک**" میم کے پیش کے ساتھ (یعنی **مُلک**) ہو، اور اگر یہ لفظ میم کے زیر کے ساتھ (یعنی **مِلک**) ہو تو پھر یہ معنی مراد ہوں گے کہ میں نے اس کو جھگڑے کے دوران قتل کیا تھا جو میرے اور اس کے درمیان فلاں شخص کی عملداری میں ہوا تھا، اس اعتبار سے قاتل کا مذکورہ جملہ بیان واقعہ کیلئے ہوگا۔ (مظاھر حق ج ۳ ص ۵۳۱)

(۱۸۸)　حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے پروردگار اس شخص سے خوش ہوتے ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے اور شکست سے دوچار ہو جائے، پھر یہ جان لے کہ اس پر کیا لازم ہے اور واپس لوٹ کر لڑے حتیٰ کہ اس کا خون بہا دیا گیا، اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتے ہیں "میرے بندے کو دیکھو! وہ میرے اجر وثواب کے شوق اور عذاب کے خوف سے واپس لوٹا یہاں تک کہ اس کا خون بہا دیا گیا" (سنن ابی داود، باب الرجل یشری نفسہ ج ۲ ص ۳۱۲)

(۱۸۹)　حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "ہمارے پروردگار اس قوم سے خوش ہوتے ہیں جسے

بیڑیوں میں جکڑ کر جنت میں پہنچایا جائے گا۔" (سنن ابی داود باب الاسیر یوثق ج ۲ ص ۳۴۹)

فائدہ:

ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہوں، جن کو مجاہدین میدانِ جنگ سے گرفتار کر کے قیدی بنا لیتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت سے نواز دیتا ہے اور مشرف بہ اسلام ہو جاتے ہیں اور جنت میں داخل ہو جاتے ہیں، چنانچہ ان کو قید و بند میں جکڑنا ان کے ایمان لانے کے باعث بنا، اگر انہیں قید و گرفتار نہ کیا جاتا تو وہ کفر کی حالت میں قتل کر دیئے جاتے۔

(۱۸) ﴿امتِ محمدیہ کے اعمال کا اجر وثواب بڑھایا جانا﴾

(۱۹۰) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''دوسری امتوں کے لوگوں کے مقابلہ میں تمہارا عرصہ حیات اتنا ہے جتنا کہ نمازِ عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک کا درمیانی وقت، (علاوہ ازیں) تمہارا معاملہ اور یہود ونصاریٰ کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص اجرت پر کام کرنے کے لیے کچھ مزدوروں کو طلب کرے اور ان سے کہے کہ کوئی ہے جو دوپہر تک میرا کام کرے اور میں ہر شخص کو ایک ایک قیراط دوں گا، چنانچہ اس اجرت کو منظور کر کے یہود نے دوپہر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا؟ پھر اس شخص نے کہا: کوئی ہے جو دوپہر سے عصر تک میرا کام کرے اور میں ہر شخص کو ایک ایک قیراط دوں گا۔ چنانچہ نصاریٰ نے دوپہر سے عصر کے وقت تک ایک ایک قیراط پر کام کیا، پھر اس شخص نے کہا: کوئی ہے جو نماز عصر سے غروب آفتاب تک میرا کام کرے اور میں ہر شخص کو دو دو قیراط دوں گا، جان لو! (اس مثال میں) تم ہی وہ لوگ ہو جو عصر کی نماز سے غروبِ آفتاب تک کام کرنے والے ہیں، یاد رکھو! تمہارا اجر دوگنا ہے، اور اسی وجہ سے یہود ونصاری بھڑک اٹھے اور بولے کہ عمل کے اعتبار سے تو ہم بڑھے ہوئے ہیں لیکن اجر وثواب میں ہمارا حصہ بہت کم ہے، اللہ تعالیٰ نے انکو جواب دیا: کیا میں نے تمہارے ساتھ کچھ ظلم کیا ہے؟ یہود ونصاریٰ نے کہا: نہیں، پروردگار نے فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ یہ زیادہ اجر دینا میرا فضل واحسان ہے، میں جس کو چاہوں زیادہ دوں''۔

(صحیح البخاری، کتاب الاجارۃ، باب الاجارۃ الی صلاۃ العصر ج ۳ ص ۹۰ مشکوٰۃ المصابیح، باب ثواب ھذہ الامۃ ص ۵۸۳)

امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

اس سے مراد وہ جماعت ہے جو اجابت اور متابعت دونوں کی جامع ہے، جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا نبی ورسولؐ بھی مانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع وپیروی بھی کی، چنانچہ اس جماعت کو ''فرقہ ناجیہ'' (نجات یافتہ گروہ) سے تعبیر کیا جاتا ہے، پس ''تنقیح''

''امت'' میں سے نہیں ہے، اور جیسا کہ ''توضیح'' میں ہے کہ علی الاطلاق ''امت'' میں سے اہل سنت والجماعت ہیں اور وہ لوگ ہیں جن کے دین پر چلنے کا راستہ رسول خدا ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے راستہ کے مطابق ہے اور صاحب ''تلویح'' نے لکھا ہے کہ مبتدع کو علی الاطلاق ''امت'' میں سے خارج اس لیے کہا جاتا ہے کہ اگر چہ وہ اہل قبلہ میں سے ہوں، مگر وہ ''امتِ دعوت'' ہی کے حکم میں ہوں گے، جیسا کہ کفار ''امتِ دعوت'' ہیں۔ ان کا شمار ''امتِ اجابت'' میں نہیں ہوگا۔

دوسری تمام امتوں کے مقابلہ میں اس امت مرحومہ کے فضائل ومناقب اور اس کے اجر وثواب کی کثرت حد حصر سے خارج حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ بلاشبہ یہ امت رسول ﷺ تمام دوسری امتوں سے افضل وبرتر ہے، اس امت کی افضلیت وبرتری کو ثابت کرنے کیلئے قرآن مجید میں خالق کائنات کا یہ ارشاد عالی کافی ہے: ''کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ'' یعنی (اے امت محمدیہ) تم لوگ سب سے اچھی امت ہو جس کو لوگوں کی (ہدایت ورہنمائی) کے لئے ظاہر کیا گیا ہے''۔ نیز یہ ارشاد باری کہ: ''وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ''۔ ''اور اس طرح ہم نے تم کو (اے امت محمدیہ) ایسی امت بنایا ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلے میں گواہ ہو''۔

اور اس امت کی مدح وتعریف میں خود یہی ایک بات سب سے بھاری ہے کہ وہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت ہے جو خاتم النبیین، سیّد المرسلین اور افضل الخلائق ہیں، اور یہ کہ تمام انبیاء اور رسولوں نے آرزو کی کہ کاش وہ محمد ﷺ کا زمانہ پاتے اور آپ کی امت کا ایک فرد ہونے کا شرف حاصل کرتے، اس کے علاوہ اس کے خصائص وکمالات اور کرامات وفضائل میں ایسی چیزیں ثابت ہیں جو پچھلی امتوں میں سے کسی امت کیلئے ثابت نہیں ہیں۔

اللّٰهم اجعلنا من امّته وارزقنا محبّته وتوفّنا علی دینه وملّته برحمتک یا ارحم الرّاحمین.

(مزید تفصیل وتحقیق کیلئے مطالعہ فرمایئے: مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۲۴۸ نیز

مجمع بحار الانوار ج ۱ ص ۱۰۸، ۱۰۹ مع حاشیہ)

حدیث میں مذکور لفظ ''اَجَل'' کسی چیز کی مدت متعینہ کو کہتے ہیں، اور کبھی اس لفظ کا اطلاق انسان کی موت پر کیا جاتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ ''دنا اجله'' کہ اس شخص کی موت قریب آ گئی۔ یہ بات ملا علی قاریؒ نے امام طیبیؒ کے حوالہ سے لکھی ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ ''اَجَل'' کے لفظ سے کبھی تو اس پوری مدت کو تعبیر کیا جاتا ہے جو عمر کے لیے متعین ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلاً وَّاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَه'' میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اور کبھی اس لفظ کا اطلاق مدتِ عمر کے خاتمہ اور زندگی کے آخری لمحہ پر ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ''اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ'' میں اس لفظ کے یہی معنی مراد ہیں، پس یہاں حدیث کے الفاظ میں لفظ اَجَل کے پہلے معنی مراد ہیں، یعنی پورا عرصہ حیات، پوری مدتِ عمر، اس وضاحت کی روشنی میں ارشاد گرامی کے ان الفاظ کی وضاحت یہ ہوگی کہ اے مسلمانو! پچھلی امتوں کے لوگوں کی لمبی عمروں کے مقابلہ میں تمہاری کم عمروں کا تناسب وہی ہے جو دن کے آغاز سے نمازِ عصر تک کے وقت کے مقابلہ میں عصر کے بعد سے غروبِ آفتاب تک کے وقت کا ہے، اس کے باوجود تمہارے اجر و ثواب کی مقدار زیادہ متعین ہے، جبکہ ان لمبی لمبی عمروں والوں کے لیے اجر و ثواب کی مقدار کم رکھی گئی، یہ تمہارا شرف و اعزاز ہے کہ تمہارے عمل کا عرصہ کم ہے مگر اجر و ثواب کہیں زیادہ ہے۔

''قیراط'' ایک وزن کا نام ہے جو درہم کے بارھویں حصہ یا دینار کے بیسویں یا چوبیسویں حصہ کے برابر ہوتا ہے۔

''یہود نے دوپہر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا۔''

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے اور ان کی اتباع کرنے والوں نے اپنی اپنی لمبی لمبی عمروں میں کم اجر و ثواب پر زیادہ عمل کیا، اور اس طرح وہ ان مزدوروں کے مشابہ ہوئے جنہوں نے صبح سے دوپہر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا ہو، اسی طرح جب حضرت عیسیٰ کے ماننے والوں اور ان کی اتباع کرنے والوں کا زمانہ آیا تو انہوں نے بھی

اپنے عرصہ حیات میں کم اجروثواب پر زیادہ عمل کیا اور اس طرح وہ ان مزدوروں کے مشابہ ہوئے جنہوں نے دوپہر کے بعد سے عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا ہو۔

''یاد رکھو! تمہارا اجر دوگنا ہے'' یعنی یہود ونصاریٰ کے ساتھ تو یہ معاملہ تھا کہ وہ جتنا کرتے تھے اسی کے برابر اجروثواب کے مستحق ہوئے تھے، لیکن تمہارا شرف واعزاز یہ ہے کہ ان کی بہ نسبت تم کو دگنا اجروثواب ملتا ہے، گویا حدیث کا یہ مضمون اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ ''یعنی اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول (محمد ﷺ) پر ایمان لاؤ، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے تمہیں دگنا ثواب دے گا۔''

پس اس امت کے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے نبی ﷺ کو مانا اور ان کی تصدیق کی، بلکہ پچھلے نبیوں اور رسولوں پر بھی ایمان لائے، اور ان کی تصدیق کی، لہٰذا دگنے اجروثواب کے مستحق ہوئے۔

''لیکن اجروثواب میں ہمارا حصہ بہت کم ہے'' یہود ونصاریٰ کی اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ پروردگار! یہ کیا بات ہے کہ امت محمدیہ کا کام کم اور اس کے اعمال قلیل، لیکن اس کا اجروثواب بہت زیادہ ہے، اس امت کے مقابلہ میں ہمارا کام کہیں زیادہ، ہمارے اعمال بہت کثیر، مگر ہمارا اجر کہیں کم اور ثواب بہت قلیل، یہاں دونوں احتمال ہیں۔ (۱) یہ بات یہود ونصاریٰ یا تو قیامت کے روز کہیں گے جب وہ امت محمدیہ کو اجرثواب کے اعتبار سے اپنے مقابلہ میں کہیں زیادہ آگے پائیں گے۔ (۲) یا اس طرح کی بات انہوں نے اس وقت کہی ہوگی کہ جب ان کے اپنے اپنے زمانہ میں اپنی آسمانی کتابوں اور اپنے رسولوں کی زبانی اس امتِ محمدیہ کے ایسے فضائل وخصائص معلوم ہوئے ہوں گے۔

بہرصورت! اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی اجروثواب ملتا ہے وہ نہ تو عبادات واعمال میں رنج وتعب اٹھانے کے اعتبار سے ملتا ہے، اور نہ استحقاق کی وجہ سے، کیونکہ بندہ اپنے مولیٰ کے نزدیک اس وجہ سے ثواب کا مستحق

نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی عبادت کی ہے، کوئی کارگزاری دکھائی ہے، بلکہ مولیٰ اپنے محض فضل واحسان کی وجہ سے بندے کو ثواب سے نوازتا ہے اور مولیٰ کو اس کا مکمل اختیار ہے کہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ سے زیادہ ثواب عطا فرمائے۔

واضح ہو کہ حدیث میں مذکور ''یہود ونصاریٰ'' سے مراد وہ یہود نصاریٰ ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنے پیغمبر کو مانا اور اس پر ایمان لائے اور اس کی لائی ہوئی کتاب اور شریعت کی پیروی کی اور آخر دم تک اپنے دین پر قائم رہے، رہی ان یہود ونصاریٰ کی بات جنہوں نے اپنے دین حق سے انحراف کیا، اپنے رسول اور اپنی کتاب کا انکار کیا، ان کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے، کیونکہ وہ تو سرے سے ثواب ہی سے محروم رہے۔

علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ نصاریٰ جو حضرت عیسیٰ اور انجیلِ مقدس پر ایمان رکھتے تھے، باوجود یہ کہ حضرت موسیٰ اور توریت پر بھی ایمان لائے تھے، لیکن ان یہود کی بہ نسبت زیادہ ثواب نہیں ملا جو صرف اپنے ہی رسولؑ اور اپنی ہی کتاب، یعنی موسیٰ علیہ السلام اور توریت پر ایمان لائے تھے۔

ایک اور بات اس حدیثِ مبارک سے حنفی علماء نے عصر کے وقت کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول کو مضبوط بنانے کے لیے استدلال کیا ہے، امام ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ عصر کا وقت جب شروع ہوتا ہے کہ ہر شے کا سایہ اس کے دو مثل یعنی دوگنا ہو جائے، چنانچہ ان حنفی علماء کا کہنا ہے کہ نصاریٰ کے عرصہ عمل کا اس امت کے عرصہ عمل سے زیادہ ہونا اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے، جبکہ حدیث میں مذکور مثال کے مطابق ان کے کام کی مدت دوپہر کے بعد سے ہر شے کا سایہ دو مثل یعنی دوگنا ہو جانے تک رہے۔

(مظاہر حق ج۵ ص ۹۱۰ تا ص ۹۱۱)

(۱۹۱) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' مسلمانوں، یہود اور نصاریٰ کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو ایک قوم کو رات تک اس شرط پر اجرت پر رکھے کہ انہیں اتنے پیسے دے گا، وہ دن کے نصف تک کام کریں، اور کہیں ہمیں وہ اجرت منظور نہیں ہے، جو آپ نے طے کی ہے، ہم نے جو کچھ طے کیا۔ وہ کالعدم سمجھیں وہ

ان سے کہے: ایسا نہ کرو، دن کا باقی حصہ بھی کام کرلو اور مقررہ اجرت پوری لے جاؤ، لیکن وہ اس سے انکار کر کے کام ادھورا چھوڑ کر چلے جائیں، ان کے جانے کے بعد وہ دوسرے مزدوروں کو اجرت پر رکھ لے اور کہے: آج کا بقیہ دن کام کرلو تمہیں اجرت وہی ملے گی جو میں نے پہلے والوں سے طے کی تھی۔ وہ لوگ کام شروع کریں اور جب عصر کا وقت ہو تو کہیں: ہم نے جو کچھ کیا وہ کالعدم سمجھیں اور آپ نے مزدوری طے کی تھی وہ اپنے پاس رکھیں، وہ ان سے کہے: دن کا باقی حصہ پورا کرلو، اب دن ختم ہی ہونے والا ہے۔ پھر ایک اور جماعت کو باقی ماندہ دن میں کام کے لیے اجرت پر رکھے، وہ باقی ماندہ دن میں کام کریں۔ سورج کے غروب ہونے تک کام کر کے پچھلی دونوں جماعتوں کی مقررہ اجرت پوری کی پوری وصول کرلیں، یہی مثال ہے ان یہود ونصاریٰ کی اور ان کی جنہوں نے اس نور (محمدیؐ) کو قبول کیا'' (صحیح البخاری، باب الاجارۃ من العصر الی اللیل ج ۳ ص ۹۰)

(۱۹) ﴿تورات میں آنحضرت ﷺ کے اوصاف کا ذکر﴾

(۱۹۲) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ اس طرح ہے: یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا (الاحزاب: ۴۵) "اے نبی! بے شک ہم نے آپ کو گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے" اور تورات میں یوں ہے کہ "اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور امیوں کا محافظ بنا کر بھیجا ہے، آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، آپ نہ تند مزاج ہیں، نہ سخت طبیعت، نہ بازاروں میں شور وشغب کرنے والے ہیں اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کرتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں وفات نہیں دیں گے جب تک کہ ان کے ذریعہ ٹیڑھی ملت کی اس طرح اصلاح نہ فرمادیں کہ لوگ لآ الٰہ الا اللہ پڑھ لیں۔ اس کے ذریعہ اندھی آنکھوں اور بہرے کانوں اور پردہ پڑے ہوئے دلوں کو کھول دیں گے۔"

(صحیح البخاری، باب قول اللّٰہ تعالیٰ انا ارسلنک شاهداً ج۶ ص ۱۳۶)

فائدہ:

حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص رضی اللہ عنہ (حدیث کے راوی) نہایت عالم، فاضل قاری حافظ صحابی تھے، کتابت خوب جانتے تھے، پچھلی آسمانی کتابوں، تورات وانجیل پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، حضور اکرم ﷺ نے ان کو اپنی احادیث لکھنے کی اجازت عطا فرمائی تھی، چنانچہ آپ، آنحضرت ﷺ سے جو سنتے تھے لکھ لیتے تھے، اسی لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرح یہ بھی کثیر الاحادیث ہیں، اور بہت سے تابعین کرام آپ سے حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ آپ بڑے عابد اور شب بیدار صحابی تھے، چنانچہ یعلیٰ بن عطاءؒ اپنی والدہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کیلئے سرمہ بنایا کرتی تھیں، کیونکہ یہ رات بھر عبادت کیا کرتے تھے، چراغ بجھا کر بہت رویا کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کی آنکھوں کی پلکیں گر گئی تھیں۔

(الاکمال فی اسماء الرجال ص ۹۸۹ مترجم)

بہرکیف! حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ نے چونکہ تورات پڑھ رکھی تھی اور انہیں

معلوم تھا کہ اس آسمانی کتاب میں ہمارے حضرت محمد ﷺ کے بارے میں کیا کیا پیشین گوئیاں ہیں اور آپ ﷺ کے کن فضائل واوصاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس لیے انہوں نے حضرت عطاء ابن یسارؒ کے سوال پر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے جو بعض اوصاف وفضائل قرآن کریم میں ذکر کیے ہیں اور جن کو ہم نے آپ ﷺ کی زندگی میں دیکھا بھی ہے وہ تورات میں مذکور ہیں۔ پھر انہوں نے کچھ تفصیل کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے ان اوصاف وفضائل کو بیان کیا جو تورات میں مذکور ہیں، نیز انہوں نے تورات میں مذکورہ باتوں کو بیان کرنے کیلئے تفنن عبارت کے طور پر شروع میں تو وہی اسلوب اختیار کیا جو قرآن حکیم میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کا ہے اور پھر وہ اسلوب بھی اختیار کیا جو تورات میں آنحضرت ﷺ کے متعلق پیش گوئی کا ہے۔

''امیوں کا محافظ بنا کر...... الخ'' اس جملہ میں ''امیوں'' سے مراد اہل عرب ہیں اور ان کو ''امی'' سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ ان کی اکثریت پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ یا پھر ان کو ''ام القریٰ'' (یعنی اہل مکہ کی طرف منسوب کر کے) ''امی'' کہا گیا۔

(مجمع البحار ج ۱ ص ۱۰۷)

نیز یہاں اہل عرب کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا نسلی اور وطنی تعلق ان ہی سے ہے اور ان ہی میں مبعوث فرمائے گئے، تا کہ ان کو غیر عرب کے غلبہ تسلط سے محفوظ رکھیں اور سب سے پہلے ان ہی کو ایمان واخلاق کے ہتھیار سے مسلح کر کے ان کی حفاظت وفلاح کا سامان کریں۔

اور اگر شیطانی گمراہیوں اور نفسانی آفات سے حفاظت و پناہ مراد لی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا بابرکت وجود تمام تر عالم کیلئے پشت پناہ ہے۔

اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ ''حفاظت و پناہ'' سے مراد آنحضرت ﷺ کی قوم وملت کا اس وقت تک عذاب الٰہی میں مبتلا ہونے اور تباہ وہلاک ہوجانے سے محفوظ ومامون رہنا ہے جب تک آپ ﷺ اپنی قوم وملت کے درمیان موجود ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ'' ''یہ ممکن نہیں کہ اللہ

تعالیٰ ان (مسلمانوں) پر عذاب نازل کرے اور آپ ﷺ ان میں موجود ہوں"۔

(مجمع بحار الانوار ج ۱ ص ۴۷۳)

اور حدیث میں مذکور لفظ "الملّة العوجاء" (کج رو اور ٹیڑھی ملت) سے مراد ہے ملت ابراہیمیؑ، جسے اہل عرب نے راہ استقامت سے بدل کر رکھ دیا تھا، اور اگر یہ اشکال کیا جائے کہ اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تورات میں مذکور چیزیں قرآن میں بھی موجود اور ثابت ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں، بالکل ایسا ہی ہے، جیسا کہ بازاروں میں شور و شغب نہ کرنا، قرآن حکیم کی اس آیت سے مفہوم ہوتا ہے: "وَكُنْ مِنَ السّٰجِدِيْنَ" اور یہ ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ میں سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جاؤں نہ کہ ان تاجر لوگوں میں سے بنوں جو بازاروں میں شور وغل مچاتے پھرتے ہیں، اسی طرح دیگر اوصاف وفضائل بھی (جو تورات میں مذکور ہیں) ضمناً یا صریحاً قرآن کریم میں بھی مذکور ہیں۔

(دیکھئے اور پڑھئے: مجمع بحار الانوار للعلامه اللغوى ملک المحدثين محمد طاهر الصديقى الهندى الفتنى الگجراتیؒ ج ۳ ص ۶۹۸)

مطلب یہ ہے کہ وہ پیغمبرؐ اپنی امت کے مومنوں کے ایمان اور کافروں کے کفر وتکذیب کی شہادت دیں گے، مومنوں کو جنت کی خوشخبری سنائیں گے اور کافروں کو دوزخ کی آگ سے ڈرائیں گے، اور امّی اہل عرب کے لیے مضبوط قلعہ ہیں۔ آپ کا نام "متوکل" اس لیے رکھا گیا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ رکھنے والے ہیں اور تھوڑے رزق پر قناعت کرنے والے ہیں اور فتح ونصرت میں اللہ پر ہی اعتماد کرتے ہیں، مصائب کی دوری میں کشادگی کا انتظار کرتے ہیں، اخلاق حسنہ کو اپناتے ہیں اور اللہ جل شانہٗ کے تمام وعدوں پر یقین کامل رکھتے ہیں، اسی وجہ سے آپ کا نام "متوکل" رکھا گیا۔

آپ ﷺ بازاروں میں شور وشغب نہیں کرتے، بلکہ نرم مزاجی اور خاموشی کے ساتھ رہتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ بازاروں میں شور وغل مچانا قابل مذمت بات ہے۔

''ٹیڑھی ملت'' سے ملت ابراہیمی مراد ہے، کیونکہ زمانہ فترت میں اس ملت میں ٹیڑھا پن آگیا تھا، اس میں کمی وزیادتی آگئی تھی، اور تغیر وتبدل ہوگیا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مبعوث ہوکر اس کی اصلاح فرمائی، عربوں میں جو کفر وشرک چہار سو پھیل چکا تھا اسے ختم کیا، توحید کا عَلَم بلند کیا، اس کلمہ توحید کے ذریعہ ایسی آنکھوں کو روشن کیا جو حق بات دیکھنے سے اندھی ہوچکی تھی، اور دلوں پر پڑے ہوئے پردوں کو چاک کیا، خلاصہ اور حاصل یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ہدایت کا سبب اور ذریعہ بنے۔

(۲۰) ﴿پیش آمدہ مصائب پر صبر کرنے کی جزاء﴾

(۱۹۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے کسی بندہ کو اس کی دونوں پیاری چیزوں میں مبتلا کر دیتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں ان دونوں کے بدلہ میں اسے جنت دیتا ہوں۔'' (راوی کہتے ہیں کہ اس کی دونوں پیاری چیزوں سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس کی دونوں آنکھیں ہیں۔'' (صحیح البخاری، کتاب الطب، باب فضل من ذهب بصره ج۷ ص ۱۱۶، مشکوٰۃ المصابیح، باب عيادة المريض ص ۱۳۵

اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے بھی جامع ترمذی، باب ماجآء في ذهاب البصر ج ۲، ص ۶۴ پر نقل کیا ہے۔

فائدہ:

اللہ جل شانہ، کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو میں نابینا کر دیتا ہوں تو اس کو اس کی دونوں آنکھوں کے بدلہ میں بہشت دیتا ہوں، یعنی اسے نجات یافتہ اور فلاح یافتہ لوگوں کے ہمراہ جنت میں داخل کروں گا۔ یا یہ کہ اسے جنت میں مخصوص مراتب و درجات عطا کروں گا، لہٰذا جب کوئی شخص اپنی بینائی سے محروم ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ نہ تو اس کی وجہ سے اپنی زبانِ شکایت کو دراز کرے، اور نہ دل میں کوئی تنگی اور تکدر پیدا کرے، بلکہ ایسی صورت میں صبر وشکر کی راہ پر گامزن رہے، اور یاد رکھے کہ اندھا ہو جانا غضب خداوندی کی وجہ سے نہیں بلکہ گناہوں کے دور ہونے، درجات کے بلند ہونے اور نگاہِ بد سے بچانے کے لیے حق تعالیٰ نے آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔

ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ جب عمر کے آخری حصہ میں نابینا ہوگئے تو فرمایا کرتے تھے کہ وہ خلوت جسے میں تمام عمر چاہا کرتا تھا اب میسر آئی ہے۔

(مظاهر حق ج۲ ص ۴۱)

اس حدیث میں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وہ اس ابتلاء وآزمائش پر

صبر سے بھی کام لیتا ہو، لہٰذا کچھ ''صبر'' کے بارے میں جاننا چاہئے کہ صبر ایک ایسی راہ ہے جس کو اختیار کیے بغیر کسی مومن کے لیے کوئی چارہ نہیں، کیونکہ ایمان کی سلامتی اور عبادت میں اطمینان وسکون کے ساتھ مشغولیت کا انحصار ''صبر'' ہی پر ہے، نیز صبر کرنے والے کو دونوں جہاں کی بے شمار سعادتیں عطا کرنے کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ اور ''صبر'' اصل میں یہ ہے کہ اپنے نفس کو جزع سے روکا جائے'' اور جزع اس کو کہتے ہیں کہ جب کوئی سخت حالت اور آفت وپریشانی آئے تو اس پر اضطراب وگھبراہٹ کا اظہار کیا جائے، اپنے عجز کا رونا رویا جائے، لہٰذا ان چیزوں کو ترک کرنا صبر کہلاتا ہے۔

نیز یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اپنی حیثیت وحالت کے اعتبار سے صبر کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) ایک تو وہ صبر ہے جو نفس کی طاعت وعبادت کی استقامت وپابندی کی محنت ومشقت برداشت کرنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا وہ صبر ہے جو گناہوں سے اجتناب کرنے کی صورت میں اختیار کرتا ہے۔ (۳) تیسرا وہ صبر ہے جو دنیا کی زائد از ضرورت چیزوں سے قطع تعلق کر لینے کی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے۔ (۴) اور چوتھا وہ صبر ہے جو کسی دینی ودنیاوی آفت ومصیبت اور سختی وپریشانی کو برداشت کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔

لہٰذا جو شخص صبر کی ان چاروں قسموں کو اختیار کر لے وہ طاعت وعبادت کی راہ پر سکون واستقامت کے ساتھ گامزن رہے گا، گناہوں سے مامون ومحفوظ رہے گا، دنیا کی آفات وبلیات سے سلامتی اور آخرت کے عذاب سے نجات پائے گا۔ علاوہ ازیں بہت زیادہ اجر وثواب سے نوازا جائے گا اور جو شخص مذکورہ بالا صورتوں میں صبر کو اختیار نہیں کرے گا اور جزع وفزع کی راہ کو اختیار کرے گا وہ تمام نعمتوں سے محروم رہے گا اور اول تو وہ دلجمعی اور اطمینان وسکون کے ساتھ عبادت نہیں کر سکے گا اور اگر کچھ کر لے گا بھی تو بے صبری کے گناہ اس کو کالعدم کر دیں گے۔

(۱۹۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے کسی بندہ کے عزیز ومحبوب کو جو اہل دنیا میں سے ہو، اٹھا لیتا ہوں اور وہ

بندہ اس پر ثواب کا طلب گار رہتا ہے تو میرے پاس اس کے لیے جنت سے بہتر کوئی جزا نہیں ہے۔'' (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب العمل یبتغی به وجه الله ج ۸ ص ۹۰، مشکوٰۃ المصابیح، باب البکاء علی المیت ص ۱۵۰)

فائدہ:

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا اہلِ دنیا میں سے کوئی عزیز و محبوب جیسے اولاد، ماں باپ یا ان کے علاوہ کوئی بھی ایسا شخص جسے وہ عزیز و محبوب رکھتا تھا، انتقال کر جائے اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کے اس صبر کی بناء پر اللہ تعالیٰ اسے جنت عطا فرمائے گا۔

''اہل دنیا'' کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر اہل آخرت میں سے کوئی عزیز و محبوب مر جائے اور اس پر صبر کیا جائے تو اس سے بھی بڑی سعادت ملتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوگا، اور کسی بندہ سے اللہ تعالیٰ کا راضی ہو جانا اس کے حق میں دنیا و آخرت کی سب سے بڑی سعادت اور سب سے بڑی فضیلت ہے۔ (مظاہر حق ج ۲ ص ۱۴۹)

(۱۹۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' کوئی دو مسلمان ایسے نہیں کہ ان کے تین بچے بالغ ہونے سے پہلے فوت ہو جائیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل و رحمت سے جنت میں داخل کرے گا، فرمایا: ان بچوں سے کہا جائے گا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ، وہ کہیں گے، ہم جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ ہمارے ماں باپ جنت میں داخل نہ ہو جائیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تم اور تمہارے ماں باپ (سب کے سب) داخل ہو جاؤ'' (سنن النسائی، باب من يتوفى له ثلاثة اولاد)

(۱۹۶) حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ابن آدم! اگر تو صدمہ کے ابتدائی مرحلہ پر صبر کرے اور اجر و ثواب کی امید رکھے تو میں جنت کے سوا تیرے لیے کسی ثواب (بدلہ) پر راضی نہ ہوں گا۔''

(سنن ابن ماجه، باب ماجاء في الصبر على المصيبة ج ۱ ص ۲۴۹)

(۱۹۷) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ

ناتمام بچے کے والدین کو دوزخ میں داخل (کرنے کا ارادہ) کرے گا تو وہ اپنے پروردگار سے جھگڑے گا، چنانچہ اس سے کہا جائے گا: پروردگار سے جھگڑنے والے ناتمام بچے! اپنے ماں باپ کو جنت میں لے جاؤ۔" لہٰذا وہ ناتمام بچہ اپنے والدین کو اپنی آنول نول کے ذریعہ کھینچے گا، یہاں تک کہ انہیں جنت میں لے جائے گا"۔(سنن ابن ماجه، باب ماجاء فيمن اصيب بسقط، مشكوٰة المصابيح، باب البكاء على الميت ص ۱۵۳)

فائدہ:

اس ارشادِ گرامی میں "آنول نول" اس جھلی کو کہتے ہیں جو پیدائش کے وقت بچہ کی ناف سے لٹکی ہوتی ہے۔ اور اس میں بچہ اور اس کی ماں کے درمیان تعلق اور علاقہ کی طرف اشارہ ہے، گویا آنول نول رسی کی مانند ہو جائے گی کہ جس کے ذریعہ وہ بچہ اپنی ماں اور اپنے باپ کو بہشت کی طرف کھینچے گا، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب اس بچہ کے مرجانے کا اتنا زیادہ ثواب ہے جو ابھی ناتمام ہی تھا اور جس سے ماں باپ کو کوئی تعلق اور لگاؤ بھی پیدا نہیں ہو سکا تھا تو اس بچہ کے مرجانے پر ماں باپ کو کتنا کچھ اجر و ثواب ملے گا جو پلا پلایا اللہ کو پیارا ہو گیا اور جس سے ماں باپ کو کمالِ تعلق و لگاؤ بھی پیدا نہیں ہو سکا تھا۔

(مظاهر حق ج ۲ ص ۱۶۳)

(۱۹۸) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب کسی بندے (مومن) کا کوئی بچہ مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے کہ تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کی ہے۔" وہ عرض کرتے ہیں کہ "ہاں" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ "جی ہاں" پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ (اس حادثہ پر) میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ اس نے تیری تعریف کی اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام "بیت الحمد" رکھو"۔(جامع الترمذی، ابواب الجنائز ج ۱ ص ۱۹۰)

فائدہ:

اس گھر کو "بیت الحمد" اس بناء پر کہا گیا ہے کہ اس کے حصول کا سبب در حقیقت اللہ تعالیٰ کی وہ حمد وثناء ہے جو بندہ مومن مصیبت پیش آنے پر صبر واحتساب اور استرجاع (اناللہ پڑھنا) کے ذریعہ کرتا ہے یا پھر اس کو "بیت الحمد" اضافت المسمّٰی الی اسمہ کے طور پر کہا گیا ہے، یعنی ایسا گھر جس کا نام ہی حمد ہے، اور یا پھر تشریفاً وتعظیماً اسے "بیت الحمد" کہا گیا ہے، جیسے بیت اللہ، ناقۃ اللہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

(۱۹۹) حضرت عطاء بن یسارؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس دو فرشتے بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں، دیکھو! کہ وہ عبادت کرنے والوں سے کیا کہتا ہے؟ اگر وہ ان کے آنے پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرتا ہے تو وہ فرشتے، اللہ تعالیٰ تک یہ بات پہنچا دیتے ہیں (حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے حال سے خوب واقف ہے) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "میں اپنے بندے کی یہ ضمانت دیتا ہوں کہ اگر میں نے اپنے بندے کو وفات دے دی تو اسے جنت میں داخل کروں گا اور اگر اسے شفا دے دی تو میں اسے اس گوشت سے بہتر گوشت اور اس خون سے بہتر خون دوں گا اور اس کے گناہوں کو مٹا دوں گا۔" (الموطاء، باب ماجاء فی فضل المریض ج۲ ص ۲۰۶)

فائدہ:

یہ حدیث حضرت عطاء سے منقول ہے مگر اس میں یہ ذکر نہیں کہ یہ حضور اکرم ﷺ کے الفاظِ مبارکہ ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ یہ حدیث حضرت عطاء بن یسارؒ جو کہ صحابی نہیں ہیں، ان کا کلام ہو، لیکن اس میں جو کلمات مذکور ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلمات خود ساختہ نہیں ہو سکتے، عقل کو ان میں کوئی عمل دخل نہیں ہو سکتا، پھر اس میں اللہ جل شانہ، کی طرف نسبت کی گئی ہے، جو حضور ﷺ کے فرمان کے بغیر معلوم ہونا ممکن نہیں۔

اور اصولِ حدیث کے علماء نے ایک قاعدہ لکھا ہے کہ جب کوئی صحابی ایسی بات کہے جس میں عقل ورائے کا دخل نہ ہو تو وہ بات حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔

لہٰذا عین ممکن ہے کہ حضرت عطاءؒ نے کسی صحابی رسول ﷺ سے اسے سنا ہو تو اس بناء پر یہ حدیث مرفوع ہو جائے گی اور اگر ان کے اپنے الفاظ ہوں تو یہ حدیث مقطوع بن جائے گی۔

بہر حال! مریض کو اپنی بیماری پر جو اجر و ثواب ملتا ہے اس کے بارے میں بخاری و مسلم میں کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ''مسلمانوں کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے اس کے ذریعہ اس کے گناہ جھڑتے ہیں، یہاں تک کہ وہ کانٹا بھی جو کسی انسان کو لگ جائے۔

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ بیمار تھے، میں آپ کے پاس حاضر ہوا، آپ ﷺ کو سخت بخار تھا، میں نے عرض کیا! یارسول اللہ آپ کو سخت بخار ہے! پھر میں نے کہا: کیا یہ اس لیے ہے تا کہ آپ کو دگنا اجر ملے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں'' کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جسے کوئی بیماری یا تکلیف لاحق ہو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتے ہیں جس طرح درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔

(۲۰۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (ایک مرتبہ) حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بیمار کی عیادت فرمائی، میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھا، اس شخص کو بخار تھا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا خوشخبری ہو! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں'' یہ بخار میری آگ ہے جسے میں دنیا میں اپنے مومن بندے پر مسلط کرتا ہوں تا کہ وہ اس کے لیے دوزخ کی آگ کے حصہ کا بدل بن جائے۔'' (سنن ابن ماجه، باب الحمّٰی ج۲ ص ۱۸۲)

(۲۰۱) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ''صاحب'' قرآن جب جنت میں داخل ہوگا تو اس سے کہا جائے گا'' پڑھتا جا اور (منزلیں) چڑھتا جا! وہ ہر آیت پڑھ کر ایک سیڑھی پر چڑھتا جائے گا یہاں تک کہ وہ پورا قرآن حکیم ختم کرے گا جو اس کے سینہ میں (محفوظ) ہے۔''

(سنن ابن ماجه، باب ثواب القرآن ج۲ ص ۲۱۷، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب فضائل القرآن ص ۱۸۶)

فائدہ:

''صاحب قرآن'' سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن کریم کی ہمیشہ تلاوت بھی کرتا رہے اور اس پر عمل پیرا بھی ہو، وہ شخص مراد نہیں ہے جو تلاوت تو کرتا ہو مگر اس پر عمل نہ کرے، بلکہ ایسا شخص کسی جزا اور انعام کا مستحق تو کیا ہوگا، الٹا قرآن کی لعنت میں گرفتار ہوگا، کیونکہ جو شخص قرآن پڑھتا ہے، مگر اس پر عمل نہیں کرتا قرآن اس پر لعنت کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک یہ روایت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جس شخص نے قرآن پر عمل کیا اس نے گویا ہمیشہ قرآن پڑھا، اگر چہ حقیقت میں نہ پڑھا ہو اور جس شخص نے قرآن پر عمل نہیں کیا اس نے گویا قرآن پڑھا ہی نہیں، اگر چہ حقیقت میں پڑھا ہو،

حاصل یہ کہ قرآن مجید کی محض تلاوت ہی کافی نہیں ہے، بلکہ بنیادی چیز قرآن پر عمل کرنا ہے۔

''پڑھتا جا اور چڑھتا جا'' یعنی قرآن کریم پڑھتا جا اور پڑھی ہوئی آیات کے بقدر جنت کے درجات پر چڑھتا جا، جتنی آیتیں پڑھے گا اتنے ہی درجات تک تیری رسائی ہوگی۔ ایک روایت میں منقول ہے کہ قرآن کریم کی جتنی آیتیں ہیں اتنے ہی درجات ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص پورا قرآن پڑھے گا تو وہ جنت کے سب سے اونچے درجات میں سے اس درجہ پر پہنچے گا جس کا وہ اہل ہے اور جو اس کے لائق ہوگا۔

آدابِ تلاوت قرآن کریم میں سے ایک سب سے اعلیٰ ادب یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کر اور لب ولہجہ کے پورے سکون وقار کے ساتھ پڑھا جائے۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ جو حافظِ قرآن کریم ترتیل کے ساتھ پڑھتے ہیں جنت میں ان کا بڑا مرتبہ ہوگا۔

قرآن کریم کی آیتوں کی تعداد کوفیوں کے اصول کے اعتبار سے جن کا فنِ قرأت اور اصول ہمارے ہاں مروج ہے، چھ ہزار دوسو سینتیس (۶،۲۳۷) ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں، مزید تفصیل اور وضاحت کے لیے تجوید وقرأت کی کتابوں سے رجوع کیا

جاسکتا ہے۔(مظاہر حق ج۲ ص ۴۰۷)

(۲۰۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے، ہر اوقیہ زمین وآسمان کے درمیان جو کچھ ہے، اس سے کہیں بہتر ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کا درجہ جنت میں بڑھایا جاتا ہے تو وہ پوچھتا ہے: یہ کیونکر ہوا؟ اس سے کہا جاتا ہے: یہ تمہاری اولاد کے استغفار (مغفرت کی دعا) کی وجہ سے ہوا، جو اس نے تیرے لیے کیا ہے''۔(سنن ابن ماجه، باب بر الوالدين ج۲ ص ۲۰۳)

(۲۱) ﴿قصاص (بدلہ) میں حد سے بڑھنا ممنوع ہے﴾

(۲۰۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نبیوں میں سے ایک نبی کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انہوں نے چیونٹی کے بل کو جلا دینے کا حکم دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ ایک چیونٹی نے آپ کو کاٹا اور آپ نے ایک امت (مخلوق) کو جلا ڈالا جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول تھی۔'' (صحیح البخاری: ج ۴ ص ۶۲)

نیز اس حدیث کو امام بخاریؒ نے باب خمس من الدواب فواسق یقتلن فی الحرم ج۴ص ۱۲۹ پر بھی نقل کیا ہے۔ اور امام مسلم رحمہ اللہ باب النهی عن قتل النحل ج۹ص ۸۹ پر اور امام ابوداوُدؒ نے باب فی قتل الذر ج۴ص ۲۷۳ پر اور امام ابن ماجہؒ نے باب ماینهی عن قتله ج۲ص ۱۵۲ پر بھی نقل کیا ہے۔ سب کے الفاظ تقریباً یکساں ہیں۔

قصاص، لغوی و شرعی مفہوم اور اعتدال پر مبنی ایک حکم

اصطلاحِ شریعت میں ''قصاص'' کا مفہوم ہے ''قاتل کی جان لینا''، یعنی جس شخص نے کسی کو ناحق قتل کر دیا ہو اس کو مقتول کے بدلے میں قتل کر دینا! یہ لفظ قَصٌّ اور قَصَصَ سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''کسی کے پیچھے پیچھے جانا'' چونکہ مقتول کا ولی قاتل کا پیچھا پکڑتا ہے، تاکہ اسے مقتول کے بدلے میں قتل کرائے، اس لیے قاتل کی جان لینے کو قصاص کہا جاتا ہے، ویسے ''قصاصات'' کے معنی مساوات (برابری) کے بھی ہیں۔ ''قصاص'' پر اس معنی کا اطلاق اس طرح ہوتا ہے کہ جب قاتل کو مقتول کے بدلے میں قتل کر دیا جاتا ہے تو مقتول کا ولی اور قاتل یا مقتول اور قاتل برابر ہو جاتے ہیں، کیونکہ قصاص میں قاتل کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو قاتل نے مقتول کے ساتھ کیا تھا۔

(مظاہر حق ج ۳ ص ۵۱۱)

یہودیوں کے مذہب میں قتل کی سزا صرف قتل ہی تھی، عفوودرگزر کی کوئی صورت نہیں تھی، اور عیسائیوں کے ہاں بس ایک ہی عفوودرگزر کا قانون تھا، قصاص نہیں تھا، عرب میں قصاص اور عفو دونوں چیزیں موجود تھیں، لیکن ان میں بہت افراط وتفریط سے کام لیا جاتا تھا، اگر قاتل کوئی معمولی آدمی ہوتا اور مقتول بڑا خاندانی تو اس کے بدلے میں قاتل کے قبیلہ سے کئی آدمی قتل کردیئے جاتے تھے، اس طرح بڑے لوگ اپنے زخموں کے عوض بھی دگنی تگنی دیتیں وصول کرتے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں قصاص ودیت کے احکام نازل فرما کر ان تمام بے اعتدالیوں کی اصلاح فرمادی۔

قصاص کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے جو اس نے دوسروں کے ساتھ کیا ہو۔ اور قصاص صرف حکومت ہی لے سکتی ہے، عوام الناس کو اختیار نہیں ہے کہ وہ خود اپنے مقتولین کا قصاص اور بدلہ لیتے پھریں، کیونکہ اس سے بہت بڑی بے اعتدالیوں کا دروازہ کھل جائے گا، عداوتیں بڑھ جائیں گی اور زمین میں فتنہ وفساد برپا ہو جائے گا۔

(دیکھئے تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۵۰، روح المعانی ج ۲ ص ۴۹، تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۲۵۶)

حکیم ترمذیؒ نقل کرتے ہیں کہ وہ نبی، حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے، بعض کہتے ہیں کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ موذی چیز کو جلانا جائز ہے۔ اس لیے کہ اصول یہ ہے کہ سابق شریعت کے احکام ہمارے لیے بھی شریعت کا درجہ رکھتے ہیں، بشرطیکہ ہماری شریعت میں اس کے منسوخ ہونے پر کوئی دلیل موجود نہ ہو البتہ ہمارے دین وشریعت میں آگ میں جلانے اور اس سے عذاب دینے سے منع کیا گیا ہے، سوائے قصاص کے۔ اسی طرح چیونٹی اور شہد کی مکھی کا مارنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چیونٹی اور شہد کی مکھی کو مار ڈالنے سے منع کیا ہے۔

اس قصہ کا ایک اور سبب بھی منقول ہے کہ وہ نبی ایک ایسی بستی سے گزر رہے تھے جس کو اللہ تعالیٰ نے وہاں کے باشندوں کے گناہوں کے سبب تباہ کردیا تھا، وہ بڑے تعجب کے ساتھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے پروردگار! اس بستی میں چھوٹے بچے، جانور اور ایسے

لوگ بھی رہتے ہیں جنہوں نے کوئی جرم اور گناہ ہی نہیں کیا تھا! پھر وہ نبی ایک درخت کے نیچے ٹھہرے اور چیونٹی نے ان کو کاٹ لیا، انہوں نے ان کا سارا بل ہی جلا ڈالا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ عتاب نازل ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آتا ہے وہ عام ہوتا ہے، پھر وہ فرماں برداروں کے لیے رحمت اور پاکیزگی کا ذریعہ بن جاتا ہے، اور نافرمانوں کے لیے جزا اور سزا اور مواخذہ بن جاتا ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ ان پیغمبرؑ کی شریعت میں چیونٹیوں کو مار ڈالنا اور آگ میں جلانا جائز تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کے مارنے اور جلانے کے سبب عتاب نہیں فرمایا، بلکہ ایک سے زیادہ کے مارنے پر عتاب فرمایا، لیکن ہماری شریعت میں آگ میں جلا کر عذاب دینا جائز نہیں ہے، چیونٹی کے مارنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے دین وشریعت میں کسی جاندار کو آگ میں جلانا جائز نہیں ہے، کیونکہ مشہور حدیث میں آتا ہے کہ آگ سے عذاب اس کا خالق (اللہ تعالیٰ) ہی دے سکتا ہے اور کسی کے لیے درست نہیں ہے، البتہ اگر کوئی کسی کو جلا دے تو قصاص میں اسے جلانا جائز ہے۔

امام قسطلانیؒ فرماتے ہیں کہ بڑی چیونٹی کو مارنا منع ہے۔ البتہ چھوٹی چیونٹی کو مار سکتے ہیں، امام مالکؒ نے چیونٹی کے مارنے کو مکروہ قرار دیا ہے مگر یہ کہ وہ ایذا پہنچاتی ہو اور بغیر مارے اس کو دور نہ کر سکتا ہو تو پھر مارنا جائز ہے۔

(شرح النووی علی مسلم وشرح القسطلانی ج ۵ ص ۳۱۴)

(۲۲) ﴿اپنی اُمّت پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت﴾

(۲۰۴) حضرت عبداللہ بن عمرو العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تلاوت فرمائی: ''رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ. (ابراهيم: ۳۶) ''اے میرے پروردگار ان (مورتیوں) نے بہت سے آدمیوں کو گمراہ کردیا ہے، پس جو میری اتباع کرے گا وہ تو میرا ہی ہے''۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا'' اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' (المائدہ: ۱۱۸) ''آپ اگر ان کو عذاب دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ انہیں بخش دیں تو بھی آپ زبردست حکمت والے ہیں۔''

پھر آپؐ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ اے اللہ! میری امت پر رحم فرما، میری امت پر رحم فرما، اور رونے لگے، اللہ عزوجل نے فرمایا: اے جبریل! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ۔ (حالانکہ آپ کا رب خوب جانتا ہے) اور ان سے پوچھو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں رو رہے ہیں؟ چنانچہ جبرئیل آپؐ کے پاس آئے اور آپؐ سے دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کی خبر دی، (حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی زیادہ خبر تھی)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبرئیل! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ اور انہیں کہہ دو، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی بارے میں راضی کردیں گے اور ناراض نہیں کریں گے۔

(صحيح مسلم، كتاب الايمان، ج ۲ ص ۱۷۹ حاشيه القسطلانى)

فائدہ:

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مبارک مندرجہ ذیل فوائد پر مشتمل ہے:

(۱) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت پر بے پایاں شفقت و رأفت اور ان کے مصالح کا اہتمام اور خیال رکھنا (۲) دعا میں ہاتھ اٹھانے کا استحباب معلوم ہوا، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھائے تھے۔ (۳) اس امتِ مرحومہ کے لیے عظیم خوشخبری کہ اللہ تعالیٰ

اس امت کے بارے میں آنحضرت ﷺ کو ناراض یا غمگین نہیں کریں گے بلکہ راضی اور خوش کر دیں گے۔(۴) اللہ تعالیٰ کے ہاں نبی کریم ﷺ کے مقام و مرتبہ کا اظہار اور لطف و کرم کا معاملہ۔ اور حدیث کا حاصل مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آپ کی امت سے عفوو درگزر کر کے اسے آگ سے نجات دے کر جنت میں داخل کر دوں گا۔

(۲۰۵) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے روئے زمین کو سمیٹا، چنانچہ میں نے روئے زمین کو مشرق سے لے کر مغرب تک دیکھا، اور یقیناً میری امت عنقریب روئے زمین کے ان تمام علاقوں کی بادشاہت سے سرفراز ہوگی جو سمیٹ کر مجھ کو دکھائے گئے ہیں، اور مجھ کو سرخ اور سفید دو خزانے عطا کئے گئے ہیں، نیز میں نے اپنے پروردگار سے التجاء کی کہ میری امت کے لوگوں کو عام قحط میں نہ مارے اور یہ کہ میری امت پر مسلمانوں کے علاوہ کسی کو مسلط نہ کرے جو ان کی اجتماعیت اور ملی نظام کے مرکز پر قبضہ کر لے''

چنانچہ میرے رب نے فرمایا: اے محمد! جب میں کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہوں تو وہ بدلا نہیں جا سکتا، پس میں تمہاری امت کے حق میں تمہیں اپنا یہ عہد و فیصلہ دیتا ہوں کہ مسلمانوں کو نہ تو عام قحط میں ہلاک کروں گا اور نہ خود ان کے علاوہ کوئی اور دشمن ان پر مسلط کروں گا جو ان کی اجتماعیت اور ملی نظام کے مرکز پر قبضہ کر لے، اگرچہ ان پر تمام روئے زمین کے (غیر مسلم دشمن) جمع ہو کر حملہ آور ہوں اِلا یہ کہ تمہاری امت ہی کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں اور ایک دوسرے کو قید و بند کی صعوبت میں ڈالیں''۔

(صحیح مسلم، کتاب الفتن ج۱۰ ص ۳۴۰، از حاشیہ القسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب فضائل سید المرسلین ﷺ ص ۵۱۲)

فائدہ:

''سرخ اور سفید خزانوں'' سے سونے اور چاندی کے خزانے مراد ہیں اور ان دونوں خزانوں کے ذریعہ کسریٰ بادشاہ فارس اور قیصر بادشاہ روم کی سلطنت و مملکت کی طرف

اشارہ مقصود ہے، کیونکہ اس زمانہ میں فارس میں سونے کے اور روم میں چاندی کے ذخائر اور خزانے بہت زیادہ تھے، پس آپ ﷺ نے پیشگوئی فرمائی کہ میری امت کے لوگ جلد ہی وقت کی ان دونوں عظیم سلطنتوں پر قابض وحکمران ہو جائیں گے اور ان کے تمام خزانے اور مال واسباب مسلمانوں کے ہاتھ لگیں گے، چنانچہ یہ پیش گوئی پوری ہوئی!۔

"اِلاّ" یہ کہ تمہاری امت ہی کے لوگ آپس میں......" اس جملہ کا سیاق وسباق اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو دو چیزوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ و مامون کر دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ عام قحط و فاقہ کشی کی ایسی صورت حال کہ جو مجموعی طور پر تمام مسلمانوں کو ہلاک وفنا کر دے، کبھی پیش نہیں آئے گی۔ دوسرے یہ کہ اگر تمام روئے زمین کی اسلام دشمن اور مسلم مخالف طاقتیں مل کر بھی یہ چاہیں کہ مسلمانوں کی دینی اور اجتماعی ہیئت کے مرکز اور ان کی مجموعی طاقت کو صفحہ ہستی سے مٹا کر ان کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیں تو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

یہ اور بات ہے کہ خود مسلمانوں میں باہمی افتراق وانتشار پیدا ہو جائے، بھائی بھائی کا گلہ کاٹنے لگے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ذلیل ورسوا کرنے لگے اور مسلمانوں کی اجتماعی طاقت اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف استعمال ہونے کے بجائے آپس میں دست وگریباں ہو جائے، اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ان کا دشمن ان کی اجتماعی طاقت کو کمزور کر دے یا کسی علاقہ کے مسلمانوں کی ملی دینی اجتماعیت اور ان کے سیاسی مرکز کو نقصان پہنچا دے!

یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقدر ہو چکا ہے، اس فیصلہ کو نہ کوئی بدل سکتا ہے اور نہ اس کے خلاف کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ (مظاہر حق ج۵ ص ۳۱۶)

(۲۰۶) حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ (انصار کے ایک قبیلہ) بنو معاویہ کی مسجد کے قریب سے گزرے تو اندر (مسجد میں) تشریف لائے اور وہاں دو رکعت نماز پڑھی، اس نماز میں آپ ﷺ کے ساتھ ہم بھی شریک ہوئے، (نماز کے بعد) آپ ﷺ نے اپنے پروردگار سے بڑی طویل دعا مانگی، پھر جب نماز ودعا سے فارغ

ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ”میں نے اپنے پروردگار سے تین چیزیں مانگی تھیں، ان میں سے دو چیزیں تو مجھے عطا فرمادی گئیں اور ایک چیز سے منع کر دیا گیا۔ ایک چیز کی درخواست میں نے اپنے رب سے یہ کی تھی کہ میری امت کو قحطِ عام میں ہلاک نہ کیا جائے، یہ درخواست قبول فرمالی گئی، دوسری درخواست میں نے یہ کی تھی کہ میری امت کو پانی میں غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے اور میری یہ درخواست بھی قبول فرمالی گئی۔ تیسری درخواست یہ تھی کہ میری امت کے لوگ آپس میں دست وگریباں نہ ہوں، لیکن میری یہ درخواست قبول نہ ہوئی“۔ (رواہ مسلم)

فائدہ:

”بنو معاویہ“ انصارِ مدینہ کے ایک قبیلہ کا نام ہے، آنحضرت ﷺ ایک اس قبیلہ میں تشریف لے گئے ہوں گے، کسی فرض نماز کا وقت آ گیا ہوگا اور آپ ﷺ نے وہ فرض نماز اس قبیلہ کی مسجد میں ادا فرمائی یا یہ کہ آپ ﷺ اس جگہ سے گزر رہے ہوں گے، مسجد دیکھ کر اندر تشریف لے گئے ہوں گے اور وہاں دو رکعت نفل نماز پڑھی ہوگی۔

بہرصورت! آپؐ نے اس نماز میں التحیات کے دوران یا سلام پھیر کر اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے حق میں جو تین دعائیں مانگیں اور ان میں سے جو ایک دعا قبول نہیں ہوئی تو اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی بعض دعائیں قبول نہیں ہوتی تھیں۔

(۲۰۷) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ مولیٰ رسول ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ” میرے لیے زمین کو سمیٹ دیا گیا یہاں تک کہ میں نے اس کے مشرق و مغرب سب کو دیکھ لیا اور مجھے دو خزانے زرد اور سفید (سونا چاندی) عطا کیے گئے، اور مجھ سے کہا گیا: آپ کی سلطنت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک کا حصہ آپ کے لیے سمیٹ کر دکھایا گیا ہے، اور میں نے اللہ تعالیٰ سے تین دعائیں مانگی تھیں، ایک یہ کہ میری امت پر ایسا قحط نازل نہ فرمانا جس سے سب کے سب ہلاک ہو جائیں اور دوسرے یہ کہ ان میں سے بعض کو بعض لڑائی جھگڑے میں نہ لگائیں اور تیسرے یہ کہ بعض کو عذاب میں نہ ڈالیں: مجھ سے فرمایا گیا: میں

جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو اسے رد نہیں کرتا اور میں آپ کی امت پر ایسا قحط مسلط نہیں کروں گا جس کی وجہ سے وہ سب ہلاک ہو جائیں اور زمین کے اطراف سے ایسے لوگوں کو ان پر جمع نہیں کروں گا کہ بعض بعض کو ہلاک و فنا کر دیں اور بعض بعض کو قتل کر دیں، اور جب میری امت میں تلوار چل جائے گی تو پھر قیامت تک امت کے لوگوں کو قتل و قتال سے باز نہیں رہے گی، اور اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ میری امت کے بعض قبائل مشرکوں کے ساتھ نہ جا ملیں گے، اور جب تک میری امت کے بعض قبائل بتوں کو نہ پوجنے لگیں گے، اور حقیقت یہ ہے کہ میری امت میں سے تیس جھوٹے ظاہر ہوں گے، ان میں سے ہر ایک یہ گمان کرے گا کہ وہ خدا کا نبی ہے، جبکہ سچ یہ ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور میری امت میں سے ہمیشہ ایک جماعت حق پر ثابت قدم رہے گی، اس جماعت کا کوئی بھی مخالف و بدخواہ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا، تا آنکہ خدا کا حکم آئے۔'' (سنن ابن ماجه، باب مایکون من الفتن ج ۲ ص ۲۴۲)

فائدہ:

''جب میری امت میں تلوار چل جائے گی'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ کو بعض مسلمانوں کی وجہ سے میری امت میں باہمی محاذ آرائی اور آپس میں قتل و قتال کی سیاست کو عمل و دخل کا موقع مل گیا تو پھر مسلمانوں کی باہمی خونریزی اور ایک دوسرے کے خلاف تشدد و طاقت کے استعمال کا ایسا سلسلہ شروع ہو جائے گا جو قیامت تک ختم نہیں ہوگا اور ہمیشہ میری امت کے لوگ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں اپنی ہی صفوں کے خلاف لڑتے رہیں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ثابت ہو، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے مسلمانوں کی جو باہمی محاذ آرائی شروع ہوئی تھی اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

''جب تک میری امت کے بعض قبائل مشرکوں کے ساتھ نہ جا ملیں'' آنحضور ﷺ کی اس پیش گوئی کا کچھ حصہ تو آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہی سامنے آ گیا تھا جب حضرت ابو

بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں عرب کے چند قبائل کچھ شر پسندوں اور منافقین کے فریب میں آکر ارتداد میں مبتلا ہو گئے تھے اور کفر وشرک کی طاقتوں کے ساتھ مل گئے تھے، لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فراست، دانشمندی اور قوت فیصلہ کی مضبوطی اور اولوالعزمی نے ان مرتدین کا استیصال کر دیا تھا۔

''جب تک میری امت کے بعض قبائل بتوں کو نہ پوجنے لگیں گے'' اس جملہ میں بتوں کا پوجنا اگر حقیقی معنی میں مراد ہے تو کہا جائے گا کہ شاید آئندہ زمانہ میں کوئی وقت ایسا بھی آئے جب مسلمانوں کے کچھ طبقے ایمان اور اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود واقعۃً بتوں کی پوجا کرنے لگیں۔ ویسے موجودہ زمانہ میں بھی ایسے مسلمانوں کا وجود بہر حال پایا جاتا ہے، جو قبر پرستی اور تعزیہ کی پرستش وغیرہ کی صورت میں اپنی پیشانیاں غیر اللہ کے آگے سجدہ ریز کرتے ہیں، اور اگر یہ کہا جائے کہ اس جملہ میں بتوں کو پوجنے والی بات اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے بلکہ اس سے مجازی اور معنوی صورت مراد ہے تو پھر اس کے محمول کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں جو ہر زمانہ میں پائی جاتی ہیں، ان ہی میں سے ایک صورت مال ودولت اور جاہ واقتدار وغیرہ کے حصول کو اپنی زندگی کا اصل مقصد اور اپنی امیدوں اور آرزوؤں کی واحد آماجگاہ بنالینا ہے، اس صورت میں اس ارشاد گرامی کا ایک محمول وہ لوگ بھی ہیں کہ جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے'' **تعس عبدالدینار وعبدالدرهم** ''یعنی درہم ودینار (مال ودولت) کے غلام ہلاک ہوں''۔

''تا آنکہ خدا کا حکم آئے'' اس میں ''خدا کے حکم'' سے مراد قیامت ہے۔ یا دین کا اس طرح تسلط وغلبہ پالینا مراد ہے کہ روئے زمین پر کفر کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے۔

(۲۴۳) ﴿اللہ تعالیٰ کی رحمت اسکے غضب پر غالب ہے﴾

(۲۰۸) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب (میثاق) کے دن مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو ایک کتاب لکھی، وہ کتاب، حق تعالیٰ کے پاس عرش کے اوپر ہے۔ (اس کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ) ''بلاشبہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔'' ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے''۔

(صحیح البخاری ، کتاب التوحید ، باب قول اللّٰہ عزوجل ویحذرکم اللّٰہ نفسہ، ج ۹ ص ۱۵۰ وشرح القسطلانی ج ۱۰ ص ۳۸۱)

یہ روایت صحیح بخاری میں کتاب بدء الخلق ج ۵ ص ۱۵۱ پر بھی مذکور ہے۔ نیز اس روایت کو امام مسلمؒ نے کتاب التوبۃ ، باب سعۃ رحمۃ اللّٰہ میں اور امام نسائیؒ نے النعوت میں بھی نقل کیا ہے۔

فائدہ:

جس کتاب میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت عظمیٰ لکھی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے، اس کتاب کی عظمت اور اس کی بزرگ قدری کا کوئی اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا، اسی کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے پاس عرش کے اوپر رکھا ہے۔

رحمتِ خداوندی کی سبقت اور اس کے غالب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی بخشش وکرم اور اس کی نعمتوں کی نشانیاں اور اس کے مظاہر غالب ہیں کہ وہ تمام مخلوقات کو گھیرے ہوئے ہیں اور بے انتہاء ہیں، اس کے مقابلہ میں اس کے غضب کی نشانیاں اور اس کے مظاہر کم ہیں، جیسا کہ خود حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا'' یعنی اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔''

نیز فرمایا: ''عَذَابِیْ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ''

یعنی عذاب میں تو میں جسے چاہتا ہوں اسے ہی مبتلا کرتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے۔"

حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ اور اس کی نعمتوں کا سلسلہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ کائنات کا کوئی فرد اس سے باہر نہیں ہے اور اس دنیاوی زندگی کا ایک ایک لمحہ کسی نہ کسی شکل میں رحمتِ خداوندی ہی کا مرہونِ منت ہوتا ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں بندوں کی طرف سے خدائے رحیم وکریم کی نعمتوں اور رحمتوں کے شکر کی ادائیگی میں جتنی کوتاہی اور قصور ہوتا ہے اس کی بھی کوئی حد اور انتہاء نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ "یعنی اور اگر اللہ تعالیٰ ان کے ظلم کے سبب ان کا مواخذہ کرنے لگے تو ایک بھی جاندار روئے زمین پر نہ چھوڑے۔"

چنانچہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ہی ظہور ہے کہ بندوں کی تمام کوتاہیوں اور خطاؤں کے باوجود اس دنیا میں ان کو باقی رکھتا ہے، ان کو روزی دیتا ہے، ان پر اپنی نعمتوں کی بارش کرتا ہے اور اس دنیا میں ان کو عذاب ومؤاخذہ میں مبتلا نہیں کرتا، یہ تو اس دنیا کا معاملہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور کس کس طرح اور کن کن صورتوں میں سامنے آتا ہے، لیکن آخرت میں اس کی رحمت کا ظہور تو اس دنیا کے ظہور سے کہیں زیادہ ہوگا۔ (مظاہر حق ج ۲ ص ۵۷۴)

(۲۰۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک بندے نے گناہ کیا اور پھر کہنے لگا: اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے۔" اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں) سے فرمایا: کیا میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو اس کے گناہ بخشتا ہے اور اس کے گناہ پر مؤاخذہ کرتا ہے؟ (تو جان لو) میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔" وہ بندہ اس مدت تک کہ اللہ نے چاہا (گناہ کرنے سے) باز رہا، اس کے بعد اس نے پھر گناہ کیا اور عرض کیا کہ: اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے۔" اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں سے) فرمایا "کیا میرا یہ بندہ یہ جانتا

ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ کو بخشتا ہے اور اس پر مؤاخذہ کرتا ہے؟ میں نے اس بندہ کو بخش دیا۔'' وہ بندہ اس مدت تک کہ اللہ نے چاہا گناہ سے باز رہا اور اس کے بعد پھر اس نے گناہ کیا اور عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے۔'' اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں سے) فرمایا'' کیا میرا بندہ یہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مؤاخذہ کرتا ہے؟ میں نے اس بندہ کو بخش دیا'' پس (جب تک وہ استغفار کرتا رہے) وہ جو چاہے کرے''۔

(صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب یریدون ان یبدلوا کلام اللّٰہ ج ۹ ص ۱۴۵)

امام مسلمؒ نے بھی اپنی ''صحیح'' میں اس حدیث کو باب سعة رحمة اللّٰہ ج ۱۰ ص ۱۱۸ کے تحت ذکر کیا ہے۔

فائدہ:

''توبہ'' کے معنی ہیں رجوع کرنا گناہوں سے طاعت کی طرف، غفلت سے ذکر کی طرف، اور غَیبت سے حضور کی طرف، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی بخشش کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کے گناہوں کو دنیا میں بھی ڈھانکے، بایں طور کہ کسی کو اس کے گناہ کا علم نہ ہونے دے، اور آخرت میں اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرے، بایں طور کہ اس کو ان گناہوں کی وجہ سے عذاب میں گرفتار نہ کرے۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''توبہ'' کا کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ گناہ کو فراموش کر دینا یعنی توبہ کرنے کے بعد گناہ کی لذت کا احساس بھی دل سے اس طرح ختم ہو جائے گویا وہ جانتا ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔''

اور حضرت سہل تستریؒ سے پوچھا گیا کہ ''توبہ'' کا کیا مفہوم ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ''تم گناہ کو فراموش نہ کرو یعنی گناہ کو بھول مت جاؤ تا کہ عذاب خداوندی کے خوف سے آئندہ کسی گناہ کی جرأت نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے اس حکم'' تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَةً نَصُوْحا'' تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو'' کے مطابق استغفار یعنی طلبِ بخشش و مغفرت اور توبہ کرنا ہر بندہ پر

واجب ہے، کیونکہ بندہ اپنے حال ومرتبہ کے اعتبار سے گناہوں سے یا بھول چوک سے خالی نہیں ہے، لہٰذا ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے تمام گزشتہ گناہوں سے توبہ کرے اور طلبِ بخشش ومغفرت کرے اور آئندہ بھی تمام گناہوں سے بچتا رہے اور صبح وشام توبہ واستغفار کو اپنا معمول بنالے، اس طرح تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا رہے گا، خواہ وہ گناہ قصداً کیئے ہوں یا خطاء وسہواً سرزد ہوئے ہوں، اور گناہوں کی نحوست کی وجہ سے طاعت کی توفیق سے محروم نہ رہے، نیز گناہوں پر اصرار کی ظلمت دل کو پوری طرح گھیر کر خدانخواستہ کفر ودوزخ تک نہ پہنچادے۔

توبہ کے صحیح اور قبول ہونے کے لیے چار باتیں ضروری ہیں اور شرط کے درجہ میں ہیں: (۱) ایک تو یہ کہ محض خدا کے عذاب کے خوف سے اور اس کے حکم کی تعظیم کے پیش نظر ہی توبہ کی جائے، درمیان میں توبہ کی کوئی اور غرض نہ ہو، مثلاً لوگوں کی تعریف ومدح کا حصول اور ضعف وفقر کی وجہ، توبہ کی غرض میں داخل نہ ہو۔ (۲) دوسرے یہ کہ گزشتہ گناہوں پر واقعی شرمندگی اور ندامت ہو۔ (۳) تیسرے یہ کہ آئندہ ہر ظاہری وباطنی گناہ سے اجتناب کرے۔ (۴) اور چوتھے یہ کہ یہ پختہ عہد اور عزم بالجزم کرے کہ آئندہ ہرگز کوئی گناہ نہیں کروں گا۔

یہ تو اس ''توبہ'' کی بات تھی جو ان گناہوں سے کی جائے جن کا تعلق ''حق اللہ'' سے ہو۔ اور اگر اپنے اوپر وہ گناہ ہوں جن کا تعلق ''حق العباد'' یعنی بندوں کے حقوق کی تلفی یا ان کے نقصان سے ہو تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ سے بھی اپنی بخشش ومغفرت چاہے، کیونکہ اس نے اس کی نافرمانی کی ہے اور ان بندوں سے بھی ان کا تدارک کرے، جن کی حق تلفی ہوئی ہے۔ چنانچہ اگر حق تلفی کا تعلق مال سے ہو تو یا صاحبِ حق کو وہ مال ادا کرے یا اس سے معاف کرائے، اور اگر اس کا تعلق مال سے نہ ہو جیسے غیبت یا اور کوئی ذہنی وجسمانی تکلیف، جو اسے پہنچی ہو تو اس سے معافی چاہے، اگر حق تلفی کا تعلق کسی ایسی کوتاہی سے ہو کہ اگر معاف کراتے وقت اس کا تذکرہ کسی فتنہ وفساد کا سبب بنتا ہو تو ایسی صورت میں اس قصور کا ذکر کیئے بغیر اس شخص سے مطلقاً قصور کو معاف کرائے اور اگر اس طرح معاف کرانے

میں بھی فتنہ وفساد کا خوف ہو تو پھر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرے، اس کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرے، اور اچھے کام کرے اور صدقہ وخیرات کرتا رہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو، اور اس شخص کو جس کا قصور ہوا ہے آخرت میں اپنے فضل وکرم کے تحت اپنے پاس سے اجر دے کر اسے راضی کرائے، اور اگر صاحبِ حق مر چکا ہو تو اس کے وارث اس کے قائم مقام ہیں، اس لیے مردہ کا حق ان سے معاف کرائے اور ان کیساتھ اچھا سلوک کرے، نیز مردہ کی طرف سے بھی صدقہ وخیرات کرے۔

گناہوں سے بچنے کا آسان علاج:

گناہوں سے بچنے کا آسان علاج یہ ہے کہ ہر چیز میں "حدِ ضرورت" پر قناعت کی جائے۔ یعنی جو چیزیں انسانی زندگی کی بقاء وتکمیل کے لیے بنیادی درجہ رکھتی ہیں ان میں صرف اسی حد تک قناعت کی جائے جو ضروری ہے اور "حد ضرورت" یہ ہے کہ اتنی غذا جو بھوک ختم کرنے کیلئے ضروری ہو، اتنا کپڑا جس سے ستر پوشی ہو سکے اور اتنا مکان جو گرمی وسردی سے بچا سکے اور اتنے برتن جو ضروری ہوں اور ایک بیوی!

حدِ ضرورت سے تجاوز کرنے اور مباحات میں وسعت اختیار کرنے کی وجہ سے انسان ان چیزوں میں مبتلا ہوتا ہے جو مشتبہ اور مکروہ ہوتی ہے اور جب وہ مکروہات میں مبتلا رہتا ہے تو پھر رفتہ رفتہ حرام چیزوں کا ارتکاب بھی ہونے لگتا ہے، اور یہی وہ نکتہ ہوتا ہے جہاں اسلام کی حد تو ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد سے کفر وآتش کا میدان شروع ہو جاتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

حدیث کے آخری الفاظ "پس جو چاہے کرے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندہ جب تک گناہ کرتا رہے گا اور اس کے ساتھ استغفار کرتا رہے گا، اس کے گناہ بخشتا رہوں گا، لہٰذا اس جملہ سے خدانخواستہ گناہ کی طرف رغبت دلانا مقصود نہیں ہے، بلکہ استغفار کی فضیلت اور گناہوں کی بخشش میں توبہ واستغفار کی تاثیر کو بیان کرنا مقصود ہے۔

(مظاہر حق ج ۲ ص ۵۴۸ تا ۵۵۱ مختصراً)

(۲۱۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ

نے فرمایا: میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں، جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے پاس ہوتا ہوں، خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو خوشی تم میں سے اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جسے اس کی گمشدہ سواری جنگل میں مل جائے۔ اور جو شخص ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اور جو ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے میں ایک باع (دو ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر) اس کے قریب ہوتا ہوں اور جب وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔'' (صحیح مسلم، کتاب التوبة، حاشیه القسطلانی ج ۱۰ ص ۱۷۱، مشکوٰة المصابیح، باب ذکر اللّٰہ ص ۱۹۶)

فائدہ:

''میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں'' کا مطلب یہ ہے کہ میرا بندہ میری نسبت جو گمان و خیال رکھتا ہے میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں، جس کی وہ مجھ سے توقع رکھتا ہے، میں اس کے ساتھ ویسا ہی کرتا ہوں، اگر وہ مجھ سے عفوو درگذر کی امید رکھتا ہے تو اس کو معافی دیتا ہوں اور اگر وہ میرے عذاب کا گمان رکھتا ہے تو پھر عذاب دیتا ہوں۔

اس ارشادِ گرامی کے ذریعہ گویا ترغیب دلائی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل وکرم کی امید اس کے عذاب کے خوف پر غالب ہونی چاہیے، اور اس کے بارہ میں اچھا گمان رکھنا چاہئے کہ وہ مجھے اپنی بے پایاں بخشش اور لامحدود رحمت سے نوازے گا۔

ایک روایت میں مذکور ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ایک شخص کو دوزخ میں لے جانے کا حکم کرے گا، جب اسے دوزخ کے کنارے پر کھڑا کیا جائے گا تو وہ عرض کرے گا کہ ''اے میرے پروردگار! تیرے بارے میں میرا گمان اچھا تھا'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا'' کہ اس کو واپس لے آؤ، میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں، جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے'' ''امید'' کا مطلب اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ عمل کیا جائے اور پھر بخشش کا امیدوار رہے، بغیر عمل کے صرف امید ہی پر تکیہ کرلینا ٹھنڈے لوہے کو کوٹنا ہے، یعنی ایسی امید کا کوئی

فائدہ نہیں ہے۔

"جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے پاس ہوتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میری یاد میں مشغول رہتا ہے تو میں اسے مزید نیکیوں اور بھلائیوں کی توفیق دیتا ہوں، اس پر اپنی رحمت نازل کرتا ہوں اور اس کی مدد اور حفاظت کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کتنا رحیم و کریم ہے،" اس کی رحمت کتنی وسیع اور ہمہ گیر ہے، اپنے بندوں پر وہ کتنا مہربان ہے، اس کی شانِ عفو کس قدر بے پایاں ہے اور اس کا فضل کس قدر بے کراں ہے، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اس حدیث کے آخری جملوں سے ہو جاتا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اگر بندہ، خدا تعالیٰ کی طرف تھوڑی سے بھی توجہ اور رجوع کرتا ہے تو اس کی طرف بارگاہِ الٰہی سے اس کی توجہ سے کہیں زیادہ توجہ، التفات اور رحمت اس کی طرف منعطف ہوتی ہے۔(ماخوذ از مظاهر حق ج ۲ ص ۴۸۴ تا ص ۴۸۵ ملخصاً)

(۲۱۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(اہل ایمان میں سے) جو لوگ (اپنے گناہوں کی پاداش میں) دوزخ میں داخل ہوں گے، ان میں سے دو آدمی بہت زیادہ چیخیں چلائیں گے، پروردگار (دوزخ کے فرشتوں کو) حکم دے گا کہ ان دونوں کو باہر نکالو اور (جب وہ باہر آئیں گے تو) ان سے فرمایا جائے گا کہ کیوں اس قدر چیخ چلا رہے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اس لیے چیخ چلا رہے تھے تا کہ آپ کی رحمت ہماری طرف متوجہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تمہارے حق میں میری رحمت یہی ہے کہ تم واپس جاؤ اور دوزخ میں جہاں تھے وہیں پڑے رہو۔" ان میں سے ایک شخص تو (یہ سنتے ہی کامل اطاعت اور رضائے الٰہی کی طلب میں) واپس ہو جائے گا اور خود کو دوزخ کی آگ میں ڈال دے گا، اور اللہ تعالیٰ اس آگ کو اس کے لیے ٹھنڈا کر دے گا اور دوسرا شخص وہیں کھڑا رہے گا اور خود کو آگ میں نہیں ڈالے گا، اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے خود کو آگ میں کیوں نہیں ڈالا جبکہ تیرا ساتھی آگ میں کود پڑا؟ وہ عرض کرے گا کہ پروردگار! میں تو اسی امید پر قائم ہوں کہ آپ نے جب مجھے دوزخ سے باہر بلوایا تو اب دوبارہ وہاں نہیں بھیجیں گے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جو امید قائم کی ہے وہ تیرے حق میں پوری کی جاتی ہے،

چنانچہ وہ دونوں شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کے صدقہ میں ایک ساتھ جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے''۔(جامع الترمذی، صفات اهل النار، ج۲ ص ۹۹ ،مشکوٰۃ المصابیح، باب الحوض والشفاعة ص ۴۹۴)

فائدہ:

''تمہارے حق میں میری رحمت یہی ہے کہ تم واپس جاؤ............ الخ کے سلسلہ میں ایک یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ دوزخ میں واپس جا کر سپردِ آگ ہونے کو رحمت پر کس طرح محمول کیا گیا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ارشاد اصل میں سبب کو مسبب پر محمول کرنے کے اسلوب سے تعلق رکھتا ہے، اس بات کو وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کو دوزخ میں ان کے اس قصور کی پاداش میں داخل کیا جائے گا کہ انہوں نے اس بات کی اطاعت کے حکم کے ذریعہ کہ وہ دوزخ میں واپس جا کر اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر دے اس امر پر تنبیہ کی جائے گی کہ رحمتِ خداوندی کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جو ہر حالت میں اس کے حکم کی اطاعت وفرمانبرداری کرے۔

''اللہ تعالیٰ اس آگ کو اس کے لیے ٹھنڈا کر دے گا'' اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی آفت ومصیبت اور ابتلاء وآزمائش کے موقع پر صبر واستقامت اور تسلیم ورضا کا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں اس آفت ومصیبت کو آسان اور ختم کر دیتا ہے، تا کہ وہ اس کی وجہ سے کوئی رنج وتکلیف نہ پائے۔

''تو نے جو امید قائم کی ہے وہ تیرے حق میں پوری کی جاتی ہے'' اس سے ثابت ہوا کہ بندے کا اپنے پروردگار پر توقع اور امید باندھنا اس کے عطاء وکرم کے حصول میں بہت مؤثر ہے، خواہ بندہ اپنے عجز وناتوانی کے سبب اطاعت وفرمانبرداری کے دائرہ سے باہر ہی نکلا ہوا کیوں نہ ہو۔(مظاهر حق ج۵ ص ۱۹۷)

(۲۴) ﴿بخیل سے نذر کے ذریعہ مال خرچ کرایا جاتا ہے﴾

(۲۱۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ دونوں راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نذر نہ مانو، کیونکہ نذر، تقدیر کی کسی چیز کو دور نہیں کر سکتی، البتہ نذر کے ذریعہ بخیل کا (کچھ مال ضرور) خرچ ہوتا ہے''۔ (صحیح البخاری، کتاب القدر، باب القاء النذر العبدالی القدر ج۸ ص ۱۲۵)

فائدہ:

حدیث کے آخری الفاظ کے ذریعہ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کے سلسلہ میں سخی اور بخیل کے درمیان ایک بڑا لطیف فرق بتایا گیا ہے کہ سخی کی شان تو یہ ہوتی ہے کہ وہ بلا واسطہ نذر، از خود خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے لیکن بخیل کو اس کی توفیق نہیں ہوتی، اگر اسے کچھ مال خرچ کرنا ہوتا ہے تو اس کے لیے نذر (منّت) کو واسطہ بناتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں خدا کے نام پر اتنا مال خرچ کروں گا، اس طرح سخی تو ''ایثار'' کا وصف اختیار کرتا ہے اور بخیل ''غرض'' کی راہ اختیار کرتا ہے۔

اس حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بناء پر بعض علماء نے نذر ماننے کو بالکل مکروہ قرار دیا ہے، لیکن قاضیؒ نے اس حدیث مبارک کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ عام طور پر لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ نذر (یعنی خدا کی راہ میں اپنا کچھ مال خرچ کرنے) کو کسی فائدہ کے حصول اور کسی ضرورت و حاجت کے پورا ہونے پر معلّق کر دیتے ہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، کیونکہ یہ بخیلوں کا کام ہے، سخی تو جب اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس میں عجلت کرتا ہے اور فوراً ہی اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے، لیکن اس کے برخلاف بخیل کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کا دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ اپنے ہاتھ سے اپنا مال کسی کو دے، ہاں اس کی کوئی غرض ہوتی ہے تو وہ اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ چنانچہ یا تو وہ اپنی حاجت پوری ہونے کے بعد اللہ کے نام پر کچھ مال نکال دیتا ہے یا خدا کی راہ میں اپنا کچھ مال نکالنے کو حصولِ نفع یا دفعِ مضرت پر معلّق کر دیتا ہے، یعنی یہ نذر

مانتا ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا یا مجھے فلاں نقصان نہ پہنچا تو میں اپنا اتنا مال خدا کی راہ میں خرچ کروں گا، اور ظاہر ہے کہ اس بات سے تقدیر کا فیصلہ نہیں بدل جاتا، لہٰذا اس صورت میں بھی اس کو مال خرچ کرنے کی نوبت نہیں آتی، ہاں کبھی اس کی نذر، تقدیر کے فیصلہ کے موافق ہو جاتی ہے تو گویا وہ نذر اس بخیل کو اپنا وہ مال خرچ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، جس کو وہ خرچ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیثِ نبوی ؐ میں نذر سے منع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نذر ماننے کے بعد اس کو پورا کرنے میں سستی اور کاہلی نہ کی جائے، کیونکہ جب کسی نے نذر مانی تو اس نذر کو پورا کرنا اس کے ذمہ واجب ہو گیا، لہٰذا اس واجب کی ادائیگی میں تاخیر مناسب نہیں ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک یہاں نذر کی ممانعت سے مراد یہ ہے کہ اس اعتقاد و خیال کے ساتھ نذر مانی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کو مقدر نہیں کیا ہے وہ نذر سے ہو جائے گا۔ لہٰذا نذر سے منع کرنا اس اعتبار سے ہے نہ کہ مطلق نذر سے منع کرنا مقصود ہے۔ (مظاہر حق ج ۳ ص ۴۹۸)

(۲۱۳) نیز امام بخاریؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نذر، ابنِ آدم کے لیے ایسی کوئی چیز نہیں لا سکتی جو میں نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) مقدر نہ کی ہو، البتہ ایسا ہوتا ہے کہ نذر، تقدیر کے مطابق ہو جاتی ہے، جسے میں پہلے ہی سے مقدر کر چکا ہوتا ہوں، میں اس نذر کے ذریعہ بخیل شخص سے مال نکلواتا ہوں۔''

(۲۱۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نذر، ابن آدم کے لیے وہی چیز لاتی ہے جو اس کی تقدیر میں ہوتا ہے، لیکن اس کی تقدیر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس نذر پر غالب آ جاتا ہے اور اس کے ذریعہ بخیل انسان سے مال نکلوایا جاتا ہے، اور اس طرح اس کے لیے خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے جو اس سے پہلے اس کے لیے آسان نہیں تھا، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تو خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا۔'' (سنن ابن ماجہ)

حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ایک ہدایت:

(۲۱۵) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا: ''کسی بندے کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں حضرت یونس بن متیٰ سے افضل ہوں۔'' (صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وروایته عن ربه ج ۹ ص ۱۵۷)

امام مسلمؒ نے بھی اس حدیث کو اپنی ''صحیح'' میں باب من فضل موسیٰ کے تحت ذکر کیا ہے۔

فائدہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یوں منقول ہے کہ ''میں یہ نہیں کہتا کوئی شخص یونس بن متیؑ سے افضل ہے'' اور حضرت ابن سعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم انبیاء میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہ دو'' اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ: ''تم خدا کے نبیوں میں سے کسی کو کسی پر فضیلت نہ دو۔'' (بخاری ومسلم)

ان احادیثِ مبارکہ میں لفظ ''مَتّیٰ'' میم کے زبر، تاء کی تشدید اور الف کے ساتھ، حضرت یونسؑ کے باپ کا نام تھا، جیسا کہ قاموس میں مذکور ہے، لیکن جامع الاصول میں یہ ہے کہ ''متّیٰ'' ان کی ماں کا نام تھا۔ (مجمع البحار ج ۴ ص ۵۵۱)

حضرت یونسؑ کے خاص طور پر ذکر کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ جب ان کی قوم نے ان کی بات نہ مانی اور ان کو ایذاء پہنچائی تو وہ بے صبری، اور غصہ کے مارے قوم کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور کشتی میں جا بیٹھے تھے، لہٰذا ان کا یہ طرز عمل لوگوں کو اس گمان میں مبتلا کر سکتا تھا کہ ان کے مقابلہ میں کسی نبی کو فضیلت دینا موزوں ہے اور یہ کہنا غیر مناسب نہیں ہے کہ حضرت یونسؑ کے مقابلہ پر فلاں نبیؑ زیادہ افضل ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشادِ گرامی کے ذریعہ اپنی امت کے لوگوں کو اس گمان سے بھی باز رکھا، اور واضح کر دیا کہ یہ حضرت یونسؑ کی ذات پر طعن اور ان کی تحقیرِ شان کے مترادف ہے۔

صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت جس میں یہ مذکور ہے کہ ''کسی بندے کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں حضرت یونس بن متی سے افضل ہوں۔'' اس عبارت کے معنی میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شخص مجھ کو (یعنی آنحضرت ﷺ کو) یونس بن متّی سے افضل و بہتر نہ کہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کوئی شخص خود اپنے بارے میں یہ نہ کہے کہ میں حضرت یونسؑ سے افضل و بہتر ہوں، کیونکہ کوئی بڑے سے بڑا ولی بھی کسی نبی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، اور جب کوئی شخص کسی نبی کا ہمسر نہیں ہوسکتا تو نبیؑ سے افضل و بہتر ہونے کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے۔

(فتح الباری، کتاب احادیث الانبیاء، باب وان یونس لمن المرسلین ۶/ ۴۵۱)

اشکال وجواب:

لیکن پہلے احتمال کی صورت میں اشکال ہوگا کہ حضور اکرم ﷺ تو بالاتفاق تمام انبیاء ومرسلین سے افضل ہیں تو پھر آپ ﷺ نے منع کیوں فرمایا، اور ایک روایت کے مطابق تو آپ ﷺ نے ایسے شخص کو جھوٹا قرار دیا ہے؟ اس اشکال کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں:

(۱) ایک جواب تو یہ ہے کہ آپؐ نے تواضعاً اور ھضماً للنفس ایسا فرمایا۔

(عمدۃ القاری:۱۸/ ۱۹۴)

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے نفسِ نبوت میں فضیلت کی نفی مراد ہے، کیونکہ نفسِ نبوت میں تمام انبیاء برابر ہیں، یعنی نفسِ نبوت کے اعتبار سے کسی نبیؑ کو کسی نبیؑ کے مقابلہ پر فضیلت وفوقیت نہ دو، کیونکہ اصل مرتبہ نبوت کے اعتبار سے تمام انبیاء برابر ہیں۔ (فتح القدیر للشوکانی ۱/ ۲۶۹)

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی نبی کو کسی نبی کے مقابلہ پر اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش نہ کرو اور کسی نبی کی فضیلت کو اس انداز میں بیان نہ کرو کہ دوسرے نبیوں کی تحقیر وتوہین لازم آئے، کیونکہ یہ چیز (یعنی کسی نبی کی تحقیر وتوہین کا مرتکب ہونا) موجبِ کفر ہے۔ (فتح الباری، کتاب احادیث الانبیاء ۶/ ۱۵۲)

(۴) چوتھا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ ممانعت اس وقت ارشاد فرمائی

تھی جبکہ آنحضرت ﷺ کی فضیلت کو ظاہر کرنے والی وحی نازل نہیں ہوئی تھی، اس وحی کے نزول کے بعد یہ ممانعت ختم ہوگئی اور یہ بات ثابت قرار پائی کہ آنحضرت ﷺ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں اور آپ کو کسی بھی نبی کے مقابلہ پر افضل واشرف کہنا درست ہے۔ جیسا کہ اس پر بے شمار دلائل موجود ہیں۔ (فتح الباری، کتاب احادیث الانبیاء ۶/ ۴۵۲)

(۲۵) نیک اعمال پر اُبھارنے اور بُرے اعمال سے منع کرنے سے متعلق احادیثِ مبارکہ

(۲۱۶) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ جب اس کے پاس موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ "کیا تو نے کوئی نیک کام کیا ہے"؟ اس نے کہا "مجھے یاد نہیں" اس سے پھر کہا گیا کہ "اچھی طرح سوچ لے" اس نے کہا کہ "مجھے قطعاً یاد نہیں آرہا ہے، ہاں (اتنا ضرور جانتا ہوں کہ) میں دنیا میں جب لوگوں سے (خرید و فروخت) کے معاملات کیا کرتا تھا تو تقاضہ کے وقت ان پر احسان کیا کرتا تھا بایں طور کہ مستطیع لوگوں کو تو مہلت دے دیتا تھا اور جو نادار ہوتے ان کو معاف کر دیتا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل کر دیا۔" اور صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں "جو عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ اور ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے اسی کے مثل نقل کی ہے، یہ الفاظ ہیں کہ "تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اس کا حق تجھ سے زیادہ رکھتا ہوں، میرے اس بندے سے درگزر کر دو"

(صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ ج۲ ص ۴۳۵ مشکوٰۃ المصابیح، باب المساھلۃ فی المعاملۃ ص ۲۴۳.)

فائدہ:

"موت کا فرشتہ" سے مراد یا تو یہ ہے کہ خود حضرت عزرائیل ؑ ہی اس کی روح قبض کرنے آئے تھے۔ یا پھر یہ کہ ان فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ آیا ہوگا جو حضرت عزرائیل ؑ کے مددگار و ماتحت ہیں، لیکن اغلب یہ ہے کہ خود حضرت عزرائیل ؑ ہی آئے ہوں گے، کیونکہ قبض روح کے سلسلہ میں زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ ارواح قبض کرنے کا کام حضرت عزرائیل ؑ ہی انجام دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ" "کہہ دیجئے کہ تمہیں وہ ملک الموت مارتا ہے، جو تم پر متعین ہے۔" چنانچہ حضرت عزرائیل ؑ جب روح قبض کر لیتے ہیں تو جو اچھی یعنی پاک باز روح ہوتی ہے اسے رحمت کے فرشتے لے لیتے ہیں۔ اور جو بری روح ہوتی ہے وہ عذاب

کے فرشتوں کی نگرانی میں چلی جاتی ہے، لیکن اتنی بات ملحوظ رہے کہ ملک الموت روح قبض کرنے کا صرف ایک ظاہری ذریعہ بنتا ہے، ورنہ حقیقت میں تو روح قبض کرنے والا اور موت طاری کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا"۔ "ہر نفس کو اس کی موت کے وقت اللہ تعالیٰ ہی مارتا ہے۔"

"تو اس سے پوچھا گیا" کے بارے میں دونوں احتمال ہیں، یا تو اس سے یہ سوال اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا، یا پھر فرشتوں نے یہ بات پوچھی، نیز وقتِ سوال کے سلسلہ میں زیادہ واضح بات تو یہ ہے کہ اس شخص سے یہ سوال روح قبض کرنے سے پہلے کیا گیا تھا، جیسا کہ حدیث کے ابتدائی الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے، لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سوال روح قبض ہونے کے بعد قبر میں کیا گیا ہوگا، جیسا کہ شیخ مظہرؒ کا قول ہے۔ اور علامہ طیبیؒ نے ایک احتمال یہ بھی بیان کیا ہے کہ اصل یہ سوال قیامت کے دن کیا جائے گا۔

بہرکیف! اس حدیثِ پاک سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ مطالبات کی وصولی میں صاحبِ استطاعت کو مہلت دینا اور نادار شخص کو معاف کر دینا بڑے اجر و ثواب کی بات ہے۔ (مظاہر حق ج ۳ ص ۵۵)

یوں تو فرض اعمال، نفل اعمال سے ستر درجے زیادہ فضیلت کے حامل ہیں، لیکن بعض مسائل و معاملات میں نفل اعمال، فرض اعمال سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں، ان ہی میں سے ایک تو تنگدست اور مفلس کو اپنا حق معاف کر دینا ہے کہ یہ اگرچہ مستحب عمل ہے، لیکن مفلس اور تنگدست کو قرض وغیرہ ادا کرنے میں مہلت دینے سے افضل ہے، جو واجب ہے، دوسرے سلام کرنے میں پہل کرنا سنت ہے لیکن یہ افضل ہے سلام کا جواب دینے سے جو کہ فرض ہے۔ تیسرے وقت سے پہلے وضو کرنا مستحب ہے لیکن یہ افضل ہے وقت شروع ہو جانے کے بعد وضو کرنے سے، جو کہ فرض ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ، ابن ماجہؒ اور حاکمؒ نے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ "جو شخص کسی مفلس و تنگدست کو مہلت دے تو ادائیگی کا دن آنے تک اس کو ہر دن کے بدلے اس کے قرضے کے برابر صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور پھر جب ادائیگی کا دن آئے اور وہ

پھر اسے مہلت دے دے تو اس کو ادائیگی کا دن آنے تک ہر دن کے بدلے اس کے قرض کے برابر صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور پھر جب ادائیگی کا دن آئے اور وہ پھر اسے مہلت دے دے تو اس کو ہر دن کے بدلے اس کے قرض کی دگنی مقدار کے برابر صدقہ کا اجر وثواب ملتا ہے"۔

اس روایت کو تمثیلی طور پر یوں سمجھئے کہ مثلاً ایک شخص نے دو مہینے کے وعدے پر ایک سو روپے قرض دیئے، اور دو مہینے کے بعد اس کی مفلسی وتنگدستی کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک مہینے کی مہلت دے دی تو اسے پورے مہینے اس طرح اجر وثواب ملتا رہے گا کہ گویا وہ ہر دن ایک سو روپیہ صدقہ وخیرات کرتا ہے، اسی طرح ایک مہینے کی مدت گزر جانے کے بعد دوبارہ مہلت دینے میں ایسا ہی اجر وثواب ملتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب تیسری بار مہلت دے گا تو اسے ہر دن ایسا ثواب ملے گا جیسے کہ وہ ہر دن دو سو روپے صدقہ وخیرات کرتا ہے۔
نیز امام بخاریؒ نے مذکورہ بالا روایت (۲۱۶ والی) کو **کتاب البیوع، باب فضل من انظر معسراً** ج ۴ ص ۲۱ پر اور امام مسلمؒ نے **باب فضل انظار المعسر والتجاوز فی الاقتضاء** میں اور امام نسائیؒ نے **باب حسن المعاملۃ والرفق فی المطالبۃ** میں بھی نقل کیا ہے۔

بغض وعداوت کی مذمت

(۲۱۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور پھر ہر اس بندے کی بخشش کی جاتی ہے جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو، البتہ وہ شخص اس بخشش سے محروم رہتا ہے جو اپنے اور کسی مسلمان بھائی کے درمیان عداوت رکھتا ہو، اور فرشتوں سے کہا جاتا ہے، ان دونوں کو جو آپس میں عداوت اور بغض رکھتے ہیں، مہلت دو تا آنکہ وہ آپس میں صلح وصفائی کر لیں"۔ (صحیح مسلم، باب النهی عن الفحشاء ج ۹ ص ۴۵۸، حاشیہ القسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب ماینہی عنہ من التہاجر والتقاطع واتباع العورات ص ۴۲۷)

امام مالکؒ نے بھی "الموطاء" میں اس حدیث کو نقل کیا ہے نیز امام ابوداؤدؒ نے بھی اسے سنن ابی داؤد باب من یھجو اخاہ المسلم کے تحت ج ۴ ص ۲۱۸ پر نقل کیا ہے۔

فائدہ:

"جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ جنت کے طبقات ودرجات یا اس کے بالا خانے ان دونوں میں کھولے جاتے ہیں، کیونکہ ان دونوں دنوں میں حق تعالیٰ کی رحمت کثرت سے نازل ہوتی ہے، جو بندوں کی مغفرت کا باعث ہوتی ہے۔ (ملاعلی قاریؒ)

اور شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ نے یہ لکھا ہے کہ دروازوں کا کھلنا دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ ان دو دنوں میں بندوں کو بہت زیادہ مغفرت سے نوازا جاتا ہے، ان کے گناہ وجرائم سے درگزر کیا جاتا ہے، اور انہیں ثواب کی کثرت اور بلندی درجات کی سعادت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کیا جائے، کیونکہ نصوص (یعنی قرآن وحدیث میں منقول احکام) کے ظاہری مفہوم پر عمل کرنا واجب ہے، تاوقتیکہ کوئی ایسی واضح دلیل موجود نہ ہو جس سے اس کے ظاہری مفہوم کے بجائے کوئی دوسرا مطلب مراد لیا جاسکتا ہو۔

"تا آنکہ وہ آپس میں صلح وصفائی کرلیں" بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی مغفرت باہمی صلح وصفائی اور بغض وعداوت کے ختم ہوجانے پر موقوف رہتی ہے، خواہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے عداوت رکھتے ہوں۔ یا ان میں سے ایک عداوت رکھتا ہو اور دوسرا اس عداوت سے صاف دل ہو۔ (مظاھر حق ج ۴ ص ۵۷۹)

(۲۱۸) حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ کسی شخص کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے ملنا جلنا

چھوڑے رکھے اور صورت یہ ہو کہ (جب آمنا سامنا ہو تو) یہ اپنا منہ اِدھر کو پھیر لے اور وہ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لے (یعنی دونوں ہی ایک دوسرے سے سلام و کلام اور ملاقات سے احتراز کریں) اور ان دونوں میں بہتر شخص وہ ہے جو (خفگی کو دور کرنے کے لیے اور بحالی تعلقات کی خاطر) سلام میں پہل کرے۔'' (صحیح البخاری، باب ذم الھجرۃ، کتاب الادب، ج۹ ص ۵۲، قسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب ما ینھیٰ عن التھاجر و التقاطع و اتباع العورات ص۴۲۷)

فائدہ:

''تین دن سے زیادہ'' کی قید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے اظہارِ خفگی کی خاطر تین دن تک ملنا جلنا چھوڑے رکھا جائے تو یہ حرام نہیں ہے، کیونکہ انسان کی طبیعت میں غیظ و غضب، غیرت و حمیت اور تندی و بے صبری کا جو مادہ ہے وہ بہر حال اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے، اس لیے اس قدر مدت معاف کر دی گئی ہے، تاکہ انسان کے ان جذبات کی بھی تسکین ہو جایا کرے، اور اس تین دن کے عرصہ میں خفگی اور ناراضگی اور بغض و نفرت کے جذبات بھی ختم ہو جائیں یا کم سے کم ہلکے پڑ جائیں اور صلح و صفائی کی صورت پیدا ہو جائے۔

بہر حال! حدیث کی مراد یہ ہے کہ اجتماعی طور پر ایک جگہ رہنے سہنے اور روزمرہ کے باہمی معاملات کی وجہ سے آپس میں نزاع و اختلاف ہو جایا کرتا ہے اور ایک دوسرے سے کوئی شکایت پیدا ہو جانے کی وجہ سے خفگی و ناراضگی کی صورت پیش آجاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کی غیبت کر دی، اس کو برا بھلا کہہ دیا یا اس کو اس شخص سے خیر خواہی کی امید تھی، مگر اس نے خیر خواہی نہیں کی، تو اس طرح کی صورتوں میں اگر آپس میں ناراضگی و خفگی ہو جائے اور ترکِ ملاقات کی نوبت آجائے تو اس خفگی اور ترک ملاقات کو تین دن سے زیادہ نہیں رہنے دینا چاہیے۔ ہاں اگر ترکِ ملاقات کسی دینی معاملہ کی وجہ سے ہو، جیسے کوئی شخص خواہشاتِ نفسانی کا غلام بن گیا ہو یا کوئی شخص بدعتی ہو تو اس سے ترکِ ملاقات اس وقت تک جائز ہے جب تک کہ وہ توبہ تائب ہو کر راہِ راست اختیار نہ کر لے اور حق کی طرف

رجوع نہ کرے۔

امام سیوطیؒ نے موطاء کے حاشیہ میں امام ابن عبدالبرؒ سے نقل کیا ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی شخص کو یہ خوف ہو کہ اگر میں فلاں آدمی سے سلام کروں اور اس سے ملنا جلنا رکھوں تو اس کی وجہ سے مجھے دینی یا دنیاوی نقصان برداشت کرنا پڑے گا، اور میرا قیمتی وقت لایعنی امور میں ضائع ہوگا تو وہ اس شخص سے کنارہ کشی اختیار کرے اور اس سے دور رہنے کی کوشش کرے، لیکن یہ کنارہ کشی اور دوری اختیار کرنا اچھے انداز میں ہونا چاہیے، یہ نہیں کہ اس کی غیبت کی جائے اس پر عیب لگائے جائیں اور اس کے متعلق کینہ وعداوت کو ظاہر کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کے ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن میں مسلمانوں کا دینی مصالح کے پیش نظر ایک دوسرے سے تین دن سے زیادہ بھی ترکِ ملاقات کیے رہنا ثابت ہے، چنانچہ "احیاء علوم الدین" میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر حضرات کی ایک جماعت کے بارے میں منقول ہے کہ ان میں بعض مرتے دم تک ترکِ ملاقات پر قائم رہے۔

ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا واقعہ تو بہت مشہور ہے جو غزوہ تبوک میں نہیں گئے تھے اور آنحضرت ﷺ نے ان میں نفاق کی راہ پا جانے کے خدشہ سے ان کو تمام مسلمانوں سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم ان تینوں کی ازواج اور ان کے عزیز واقارب تک کو ان سے ترک ملاقات اور ترکِ اسلام وکلام کا حکم دیا تھا، یہ حکم اور اس پر عمل پچاس دنوں تک جاری رہا، خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپؐ نے ایک مہینہ تک اپنی ازواج مطہرات سے ملنا جلنا چھوڑے رکھا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مدت تک حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے ترکِ ملاقات اختیار کیے رکھی۔ (جیسا کہ اگلی حدیث میں تفصیل سے آرہا ہے)، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے بیٹے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ایک دینی معاملہ میں اس درجہ ناراض ہوئے کہ ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دی تھی۔

غرضیکہ ایسے بہت سے واقعات منقول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دینی معاملات میں خفگی وناراضگی تین دن سے زیادہ بھی جاری رکھی جاسکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ نیت صادق رکھی جائے اور اس میں کسی نفسانی خواہش اور دنیاوی غرض کا عمل و دخل نہ ہو۔

''جو سلام میں پہل کرے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے جو شخص خفگی وناراضگی کو ختم کرنے کے لیے پہلے سلام کرے گا، اس کا درجہ دوسرے کے مقابلہ میں بڑا ہوگا، نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ سلام میں پہل کرنا ترکِ ملاقات کے گناہ کو زائل کردیتا ہے، اور یہ کم سے کم ترکِ سلام کو تو ختم کر ہی دینا چاہیے، تا کہ اخوتِ اسلامی کا یہ بنیادی حق ضائع نہ ہونے پائے۔ (مظاھر حق ج ۴ ص ۵۷۵ تا ۵۷۶)

(۲۱۹) امام بخاری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عوف بن مالک بن طفیل رحمہ اللہ نے حدیث بیان کی (آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ماں شریک بھائی کے صاحبزادے ہیں) کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتایا گیا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کسی بیع یا ہدیہ کے سلسلہ میں جو ام المؤمنینؓ نے دیا تھا، کہا کہ خدا کی قسم! یا تو عائشہ رضی اللہ عنہا یہ طرزِ عمل چھوڑ دیں ورنہ انہیں دینا بند کردوں گا، ام المؤمنینؓ نے فرمایا: کیا اس نے یہ الفاظ کہے ہیں! لوگوں نے بتایا کہ جی ہاں، ام المؤمنینؓ نے فرمایا پھر میں اللہ سے عہد کرتی ہوں کہ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ سے اب کبھی نہیں بولوں گی، اس کے بعد جب آپ کا قطع تعلق پر عرصہ گزر گیا تو ابنِ زبیر کے لیے آپ سے سفارش کی گئی (کہ انہیں معاف فرمادیں) ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اس کے بارے میں سفارش نہیں مانوں گی، اور اپنی قسم نہیں توڑوں گی، جب یہ قطع تعلق ابن زبیرؓ کے لیے بہت تکلیف دہ ہوگیا تو آپ نے مسور بن مخرمہؓ اور عبدالرحمٰن بن اسود بن عبد یغوثؓ سے اس سلسلہ میں بات کی، آپ دونوں حضرات ہی بنی زہرہ سے تعلق رکھتے ہیں، آپ نے ان سے کہا کہ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، کسی طرح تم لوگ مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں داخل کرادو، کیونکہ ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ میرے ساتھ صلہ رحمی کو توڑنے کی قسم کھائیں، چنانچہ مسورؓ اور عبدالرحمٰنؓ دونوں اپنی چادروں میں لپٹے ہوئے ابن

زبیر رضی اللہ عنہ کو اس میں ساتھ لے کر آئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اندر آنے کی اجازت چاہی اور عرض کی: السلام علیک ورحمة الله وبرکاته! کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آجاؤ، انہوں نے عرض کی، ہم سب؟ ہاں سب آجاؤ، ام المؤمنینؓ کو اس کا علم نہیں تھا کہ ابن زبیرؓ بھی ان کے ساتھ ہیں، جب یہ حضرات اندر آگئے تو ابن زبیرؓ پردہ ہٹا کر اندر چلے گئے، اور ام المؤمنین سے لپٹ کر اللہ کا واسطہ دینے لگے اور رونے لگے کہ معاف کر دیں، آپ ام المؤمنین کے بھانجے تھے، مسورؓ اور عبدالرحمٰنؓ بھی ام المؤمنینؓ کو اللہ کا واسطہ دینے لگے کہ ابن زبیرؓ سے بولیں اور انہیں معاف کر دیں، ان حضرات نے یہ بھی عرض کی کہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلق توڑنے سے منع کیا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ کسی اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق رکھے، یہ حدیث یاد دلانے لگے اور یہ کہ اس میں نقصان ہے، تو ام المؤمنین بھی انہیں یاد دلانے لگیں اور رونے لگیں، اور فرمانے لگیں کہ میں نے تو قسم کھالی ہے؟ اور قسم کا معاملہ سخت ہے، لیکن یہ حضرات مسلسل اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ ام المؤمنینؓ نے ابن زبیرؓ سے بات کرلی اور اپنی قسم (کو توڑنے) کی وجہ سے چالیس غلام آزاد کیے، اس کے بعد جب بھی آپ اپنی یہ قسم یاد کرتیں تو رونے لگتیں اور آپ کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا"۔

(صحیح البخاری، باب الهجرة وقول رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحل لرجل ان یهجر اخاه فوق ثلاث)

رضائے الٰہی کی خاطر محبت رکھنے کا قیامت کے دن اعزاز

(۲۲۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (سب لوگوں کے سامنے اپنے بعض بندوں کی عظمت و بزرگی ظاہر کرنے کے لیے) فرمائے گا، کہاں ہیں وہ لوگ جو میری بڑائی کے اظہار اور میری تعظیم کی خاطر آپس میں محبت و تعلق رکھتے تھے، آج میں ان لوگوں کو اپنے سایہ میں پناہ دوں گا اور آج کے دن میرے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہے"۔(صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب الحب فی اللہ تعالیٰ ج۹ ص ۴۲۰ از حاشیہ القسطلانی مشکوٰۃ المصابیح، باب الحب فی اللہ

ومن اللہ ص ۴۲۵)

فائدہ:

اللہ تعالیٰ کے سایہ سے مراد (۱) یا تو عرش کا سایہ ہے جیسا کہ بعض احادیث میں اس کا صراحۃً ذکر ہے، اس صورت میں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سایہ کی وضاحت اس سایہ کی عظمت وتکریم کو ظاہر کرنے کیلئے ہے (۲)۔ یا ''سایہ'' سے مراد حفاظتِ خداوندی اور رحمت الٰہی ہے، جیسا کہ السلطان ظل اللّٰہ فی الارض ،(یعنی بادشاہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے) فرمایا گیا ہے (عیسیٰ بن دینار رحمۃ اللہ علیہ) (۳) اور یا یہ کہ سایہ کے ذریعہ قیامت کے دن کی ان راحتوں اور نعمتوں کو تعبیر کیا گیا ہے جو ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوں گی، چنانچہ عربی میں لفظ ''ظلٌّ'' یعنی سایہ، راحت اور نعمت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ خوشی وراحت کے ساتھ گزرنے والی زندگی کو ''عَیْشٌ ظَلِیْلٌ'' کہا جاتا ہے۔ (مظاہر حق ج ۴ ص ۵۶۳)

حبّ فی اللہ کی فضیلت

(۲۲۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ ''ایک شخص اپنے بھائی کی ملاقات کے لیے روانہ ہوا جو کسی دوسری آبادی میں رہتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ پر اس کے انتظار میں ایک فرشتہ کو بٹھا دیا، جب وہ شخص اس جگہ پہنچا تو فرشتہ نے پوچھا کہ کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ اس شخص نے کہا کہ میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں جو اس آبادی میں رہتا ہے، فرشتہ نے پوچھا کہ کیا اس پر تمہارا کوئی حقِ نعمت ہے جس کو حاصل کرنے کیلئے تم اس کے پاس جا رہے ہو؟ اس شخص نے کہا کہ نہیں، میں محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اس سے محبت وتعلق رکھتا ہوں، فرشتہ نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس بھیجا ہے تاکہ میں تمہیں یہ بشارت دوں کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرتا ہے، جیسا کہ تم محض اللہ تعالیٰ کی خاطر اس شخص سے محبت وتعلق رکھتے ہو۔'' (ایضاً، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحب فی اللہ ومن اللہ ص ۴۲۵)

فائدہ:

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرنے کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ چیز (حب فی اللہ) محبتِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے، نیز اس سے صالحین کی ملاقات کے لیے ان کے پاس جانے کی فضیلت بھی واضح ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے نیک اور محبوب بندوں کے پاس فرشتوں کو بھیجتا ہے جو ان سے ہم کلام ہوتے ہیں، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ چیز پچھلی امتوں کے ساتھ خاص تھی، کیونکہ اب نبوّت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور انسانوں کے پاس فرشتوں کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ (مظاہر حق ج ۴ ص ۵۶۴)

(۲۲۲) حضرت معاذؓ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ میرا محبت کرنا ایک طے شدہ امر ہے جو محض میری رضا مندی اور خوشنودی کی خاطر آپس میں میل محبت رکھتے ہیں، محض میری رضا اور خوشنودی کی خاطر اور میری حمد وثناء کرنے کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں، اور محض میری رضا وخوشنودی کی خاطر ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں، اور محض میری رضا اور خوشنودی کی خاطر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔'' (رواہ الامام مالکؒ فی الموطاء)

اور جامع ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو میری عظمت وجلال کے سبب آپس میں میل ومحبت رکھتے ہیں ان کے لئے (آخرت میں) نور کے منبر ہوں گے جن پر انبیاء وشہداء (بھی) رشک کریں گے۔

(جامع الترمذی ج ۲ ص ۶۳ مشکوٰۃ المصابیح، باب الحب فی اللّٰہ ومن اللّٰہ ص ۴۲۶)

فائدہ:

''جن پر انبیاء وشہداء رشک کریں گے'' اس جملہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کس طرح درست ہوسکتی ہے؟ کیونکہ انبیاء علی الاطلاق تمام لوگوں سے افضل وبرتر ہیں اور شہداء راہِ خدا میں اپنی جان ومال قربان کردینے کے سبب عظیم فضیلت رکھتے ہیں، لہٰذا ان

دونوں کا ایسے لوگوں کے اجر وانعام پر رشک کرنا کس طرح موزوں ہوسکتا ہے جس کا مذکورہ عمل نہایت آسان اور سہل ہے، علاوہ ازیں اس بات سے انبیاء وشہداء کے مقابلہ پر مذکورہ لوگوں کا زیادہ افضل ہونا لازم آتا ہے، کیونکہ رشک اسی کو ہوتا ہے جو مفضول ہو، اور جس پر رشک کیا جاتا ہے، وہ فاضل ہوتا ہے؟

(۱) اس کا پہلا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ یہاں اجر وانعام پر خوشی ومسرت کا اظہار کرنا مراد ہے، نہ کہ رشک کا حقیقی مفہوم مراد ہے۔(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مذکورہ بالا جملہ دراصل فرض وتقدیر پر مبنی ہے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو رتبہ ومقام حاصل ہوگا اس کی اہمیت وفضیلت کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر بفرضِ محال انبیاء وشہداء کو کسی رتبہ ومقام پر رشک ہوتا تو ان لوگوں کے رتبہ ومقام پر ہوتا۔(۳) اور تیسرا جواب یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مفضول میں کوئی ایسی خاص صفت وفضیلت ہوتی ہے جو فاضل میں نہیں ہوتی، اور باوجودیکہ فاضل اپنے اندر جو فضائل اور خوبیاں رکھتا ہے، ان کے مقابلہ پر مفضول کی اس صفت وفضیلت کی اہمیت نہیں ہوتی، لیکن فاضل کی تمنا اور خواہش ہوتی ہے کہ اس کو وہ صفت اور خوبی حاصل ہوجائے جو مفضول میں ہے۔

اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ زید کے پاس ایک ہزار بہت خوب صورت غلام ہوں اور ان میں خوبصورتی کے علاوہ دوسری اور خوبیاں بھی موجود ہوں، اور اس کے مقابلہ پر عمر کے پاس صرف ایک غلام بچہ ہو، جو بہت نیک اور ہونہار ہو، اب ظاہر ہے کہ زید اپنے غلاموں کی تعداد اور اہمیت کے اعتبار سے عمر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ برتری اور فضیلت رکھتا ہے، اور اس کو اس بات کی بظاہر کوئی ضرورت ہی نہیں کہ وہ عمر کے غلام بچہ پر رشک کرے، لیکن اس کے باوجود اس کی خواہش یہ ہو کہ عمر کے پاس جو غلام بچہ ہے اسی طرح کا ایک غلام بچہ مجھے بھی حاصل ہوجائے، اسی طرح انبیاء وشہداء بھی مذکورہ لوگوں کی فضیلت دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ کاش دوسری فضیلتوں کے ساتھ یہ فضیلت بھی ان کو حاصل ہوجاتی۔(مظاھر حق ج ۴ ص ۵٦۷ تا ص ۵٦۸)۔

اور ایک خاص بات یہ بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ ''انبیاء'' سے وہ نبی اور پیغمبر

مراد ہیں جو اپنی زندگی میں کسی عذر یا کسی اور سبب سے باہمی ملاقات کا موقع نہ پا سکے ہوں گے، ورنہ تو جہاں تک نفس محبت اور ہم نشینی کا تعلق ہے، تو ایسا کوئی نبی اور پیغمبر نہیں گزرا ہے جو اللہ کی خاطر اپنی امت کے لوگوں سے محبت و تعلق نہ رکھتا ہو اور ہم نشینی سے محروم رہا ہو۔ (ایضاً)

(۲۲۳) ابوادریس الخولانی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں دمشق کی مسجد میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چمکدار دانتوں والے نوجوان بیٹھے ہیں، لوگ ان کے پاس ہیں (اور ایک روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ بیس صحابہ رضی اللہ عنہم بیٹھے ہیں اور ایک روایت میں تمیں صحابہ رضی اللہ عنہم کا لفظ مذکور ہے۔) جب کسی چیز میں ان کا اختلاف ہوتا ہے تو ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ان کی بات پر عمل کرتے ہیں، میں نے ان کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے بتلایا گیا کہ یہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں، دوسرے دن میں بالکل ابتدائی وقت میں صبح صبح چلا گیا تو کیا دیکھا وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود ہیں، میں نے دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں، فرماتے ہیں: میں نے ان کا انتظار کیا، یہاں تک کہ جب وہ نماز پڑھ چکے تو میں ان کے سامنے سے ان کے پاس آیا، ان کو سلام کیا اور عرض کیا، بخدا میں آپ سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرتا ہوں، انہوں نے فرمایا: بخدا! کیا یہی بات ہے؟ میں نے کہا: بخدا! یہی بات ہے، انہوں نے پوچھا: کیا بخدا یہی بات ہے؟ میں نے عرض کیا: بخدا! یہی بات ہے، انہوں نے پھر فرمایا: بخدا! یہی بات ہے؟ میں نے کہا: بخدا! یہی بات ہے، چنانچہ انہوں نے میری چادر کا کنارہ (ایک روایت میں میری چادر کے کنارے) پکڑ لیے اور اپنی طرف کھینچ کر فرمایا، مبارک ہو! خوشخبری سن لو! کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں "میری محبت ان لوگوں کے لیے واجب ہوگئی جو میری خاطر ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں اور میری خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں، میری خاطر ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری خاطر ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں اور جانیں قربان کرتے ہیں۔" (الموطاء)

طبرانی میں یہ الفاظ بھی زائد ہیں: "اور جو میری خاطر ایک دوسرے سے دوستی

کرتے ہیں۔''

بیمار پُرسی کی اہمیت

(۲۲۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا: اے ابنِ آدم! میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہیں کی؟ بندہ عرض کرے گا کہ ''اے میرے رب! میں تیری عیادت کس طرح کرتا کہ تو تو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے! اللہ تعالیٰ فرمائے گا'' کیا تجھے معلوم نہیں ہوا تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے؟ اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی تھی، کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس بیمار بندہ کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، (پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا) اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا؟ بندہ عرض کرے گا کہ ''اے میرے رب! میں تجھے کھانا کس طرح کھلاتا تو تو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے''۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے یاد نہیں کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا اور تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا تھا، کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اسے (ثواب کو) میرے پاس پاتا، (پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا) اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے مجھے پانی نہیں پلایا؟ بندہ عرض کرے گا'' اے میرے رب! میں تجھے پانی کس طرح پلاتا؟ تو تو دونوں جہانوں کا پروردگار ہے'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا'' تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا اور تُو نے اسے پانی نہیں پلایا، کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اسے پانی پلاتا تو اسے (ثواب کو) میرے پاس آتا'' (صحیح مسلم، باب فضل عیادة المریض، کتاب البر والصلة والادب ج۹ ص ۲۶۳ ، مشکوٰة المصابیح، باب عیادة المریض وثواب المرض، کتاب الجنائز ص ۱۳۳)

فائدہ:

حدیث میں ذکر کی گئی تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت یعنی عیادت کرنے اور بعد کی دونوں صورتوں کا یہ فرق ملاحظہ فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مریض کی عیادت کے بارہ میں تو یہ فرمائے گا کہ اگر تو مریض کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، جبکہ کھانا کھلانے اور

پانی پلانے کے بارہ میں فرمائے گا کہ اگر تو کھانا کھلاتا یا یہ کہ اگر تو پانی پلاتا تو اس کے ثواب کو میرے پاس پاتا، اس سے معلوم ہوا کہ مریض کی عیادت کرنا، بھوکے کو کھانا کھلانے اور پیاسے کو پانی پلانے سے افضل ہے۔(مظاہر حق ج ۲ ص ۲۹)

رجوع الی اللہ کا حکم

(۲۲۵) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حدیثوں کے سلسلہ میں کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے اور میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار دیا ہے، پس تم آپس میں ظلم نہ کرو، اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو، علاوہ اس شخص کے جس کو میں ہدایت بخشوں، پس تم سب مجھ سے ہدایت چاہو، میں تمہیں ہدایت دوں گا، اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو، علاوہ اس شخص کے جس کو میں کھلاؤں، پس تم سب مجھ سے کھانا مانگو، میں تمہیں کھلاؤں گا۔

اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو، علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے پہننے کے لیے دیا، پس تم سب مجھ سے لباس مانگو میں تمہیں پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم اکثر دن رات خطائیں کرتے ہو، اور میں تمہاری خطائیں بخشتا ہوں، پس تم سب مجھ سے بخشش مانگو، میں تمہیں بخشوں گا۔ اے میرے بندو! تم ہرگز میرے ضرر کو نہیں پہنچ سکو گے تا کہ مجھے نقصان پہنچا سکو، اور ہرگز میرے نفع کو نہیں پہنچ سکو گے تا کہ مجھے فائدہ پہنچا سکو۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور تمہارے پچھلے انسان اور جنات مل کر تم میں سے کسی ایک نہایت پرہیزگار دل کی مانند ہو جائیں تو اس سے میری مملکت میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور تمہارے پچھلے انسان و جنات مل کر تم میں سے کسی ایک نہایت بدکار دل کی مانند ہو جائیں تو اس سے میری مملکت کی کسی ادنیٰ سی چیز کو بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے، تمہارے پچھلے انسان اور جنات سب مل کر کسی جگہ کھڑے ہوں اور پھر مجھ سے مانگیں اور میں ہر ایک کو اس کے مانگنے کے مطابق

دوں تو میرا یہ دینا اس چیز سے جو میرے پاس ہے، اتنا ہی کم کرتی ہے جتنا کہ ایک سوئی سمندر میں گر کر (اس کے پانی کو کم کرتی ہے)۔ اے میرے بندو! جان لو! میں تمہارے اعمال یاد رکھتا ہوں اور انہیں تمہارے لیے لکھتا ہوں، میں تمہیں ان کا پورا پورا فائدہ دوں گا، پس جو شخص بھلائی پائے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جو شخص بھلائی کے علاوہ پائے تو وہ اپنے نفس ہی کو ملامت کرے۔'' (صحیح مسلم، باب تحریم الظلم ج ۱۰ ص ۸، مشکوٰۃ المصابیح، باب الاستغفار والتوبۃ ص ۲۰۳)

فائدہ

''تم سب گمراہ ہو'' اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ دنیا کا کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اسے دین و دنیا کا ہر کمال، ہر سعادت اور تمام ہی بھلائیاں حاصل ہوں، ہر شخص کے اندر کچھ نہ کچھ کمی اور کوتاہی ضرور ہوتی ہے، اور اگر کوئی دینی اور اخروی اعتبار سے اپنے اندر کوئی کمی اور کوتاہی و گمراہی رکھتا ہے تو کسی کے اندر دنیاوی امور کے اعتبار سے کوئی نہ کوئی کمی اور کجی ہوتی ہے، اس لیے فرمایا کہ تم سب گمراہ ہو، یعنی دنیوی اور دینی دونوں اعتبار سے درجہ کمال سے ہٹے ہوئے ہو۔

''علاوہ اس شخص کے جس کو میں ہدایت بخشوں'' اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگوں کو ان کی اس حالت و کیفیت پر چھوڑ دیا جائے جو ان کی طبیعت اور ان کے نفس کی بنیاد ہے تو وہ خودرو درخت کی طرح جس طرح چاہیں بڑھیں اور جس سمت چاہیں چلیں، جس کا نتیجہ گمراہی اور بے راہ روی ہے، اس لیے میں جس کو چاہتا ہوں اسے فکر و ذہن کی سلامتی اور اعمالِ نیک کی ہدایت و توفیق بخشتا ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا نفس صحیح راہ پر چلتا ہے اور اس کی طبیعت نیکی ہی کی سمت بڑھتی ہے، اس بات کو نبی کریم ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا کہ: '' ان اللہ خلق الخلق فی ظلمۃ ثم رش علیھم من نورہ'' یعنی اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا اور پھر ان پر اپنے نور کا چھینٹا دیا۔''

اس موقع پر یہ خلجان پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ بات، حدیث پاک کل مولود

یولد علی الفطرۃ "(ہر بچہ فطرت (اسلام کی فطرت) پر پیدا کیا جاتا ہے) کے منافی ہے، کیونکہ ''فطرت'' سے مراد توحید ہے۔ اور ''ضلالت'' سے مراد احکامِ ایمان کی تفصیل اور اسلام کے حدود وشرائط کا نہ جاننا ہے۔

''میں تمہاری ساری خطائیں بخشتا ہوں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دن رات لغزشوں اور گناہوں میں مبتلا رہتے ہو لیکن اگر اپنے ان گناہوں پر ندامت کے ساتھ توبہ واستغفار کرتے رہو تو میں تمہارے سب گناہ بخش دیتا ہوں۔ یا پھر مراد یہ ہے کہ ایک تو صرف ایسا گناہ ہے جس سے توبہ کئے بغیر بخشش ممکن نہیں، ہاں اس کے علاوہ اور سارے گناہ اگر میں چاہتا ہوں تو بغیر توبہ واستغفار کے بھی اپنے فضل وکرم اور اپنی رحمتِ خاص کے پیشِ نظر بخش دیتا ہوں۔

''جتنا کہ سوئی کم کر دیتی ہے'' اس کے بارے میں علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سوئی کا سمندر میں گر کر اس کے پانی کو کم کر دینا نہ محسوس چیز ہے اور نہ عقل وشعور کی رسائی میں آنے والی بات، بلکہ وہ کالعدم ہے، اس لئے اس کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے، ورنہ تو اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی کمی کا بھی کیا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں یا پھر یہ کہا جائے کہ یہ جملہ بالفرض والتقدیر کے قبیل سے ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کمی فرض بھی کی جائے تو وہ اس قدر ہو سکتی ہے۔ (مظاہر حق: ج ۲ ص ۵۵۴)

(۲۲۶) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: '' اے میرے بندو! تم میں سے ہر شخص گمراہ ہے، مگر وہ جسے میں ہدایت بخشوں، لہٰذا تم مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تمہیں ہدایت دوں گا، اور تم میں سے ہر ایک فقیر ہے، علاوہ اس شخص کے جسے میں غنی کر دوں، لہٰذا تم مجھ سے سوال کرو میں تمہیں رزق دوں گا، اور تم میں سے ہر شخص گنہگار ہے، علاوہ اس شخص کے جسے میں عافیت بخشوں، لہٰذا تم میں سے جس شخص نے یہ جان لیا کہ میں مغفرت پر قدرت رکھنے والا ہوں اور مجھ سے مغفرت طلب کرے تو میں اس کی مغفرت کر دیتا ہوں، اور مجھے کسی کی پرواہ نہیں، اور اگر

تمہارے اگلے پچھلے، زندہ ومردہ خشک اور تَر سب کے سب مل کر میرے بندوں میں سے انتہائی پرہیزگار شخص کے دل کی طرح ہو جائیں، تب بھی میری سلطنت میں اس سے مچھر کے ایک پَر کے برابر بھی اضافہ نہیں ہوگا، اور اگر تمہارے اگلے پچھلے، زندہ ومردہ، خشک وتر سب کے سب مل کر میرے بندوں میں سے کسی بد بخت ترین بندے کے دل کی طرح ہو جائیں تب بھی میری مملکت میں اس سے مچھر کے پَر کے برابر بھی کمی نہ ہوگی۔ اور اگر تمہارے اگلے پچھلے زندہ ومردہ اور خشک وتَر سب کے سب ایک کھلے میدان میں جمع ہو کر ان میں سے ہر انسان اپنی تمام آرزوئیں بھی مانگ لے اور میں تم میں سے ہر سائل کی تمام مطلوبہ چیزیں عطا کردوں تب بھی میری سلطنت میں اس سے اتنی بھی کمی نہیں آئے گی کہ جتنی تم میں سے اگر کوئی شخص سمندر کے پاس سے گزرے اور اس میں سوئی داخل کر کے نکالے، اس سے آتی ہے، یہ اس لیے کہ میں خوب سخی اور بزرگ وبرتر ہوں، جو چاہتا ہوں کرتا ہوں، میری عطاء کلام ہے، میرا عذاب کلام ہے، میں جب کوئی کام کرنا چاہتا ہوں تو "کُنْ" (ہوجا) کہتا ہوں اور وہ چیز ویسے ہی ہو جاتی ہے۔" (جامع الترمذی)

امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو مذکورہ الفاظ کے قریب قریب نقل کیا ہے، فرق یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر ہے، نیز اس میں یہ مذکور نہیں ہے: "اگر تمہارے زندہ ومردہ اور خشک وتَر سب کے سب کسی متقی ترین شخص کے دِل کی مانند ہو جائیں" نیز اس میں یہ بھی مذکور نہیں ہے"۔ اور میرا عذاب کلام ہے۔"

تکبّر کرنا گویا شرک میں مبتلا ہونا ہے:

(۲۲۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ذاتی بزرگی (گویا تمہارے اعتبار سے) میری چادر ہے اور صفاتی عظمت (گویا تمہارے اعتبار سے) میرا تہبند ہے، لہٰذا جو شخص مجھ سے ان دونوں میں سے کسی ایک کے بارہ جھگڑے گا، میں اس کو آگ میں داخل کردوں گا،، اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "تو میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا" (صحیح مسلم، باب تحریم الکبر ج ۱۰ ص ۵۳، حاشیہ القسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب الغضب والکبر ۴۳۴) اس حدیث کو امام

ابوداؤد نے بھی سنن ابی داؤد" میں باب البراءۃ من الکبر والتواضع کے تحت ج ۲ ص ۲۸۲ پر نقل کیا ہے، نیز امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو اپنی "سُنن" میں نقل کیا ہے۔

فائدہ:

میری چادر اور میرا تہبند جیسے الفاظ اللہ تعالیٰ نے مثال کے طور پر بیان فرمائے ہیں، اور اس مثال کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ یہ دونوں صفتیں یعنی کبریائی اور عظمت صرف میری ذات سے تعلق رکھتی ہیں، جن میں کوئی بھی میرا شریک اور ساجھی نہیں ہوسکتا۔ جیسے کسی کے لباس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات تو ایسی ہیں جن کا کچھ حصہ بندوں کو بھی دیا گیا ہے اور بندے بطریق مجاز خود کو ان صفات کے ساتھ موصوف کر سکتے ہیں۔ جیسے جود وکرم اور لطف ومہربانی وغیرہ، لیکن کچھ صفات ایسی ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کیلئے مخصوص ہیں، اور جن کے ساتھ کوئی بندہ اپنے آپ کو بطریق مجاز بھی موصوف نہیں کرسکتا۔ اسی حقیقت کو مثال کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ جس طرح کوئی شخص ان کپڑوں کو نہیں پہن سکتا جو کسی دوسرے شخص کے جسم پر ہوں، اسی طرح کبریائی اور حقیقی عظمت و بڑائی کا بھی کوئی بندہ دعویٰ نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ دونوں صفتیں صرف میری ذات کیلئے موزوں اور مخصوص ہیں۔

"کِبریاء" اور "عظمة" یہ دونوں لفظ لغت میں ایک ہی معنی کے حامل ہیں، یعنی بزرگی اور بڑائی، لیکن حدیث مبارک کے ظاہری اسلوب سے ان دونوں کے درمیان فرق معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو تو چادر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اور دوسرے کو تہبند کے ساتھ!۔ لہٰذا اس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ 'کبریاءُ' توصفتِ ذاتی ہے۔ یعنی اللہ کی ذات کبیر ومتکبر ہے، خواہ دوسرا اس حقیقت کو جانے یا نہ جانے اور "عظمة" کا لفظ اللہ تعالیٰ کی اس بڑائی کو بیان کرتا ہے جس کا ظہور اس کے غیر پر بھی ہوتا ہے کہ ساری مخلوق جانتی ہے کہ ایسا بڑا ہے، پس "عظمة" اللہ تعالیٰ کی صفتِ اضافی ہوئی، اور "کبریاء" صفت ذاتی، اور ذاتی صفت کا اضافی صفت سے اعلیٰ و برتر ہونا

ضروری ہوتا ہے، لہٰذا ''کبریاء'' کو چادر کے ساتھ تشبیہ دی گئی، کیونکہ چادر، تہبند سے اعلیٰ ہوتی ہے اور ''عظمت'' کو تہبند کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (مظاہر حق ج ۴ ص ۱۲۹)

بہر حال! اس حدیث میں تکبر پر شدید ترین وعید اور اس کے حرام ہونے کی صاف اور واضح دلیل موجود ہے، اور اس (تکبر) کو ازار اور رداء مجازاً کہا گیا ہے، جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں، '' **فلان شعاره الزهد و دثاره التقوى** '' یعنی زہد، فلاں شخص کا شِعار (جسم و بدن سے متصل کپڑا) اور تقویٰ، دثار (جسم اور کپڑے کے درمیان حائل کپڑا) ہے۔

تکبر کی مذمت اور اس پر وعید قرآن پاک کی متعدد آیات میں وارد ہوئی ہے، تکبر کو اللہ تعالیٰ نے خیر و توفیق سے محرومی کا سبب قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا: ''**سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ**'' (الاعراف: ۱۴۶) ''میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو پھیروں گا جو روئے زمین پر ناحق تکبر کرتے ہیں''

نیز فرمایا: ''**اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ**'' (الزمر: ۶۰) ''کیا ان متکبر لوگوں کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہے'' نیز فرمایا: ''**بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ**'' (الاحقاف: ۲۰) ''اس وجہ سے کہ تم دُنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانی کیا کرتے تھے'' نیز ارشاد فرمایا: ''**اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ**'' (الانعام: ۹۳) ''آج تم کو ذلت و رسوائی کا عذاب دیا جائے گا، اس وجہ سے کہ تم اللہ پر ناروا باتیں کہتے تھے اور تم اس کی نشانیوں کے مقابلہ میں تکبر کیا کرتے تھے۔''

ہم اللہ تعالیٰ سے التجاء کرتے ہیں کہ وہ ہمارے نفوس کو تکبر، عُجب اور بڑائی کے مرض سے نجات دے اور ہمیں اخلاص اور تواضع کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

(۲۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر

(۲۲۸) حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: نوف بکالی کہتے ہیں، جن موسیٰ کی خضرؑ کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ موسیٰ کے علاوہ دوسرے ہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا: دشمنِ خدا نے غلط کہا، مجھ سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے کہ موسیٰ بنی اسرائیل کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے، تو اُن سے پوچھا گیا کہ انسانوں میں سے سب سے زیادہ علم کسے ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ مجھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن پر عتاب نازل کیا، کیونکہ انہوں نے علم کو اللہ تعالیٰ پر محمول نہیں کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی کے ذریعے بتایا کہ دو سمندروں کے سنگم پر ایک بندہ رہتا ہے۔ وہ تم سے زیادہ علم رکھتا ہے، موسیٰ نے عرض کی۔ اے رب! میں اُن تک کیسے پہنچ پاؤں گا؟ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ایک مچھلی لے لو اور اسے ایک تھیلے میں رکھ لو۔ وہ جہاں گم ہو۔ بس میرا بندہ وہیں ملے گا۔ چنانچہ آپ نے ایک مچھلی لی اور تھیلے میں رکھ لی اور روانہ ہوئے، آپ کے ساتھ آپ کے خادم یوشع بن نون رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جب یہ دونوں حضرات چٹان کے پاس آئے تو سر رکھ کر سو گئے۔ ادھر مچھلی تھیلے میں پھڑ پھڑائی، تھیلے سے نکل گئی اور دریا میں اس نے اپنا راستہ پالیا، مچھلی جہاں گری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں دریا کی روانی کو روک لیا اور وہاں مچھلی نالی کی طرح اٹک کر رہ گئی۔ پھر جب موسیٰ بیدار ہوئے تو اُن کے خادم مچھلی کے متعلق بتانا بھول گئے۔ اس لیے دن اور رات کا حصہ باقی تھا۔ اس میں یہ چلتے رہے۔ دوسرے دن موسیٰ نے خادم سے فرمایا: کہ کھانا لاؤ، سفر نے بہت تھکا دیا ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ موسیٰ اس وقت تک نہیں تھکے، جب تک وہ اس مقام سے نہ گزر گئے جس کا اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا، اب ان کے خادم نے کہا: آپ نے نہیں دیکھا، جب ہم چٹان کے پاس تھے تو مچھلی کے متعلق بتانا میں بھول گیا تھا، اور صرف شیطان نے یاد رہنے نہیں دیا، اس نے تو عجیب طریقہ سے سمندر میں اپنا راستہ بنا لیا تھا، مچھلی تو سمندر میں اپنا راستہ پا گئی تھی، اور موسیٰ اور ان کے خادم کو ورطۂ حیرت میں ڈال

گئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہی جگہ تھی جس کی تلاش میں ہم تھے، چنانچہ دونوں حضرات پیچھے اسی راستہ سے لوٹے، بیان کیا کہ دونوں حضرات پیچھے اپنے نقش قدم پر لوٹے اور آخراس چٹان پر پہنچے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک صاحب کپڑے میں لپٹے ہوئے وہاں موجود ہیں، موسیٰ نے انہیں سلام کیا، خضر علیہ السلام نے کہا، اس سرزمین پر سلام کہاں سے آگیا! آپ نے فرمایا کہ میں موسیٰ ہوں، پوچھا: بنی اسرائیل کے موسیٰ!؟ فرمایا: جی ہاں، آپ کے پاس اس لیے حاضر ہوا ہوں تا کہ جو رشد وہدایت کا علم آپ کو حاصل ہے وہ مجھے بھی سکھا دیں! خضر علیہ السلام نے فرمایا: موسیٰ! آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے، مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص علم ملا ہے جسے آپ نہیں جانتے، اسی طرح آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم ملا ہے وہ میں نہیں جانتا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: انشاء اللہ! آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کے خلاف نہیں کروں گا، خضر علیہ السلام نے فرمایا: اچھا! اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو کسی چیز کے متعلق سوال نہ کریں، یہاں تک کہ میں خود آپ کو اس کے متعلق بتا دوں گا۔

اب دونوں حضرات سمندر کے ساحل پر روانہ ہوئے، اتنے میں ایک کشتی گزری، انہوں نے کشتی والوں سے بات کی کہ انہیں بھی اس پر سوار کرلیں، کشتی والوں نے خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور کسی کرایہ کے بغیر انہیں سوار کرلیا۔ جب دونوں حضرات کشتی پر بیٹھ گئے، تو خضر علیہ السلام نے کلہاڑے سے کشتی کا ایک تختہ نکال ڈالا، اس وقت موسیٰ نے دیکھا تو خضر علیہ السلام سے کہا کہ ان لوگوں نے ہمیں بغیر کسی کرایہ کے اپنی کشتی میں سوار کرلیا تھا اور آپ نے انہی کی کشتی چیر ڈالی تا کہ سارے مسافر ڈوب جائیں، بلاشبہ آپ نے یہ بڑا ناگوار طرز عمل اختیار کیا ہے! خضر علیہ السلام نے فرمایا: کیا میں نے آپ سے پہلے ہی نہ کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے: موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو بات میں بھول گیا تھا اس پر آپ مجھ سے مؤاخذہ نہ کیجئے اور میرے معاملہ میں تنگی نہ کیجئے، بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پہلی مرتبہ موسیٰ علیہ السلام نے بھول کر انہیں ٹوکا تھا، بیان کیا کہ اتنے میں ایک چڑیا آئی اور اس نے سمندر میں اپنی ایک مرتبہ چونچ ماری تو خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: میرے اور آپ

کے علم کی حیثیت، اللہ کے علم کے معاملہ میں اس سے زیادہ نہیں ہے جتنا کہ اس چڑیا نے اس سمندر کے پانی سے کم کیا ہے، پھر دونوں حضرات کشتی سے اُتر گئے، ابھی وہ ساحل سمندر پر ہی چل رہے تھے کہ خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کو دیکھا، جو دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، آپ نے اس بچہ کا سر اپنے ہاتھ میں دبایا اور اسے اکھاڑ دیا اور اس کی جان لے لی، موسیٰ علیہ السلام اس پر بولے، آپ نے ایک بے گناہ کی جان بغیر کسی جان کے بدلے کے لے لی، یہ آپ نے بڑا ناپسند کام کیا، خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے! سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ (راوی حدیث) نے بیان کیا اور یہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا، موسیٰ علیہ السلام نے آخر اس مرتبہ بھی معذرت کی کہ اگر میں نے اس کے بعد پھر آپ سے کوئی سوال کیا تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیئے گا، آپ میرا بار بار عذر سُن چکے ہیں۔

پھر دونوں حضرات روانہ ہوئے، یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور بستی والوں سے کہا کہ ہمیں اپنا مہمان بنالو، لیکن انہوں نے میزبانی سے انکار کیا، پھر انہیں بستی میں ایک دیوار دکھائی دی جو بس گرنے ہی والی تھی، بیان کیا کہ دیوار جھک رہی تھی، خضر علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور دیوار اپنے ہاتھ سے سیدھی کر دی، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: کہ ان لوگوں کے ہاں ہم آئے اور ان سے کھانے کیلئے کہا لیکن انہوں نے ہماری میزبانی سے انکار کیا، اگر آپ چاہتے تو دیوار کے اس سیدھا کرنے کے کام پر اجرت لے سکتے تھے؟

خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ بس! اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: "ذٰلِکَ مَالَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا" تک۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہم تو چاہتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام نے صبر کیا ہوتا تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور واقعات ہم سے بیان کرتا۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تلاوت کرتے تھے۔ (جس میں خضر علیہ السلام نے اپنے کاموں کی وجہ بیان کی ہے کہ) کشتی والوں کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر اچھی کشتی کو چھین لیا کرتا تھا اور اس کی بھی آپ تلاوت کرتے تھے کہ "اور (جس کی گردن خضر علیہ السلام نے توڑ دی تھی) تو وہ (اللہ کے علم میں) کافر تھا اور اس کے والدین مومن تھے"۔ (صحیح البخاری،

سورة الكهف من قوله تعالىٰ وَاِذْ قَالَ مُوْسىٰ لِفَتَاه" ج٦ ص ٨٨).

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو کتاب العلم باب ماذکر فی ذهاب موسیٰ علیہ السلام فی البحر الی الخضر ج ۱ ص ۱۷ اور باب الخروج فی طلب العلم اور باب مایستحب للعالم اذا سئل ای الناس اعلم ج ۱ ص ۲۳ پر بھی ذکر کیا ہے۔ امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ (شارح بخاری) سورۃ الکهف ج ۷ ص ۲۲۱ پر لکھتے ہیں کہ مؤلف (امام بخاریؒ) نے یہ حدیث اپنی "الجامع" میں دس سے زیادہ مقامات پر ذکر کی ہے۔

فائدہ:

بخاری و مسلم کی روایت میں یوں آتا ہے کہ "حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچہ کو مار ڈالا تھا وہ کفر کی طبیعت لے کر پیدا ہوا تھا، اگر وہ لڑکا زندہ رہتا تو یقیناً اپنے ماں باپ کو کفر و سرکشی میں مبتلا کر دیتا" (بحوالہ مظاہر حق ج ۵ ص ۲۸۰) اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مقدر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہوگا، پس یہ حدیث اُس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے: "کل مولود یولد علی الفطرة" یعنی ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے،، کیونکہ "فطرتِ اسلام" پر پیدا ہونے کا مطلب، فطرتِ انسانی کا ایسی ساخت کا ہونا ہے جو نورِ ہدایت کی طرف لپکے اور اسلام کو قبول کرنے کی استعداد وصلاحیت رکھے، اور یہ بات اس چیز کے منافی نہیں ہے کہ کوئی نومولود بچہ آگے چل کر اپنے ماحول اور اپنے نفس کی گمراہیوں کا اس طرح شکار ہو جائے کہ اس کی وہ استعداد وصلاحیت دب کر رہ جائے، اور وہ اپنی اصل فطرت کے تقاضوں پر قائم نہ رہ سکے۔ یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہو۔

اب حضرت خضرؑ کے بارے میں کچھ تفصیل جان لینی چاہیے:۔ لفظِ "خضر" خ کے زبر اور ض کے زیر کے ساتھ "خَضِرٌ" ہے اور ایک نسخہ میں یہ لفظ خ کے زیر اور ض کے جزم کے ساتھ "خِضْر" منقول ہے، یہ ان کا لقب ہے، اصل نام لیان ابن ملکان ہے جبکہ

مجمع بحار الانوار ج ۲ ص ۵۸ پر ہے کہ: "واسمه بلياء، وكنيته ابو العباس" یعنی ان کا نام بلیاء اور کنیت ابو العباس ہے۔

بعض حضرات لکھتے ہیں کہ یہ حضرت الیاسؑ کے بھائی ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کے صلبی بیٹے تھے، اور بعض نے ان کو سات واسطوں سے حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے لکھا ہے، اور وضاحت کی ہے کہ اُن کے باپ سلاطین میں سے تھے، ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں تھے۔ (مجمع بحار الانوار ج ۲ ص ۵۸)

مشہور قول کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام پیغمبر ہیں، عمرِ طویل رکھتے ہیں، عام نظروں سے مخفی اور پوشیدہ رہتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ زندہ ہیں، بلکہ قیامت کے دن تک زندہ رہیں گے کیونکہ انہوں نے آبِ حیات پی رکھا ہے۔

لیکن بعض بڑے محدثین جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ان کی حیاتِ ابدی کا انکار کیا ہے۔ جمہور علماء، صوفیاء اور بہت سے صلحاء ان کی حیات کے قائل ہیں، (مجمع البحار صفحہ مذکورہ)۔ نیز حضرت خضر علیہ السلام کا بعض صلحاء سے ملاقات کرنا، ان سے ہمکلام ہونا اور خیر و بھلائی کی جگہوں پر ان کا موجود ہونا مشہور ہے۔ مشائخ کے حالات و کلام میں ان کا بہت ذکر ملتا ہے اور عجیب و غریب واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی رحمہ اللہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ کسی مسئلہ پر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے کہ اچانک انہوں نے حضرت خضرؑ کو ہوا پر سوار گزرتے دیکھا اور فرمایا: "قف يا اسرائيلي واسمع كلام محمدي" یعنی اے اسرائیلی (خضرؑ!) ٹھہریئے: کلامِ محمدی سنتے جایئے"۔

چنانچہ منقول ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ میں سے جو بھی حضرت خضر علیہ السلام کو ملتا، آپ اس کو یہ ہدایت فرماتے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ضرور جایا کرو، کیونکہ ان مجلسوں میں برکتیں نازل ہوتی ہیں اور وہاں فلاح و سعادت حاصل ہوتی ہے۔

''خضرؑ'' کی وجہ تسمیہ:

بخاری شریف کی ایک روایت جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے، یہ مذکور ہے کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت خضرؑ کا نام ''خضر'' (یعنی سرسبز وشاداب) اس لیے رکھا گیا کہ وہ ایک خشک وبنجر سفید زمین پر بیٹھے تو یکا یک وہ زمین ان کے پیچھے سے لہلہانے لگی اور وہاں سبزہ پیدا ہوگیا''۔ دیکھئے (مظاہر حق ج ۵ ص ۲۸۱)

''موسیٰ'' کی وجہ تسمیہ:

آپ بنی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر ہیں، آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے: موسیٰ بن عمران (یا عمرام) بن قامت بن لاری بن یعقوب علیہ السلام، گویا آپ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتے کے پوتے تھے، آپ کے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے درمیان تقریباً چار سو سال کی مدت تھی۔ ''موسیٰ'' کے معنی عبرانی زبان میں ''پانی سے نکالے ہوئے کے ہیں'' اور ایک دوسرا قول یہ ہے کہ ''مو'' قبطی زبان میں پانی کو کہتے ہیں اور ''سیٰ'' درخت کو، چونکہ حضرت موسیٰ کو فرعون کے ڈر سے ایک تابوت میں رکھ کر درختوں کے نیچے پانی کی موجوں میں بہا دیا گیا تھا اور پھر خدا کے حکم سے ان کو زندہ سلامت نکال لیا گیا تھا۔ اس لیے ان کا نام ''موسیٰ'' پڑ گیا۔ بہت سی وجوہات کی بناء پر آپ کی زندگی، سید المرسلین، خاتم النبیین علیہ الصلوۃ والتسلیم کی زندگی سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے اور اس میں امتِ محمدیہ کیلئے بہت کچھ مواعظ وعبر پنہاں ہیں، لہٰذا آپ کا ذکر مجملاً ومفصلاً قرآن کریم میں جا بجا آیا ہے اور آپ کا نام نامی قرآن کریم میں ۱۳۰ جگہ مذکور ہے۔ (قاموس القرآن ص ۵۶۴)

﴿(۲۷) خودکشی حرام ہے﴾

(۲۲۹) حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن) فرمایا: ''تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص تھا (جو کسی طرح) زخمی ہوگیا تھا، چنانچہ (جب زخم کی تکلیف شدید ہونے کی وجہ سے) اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو چھری اٹھائی اور اپنے (اس) ہاتھ کو کاٹ ڈالا (جس میں زخم تھا)، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زخم نہ رُکا اور وہ مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے نے اپنی جان کے بارے میں میرے فیصلہ کا انتظار نہیں کیا (بلکہ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا)، لہٰذا میں نے اس پر جنت کو حرام کر دیا''۔ (صحیح البخاری، باب الحدیث عن بنی اسرائیل ج ۴ ص ۱۷۰، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب القصاص ص ۳۰۰)

فائدہ:

''میں نے اس پر جنت کو حرام کر دیا'' یہ اس بات پر محمول ہے کہ اس نے خودکشی کو حلال جانا تھا اور چونکہ ایک حرام چیز کے بارے میں حلال کا عقیدہ رکھنا صریحاً کفر ہے، اس لیے اس پر دخولِ جنت کو حرام کر دیا گیا۔ یا اس سے مُراد یہ ہے کہ جب تک وہ دوزخ میں جا کر اپنے کیے کی سزا نہ چکھ لے اس کو اول مرحلہ میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جانے سے محروم کر دیا گیا۔

خودکشی یعنی اپنے آپ کو ہلاک کر لینا دُنیا کے کسی بھی مہذب قانون اور سماج میں جائز نہیں ہے، خُدا کے اُتارے ہوئے قانون میں بھی اسے بُرا کہا ہے اور انسان کا بنایا ہوا قانون بھی اسے قابلِ تعزیز جرم قرار دیتا ہے، اس کا تعلق دراصل اس بات سے ہے کہ انسان جو کچھ ہے یعنی اس کا ظاہر بھی اور اس کا باطن بھی، کیا وہ خود اس کا مالک ہے؟ یا اس کا ظاہر و باطن، سب کچھ کسی اور کی ملکیت ہے؟ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ انسان بذاتِ خود اپنے وجود کا مالک نہیں ہے، بلکہ اس کا وجود اس دُنیا میں صرف ایک امانت کے طور پر ہے،

خوداس کیلئے بھی اور دُنیا والوں کیلئے بھی، اوراس کا مالکِ حقیقی وہ ذاتِ پاک ہے جس نے اس کو تخلیق سے نوازا ہے، اوراس دُنیا میں پیدا کیا ہے، پھر کیا یہ امانت میں خیانت نہیں ہے کہ انسان اپنے وجود کو نقصان پہنچائے؟ کیا یہ جرم نہیں ہے کہ بندہ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے جس کا ظاہر و باطن سب کچھ پروردگارِ عالم کی ملکیت ہے!؟ یقیناً یہ ایک بہت بڑا جرم ہے اور بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا درحقیقت غیر کی ملکیت میں تصرف کرنا ہے، اور کسی بندے کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ پروردگارِ عالم کی ملکیت میں تصرف کرے۔ اسی لیے شریعت نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے اور اسے گناہِ کبیرہ کہا ہے اور اس کے مرتکب کو بڑے دردناک عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

(مظاهر حق ج ۳ ص ۵۱۵ تاص ۵۱۶)

(۲۸) ﴿حضرت ایوب علیہ السلام کا ایک واقعہ﴾

(۲۳۰) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت ایوب علیہ السلام (جب طویل اور سخت ترین بیماری کی آزمائش وامتحان میں سرخرو ہوئے اور ان کو صحت وعافیت نصیب ہوئی تو انہوں نے غسلِ صحت کیا اور اسی غسلِ صحت کے دوران وہ) برہنہ جسم نہا رہے تھے کہ سونے کی ٹڈیاں ان کے اوپر گرنے لگیں، حضرت ایوبؑ ان ٹڈیوں کو سمیٹ کر اپنے کپڑے میں رکھنے لگے، ان کے پروردگار نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ایوبؑ! جو چیز تم دیکھ رہے ہو کیا ہم نے اس سے تمہیں بے نیاز نہیں کر دیا؟ حضرت ایوبؑ نے عرض کی: بے شک تیری عزت کی قسم! تو نے مجھے اس چیز سے بے پرواہ کر دیا ہے، لیکن میں تیری نعمت کی کثرت اور تیری رحمت کی فراوانی سے ہرگز بے نیاز نہیں ہوں''

(صحیح البخاری، کتاب الغسل، باب من اغتسل عریاناً ج ۱ ص ۴۲، مشکوٰۃ المصابیح باب بدء الخلق وذکر الانبیاء علیہم السلام ص ۵۰۷)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو کتاب بدء الخلق، باب قول اللہ تعالیٰ: ''وایوب اذ نادیٰ ربہ انّی مسّنی الضرّ' ج ۴ ص ۱۵۱ پر اور کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ''یریدون ان یبدلوا کلام اللّٰہ'' ج ۹ ص ۱۴۳ پر بھی نقل کیا ہے اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے باب الاستتار عندالاغتسال ج ۱ ص ۲۰۱ پر نقل کیا ہے۔

فائدہ:

''برہنہ جسم نہار ہے تھے،، اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم پر تہبند کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں تھا اور وہ تہبند باندھے ہوئے نہا رہے تھے، اس کی تائید اگلی عبارت ''یحثی فی ثوبہ'' (سمیٹ کر اپنے کپڑے میں رکھنے لگے) سے بھی ہوتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ اس وقت کسی پوشیدہ جگہ پر بالکل برہنہ نہا رہے تھے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پوشیدہ جگہ پر بالکل برہنہ نہانا منقول ہے، اور

اس کے شرعی جواز میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے، لیکن آنحضرت ﷺ نے گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ اپنے پروردگار سے شرم وحیا کی خاطر پوشیدہ جگہ پر بھی نہاتے وقت ستر پوشی افضل ہے، اور آنحضرت ﷺ جس مکارم واخلاق کی تکمیل کیلئے دُنیا میں مبعوث ہوئے۔ اس کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

''ان ٹڈیوں کو سمیٹ کر اپنے کپڑے میں رکھنے لگے'' اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام برستی ہوئی سونے کی ٹڈیاں کو ایک ہاتھ سے اٹھا اٹھا کر، یا دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر اُنہیں تہبند میں سمیٹتے جاتے تھے جو انہوں نے نہانے کیلئے باندھ رکھا تھا، یا ''کپڑے'' سے مراد وہ پوشاک ہے جو انہوں نے نہانے کے بعد پہنی ہوگی۔ اور یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کپڑا مراد ہو جو انہوں نے اس وقت تک پہنا نہ ہو، بلکہ ان کے قریب ہی رکھا ہو۔

حضرت ایوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا مذکورہ خطاب، اظہار ناراضگی اور عتاب کے طور پر نہیں تھا، بلکہ اظہار شفقت ومحبت کے طور پر تھا کہ جب میں نے تمہارے گھر میں اتنا زیادہ سونا برسا دیا ہے اور تمہیں مالا مال کر دیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ تم ان ٹڈیوں کو اٹھا اٹھا کر اپنے کپڑے میں رکھو؟ چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے جواب دیا کہ بے شک تو نے مجھے اس قدر مالا مال کر دیا ہے اور میرے گھر میں اتنا سونا برسا دیا ہے کہ ان ٹڈیوں کو جمع کرنے اور ان کو اٹھا اٹھا کر رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رکھتا، لیکن تیری بارگاہ میں اپنے عجز واحتیاج کے اظہار کیلئے میں تیری رحمتوں کی طلب سے بے نیاز بھی نہیں ہوسکتا، خواہ تو مجھے کتنا ہی مالا مال کر دے اور مجھ پر اپنی نعمتوں اور رحمتوں کی کتنی ہی بارش برسا دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا ان ٹڈیوں کے اٹھانے میں انہماک و دلچسپی دکھانا، دنیا کی حرص وطمع اور مال ودولت میں اضافہ کی خواہش کی بناء پر نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت سے مستفید ہونے اور تشکر وامتنان کی بناء پر تھا۔

اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ جائز مال و دولت میں اضافہ کی حرص اس شخص کے حق میں روا ہے جس کو اپنے نفس پر اعتماد ہو کہ اس مال ودولت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں کوتاہی نہیں ہوگی اور اس کو ان ہی مقاصد ومصارف میں خرچ کیا جائے گا جن سے اللہ تعالیٰ راضی اور خوش ہوتا ہے۔ (مظاہر حق ج ۵ ص ۲۷۶)

(۲۹) ﴿چند قبائلِ عرب کا ذکر﴾

(۲۳۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''(قبیلہ) غفار کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، (قبیلہ) اَسْلَمُ کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھے، اور (قبیلہ) عُصَیّہ (تو وہ قبیلہ ہے) جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی معصیت میں مبتلا ہوا ہے، خوب سن لو! یہ بات میں نے نہیں کہی ہے بلکہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے''

(صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل غفار و اسلم ج۹ ص ۳۰۷) از حاشیہ القسطلانی علی البخاری، مشکوٰۃ المصابیح، باب مناقب قریش و ذکر القبائل ص ۵۵۰)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو ذرؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

فائدہ:

''غِفار'' عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے، ممتاز صحابی حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، کہا جاتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں یہ قبیلہ حاجیوں کا مال چُرایا کرتا تھا اور اپنی اس بُرائی کے سبب عام قبائل میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، اسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلہ کے حق میں دُعا فرمائی کہ اس قبیلہ کے دامن پر جو پہلا داغ لگا ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کو مٹائے اور قبیلوں والوں کو مغفرت و بخشش سے نوازے کیونکہ اب اسی قبیلہ کے لوگ خوشی خوشی اسلام میں داخل ہوگئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ارشاد گرامی جملۂ دُعائیہ کے بجائے جملہ خبریہ ہے، یعنی آپؐ نے ان الفاظ کے ذریعہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اس قبیلہ کی جاہلی زندگی کے واقعات کو کالعدم قرار دے دیا ہے اور اب اہل قبیلہ کو ان کے ایمان واسلام کی بدولت مغفرت و بخشش سے نواز دیا ہے۔

''اَسْلَمُ'' یہ بھی ایک قبیلہ کا نام ہے، اس قبیلہ کے لوگوں نے چونکہ لڑائی کے بغیر

اسلام قبول کرلیا تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے حق میں یہ دُعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس قبیلہ کے لوگوں کو سلامت رکھے، اس قبیلہ کے بارے میں مذکورہ جملہ بھی جملہ خبریہ کا احتمال رکھتا ہے، یعنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ کے ذریعہ خبر دی ہو کہ یہ وہ قبیلہ ہے جس نے مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کو پسند نہیں کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس قبیلہ کے لوگوں کو قتل و تباہی سے سلامت و محفوظ رکھا۔

(مجمع بحار الانوار ج ۴ ص ۵۰)

''عُصَیَّہ'' یہ اس بدنصیب قبیلہ کا نام ہے جس نے مسلمان قاریوں کو بیر معونہ پر مکروفریب کے ذریعہ بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کردیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر بڑا رنج اور دُکھ ہوا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم قنوت میں اس قبیلہ کے لوگوں پر لعنت اور بددُعا فرمایا کرتے تھے، اس قبیلہ کے حق میں مذکورہ حدیث کے الفاظ صرف جملہ خبریہ کہ طور پر ہیں، ان میں جملہٴ دعائیہ کا کوئی احتمال نہیں ہے، تاہم ان الفاظ میں اس قبیلہ کا ذکر جس طرح شکوہ کو ظاہر کرتا ہے وہ بجائے خود بددُعا کو مستلزم ہے، لیکن اس مفہوم میں نہیں کہ اہل قبیلہ گناہ و معصیت میں زیادہ سے زیادہ مبتلا ہوں بلکہ اس مفہوم میں کہ قبیلے والوں نے جس عظیم معصیت اور سرکشی کا ارتکاب کیا، اس پر ان کو دنیا و آخرت میں ذلت و خواری نصیب ہو۔

(دیکھیے: مجمع بحار الانوار ج ۴ ص ۵۰ و ج ۳ ص ۱۰۸ و ص ۶۱۵، مظاہر حق ج ۵ ص ۲۰۷)

(۲۳۲) محمد بن یعقوب رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے والد سے یہ بیان کرتے ہوئے سُنا کہ اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: آپؐ کے ہاتھ پر (قبیلۂ) اسلم، غفار اور مزینہ، جو حاجیوں کا سامان چوری کرنے والے ہیں، نے بیعت کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے بتلاؤ! اگر (قبیلۂ) اسلم، غفار اور مزینہ، بنو تمیم، بنو عامر، اسد اور غطفان سے بہتر ہوں تو کیا پھر بھی وہ ناکام اور نامراد ہوں گے؟! انہوں نے کہا جی ہاں: آپؐ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، یہ ان سے بہت بہتر ہیں'' (صحیح مسلم)

فائدہ:

بنواسد اور غطفان بھی دو قبیلوں کے نام ہیں، یہ دونوں قبیلے آپس میں ایک دوسرے کے حلیف تھے اور جیسا کہ اس زمانہ میں عرب کا دستور تھا، ان دونوں نے ایک دوسرے کے سامنے قسم کھا کر عہد و پیمان کر رکھا تھا کہ باہم دگر مددگار و معین رہیں گے۔

''اَسَد'' یمن کے ایک قبیلہ کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہے اور یہ قبیلہ اسی کے نام سے مشہور و متعارف ہوا۔ اسی قبیلہ کو ''ازد'' اور ''از دشنوہ'' بھی کہا جاتا ہے، تمام انصار مدینہ اسی قبیلہ سے نسلی تعلق رکھتے تھے۔ حدیث میں مذکورہ قبیلوں کو اس لیے بہتر فرمایا کہ ان قبائل کے لوگوں نے قبول اسلام میں سبقت کا شرف حاصل کیا اور اپنے اچھے احوال و معاملات کا قابلِ تحسین مظاہرہ کیا۔ (مظاہر حق ج ۵ ص ۶۰۸، ۶۰۹ مختصراً)

(۳۰) قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی اور سہولت

(۲۳۳) حضرت ابیؓ بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنو غفار کے تالاب کے پاس تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام، آپؐ کے پاس آئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دے رہے ہیں کہ آپؐ اپنی امت کو ایک طریقہ سے قرآن مجید پڑھائیں، آپؐ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے عفو و مغفرت کا طلبگار ہوں، میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، حضرت جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تیسری مرتبہ آئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دے رہے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو تین طریقوں سے قرآن مجید پڑھائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے عفو و مغفرت کا طلبگار ہوں، میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، پھر وہ چوتھی مرتبہ آئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہے ہیں کہ آپؐ اپنی امت کو سات طریقوں سے قرآن مجید پڑھائیں، وہ ان میں سے جس طریقہ سے بھی پڑھیں گے درست ہوگا۔"

(سُنن النسائی. باب جامع. ماجاء فی القرآن، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم ص ۳۵)۔

فائدہ:

دنیا کی ہر زبان میں فصاحت و بلاغت اور لب ولہجہ کے اعتبار سے مختلف اسلوب اور مختلف لغات ہوتے ہیں، اسی طرح عربی زبان کی بھی سات لغاتِ عرب مشہور تھیں، اس کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ قرآنِ کریم کو سات طریقوں یعنی سات لغات کے مطابق پڑھو، ان سات لغات کی تفصیل اس طرح ہے، لغتِ قریش، لغتِ ہوازن، لغتِ اہل یمن، لغتِ ثقیف، لغتِ ہذیل اور لغتِ بنوتمیم، قرآن کریم سب سے پہلے قریش کی لغت کے مطابق نازل ہوا تھا، جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لغت تھی، لیکن جب تمام عرب میں اس لغت کے مطابق قرآن کریم کا پڑھا جانا اس بناء پر دشوار اور مشکل ہوا کہ ہر قبیلہ اور ہر قوم کی اپنی ایک مستقل لغت اور زبان کے لب ولہجہ کا الگ الگ انداز تھا تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ الوہیت میں درخواست پیش کی کہ اس سلسلہ میں وسعت بخشی

جائے تو حکم دے دیا گیا کہ ہر شخص قرآن مجید کو اپنی لغت کے مطابق پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک اسی طرح سلسلہ چلتا رہا اور لوگ اپنی اپنی لغت کے اعتبار سے قرآن کریم پڑھتے رہے، لیکن جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کلام اللہ کو جمع کیا اور اس کی کتابت کرا کرا اسلامی سلطنت کے ہر ہر خطہ میں اُسے بھیجا تو انہوں نے اسی لغت کو مستقل قرار دیا جس پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے قرآن کریم کو جمع کیا تھا اور وہ لغت قریش تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یہ حکم بھی فرمایا کہ تمام لغات منسوخ کر دی جائیں۔ صرف اسی ایک لغت کو باقی رکھا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حکم کی وجہ سے ایک بڑے فتنہ کی جڑ ختم کر دی گئی۔ اور فتنہ یہ تھا کہ لغات کے اختلاف کی وجہ سے مسلمان آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے تھے، اور نوبت بایں جا رسید کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنی لغت کے خلاف قرآن مجید پڑھتا دیکھتا تو یہ سمجھ کر کہ صرف میرے قبیلہ ہی کی لغت صحیح ہے، اسے کافر کہہ دیا کرتا تھا، چنانچہ لغت قریش کے علاوہ جس پر قرآن نازل ہوا تھا، بقیہ تمام لغات ختم کر دی گئیں، اور اگر کوئی لغت باقی بھی رہی تو وہی رہی جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق رہا اور جو سندِ متصل اور تواتر کے ساتھ آخر میں قراءِ سبعہ تک پہنچی۔ اس کے علاوہ لغت میں مکرر یعنی امالہ وادغام وغیرہ کا اختلاف بھی باقی رہا، جو آج تک قراء سبعہ میں موجود ہے۔ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ سات طریقوں سے وہ سات قرائتیں مراد ہیں جو قراء سبعہ پڑھتے ہیں، پھر علماء یہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ قراءتیں سات سے زیادہ ہیں، لیکن یہاں سات کی تحدید اس لیے کی گئی ہے کہ اختلاف کی بھی سات ہی قسمیں ہیں، جن کی طرف یہ سات قرائتیں راجع ہیں، جیسے (۱) کلمہ کی ذات میں اختلاف، یعنی کلمہ میں کمی وزیادتی کا اختلاف۔ (۲) مفرد اور جمع کا اختلاف، (۳) مذکر اور مؤنث کا اختلاف، (۴) صرفی اختلاف یعنی تخفیف وتشدید اور فتح وکسرہ وغیرہ کا اختلاف، جیسے مَيِّتٌ اور مَيْتٌ، يَقْنَطُ اور يَقْنِطُ (۵) اعراب کا اختلاف (۶) حروف کا اختلاف، جیسے لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ میں نون کی تشدید اور تخفیف (۷) ادائیگی لغات کا اختلاف، جیسے تفخیم اور امالہ وغیرہ (مظاہر حق ج ۱ ص ۴۵۴)

اور "مسلم" کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ "جتنی مرتبہ ہم نے

آپ ﷺ کو حکم دیا ہے اتنی ہی مرتبہ آپ ﷺ ہم سے دُعا مانگیئے، ہم اسے قبول کریں گے، چنانچہ میں نے بارگاہِ اُلوہیت میں دو مرتبہ یہ دعا کی "اے اللہ! میری امّت میں سے کبیرہ گناہ کرنیوالوں کو بخش دے، اے اللہ! میری امت میں سے صغیرہ گناہ کرنے والوں کو بخش دے، اور تیسری دعا میں نے اس دن کیلئے رکھ چھوڑی ہے جس دن مخلوق مجھ سے سفارش و شفاعت کی خواہش کرے گی، یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی مجھ سے شفاعت کی خواہش کریں گے"۔ (بحوالہ مشکوٰۃ اللصابیع ص ۱۹۲)

اس ارشادِ ربانی کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے آپ ﷺ کو تین مرتبہ حکم دیا، یعنی ایک مرتبہ تو ایک قرأت کے مطابق، دوسری مرتبہ دو قرأت کے مطابق اور تیسری مرتبہ سات قرأتوں کے مطابق قرآن کریم پڑھنے کا حکم دیا۔ اب آپؐ ان تینوں مرتبہ کے عوض ہم سے تین سوال کیجئے، تا کہ ہم تینوں کو پورا کریں، چنانچہ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں سوال اپنی امت کی مغفرت کیلئے ہی کیے، کیونکہ اصل چیز تو مغفرت ہی ہے، اگر مغفرت نہ ہو تو کسی کی نجات ممکن نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ" "(اے اللہ) تو اگر ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو بلاشبہ ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہوں گے"۔

لیکن آنحضورؐ نے اس موقع پر مغفرت کو تین زمروں میں تقسیم کیا، دو مغفرت تو آپؐ نے اپنی امت کیلئے یعنی گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کرنے والوں کیلئے چاہی، اور تیسری مغفرت کو تمام ہی مخلوق کیلئے قیامت کے دن پر چھوڑا، اسی کو "شفاعت کبریٰ" کہتے ہیں، یعنی قیامت کے روز جب سب ہی نفسی نفسی کہتے ہوں گے اور کوئی بھی نبی اور پیغمبر مخلوق خدا کی شفاعت کی جرأت نہیں کر پائے گا تو آخر کار شافع روز محشر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی جائے گی کہ آپؐ پروردگارِ عالم کے حضور مخلوقِ خدا کی شفاعت کیجئے، چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب کی شفاعت کریں گے، اس طرح وہ تیسری دُعا جس کی قبولیت کا وعدہ بارگاہِ رب العزت سے اس وقت کیا گیا تھا اور جسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آج کیلئے رکھ چھوڑا تھا وہ اس موقع پر کام آئے گی۔

اگرچہ پوری مخلوق یہاں تک کہ تمام ہی انبیائے کرام علیہم السلام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی آرزو و خواہش کرینگے، لیکن اس جگہ (مشکوٰۃ کی حدیث میں) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام بطورِ خاص اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تمام انبیاء کرامؑ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہیں۔

اختلافِ قرأت سے دینی احکام پر اثر نہیں پڑتا:

اور ''بخاری و مسلم'' کی ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت جبریلؑ نے پہلی مرتبہ مجھے ایک قرأت یعنی ایک لہجہ پر قرآن پڑھایا، پھر میں نے اپنی امت کی آسانی کیلئے خدا کی طرف مراجعت کی اور میں آسانی میں برابر زیادتی طلب کرتا رہا، جس کے نتیجہ میں مجھے زیادہ آسانی حاصل ہوتی رہی، یہاں تک کہ سات قرأتوں تک نوبت پہنچ گئی اور یہ آخری فیصلہ دے دیا گیا کہ قرآن کریم سات لغات پر پڑھا جا سکتا ہے اور (حدیث کے راوی) ابنِ شہاب زہریؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ یہ بات مجھ تک تحقیقی طور پر پہنچی ہے کہ قرأت کے یہ سات طریقے دینی احکام و امور میں متفق و متحد ہیں، حلال و حرام میں ان سے کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔ (بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۹۲)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف قرأت سے قرآن حکیم میں مذکور احکام و مسائل میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا، یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ قرآن کی اگر کوئی آیت کسی ایک قرأت سے پڑھی جائے اور اس آیت میں کسی چیز کے حلال ہونے کا ذکر موجود ہو اور پھر جب وہی آیت دوسری قرأت سے پڑھی جائے تو اس اختلاف قرأت سے حکم میں تغیر ہو جائے، اور وہی چیز جو پہلی قرأت سے حلال ثابت ہو رہی تھی اب دوسری قرأت کی بناء پر حرام ہو جائے، ایسا نہیں ہوتا، بلکہ ایک قرأت سے کسی چیز کے حلال ہونے کا حکم ثابت ہوتا ہے تو دوسری قرأت سے بھی اس چیز کے حلال ہونے کا ہی حکم ثابت ہوتا ہے۔

حاصل یہ کہ اختلاف قرأت کا تعلق صرف الفاظ، لہجہ اور صوت سے ہے۔ احکام و معانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ (مستفاداز مظاہر حق ج ۲ ص ۴۵۴)

(۲۳۴) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین

آدمی ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں، ایک وہ شخص جو کسی قوم کے پاس آئے اوران سے اللہ تعالیٰ کے نام پر سوال کرے، ان کی اس سے کوئی قرابت ورشتہ داری نہ ہواور وہ لوگ اسے منع کردیں، ان میں سے ایک آدمی چپکے سے پیچھے ہوکر اسے پوشیدہ طور پر دیدے۔ اس کے اس عمل کی خبر اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور جس کو اس نے دیا ہے، کسی اور کو نہ ہو، اور ایک وہ قوم جو ساری رات چلی ہو، اور پھر جب سونا ان کو اور دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوگیا ہو، تو وہ ایک جگہ پر اتریں اور سر رکھ کر لیٹ جائیں، ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوکر مجھ سے خوشامد کرنے لگے اور میری آیات تلاوت کرنے لگے، اور ایک وہ شخص جو کسی جنگ میں ہو، ان کا دشمن سے مقابلہ ہوا ہو اور (سارے) شکست کھا گئے ہوں (مگر) یہ سینہ تان کر لڑے اور شہید ہوجائے یا اسے فتح حاصل ہوجائے''

(سُنن النسائی، باب فضل صلوٰۃ اللیل فی السفر ج ۳ ص ۲۰۷)

فائدہ:

اس حدیث پاک میں تین ایسے اشخاص کا ذکر ہے جن سے اللہ تعالیٰ خصوصی طور پر محبت فرماتے ہیں، اور جن کو اپنی رحمت سے نوازتے ہیں۔ اور اس حدیث میں (دراصل) ان عمدہ صفات کو اختیار کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ وہ تین اشخاص یہ ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کیلئے پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کرنے والا، **سبعة بظلهم الله تعالٰی في ظله** (سات اشخاص جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دیں گے) والی حدیث میں ایک شخص اس کو بھی شمار کیا گیا ہے جو انتہائی پوشیدہ طریقہ سے صدقہ و خیرات کرتا ہو۔ (۲) جب لوگ خواب غفلت میں پڑے ہوں اور نرم و گداز بستر پر سو رہے ہوں، اس وقت جو شخص نماز تہجد اور عبادت و تلاوت میں مشغول ہوجائے، بالخصوص جب طویل سفر طے کرکے آیا ہو، اور تھکا ماندہ ہو۔ (۳) ساتھیوں کے شکست خوردہ ہونے کے وقت جو شخص سینہ سپر ہوکر جوانمردی سے لڑتا ہو، اور بالآخر شہادت کے عظیم مرتبہ سے نوازا جائے، یا فتح یاب ہوکر واپس لوٹے۔

(۲۳۵) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''دریں اثناء کہ ایک روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند کا ایک

جھونکا آیا، پھر آپ ﷺ نے مسکراتے ہوئے اپنا سر مبارک اٹھایا، ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ ﷺ کو کس چیز نے ہنسادیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے: بسم اللّٰہ الرّحمن الرحیم ''اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ. فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ. اِنَّ شَانِئَکَ هُوَالْاَبْتَرُ'' (سورۃ الکوثر) ''ہم نے آپ ﷺ کو خیر کثیر عطا کی ہے، پس آپؐ اپنے رب کی نماز پڑھیئے اور قربانی کیجئے، بلاشبہ آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہوکر رہے گا''۔

پھر آپؐ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ کوثر کیا ہے؟ ہم نے کہا، اللہ اور اس کے رسولؐ خوب جانتے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''یہ جنت میں ایک نہر ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اس کے برتن ستاروں کی تعداد سے بھی زیادہ ہیں، اس پر میری امت میرے پاس آئے گی، کچھ لوگوں کو زبردستی ہٹادیا جائے گا، میں کہوں گا: ''اے میرے رب! یہ میری امت میں سے ہیں، (اللہ تعالیٰ) فرمائیں گے: ''آپ ﷺ کو معلوم نہیں کہ اس نے آپؐ کے بعد کیا کیا نئی چیزیں نکالی تھیں'' (سنن النسائی، باب قراۃ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ج ۲ ص ۱۳۳ مشکوٰۃ المصابیح، باب الحشر ص ۴۸۳)

''کوثر'' سے کیا مراد ہے؟:

''کوثر'' سے مراد کے بارے میں مفسرین کرام کے تقریباً پندرہ اقوال ہیں۔ سب سے زیادہ معروف دوقول ہیں، اول یہ کہ اس سے مراد حوضِ کوثر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگا اور آپؐ اس سے اپنی امت کے لوگوں کو سیراب کریں گے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہوگا، قیامت کے دن آپ ﷺ کو حوضِ کوثر کا ملنا متواتر احادیث سے ثابت ہے، دوم یہ کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے جو دین و دنیا کا کوثر ہے اور دین و دنیا کی خیر کثیر کا سرچشمہ ہے، یا پھر ''کوثر'' سے مراد خیر کثیر یعنی ''بے شمار بھلائیاں اور نعمت کی کثرت'' ہے، جو پروردگار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہے۔ اس میں نبوّت و رسالت، قرآن کریم اور علم و حکمت کی نعمتیں بھی شامل ہیں، اور امت کی کثرت اور وہ تمام مراتب عالیہ بھی شامل ہیں جن میں ایک بہت بڑی نعمت آپ کو

آخرت میں مقام محمود، لوائے ممدود اور مذکورہ حوض کا عطا کیا جانا ہے، اس اعتبار سے اس بارہ میں کوئی منافات نہیں ہے کہ ''کوثر'' سے مراد ''حوض کوثر'' ہے یا ''خیر کثیر''، کیونکہ خیر کثیر مراد ہونے کی صورت میں بشمول حوضِ کوثر، تمام ہی نعمتیں اور بھلائیاں اس میں شامل ہو جائیں گی۔ بعض مفسرین نے ''کوثر'' سے مراد اولاد اور علماء امت لکھا ہے لیکن یہ قول بھی ''خیر کثیر'' کے قول کے منافی نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں (اولاد اور علماء امت) بھی خیر کثیر ہی میں داخل ہیں، اور یہ قول (یعنی کوثر سے خیر کثیر مراد ہونے کا) امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ ''کوثر'' کی مراد میں پندرہ اقوال ہیں، اب یہاں افادۂ عام کی خاطر وہ اقوال لکھے جاتے ہیں۔ (۱) جنت میں ایک نہر کا نام ہے، اور یہ قول بہت مشہور بھی ہے اور اسلاف و اخلاف سے مستفاض ہے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں (معراج کی رات) جنت کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک میرا گزر ایک نہر پر ہوا جس کے دونوں اطراف موتیوں کے گنبد تھے، میں نے پوچھا کہ جبریلؑ! یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ وہ کوثر ہے جو آپ کو آپؐ کے پروردگار نے عطا کی ہے، پھر جو میں نے دیکھا تو اس کی مٹی تیز خوشبودار مُشک کی مانند تھی'' (بخاری) (۲) حوضِ کوثر، (۳) اولاد، (۴) علماء امت، (۵) نبوت و رسالت، (۶) قرآن حکیم، (۷) دین اسلام، (۸) کثرت اتباع، (۹) فضائل کثیرہ وعظیمہ، (۱۰) رفعتِ ذکر، (۱۱) علم، (۱۲) حسن خُلق، (۱۳) مقامِ محمود، (۱۴) سورۃ الکوثر، (۱۵) وہ تمام نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائیں یعنی خیر کثیر۔

(تفصیل کیلئے دیکھیے: تفسیر کبیر ج ۸، ص ۴۹۸ تا ص ۵۰۱ مختصراً)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے فتاوی میں ''خیر کثیر'' کی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے (مجموع فتاوی ابن تیمیة، کتاب التفسیر ۱۶/ ۵۲۷، ۵۲۸ سورة الکوثر)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ''کوثر'' کے متعلق تفسیر ''البحر المحیط'' (۸/۵۱۹) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس میں ''کوثر'' کے متعلق چھبیس (۲۶) اقوال ذکر کیے ہیں اور آخیر

میں ترجیح اس کو دی ہے کہ اس لفظ کے تحت ہر قسم کی دنیوی واخروی نعمتیں داخل ہیں۔

لیکن تفسیر ''البحر المحیط'' میں کوثر کے متعلق تقریباً نو قول ذکر کیے ہیں، اور ''نہرِ جنت'' کی تفسیر کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے، البتہ انہوں نے لکھا ہے کہ ''التحریر'' میں ''کوثر'' کے متعلق چھبیس اقوال مذکور ہیں۔

(دیکھیے: تفسیر عثمانی ص ۸۰۴)۔ واللّٰہ اعلم

بعض روایات میں اس کا محشر میں ہونا اور اکثر روایات سے جنت میں ہونا ثابت ہوتا ہے، اکثر علماء نے ان میں یوں تطبیق دی ہے کہ اصل نہر جنت میں ہوگی اور اسی کا پانی میدانِ حشر میں لاکر کسی حوض میں جمع کر دیا جائے گا، دونوں کو ''کوثر'' ہی کہتے ہوں گے۔

(تفسیر عثمانی)

جبکہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نہر کی تفسیر حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منصوص ہے، اسی لیے اسے راجح قرار دیا جائے گا۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ۱۹/ ۷۳۲)

مذکورہ بالا حدیث (۲۳۵) میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ حوض کوثر کی طرف آئیں گے لیکن ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حوض کوثر سے دور رکھا جائے گا! ان کے بارے میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ وہ کون لوگ ہونگے؟ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمان ہو گئے تھے اور جب تک آپؐ اس دنیا میں رہے۔ مسلمان ہی رہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ مختلف گمراہ کن تحریکوں، جیسے مسیلمہ کذاب کے جھوٹے دعویٰ نبوت وغیرہ کا شکار ہو کر اسلام سے روگردانی اختیار کر گئے تھے۔ پس اس حدیث کا مفہوم وہی ہے جو ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''قیامت کے دن میدان حشر میں جب میں اپنے کچھ لوگوں کو دوزخ کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھوں گا تو کہوں گا کہ ''یہ تو میرے صحابہ ہیں، یہ تو میرے صحابہ ہیں!؟ لیکن پھر مجھے یہ بتایا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو آپؐ کے سامنے مسلمان تھے، لیکن آپؐ کے بعد اسلام سے پھر گئے تھے''، یعنی حدیث میں ''صحابہ'' سے مراد وہ صحابہ نہیں ہیں

جن کو آپؐ کی زندگی میں بھی اور آپؐ کی وفات کے بعد بھی آپؐ سے نسبت حاصل رہی، اور جن کو حقیقت میں ''صحابہ رضی اللہ عنہم'' کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے بارے میں یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان میں سے کوئی بھی صحابی مرتد نہیں ہوا، اور نہ کسی نے عقیدہ وعمل کی کوئی ایسی گمراہی اختیار کی جس کی بناء پر انہیں دوزخی کہا جا سکے۔ لہٰذا اس سے مراد وہ اجڈ دیہاتی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے لیکن آپؐ کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب وغیرہ کی اتباع کرنے کے سبب مرتد ہو گئے تھے۔

ایک احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ لوگوں سے مراد ''اہل بدعت'' ہوں جو دین میں نئی نئی باتیں نکالتے ہیں، لیکن یہ بات چونکہ ثابت ہے کہ اس امت کا کوئی بھی گنہگار، خواہ اس کا گناہ کتنا ہی بڑا ہو، حوض کوثر پر آنے اور اس کا پانی پینے سے روکا نہیں جائے گا، اس لیے یہ احتمال سرے سے رد ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر ''بدعت'' کا تعلق دین وملت میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرنے سے ہو جس سے اصولِ دین کی نفی ہوتی ہو اور نبوت و شریعت پر براہ راست اس طرح کی زد پڑتی ہو کہ اس پر کفر کا اطلاق ہو جائے تو اس درجہ کے اہل بدعت یقیناً مرتد ہی کہلائیں گے اور ان لوگوں کو اس حدیث کا محمل قرار دیا جا سکتا ہے۔

(مستفاض از مظاہر حق متفرقاً ج ۵ ص ۱۲۳ و ص ۱۶۰)

(۲۳۶) حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم (صحابہ کے پاس) تشریف لائے اور اس وقت آپؐ کے چہرۂ مبارک پر بشاشت کھیل رہی تھی، آپؐ نے (صحابہ رضی اللہ عنہم کے دریافت کرنے کے بعد یا دریافت کرنے سے پہلے ہی) فرمایا: ''میرے پاس حضرت جبرئیل آئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پروردگار فرماتا ہے کہ اے محمدؐ! کیا آپؐ اس بات سے راضی نہیں ہیں کہ آپؐ کی امت میں سے جو کوئی آپؐ پر درود بھیجے گا میں اس پر دس مرتبہ رحمت نازل کروں گا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے جو کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجے گا میں اس پر دس مرتبہ سلام بھیجوں گا''۔ (سُنن النسائی، باب فضل التسلیم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج ۳ ص ۴۴، مشکوٰۃ المصابیح، باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفضلها ص ۸۶)

فائدہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اپنی امت کے حق میں انتہائی مشفق ومہربان تھے، اور امت کیلئے خیر کی طلب آپ کی انتہائی غرض وخواہش تھی۔ اس لیے جب آپ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ یہ عظیم بشارت دی گئی تو آپ کا چہرۂ مبارک خوشی ومسرت سے کھل اٹھا اور آپ نے یہ عظیم بشارت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے واسطے سے پوری امت تک پہنچادی۔ (مظاہر حق ج ۱ ص ۶۲۰)

لغوی طور پر ''صلوٰۃ'' کے معنی دعاء رحمت اور استغفار کے ہیں، اور درود کا مطلب ہے بندوں کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اللہ جل شانہ کی ایسی رحمت کو طلب کرنا جو دنیا وآخرت کی بھلائی کو شامل ہو۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام یعنی درود بھیجنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً'' ''اے ایمان والو! ان (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) پر سلام ورحمت بھیجو''۔

علماءِ امّت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم وجوب کیلئے ہے، چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ جتنی مرتبہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک سُنا جائے ہر ہر بار درود بھیجا جائے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ جس طرح پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی گواہی دینا فرض ہے اسی طرح پوری عمر میں صرف ایک مرتبہ آپ پر درود بھیجنا فرض ہے۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ درود بھیجنا مستحب ومسنون اور شعائر اسلام میں سے ہے، جس پر بے حد وحساب اجر وثواب کا وعدہ ہے۔

قاضی ابوبکر رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے مومنین پر فرض کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجا جائے، اور چونکہ اس سلسلہ میں کوئی خاص وقت متعین نہیں کیا ہے اس لیے واجب ہے کہ درود وسلام زیادہ سے زیادہ بھیجا جائے اور اس میں غفلت نہ برتی جائے''۔ لیکن بعض حضرات نے قاضی ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے مقابلہ میں پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔

علماء کے ہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ انبیائے کرام کے علاوہ دوسرے لوگوں کے ناموں کے ساتھ صلوٰۃ وسلام کے الفاظ استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً آنحضرت ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے اسماء کے ساتھ علیہ السلام کے الفاظ بولے اور لکھے جاتے ہیں تو اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے نام کے ساتھ ان الفاظ کا استعمال جائز ہوگا یا نہیں؟ چنانچہ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ ''ان الفاظ کا استعمال صرف انبیائے کرام کیلئے مخصوص ہے، ان کے علاوہ کسی دوسرے شخص کیلئے ان الفاظ کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ دوسرے لوگوں کے اسماء کے ساتھ غفر اللّٰہ، رحمہ اللّٰہ اور دوسرے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ انبیاء کرام کے علاوہ دوسرے لوگوں پر درود بھیجنا خلاف اولیٰ ہے، بعض حضرات نے حرام اور مکروہ بھی کہا ہے۔ اس مسئلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ ''غیر انبیاء اور ملائکہ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا ابتداءً اور مستقلاً مکروہ تنزیہی ہے، کیونکہ یہ اہل بدعت کا شعار ہے، البتہ انبیاء کے ساتھ (تبعاً) ان پر بھیجنا جائز ہے، مثلاً اس طرح کہا جاسکتا ہے، صلی اللّٰہ علی محمد وعلیٰ اٰلہ و اصحابہ وسلم، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کی آل واولاد پر اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر اللہ کی رحمت و برکت ہو''۔ (مظاہر حق ج ا ص ۲۱۳)

حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی فضیلت:

(۲۳۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت جبرائیلؑ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور بولے کہ یارسول اللہ! ابھی خدیجہ رضی اللہ عنہا (مکہ سے چل کر غارِ حرا میں) آرہی ہیں، ان کے پاس ایک برتن ہے جس میں سالن یا کھانا ہے، جب وہ آپؐ کے پاس پہنچ جائیں تو آپؐ ان کے پروردگار کی طرف سے اور میری طرف سے بھی ان کو سلام کہہ دیجئے، اور ان کو جنت میں ایک محل کی خوشخبری سنا دیجئے جو خولدار موتی کا ہے، اور اس محل میں نہ شوروغل ہے، نہ تکلیف وتکان ہے''۔ (صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ تعالیٰ، یریدون ان یبدلوا کلام اللّٰہ ج۹ ص ۱۴۴، مشکوٰۃ المصابیح، باب مناقب ازواج النبی ﷺ ص ۵۷۳)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو کتاب المناقب، باب تزویج النبی ﷺ خدیجة وفضلها کے تحت بھی اور باب مناقب خدیجة وبشارتها بیت فی الجنة کے تحت بھی ذکر کیا ہے۔

فائدہ:

ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، خویلد بن اسد کی بیٹی ہیں، جو عرب کے مشہور تاجر اور قریش کے معزز اور نامور فرد تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح ابن ہالہ بن زرارہ سے ہوا تھا، اس کے فوت ہوجانے کے بعد دوسرا نکاح عتیق بن عائذ سے ہوا تھا۔

ان کا تیسرا نکاح جب آنحضرت ﷺ سے ہوا تو اس وقت ان کی عمر چالیس برس تھی، اور نبی کریم ﷺ کا یہ پہلا نکاح تھا، آپؐ نے نہ تو ان سے پہلے کسی عورت سے نکاح کیا تھا اور نہ ان کی موجودگی میں کسی اور سے نکاح کیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اول مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہے، یعنی تمام مردوں اور عورتوں میں سب سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا، ان کا انتقال بعمر ۶۵ سال آنحضرت ﷺ کی ہجرت مدینہ سے پانچ سال قبل مکہ معظمہ میں ہوا۔ بعض حضرات نے ان کا سن وفات ہجرت سے چار سال قبل اور بعض نے تین سال قبل یعنی ۱۰ نبوی لکھا ہے۔

آنحضرت ﷺ سے ان کی رفاقت کی مدت ۲۴ سال چھ ماہ یا پانچ ماہ ہے۔

مذکورہ حدیث میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے یہ اس زمانہ کا ہے جب آنحضرت ﷺ خلوت کے لئے غارِ حراء چلے جاتے تھے اور کئی کئی دن تک وہاں عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے، آپ ﷺ اپنے ساتھ کھانے پینے کی کچھ چیزیں (جیسے ستو اور پانی وغیرہ) لے لیتے تھے، تاکہ بھوک اور پیاس کا غلبہ خلوت گزینی میں مخل نہ ہو، ایک دن حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ آپؐ کے کھانے پینے کا کچھ سامان خود لے کر غارِ حرا پہنچیں، اور مذکورہ سعادت وبشارت سے سرفراز ہوئیں۔

واضح رہے کہ عام طور پر ثابت تو یہی ہے کہ آں حضرت ﷺ کا خلوت گزینی کے لئے غارِ حراء میں جانا اور وہاں عبادت وذکر الٰہی میں مشغول رہنا اس زمانہ کا معمول تھا جبکہ

آپ خلعتِ نبوّت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے، اور آپ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیلؑ کا آنا جانا شروع نہیں ہوا تھا، لیکن اس میں کچھ استبعاد نہیں ہے کہ مرتبہ نبوت پر فائز ہونے اور حضرت جبرئیلؑ کی آمد شروع ہو جانے کے بعد بھی کچھ دنوں تک آپ نے یہ معمول جاری رکھا ہو، اور انہی دنوں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کسی دن آپ کا کھانا لے کر غارِ حرا میں گئی ہوں۔

''ان کو سلام کہہ دیجئے'' علماء نے لکھا ہے کہ رب العلمین کا سلام ایسا شرف ہے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سوا دنیا کی کسی عورت کو حاصل نہیں، ایک مرتبہ حضرت جبرائیلؑ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سلام کہلایا تھا لیکن صرف اپنی طرف سے نہیں۔ اسی لیے اس حدیث کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت کی دلیل قرار دیا جاتا ہے۔

''جو خول دار موتی کا ہے'' حدیث میں مذکور لفظ ''قصب'' کا اطلاق اس موتی پر ہوتا ہے جو بہت بڑا ہو اور اندر سے خالی ہو، روایتوں میں آتا ہے کہ جنت کے محلات پر جو گنبد ہوں گے وہ دراصل قبہ جیسے بڑے بڑے موتی ہوں گے، جن کے اندر خلا ہوگا۔ لہٰذا اس جملہ کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس محل کا گنبد ایک پورا موتی ہوگا۔ یا یہ کہ وہ پورا محل موتی کا ہوگا یعنی ایک اتنا بڑا موتی ہوگا جس کے اندر کا خلا ایک پورے محل پر محیط ہوگا۔

''اس محل میں نہ شور وغل ہے نہ تکلیف اور تکان ہے'' بطور خاص ان دونوں چیزوں کی نفی اس اعتبار سے کی گئی ہے کہ دنیاوی گھروں میں رہنے والوں کو دو ناگوار چیزوں کا زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے، ایک تو شور وغل کا اور دوسرے اس محنت و مشقت اور تکلیف و تکان کا جو گھروں کو بنانے، سنوارنے اور سجانے میں ہوتی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ جنت کے محلات ان ناگوار اور تکلیف دہ چیزوں سے خالی ہوں گے۔

نیز علماء نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حق میں یہ بشارت گویا اس مقام کا اعلان تھا جو ان کو اس بات کے بدلہ میں عطا ہوا کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی دعوت اسلام کو سب سے پہلے بخوشی قبول کر لیا تھا، انہوں نے خدائی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنا آبائی مذہب یک لخت اس طرح ترک کر دیا کہ نہ تو کسی طرح کا شور ہونے دیا، نہ بحث و تکرار اور لڑنے جھگڑنے کے تعب میں پڑیں۔ (مظاہر حق ج ۵ ص ۷۹۷، ۷۹۸)

(۳۱) ﴿ریاکاری کی مذمت اور مخلصانہ عمل کی ترغیب﴾

(۲۳۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک کے بارہ تمام شرکاء سے نہایت زیادہ بے نیاز ہوں، جو شخص کوئی ایسا عمل کرے کہ جس میں وہ میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک کرلے تو میں اس شخص کو شرک کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہوں، اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: تو میں اس سے بے نیازی اور بے زاری ظاہر کرتا ہوں، وہ شخص (یا اس کا وہ عمل) اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے وہ عمل کیا ہے" (سنن ابن ماجه ج۲ ص ۲۸۵، باب الرياء والسمعة، مشكوٰة المصابيح، باب الرياء والسمعة ۴۵۴)

اس حدیث کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی صحیح میں باب تحريم الرياء ج۱۰ ص ۴۴۳ پر نقل کیا ہے۔

فائدہ:

"میں شرک کے بارہ تمام شرکاء سے نہایت زیادہ بے نیاز ہوں" مطلب یہ ہے کہ دنیا کا جیسے دستور ہے کہ لوگ اپنے معاملات اور کاروبار میں ایک دوسرے کے اشتراک وتعاون کے محتاج ہوتے ہیں، اور آپس میں ایک دوسرے کے شریک بنتے ہیں، نیز وہ اس شرکت وتعاون پر راضی اور مطمئن ہوتے ہیں، اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان اس درجہ کی مفاہمت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک شریک متعلقہ معاملات وکاروبار میں اپنا پورا عمل دخل رکھتا ہے، لیکن میرا معاملہ بالکل جداگانہ ہے کہ میں علی الاطلاق خالق وحاکم ہوں" احکام وفیصلے اور اپنے نظام قدرت میں نہ تو مجھے کسی کے تعاون واشتراک کی حاجت وضرورت ہے، اور نہ مجھے یہ گوارا ہے کہ میرے بندے کسی کو میرا شریک قرار دیں، اور میرے کئے جانے والے کسی بھی عمل میں میرے علاوہ کسی اور کو مدِ نظر رکھیں، یہاں تک کہ میرے نزدیک ان کے صرف اسی عمل کا اعتبار ہے جو وہ خالص طور پر میرے لئے کریں۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ذکر شرکاء کے ضمن میں کرنا یعنی خود اپنے کو ایک ''شریک'' کے ساتھ تعبیر کرنا محض ان بندوں کے اعتبار سے ہے جو اپنے جہل اور اپنی نادانی کی وجہ سے اس کی ذات وصفات اور اس کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرتے ہیں، اور اس طرح وہ خدا کو بھی ایک ''شریک'' کا درجہ دیتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اس بات سے بے نیازی اور ناخوشی کا اعلان فرمایا کہ کسی کو اس کا شریک قرار دیا جائے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ جو شخص میری طاعت وعبادت کے طور پر کوئی ایسا عمل کرے کہ جس میں وہ میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک کرلے تو میں اس شخص کو شرک کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہوں اور ایک روایت میں (ترکتہ وشرکہ) کے بجائے یہ الفاظ ہیں: ''فانا منه بری ء'' ھو للذی عمله یعنی میں اس سے بے نیاز اور بے زار ہوں، وہ شخص یا اس کا عمل اسی کے لئے ہے جس کیلئے اس نے وہ عمل کیا ہے۔

اس حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خالص ریاکاری کے جذبہ سے کیا جانے والا عمل تو باطل ہو ہی جاتا ہے، لیکن وہ عمل بھی فوت ہو جاتا ہے جس میں ریا کی آمیزش اور اس کا دخل ہو جائے۔ لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ حکم اس عمل کے بارے میں ہوگا جو ریاکاری کی ان دو قسموں سے تعلق رکھے کہ یا تو اس عمل کو اختیار کرنے میں سرے سے ثواب کی نیت ہی نہ ہو یا ثواب کی نیت تو ہو مگر ریا کا قصد وارادہ اس نیت پر غالب ہو۔

نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث کا اصل مقصد خدا کے لئے کئے جانے والے کسی بھی عمل کو ریا کی آمیزش اور اس کے دخل سے پاک رکھنے کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا اور اس کے امر سے لاپرواہی اختیار کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ تنبیہ اور سرزنش کرنا ہے۔

ریاء کی حقیقت:

ریاء کا لفظ رؤیت سے مشتق ہے، اور لغت کی معتبر کتاب ''الصراح'' میں لکھا ہے کہ ''ریاء'' کے معنی ہیں اپنے آپ کو لوگوں کی نظر میں اچھا بنا کر پیش کرنا اور ''عین

العلم ‘‘میں لکھا ہے کہ ’’ریاء‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی عبادت و نیکی کا سکہ جمانا اور اسکے ذریعہ لوگوں کی نظر میں اپنی قدر و منزلت چاہنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ’’ریاء‘‘ کا تعلق خاص طور پر ان چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے جو عبادت و نیکی کے ظاہری عمل کہلاتے ہیں، اور جو چیزیں عبادت کی قسم سے نہ ہوں جیسے کثرتِ مال و متاع، علم و ذہانت کی فراوانی، اشعار وغیرہ کا یاد رکھنا اور نشانہ بازی کی مہارت وغیرہ تو ان میں دکھاوے کے لئے کئے جانے والے کام کو ’’ریاء‘‘ نہیں کہا جاتا، بلکہ وہ افتخار و تکبر کی ایک قسم کہلاتا ہے۔ اسی طرح نیکی وعبادت کے ظاہری اعمال میں اگر کوئی کام اس صورت میں لوگوں کو دکھانے کیلئے کیا جائے جبکہ اس کا مقصد عزت وجاہ کی طلب نہ ہو، جیسا کہ بعض مشائخ اپنے مریدوں کو تلقین وتعلیم، لوگوں کے دلوں کو نیک اعمال کی طرف مائل کرنے اور ان کو اتباع و پیروی کی طرف راغب کرنے کے لئے بعض اعمال اس طرح کرتے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں تو یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے ’’ریاء‘‘ نہیں کہلائے گا، اگرچہ ظاہر میں ان کا وہ عمل ریاکاری معلوم ہو! اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ: ’’ریاء الصدیقین خیر من اخلاص المریدین‘‘ یعنی اونچے درجہ کے مشائخ اور بزرگوں کا ریاء مریدین کے اخلاص (یعنی عدم ریاکاری) سے بہتر ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ’’ریاء‘‘ اصل میں اس چیز کا نام ہے کہ کسی شخص کی ذات میں واقعۃً کوئی صفت و کمال ہو اور وہ اپنے اس واقعی وصف و کمال کو لوگوں کے سامنے نمایاں کرے اور یہ خواہش رکھے کہ لوگ اس کے اس وصف و کمال کو جانیں تاکہ ان کی نظر میں قدر و منزلت اور عزت و وقعت حاصل ہو۔

ریاء کی اقسام اور صورتیں:

(۱) ’’ریاء‘‘ کی مختلف اقسام اور صورتیں ہیں اور ان اقسام میں سب سے زیادہ بری اور نہایت قابلِ نفرین وہ قسم ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا قصد اور حصول ثواب کا ارادہ قطعاً نہ ہو، بلکہ واحد مقصد لوگوں کو دکھانا اور ان کی نظر میں قدر و منزلت حاصل کرنا ہو

ریا کاری کی یہ قسم ارذل ترین اور اللہ تعالیٰ کے سخت غضب وقہر کے نازل ہونے کا باعث ہے، اوراس صورت میں کیا جانے والا عمل قطعی باطل ہوتا ہے۔

(۲) دوسری قسم وہ صورت ہے جس میں کسی نیک عمل کرنے میں دونوں چیزیں ہوں، یعنی ارادہ ثواب بھی اور ریا کاری بھی، لیکن ریا کا پہلو غالب اور ارادہ ثواب کا پہلو مغلوب اور ضعیف ہو۔

(۳) تیسری قسم وہ صورت ہے جس میں نیک عمل کو اختیار کرنے میں دونوں چیزیں یعنی ریا کاری کا جذبہ اور حصولِ ثواب کا ارادہ برابر ہوں۔

(۴) چوتھی قسم وہ صورت ہے کہ جس میں کسی نیک عمل کو اختیار کرنے میں ثواب کے حصول کی نیت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ارادہ، راجح اور غالب ہو۔

بہر حال! حقیقت یہ ہے کہ ''ریاء'' ایک ایسا جذبہ ہے جس سے پوری طرح خلاصی نہایت دشوار ہے، اور ہر حالت میں حقیقی اخلاص کا پایا جانا بہت مشکل ہے، اسی لئے علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ کسی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر خوش ہونا ریاء کے پائے جانے کے علامت ہے، علماء نے اس کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں، لہٰذا اگر اس دقیق اور پیچیدہ مسئلہ کی تحقیق زیادہ وضاحت کے ساتھ معلوم کرنی ہو تو اہل اللہ اور عارفین کی کتابوں اور ان کے اقوال وملفوظات سے راہنمائی حاصل کرنی چاہئے، خصوصاً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''احیاء علوم الدین'' اس سلسلہ میں زیادہ بہتر طریقہ سے رہبری کر سکتی ہے۔(مظاهر حق ج ۴ ص ۸۲۴ تا ص ۸۲۸ مختصراً)

(۲۳۹) حضرت ابوسعید بن فضالہ رضی اللہ عنہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہ جس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، لوگوں کو (حساب اور جزاوسزا کیلئے) جمع فرمائے گا تو ایک اعلان کرنے والا (فرشتہ) یہ اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں کہ جس کو اس نے خدا کے لئے کیا تھا، خدا کے سوا اور کو شریک کیا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے اس عمل کا ثواب اسی غیر اللہ سے طلب کرے جس کو اس نے شریک کیا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ شرک کے بارہ، تمام شریکوں سے نہایت

زیادہ بے نیاز ہے۔"(سنن ابن ماجه، ج۲ ص ۲۸۵، باب الریاء والسمعة مشکوٰة المصابیح، باب الریاء والسمعة ص ۴۵۴)

فائدہ:

• علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حدیث میں مذکور لفظ "لیوم" میں حرف لام "جَمَعَ" (حدیث میں مذکور لفظ) سے متعلق ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو اس دن کے لئے جمع کرے گا کہ اس کا پیش آنا یقینی امر ہے اور اس دن کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اور یہ جمع کرنا اس لئے ہوگا کہ ہر ایک کو اس چیز کے مطابق جزا وسزا دے، جس کو اس نے دنیا کی زندگی میں اختیار کیا تھا۔ اس اعتبار سے (حدیث میں مذکور لفظ) "یَوْمَ الْقِیٰمَةِ" مابعد کے الفاظ کی تمہید کے طور پر ہوگا، تاہم اس کو "جَمَعَ" کا ظرف بھی قرار دیا جا سکتا ہے، اور اس کی تائید اس روایت کے الفاظ سے ہوتی ہے جو "الاستیعاب" میں نقل کی گئی ہے کہ: اذا کان یوم القیٰمة یجمع اللّٰہ الاولین والاٰخرین لیوم لاریب فیه الخ" اس صورت میں "لِیَوْمٍ" کے لفظ کو ایسا اسمِ ظاہر قرار دیا جائے گا کہ جو اسم ضمیر کی جگہ واقع ہوا ہے اور جو اس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے کہ جمع اللّٰہ الخلق یوم القیٰمة لیجز یهم فیه" یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام مخلوق کو جمع فرمائے گا تا کہ اس دن سب کو جزا اور سزا دے۔ (مظاهر حق ج۴ ص ۸۳۰)

(۲۴۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آخر زمانہ میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو دین کے نام پر دنیا کے طلب گار ہوں گے، از راہِ تملق وچاپلوسی اور اظہارِ تواضع کیلئے لوگوں (پر اثر ڈالنے) کے لئے دنبوں کی کھال کا لباس پہنیں گے، ان کی زبانیں تو **شکر** سے زیادہ شیریں ہوں گی، لیکن ان کے دل بھیڑیوں کے دل کی طرح ہوں گے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا یہ لوگ (میرے ڈھیل دینے کے سبب) مغرور ہوگئے ہیں! اور فریب میں مبتلا ہیں؟ اور کیا ان میں اتنی جرأت ہوگئی ہے! پس میں اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یقیناً ان لوگوں پر ان ہی میں سے فتنہ وبلا مسلط کروں گا اور وہ (آفات

ومصائب) بڑے سے بڑے دانشوراور عقل مند شخص کو بھی عاجز وحیران کردیں گے۔"

(جامع الترمذی، الفتن، ج۲ ص ۶۵ ، مشکوٰۃ المصابیح ، باب الریاء و السمعة ص ۴۵۴)

فائدہ:

مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ان اعمال کے ذریعہ جو آخرت کے لئے کئے جاتے ہیں، دنیا حاصل کریں گے، یا یہ کہ وہ لوگ دین کے بدلہ میں دینا کمائیں گے اور دینی واخروی مفاد ومصالح پر دنیاوی اور مادی مفاد ومنافع کو ترجیح دیں گے، اور زیادہ صحیح معنی یہ ہوں گے کہ وہ لوگ دین کا لبادہ اوڑھ کر دنیا والوں کو دھوکہ دیں گے، بایں طور کہ وہ دنیا کمانے کی خاطر اپنی ظاہری وضع قطع اور اپنے ظاہری اعمال واخلاق کا ایسا دلفریب مظاہرہ کریں گے کہ دنیا والے ان کو سچا عابد وزاہد اور دین وملت کا مخلص بہی خواہ سمجھ کر ان کے ساتھ عقیدت ومحبت رکھیں گے، اور سادہ لوح مسلمان ان کے مرید ومعتقدین بن کر ان کی مراد پوری کریں گے۔ مثلاً وہ نماز، روزہ، اور دیگر عبادات کے پابند نظر آئیں گے، موٹے جھوٹے کپڑوں کا لباس پہنیں گے، دینداروں کی سی شکل وصورت بنائیں گے، ان کی تحریر وتقریر، دین وآخرت کی تلقین وتعلیم، موعظت ونصیحت کی باتوں، ملت کی بہی خواہی، اور مسلمانوں کے مفاد اور باہمی ہمدردی وغمگساری سے پُر نظر آئے گی۔ لیکن یہ تمام تر چیزیں صدق واخلاص سے خالی، ریاء وسُمعہ کے طور پر ہوں گی، جن کا واحد مقصد مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر دنیا سمیٹنا، اور صرف ذاتی منافع حاصل کرنا ہوگا۔

پس ایسے لوگوں کی اس ریا کارانہ زندگی کے خلاف یہ خُدائی تنبیہ بیان فرمائی گئی کہ انہیں اس ناز وگھمنڈ میں ہرگز نہ رہنا چاہئے کہ ان کی یہ دھوکہ دہی ہمیشہ ہمیشہ کھڑی رہے گی، اور وہ اپنی اس ریا کارانہ زندگی کی سزا اسی دنیا میں نہیں بھگتیں گے؟ خدا قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں ان لوگوں کو ضرور مزا چکھاؤں گا، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ میرا غضب وقہر ان پر یقیناً نازل ہوگا، میں ان پر ایسے امراء وحکام مسلط کردوں گا اور ان ہی میں سے کچھ ایسے لوگ اور گروہ کردوں گا جو ان کی ناؤ کو آفات ومصائب، ذلت وخواری اور تباہی وبربادی

کے بھنور میں ڈال دیں گے، اور ان کی ریا کارانہ زندگی کا پردہ چاک کردیں گے، اور ان کو ایسے ایسے فتنوں اور بلاؤں میں مبتلا کریں گے کہ وہ نجات کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے، وہ اپنی اس خود ساختہ شان وشوکت، عزت وعظمت اور جاہ ومنصب کو بچانے کے لئے جس قدر ہاتھ پاؤں ماریں گے اسی قدر ذلت ورسوائی اور تباہی وبربادی کے حلقے ان کے گرد تنگ ہوتے جائیں گے، اور بڑے بڑے دانشور اور عقل مند لوگ بھی ان آفات ومصائب سے گلو خلاصی کا کوئی ذریعہ نہیں نکال پائیں گے۔ (مظاہر حق ج ۴ ص ۸۴۳ تا ص ۸۴۴)

(۴۴۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا: "اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جس کی زبان **شکر** سے زیادہ شیریں ہے اور جس کے دل ایلوے سے زیادہ تلخ ہیں، پس میں اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یقیناً ان پر ایسی بلائیں نازل کروں گا جو بڑے سے بڑے دانشور عقل مند شخص کو بھی حیران وعاجز بنادیں گی، تو کیا وہ لوگ مجھے دھوکہ دیتے ہیں یا مجھ پر جرأت ودلیری دکھاتے ہیں؟ (جامع الترمذی حوالہ مذکورہ)

(۴۴۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ" (المدثر: ۵۶) (وہی صاحب تقویٰ ہے اور صاحب بخشش ہے) پھر آپ نے (اس کی تفسیر کے سلسلہ میں) فرمایا کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے کہ میری شان کا تقاضہ یہ ہے کہ لوگ (میرے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے) پرہیز کریں، لہٰذا جو شخص (شرک سے) بچتا ہے تو پھر میرے لائق یہی ہوتا ہے کہ میں اسے بخش دوں۔"

(سنن ابن ماجہ، باب ما یرجیٰ من رحمة اللّٰہ یوم القیامة)

فائدہ:

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق یہی ہے کہ ان سے اور ان کے عذاب سے لوگ ڈریں، کیونکہ وہ ذات سخت پکڑ کرنے والی اور جبار وقہار ہے، جو چاہتی ہے کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کی صورت یہ ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کی

جائیں جن کی اساس اور بنیاد اللہ تعالیٰ کی توحید اور اخلاص سے نیکی وعبادت اور اس کے سامنے خشوع وخضوع کے ساتھ جھکنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس کی وحدانیت کا اقرار ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ مشرک کی مغفرت نہیں فرماتے اور اس کے علاوہ جس کو چاہیں گے معاف فرمادیں گے، اللہ تعالیٰ ہی گنہگاروں کے گناہ معاف فرماتے ہیں اور وہی اس کے اہل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے بصد عجز ونیاز دعا ہے کہ ہمارے گناہ معاف فرمادے، ہمارے عیوب کی پردہ پوشی فرمائیں، ایمان کامل نصیب بھی فرمائے اور اسی پر خاتمہ بھی فرمائے تاکہ ہمارا شماران لوگوں میں ہو جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیائے کرامؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور ان کی رفاقت بہت ہی عمدہ اور شاندار ہے۔

(۲۴۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''قیامت کے دن پہلا شخص جس پر حکم لگایا جائے گا وہ ہوگا جسے شہید کردیا گیا تھا، چنانچہ وہ پیش کیا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تونے ان نعمتوں کے شکر میں کیا کام کیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا، یہاں تک کہ شہید کردیا گیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو جھوٹا ہے، کیونکہ تو اس لئے لڑا تھا تاکہ تجھے بہادر کہا جائے، چنانچہ تجھے (بہادر) کہہ دیا گیا، پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے مُنہ کے بل کھینچا جائے، یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا، پھر وہ شخص ہوگا جس نے علم حاصل کیا، دوسروں کو تعلیم دی اور قرآن کو پڑھا، چنانچہ اسے بھی لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آجائیں گی، پھر اللہ پوچھے گا، تونے ان نعمتوں کے شکر میں کیا اعمال کیے؟ وہ کہے گا: میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھلایا اور تیرے ہی لئے قرآن پڑھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، تونے تو علم محض اس لئے حاصل کیا تھا تاکہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لئے پڑھا تھا تاکہ تجھے قاری کہا جائے، چنانچہ تجھے کہہ دیا گیا، پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے، یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے، پھر وہ شخص ہوگا جس کو اللہ نے وسعت دی اور ہر قسم کا مال عطا فرمایا، اس کو بھی لایا

جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو نعمتیں یاد دلائے گا جو اسے یاد آ جائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو نے ان (نعمتوں کے شکر) میں کیا اعمال کیے؟ وہ کہے گا: میں نے کوئی ایسی راہ نہیں چھوڑی جس میں خرچ کرنا تو پسند کرتا ہو اور تیری خوشنودی کے لئے میں نے اس میں خرچ نہ کیا ہو، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو جھوٹا ہے، تو نے خرچ اس لئے کیا تا کہ تجھے سخی کہا جائے اور تجھے (سخی) کہدیا گیا، پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے، یہاں تک کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔" (صحیح مسلم، الجهاد، باب من قاتل للرياء والسمعة استحق النار، مشكوٰة المصابيح، كتاب العلم ص ۳۳)

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس طرح کی حدیث کو باب من قاتل ليقال فلان جرىء کے تحت ذکر کیا ہے۔

فائدہ:

اعمال میں نیت کا کیا درجہ ہے؟ اور خلوص کی کتنی ضرورت ہے؟ یہ بات اس حدیث سے بخوبی واضح ہوتی ہے، بندہ کتنا بڑے سے بڑا عمل خیر کیوں نہ کرے اور بڑی سے بڑی نیکی کیوں نہ کر ڈالے لیکن اگر اس کی نیت بخیر نہیں ہے تو اس کا وہ عمل اور نیکی کسی کام نہیں آئے گی، اللہ تعالیٰ کو وہی عمل پسند ہے جس میں محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی نیت ہو، اور جذبہ اطاعت و خلوص سے بھرپور ہو، ورنہ جو بھی عمل بغیر اخلاص اور بغیر نیتِ خیر کیا جائے گا کہ چاہے وہ کتنا ہی عظیم عمل کیوں نہ ہو، بارگاہ رب الصمد سے ٹھکرا دیا جائے گا اور اس پر کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوگا، بلکہ الٹا عذابِ خداوندی میں گرفتار کیا جائے گا۔ (مظاہر حق ج ا ص ۲۳۸)

جیسا کہ (مذکورہ) حدیث سے معلوم ہوا۔ علامہ حموی کی "الاشباه والنظائر" میں لکھا ہے کہ "اخلاص ایک راز ہے۔" آپ کے اور آپ کے پروردگار کے درمیان، جس پر نہ کوئی فرشتہ مطلع ہو سکتا ہے کہ وہ اسے زیور قرطاس سے آراستہ کرے اور نہ شیطان کہ اسے فاسد اور خراب کر سکے اور نہ خواہشاتِ نفسانی کہ اسے کسی دوسرے کی طرف مائل کرے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ریا کاری کی شدید حرمت معلوم ہوتی ہے، اور اس میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن ایسا شخص سخت سزا کا مستوجب ہوگا، نیز اس حدیث میں اعمال میں اخلاص پیدا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے: جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ'' (البیّنۃ: ۵) '' حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ دین کو اسی کیلئے خالص رکھیں۔''

امام غزالی نے ''احیاء علوم الدین'' میں لکھا ہے کہ '' جاننا چاہئے! ریا حرام ہے اور ریا کار (شخص) اللہ تعالیٰ کو بڑا مبغوض اور ناپسندیدہ ہے، اس پر بہت سی آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسولؐ اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم دلالت کرتے ہیں، مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ'' یعنی ''سو ہلاکت ہے ایسے نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز سے غافل ہیں جو ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی چیز تک کو روکے رہتے ہیں۔'' (الماعون: ۴تا۷)

ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! نجات کیسے ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا کہ اس طرح کہ انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت لوگوں کی خوشنودی کے لئے نہ کرے۔ (الحدیث)

منقول ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا جس نے گردن جھکائی ہوئی تھی، آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا، اے گردن جھکانے والے! اپنی گردن اٹھاؤ، خشوع، گردن سے نہیں بلکہ دل سے ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ریا کار شخص کی تین علامتیں ہیں: جب تنہا ہوگا تو کاہل اور سست ہوگا اور جب لوگوں کے درمیان ہوگا تو خوب چست ہوگا اور جب اس کی تعریف کی جائے تو عمل میں بڑھنے لگے اور اگر مذمت ہو تو عمل میں کمی کردے۔''

کسی عارف باللہ (بزرگ شخص) کا قول ہے کہ ''ریاء'' یہ ہے کہ انسان اپنے معتاد عمل کو اس لئے ترک کردے تاکہ لوگ اسے ریاکار نہ کہیں اور لوگوں کو دکھانے کیلئے عمل

کرنا شرک ہے۔(ماخوذ از شرح النووی)

(۳۴۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کیلئے آئیں گے، ہر امت گھٹنوں کے بل کھڑی ہوگی، ان میں سب سے پہلے جسے بلائیں گے وہ ایسا شخص ہوگا جس نے قرآنِ مجید یاد کیا ہوگا، اور وہ شخص جس کو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا ہوگا، اور وہ شخص جو بہت مال دار ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ، قاری سے فرمائیں گے: کیا میں نے تجھے اس قرآن کی تعلیم نہ دی جو میں نے اپنے پیغمبرؐ پر نازل کیا تھا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں! اے میرے رب! اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: پھر تو نے جو پڑھا تھا اس پر کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا: میں اسے دن رات کے حصوں میں پڑھتا تھا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے، تو نے جھوٹ کہا، اور فرشتے بھی اس سے کہیں گے، تو نے جھوٹ کہا، اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: بلکہ تو نے یہ چاہا تھا کہ یہ کہا جائے: فلاں شخص قاری ہے اور تجھے یہ کہا جا چکا۔ اور مال دار کو لایا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: کیا میں نے تجھے مال میں وسعت نہ دی تھی اور میں نے تجھے کسی کا محتاج نہ بنایا تھا؟ وہ کہے گا: جی ہاں! اے میرے رب! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں نے جو تجھے عطا کیا تھا تو نے اس میں کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا: میں صلہ رحمی کیا کرتا تھا اور صدقہ و خیرات کرتا تھا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: تو نے جھوٹ کہا اور فرشتے (بھی) اس سے کہیں گے: تو نے جھوٹ کہا، اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، بلکہ تو نے یہ چاہا تھا کہ یہ کہا جائے کہ فلاں شخص بڑا سخی ہے، اور یہ کہا جا چکا ہے، اور اس شخص کو لایا جائے گا جو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: تجھے کیوں قتل کیا گیا؟ وہ کہے گا: مجھے آپ کی راہ میں جہاد کا حکم دیا گیا تھا، چنانچہ میں لڑا حتیٰ کہ قتل کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، تو نے جھوٹ کہا، اور فرشتے (بھی) اس سے کہیں گے تو نے جھوٹ کہا، اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: بلکہ تو نے یہ چاہا تھا کہ یہ کہا جائے کہ فلاں شخص بڑا بہادر ہے اور یہ کہا جا چکا ہے۔ پھر رسول کریم ﷺ نے میرے گھٹنوں پر ہاتھ مارا اور فرمایا ''اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! یہ تین اشخاص، اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے پہلے وہ ہوں گے جن سے قیامت کے دن آگ دہکائی جائے گی۔'' (جامع الترمذی، باب الریاء والسمعة)

اپنی تقصیر کا اقرار:

(۲۴۵) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ بزرگ و برتر قیامت کے دن بندے سے سوال کرتے ہوئے فرمائے گا: تجھ کو کیا ہوا تھا، جب تو نے کسی خلافِ شرع کام کو دیکھا تو اس کی بیخ کنی کا فریضہ انجام نہیں دیا؟ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو تاویل ودلیل سکھائی جائے گی، چنانچہ وہ عرض کرے گا، میرے پروردگار! میں (لوگوں کے ظلم وزیادتی سے) ڈرتا تھا اور تجھ سے (عفو ودرگزر اور مغفرت وبخشش کی) امید رکھتا تھا۔'' (سنن ابن ماجه و رواه البيهقي في شعب الايمان ، مشكوٰة المصابيح، باب الامر بالمعروف ص ۴۳۹)

فائدہ:

اس بندے کی طرف سے مذکورہ جواب میں گویا اپنی تقصیر کا اقرار، اپنے عجز کا اظہار، اور رب کریم کے فضل وکرم پر اپنے یقین واعتماد کا بیان ہوگا، اور جیسا کہ بیہقی میں کہا گیا ہے کہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس شخص سے ہو جو خلافِ شروع امور کا ارتکاب کرنے والوں کے غلبہ ودبدبہ سے ڈرتا ہو اور ان کی طرف سے پہنچائے جانے والے کسی بھی طرح کے نقصان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی طاقت وقدرت نہ رکھتا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر لوگوں کے رعب داب کی وجہ سے کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دے سکے تو مؤاخذہ کا مستوجب نہیں ہوگا، اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے حق میں عفو ودرگزر کی امید رکھی جاسکتی ہے۔

لیکن اس صورت میں یہ اشکال یقیناً پیدا ہوگا کہ ایسا شخص شریعت کی نظر میں معذور ہے، لہٰذا قیامت کے دن نہ تو اس سے مؤاخذہ ہوگا اور نہ اس کو معذرت کے لئے کسی تاویل ودلیل کے سکھانے کی ضرورت ہوگی؟ اس اشکال کو دور کرنے کیلئے یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ اس حدیث کا تعلق دراصل اس شخص سے ہے جس نے کسی عذر ومانع کے بغیر مذکورہ فریضہ کی انجام دہی میں کچھ تقصیر کی ہوگی اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی اس جزوی تقصیر کو

معاف کرنا چاہے گا تو اس کو مذکورہ تاویل ودلیل الہام کردے گا، تاکہ وہ معذرت کر سکے۔(مظاہر حق ج۴ ص ۶۶۷)

(۲۴۶) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے، عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم میں سے کوئی شخص اپنے آپکو حقیر کس طرح سمجھے گا؟ فرمایا کہ اس طرح کہ اللہ جل شانہٗ کے کسی حکم کو دیکھے اس بارے میں اس پر گفتگو لازم ہو، (مگر) وہ کچھ نہ کہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس سے فرمائیں گے: تمہیں فلاں فلاں چیز کے بارے میں بات کرنے سے کس چیز نے روکا تھا؟ وہ کہے گا: لوگوں کے خوف اور ڈرنے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم مجھ سے ڈرنے کے زیادہ حقدار تھے۔'' (سنن ابن ماجه)

(۲۴۷) حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ اپنے والد (حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب تمام مخلوق کو جمع فرمائیں گے تو امتِ محمدیہؐ کو سجدے کی اجازت دیں گے، وہ اللہ جل شانہٗ کے لئے طویل سجدہ کریں گے، پھر ارشاد ہوگا: اپنے سروں کو اٹھاؤ، ہم نے تمہارے لئے دوزخ سے چھٹکارے کا وعدہ پورا کردیا ہے۔'' (سنن ابن ماجه)

(۳۲) لقائے مولیٰ اور موت

(۲۴۸) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتے ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند نہیں کرتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یا آپ کی کسی زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا ''ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں'' آپ نے فرمایا: بات یہ نہیں ہے، بلکہ جب مومن کی موت آتی ہے تو اس بات کی اسے خوشخبری دی جاتی ہے کہ خدا اس سے راضی ہے، اور اسے بزرگ رکھتا ہے، چنانچہ وہ اس چیز سے جو اس کے آگے آنے والی ہے زیادہ کسی چیز کو محبوب نہیں رکھتا، اس لئے بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتے ہیں، اور جب کافر کو موت آتی ہے تو اسے خدا کے عذاب اور سزا کی خبر دی جاتی ہے، چنانچہ وہ اس چیز سے، جو اس کے آگے آنے والی ہے، زیادہ اور کسی چیز کو ناپسند نہیں کرتا، اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں منقول ہے کہ موت، اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے پہلے ہے۔'' (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، ج۹ قسطلانی ص ۲۹۵، باب من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ، مشکوٰۃ المصابیح، باب تمنی الموت و ذکرہ ص ۱۳۹)

فائدہ:

مشہور تو یہی ہے کہ لقائے مولیٰ سے مراد موت ہے، لیکن اس بارے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ لقائے مولیٰ سے موت مراد نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ آخرت کی طرف متوجہ ہونا، حق تعالیٰ کی مغفرت ورحمت اور اس کی رضا و خوشنودی کا طالب ہونا اور دنیا کی طرف مائل نہ ہونا اور دنیا و آخرت کی زندگی کی محبت میں گرفتار نہ ہونا۔ لہٰذا جس شخص نے دنیا ترک کی اور دنیا اور اس کی چیزوں کو ناپسند کیا اس نے گویا لقائے مولیٰ کو پسند کیا اور جس شخص نے

دنیا کو اختیار کیا اور دنیا کی چیزوں کی محبت میں گرفتار ہوا، اور دنیا کی طرف اپنا میلان رکھا، اس نے گویا لقائے مولیٰ کو ناپسند رکھا! یہی وجہ ہے کہ لقائے مولیٰ کا اشتیاق موت کی محبت اور اس کے اشتیاق کو لازم ہے۔ یعنی جو شخص لقائے مولیٰ کو پسند کرے گا وہ موت کو بھی پسند کرے گا، کیونکہ لقائے مولیٰ کے لئے موت وسیلہ اور ذریعہ ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (یا کوئی اور زوجہ مطہرہ) چونکہ یہی سمجھی تھیں کہ لقائے مولیٰ سے موت مراد ہے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد "بات یہ نہیں ہے" کے ذریعہ وضاحت فرمائی کہ لقائے مولیٰ سے مراد موت نہیں ہے، اور نہ یہ مراد ہے کہ بتقاضائے جبلّت طبعی موت سے ہو، اور بالفعل موت کی آرزو کرنی چاہئے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جو شخص رضائے حق کا طالب اور لقائے مولیٰ کا مشتاق ہوتا ہے وہ لقائے مولیٰ کے لئے وسیلہ ہونے کی وجہ سے موت کو ہمیشہ عقلی طور پر محبوب رکھتا ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب زندگی کا وقت پورا ہونے لگتا ہے اور موت کا وقت قریب آتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو پھر اس وقت وہ موت کو طبعی طور پر پسند کرتا ہے اور لقائے مولیٰ کا اشتیاق اس کی طبعی خواہش کی آواز بن جاتا ہے، چنانچہ حدیث کے الفاظ ولکن المؤمن (یعنی جب بندۂ مومن کو موت آتی ہے تو اسے اس بات کی خوشخبری دی جاتی ہے کہ خدا اس سے راضی ہے۔ اسی بات کی وضاحت کررہے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ "موت اللہ کی ملاقات سے پہلے ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار موت سے پہلے ممکن نہیں ہے، بلکہ موت کے بعد ہی یہ شرف واعزاز حاصل ہوتا ہے، یا پھر مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے وہ موت کو بھی پسند کرتا ہے، کیونکہ اس عظیم شرف وسعادت کا حصول موت کے ذریعہ سے ممکن ہے اور یہ کہ لقائے الٰہی کا وجود موت سے پہلے متصور نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ لقائے الٰہی اور موت دونوں ایک چیز نہیں، بلکہ دونوں الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔ (مظاہر حق ج ۲ ص ۶۸)

(۲۴۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ عز وجل

نے ارشاد فرمایا ''جب میرا بندہ میری ملاقات کو پسند کرتا ہے تو میں بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہوں اور جب وہ میری ملاقات کو ناپسند کرتا ہے تو میں بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہوں۔'' (صحیح البخاری، کتاب التوحید)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو کتاب الجنائز میں نقل کیا ہے۔

(۲۵۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔

(راوی) شریح رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا، میں نے عرض کیا! اے امّ المؤمنین! میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سنا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے (مذکورہ) حدیث ذکر کرتے ہیں، اگر تو یہ حدیث اسی طرح ہے تو پھر تو ہم ہلاک ہو گئے! انہوں (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) نے فرمایا! ہلاک ہونے والا شخص وہ ہے جسے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلاک ہونے والا فرمایا ہے۔ بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتے ہیں اور جو شخص اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں، حالانکہ ہم میں سے ہر شخص ہی موت کو ناپسند کرتا ہے!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے لیکن اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو، بلکہ بات یہ ہے کہ جب نگاہ پھٹی کی پھٹی رہ جائے اور سینہ میں سانس اکھڑ جائے اور رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور انگلیاں تشنج میں مبتلا ہو جائیں، تو اس وقت یہ بات ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرے گا اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کریں گے۔ (اخرجه مسلم فی الدعوات والترمذی فی الزهد و الجنائز)

تنبیہ:

مذکورہ روایات میں صحیح بخاری کی کتاب التوحید والی روایت اور موطاء امام

مالک کی روایت، دونوں میں صراحۃً اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی ہیں۔ لہٰذا یہ دونوں روایتیں تو احادیث قدسیہ میں شامل ہیں، لیکن دیگر روایات میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف صراحۃً نسبت نہیں کی گئی ہے، اس لیے اس سے ان کا احادیث قدسیہ ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ فائدہ کی تکمیل کی خاطر ان روایات کو بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ واللّٰہ الموفق للصواب

(۲۵۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور موت کا فرشتہ:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! ''(جب) حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام (کی موت کا وقت آیا تو ان) کے پاس موت کا فرشتہ (عزرائیلؑ) آیا اور اس نے کہا کہ اپنے پروردگار کی طرف سے پیغام اجل کو قبول فرمائیے۔ (یعنی آپ کی روح قبض ہونے کا وقت آ پہنچا ہے، واصل الی اللہ ہونے کے لئے تیار ہو جایئے) آنحضرتؐ نے فرمایا: (یہ سن کر) حضرت موسیٰؑ نے فرشتہ موت کے طمانچہ رسید کر دیا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موت کا فرشتہ دربار الٰہی میں واپس گیا اور عرض کیا کہ (پروردگار!) تو نے مجھے (روح قبض کرنے کیلئے) اپنے ایک ایسے بندے کے پاس بھیجا جو موت نہیں چاہتا، اور یہ کہ اس نے (طمانچہ رسید کر کے) میری آنکھ بھی پھوڑ دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے (فرشتہ کی یہ شکایت سن کر) اس کی آنکھ درست کر دی اور حکم دیا کہ میرے بندے (موسیٰؑ) کے پاس دوبارہ جاؤ اور ان کو میرا یہ پیغام پہنچاؤ کہ کیا تم طویل زندگی چاہتے ہو؟ اگر تم طویل زندگی چاہتے ہو تو کسی بیل کی کمر پر اپنا ہاتھ رکھ دو، تمہارے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آ جائیں گے ان میں سے ہر ایک بال کے عوض تمہاری زندگی میں ایک سال کا اضافہ ہو جائے گا، (فرشتہ نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنایا تو) انہوں نے کہا کہ اس کے بعد پھر کیا ہوگا؟ فرشتہ نے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا کہ) آخرکار پھر موت ہے، تب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ (اگر طویل زندگی کا بھی آخری نتیجہ موت ہی ہے، تو پھر وہ آج ہی کیوں نہ آ جائے (لیکن میری دعا ضرور ہے کہ) اے رب کریم! (تدفین کیلئے) مجھے ارض مقدس

(بیت المقدس) کے قریب کر دے، اگر چہ ایک پھینکے ہوئے پتھر کے بقدر ہو۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے فرمایا "اگر میں بیت المقدس کے قریب ہوتا تو تمہیں حضرت موسیٰ کی قبر (کا نشان) دکھا دیتا جو ایک راستہ کے کنارے پر سرخ ٹیلے کے قریب ہے"۔ (صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب وفاۃ موسیٰ علیہ السلام ج ۵ قسطلانی ص ۳۸۷، وکتاب الجنائز، باب من احب ان یدفن فی الارض المقدسۃ ج ۲ ص ۴۳۵، صحیح مسلم، باب من فضائل موسیٰ ج ۹ ص ۲۲۴، سنن النسائی، باب التعزیۃ ج ۴ ص ۱۱۸، مشکوٰۃ المصابیح، باب بدء الخلق وذکر الانبیاء علیہم السلام ص ۵۰۷)

فائدہ:

"رب کریم! مجھے ارض مقدس کے قریب کر دے" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آخری وقت میں یہ دعا اس لیے کی کہ وہ بیت المقدس کے قریب دفن ہونا چاہتے تھے، اور اس زمانہ میں وہی جگہ سب جگہوں سے افضل واشرف تھی، کیونکہ وہاں انبیاء کا مدفن اور ان کے مزارات تھے۔ ہوسکتا ہے کہ مذکورہ واقعہ کے وقت حضرت موسیٰ میدان تیہ (صحراء سیناء) میں ہوں گے۔ لہٰذا انہوں نے آخری وقت میں بیت الرب (بیت المقدس) کی قربت کی خواہش ظاہر کی اور اس خواہش کی شدت کو ظاہر کرنے کیلئے کہا کہ چاہے یہاں سے وہ قربت اتنے کم فاصلہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو جو ایک پھینکا ہوا پتھر طے کرتا ہے، نیز انہوں نے بیت المقدس کے قریب دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی، خود بیت المقدس میں دفن ہونے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا، کیونکہ انہیں یہ خوف تھا کہ اگر میں بیت المقدس میں دفن کیا گیا تو میری قبر بہت مشہور اور زیارت گاہِ خلائق ہو جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ کسی فتنہ اور برائی میں مبتلا ہو جائیں۔

بعض محققین نے لکھا ہے کہ حدیث میں جس "سرخ ٹیلے" کا ذکر ہے وہ ایک بستی اریحاء کے قریب ہے، اور یہ بستی، میدان تیہ کے سب سے قریب وادی مقدس کا علاقہ ہے۔

بہر حال! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صلحاء کے مزارات و مدافن کے قریب اور متبرک جگہوں میں دفن ہونا مستحب ہے۔

عقل وقیاس کے اسیروں کا انکار:

بعض لوگوں نے جو عقل وقیاس کے اسیر ہیں اس حدیث (قدسی) کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ فرشتۂ موت کا آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ روح قبض کرنے کیلئے آنے والے فرشتہ کے طمانچہ رسید کرنا انسانی طاقت کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے اور یہ کہ اس واقعہ سے موت کو غیر پسندیدہ اور غیر محبوب شے سمجھنا اور دنیا میں زیادہ دنوں تک باقی رہنے کی آرزو کرنا لازم آتا ہے اور یہ چیز اس انسان کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی جو نبوت و رسالت جیسے عظیم الشان منصب پر فائز ہو؟

ان باتوں کا جواب الفاظ حدیث کی اس تعبیر میں مل جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں موت کا فرشتہ حاضر ہوا تو وہ انسانی شکل وصورت میں تھا، حضرت موسیٰؑ اسے دیکھ کر پہچان نہ سکے کہ یہ موت کا فرشتہ ہے اور میری روح قبض کرنے آیا ہے۔ ان کو یہ ناگوار گزرا کہ ایک اجنبی شخص بغیر اجازت کیوں ان کے خلوت کدہ میں گھس آیا ہے۔ پھر اس نے ان کو موت کا پیغام دیا تو یہ خطرہ بھی ہوا کہ کہیں یہ شخص قتل کرنے کی نیت سے تو میرے پاس نہیں آیا ہے۔ اس لیے ان کو طیش بھی آیا اور انہوں نے اس کے خلاف دفاعی اقدام کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا، فرشتہ بشکل انسان تھا، لہٰذا بشری اثرات نے کام کیا، اور حضرت موسیٰؑ کے زبردست طمانچہ کی چوٹ سے اس کی آنکھ جاتی رہی۔ پھر یہ کہ انہوں نے اس کو ایک دروغ گو کی حیثیت میں بھی دیکھا، کیونکہ اس نے روح قبض کرنے کا دعویٰ کیا تھا، اور ظاہر تھا کہ کوئی انسان روح قبض کرنے والا نہیں ہو سکتا، لہٰذا ان کو اس دروغ گوئی پر غصہ آیا اور دروغ گو پر غصہ للہ فی اللہ ہوتا ہے، اس لیے حضرت موسیٰؑ پر کوئی اعتراض کیسے وارد ہو سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اس اقدام پر بارگاہ حق سے کوئی عتاب بھی نہیں ہوا۔

بہر حال! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس اقدام کے بعد بھی فرشتۂ موت نے اپنی

اصل حیثیت ظاہر نہ کی اور ان کو یہ بتائے بغیر کہ وہ موت کا فرشتہ ہے، غائب ہوگیا اور دربار الٰہی میں جا پہنچا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس کو پھر ملکوتی ہیئت پر واپس کیا اور حضرت موسیٰ کی خدمت میں دوبارہ بھیجا، اور اس طرح وہ اس عیب ونقصان سے بری ہوگیا جو بشری شکل وصورت میں آنکھ مجروح ہو جانے سے پیدا ہوگیا تھا۔ ادھر فرشتۂ موت نے حضرت موسیٰ کے خیالات سے آشنا ہوئے بغیر خود ہی یہ سمجھ لیا کہ حضرت موسیٰ موت کے نام سے خفا ہوگئے اور موت نہیں چاہتے اور دربار الٰہی میں جا کر یہ شکایت بھی کی، لیکن اللہ تعالیٰ تو اصل صورت حال جانتے تھے، اس نے فرشتہ کی غلط فہمی اور حضرت موسیٰ کی جلالتِ شان دونوں کے اظہار کیلئے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ فرشتہ موت دوبارہ حضرت موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہو، اور ایک بلیغ انداز میں موت کا پیغام پہنچائے۔ ادھر حضرت موسیٰ نے اس اجنبی شخص کے یکایک غائب ہو جانے پر فوراً محسوس کرلیا کہ درحقیقت یہ معاملہ عالمِ بالا کا ہے۔ چنانچہ فرشتہ موت نے جب دوبارہ حاضر ہوکر حضرت موسیٰ کو پیغام الٰہی سنایا تو ان کا طرزِ عمل اور طریقہ گفتگو فوراً بدل گیا۔ پھر انہوں نے پیغامِ اجل کو لبیک کہنے میں دیر نہیں کی اور رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مزاج میں نہایت تیزی وشدت تھی، وہ جلال کا مظہر تھے، مزاج اور اصول کے خلاف کوئی بات ان کیلئے نا قابلِ برداشت بن جاتی تھی، ان کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ ''چلہ کشی'' اور تورات لینے کیلئے جبلِ طور یا حوراب پہاڑ پر تشریف لے گئے تو اپنے پیچھے بنی اسرائیل کا نگہبان اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو بنا گئے تھے، جب ان کو گئے ہوئے ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر گیا تو بنی اسرائیل کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا اور ایک بد باطن شخص ''سامری'' کے بہکاوے میں آکر قوم کے لوگ گوسالہ (بچھڑے) پرستش کرنے لگے، حضرت ہارونؑ نے قوم کو بہت سمجھایا اور اس مشرکانہ حرکت سے لاکھ منع کیا مگر کسی نے ان کی بات پر کان نہیں دھرا، حضرت موسیٰ واپس آئے اور قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھا تو بپھر گئے اور یہ خیال کر کے ہارونؑ نے ان لوگوں کو شرک سے باز رکھنے میں کوتاہی کی، ان کی گردن پکڑ لی اور ان کے سر کے بال نوچنے لگے اور داڑھی تک پر ہاتھ ڈال دیا، حضرت ہارونؑ نے پوری صورتِ حال بتائی اور اپنا بے قصور

ہونا ثابت کر دیا، تب جا کر حضرت موسیٰ کے جلال وغصہ سے ان کی خلاصی ہوئی۔

بہر حال! اس حدیث کی صحت میں کوئی کلام یا شبہ نہیں ہے، اس پر عقیدہ رکھنا چاہیے اور اگر اس کی کچھ باتیں عقل وقیاس کے خلاف معلوم ہوتی ہوں تو اپنے فہم کا قصور سمجھنا چاہیے، اگرچہ مندرجہ بالا صحیح تعبیرات وتاویلات کی روشنی میں دیکھ لینے کے بعد اس حدیث پاک میں کوئی بات عقل وقیاس کے خلاف معلوم ہی نہیں ہو سکتی۔

(مظاہر حق ج۵ ص ۲۸۳ تا ۲۸۴)

حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: اگر یہود کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر معلوم ہو جاتی تو وہ ان کو معبود بنا کر اس کی پرستش شروع کر دیتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر اریحا مقام میں سرخ ٹیلے کے پاس مشہور ہے۔

حضرت وھب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نمازِ جنازہ بھی فرشتوں نے پڑھائی تھی اور تدفین کا عمل بھی انہوں نے انجام دیا تھا۔

شارحِ بخاری علامہ قسطلانی لکھتے ہیں کہ حضرت وھب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ" حضرت موسیٰ کسی کام سے باہر نکلے تو دیکھا کہ فرشتے ایک ایسی قبر کھود رہے ہیں کہ اس سے اچھی انہوں اس سے قبل نہ دیکھی تھی، چنانچہ انہوں نے فرشتوں سے پوچھا: یہ قبر تم کس کے لئے کھود رہے ہو؟ انہوں نے کہا، کیا آپ یہ پسند کرتے ہیں کہ یہ قبر آپ کی ہو جائے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، چاہتا ہوں، فرشتوں نے کہا، پھر آپ اس قبر میں اتریں اور لیٹ جائیں، اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جائیں! چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور پھر ہلکا سا سانس لیا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض کر لی اور فرشتوں نے ان پر مٹی ڈال دی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فرشتہ موت ان کے پاس جنت کا ایک سیب لائے جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونگھا اور ان کی روح قبض ہو گئی۔

(۳۳) میدانِ حشر میں ہر شخص ننگے بدن، ننگے پاؤں اور غیر مختون حالت میں آئے گا

(۲۵۲) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ''تمہیں (قیامت کے دن) اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ تم ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بے ختنہ ہوں گے، اس کے بعد آپؐ نے (بطور دلیل واستشہاد) یہ آیت پڑھی: ''كَمَا بَدَأْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ'' (الانبیاء : ۱۰۴)

یعنی جس طرح ہم نے ان کو ابتداءً پیدا کیا تھا اسی طرح ان کو دوبارہ پیدا کریں گے، یہ وعدہ ہم پر لازم ہے اور یقیناً ہم کرنے والے ہیں'' پھر آپؐ نے فرمایا ''قیامت کے دن ان لوگوں میں سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، (فرمایا) اور اس وقت میرے کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کو پکڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف لے جایا جار ہا ہوگا، میں کہوں گا کہ یہ میرے صحابی ہیں، یہ میرے صحابی ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، جب سے تم ان سے جدا ہوئے، یہ برابر دین سے برگشتہ اور پھرتے رہے، پھر میں وہی کہوں گا جو بندہ صالح (یعنی حضرت عیسیٰؑ) نے کہا تھا کہ: ''وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (تا) الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. یعنی ''جب تک میں ان کے درمیان رہا، میں ان کے احوال سے واقف رہا۔ (الخ) (صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب قول اللّٰہ تعالیٰ واتخذ اللّٰہ ابراهيم خليلاً والقسطلانی ج۵ ص ۳۴۲)

نیز امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت روایت کو کتاب الرقاق ، باب کیف الحشر میں اور کتاب التفسیر اور احادیث الانبیاء میں بھی نقل کیا ہے۔ نیز امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو صفۃ القیامۃ ج ۱ ص ۳۱۱ پر اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع الترمذی ج ۲ ص ۱۹۹ پر نقل کیا ہے۔

(نیز دیکھئے، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحشر ص ۴۸۳)

فائدہ:

''اور بے ختنہ ہوں گے'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن جب مردے اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو ان کے جسم و بدن کے تمام اجزاء یک جا ہو کر مل جائیں گے اور پورا جسم اس طرح کا ہو جائے گا جیسا کہ اس دنیا میں تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ ختنہ کی وہ کھال جو کاٹ کر پھینک دی جاتی ہے اور جو اس دنیا میں ضائع کر دیئے جانے کے قابل ہے جب وہ قیامت کے دن اپنی جگہ (یعنی ختنہ کے مقام پر) واپس آ کر جسم کا حصہ بن جائے گی تو دوسرے اجزاء جیسے بال اور ناخن وغیر روئی کے طور پر پیدا ہوں گے اور اپنی اپنی جگہ لگ جائیں گے! پس یہ حقیقت نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کے کمالِ علم اور کائنات کے ایک ایک جز وکل پر محیط ہونے کی دلیل ہے، بلکہ اشیاء ممکنات کے تعلق سے اس کی قدرت کاملہ کی لامتناہی وسعتوں کی بھی علامت ہے۔

''سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ فضیلت محض اس لئے حاصل ہوگی کہ وہ ان لوگوں میں پہلے شخص ہیں جو فقراء اور ضرورت مندوں کو کپڑے پہناتے ہیں، اور ان کی ستر پوشی کرتے ہیں۔ یا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ وہ سب سے شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے لباس کیا گیا تھا، جبکہ انہیں نمرود کی آگ میں ڈالا گیا تھا، بس ان کی یہ مخصوص نوعیت کی فضیلت ہمارے پیغمبر ﷺ پر ان کی فضیلت کو ثابت نہیں کرتی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو سب سے پہلے پہنایا جانا ان کے اس اعزاز و اکرام کے طور پر ہوگا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے روحانی اور دینی باپ ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو اولیت حاصل ہوگی وہ حقیقی ہے یا اضافی؟ یعنی ان کو آنحضرت ﷺ کے علاوہ اور تمام لوگوں میں سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جن کپڑوں میں دفن کیا گیا ہے آپؐ قیامت کے دن انہیں کپڑوں میں اٹھ

کر میدان حشر میں آئیں گے۔ نیز جامع الصغیر میں حضرت ابو ہریرہؓ سے جامع ترمذی کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''انا اوّل من ینشق عنه الا رض فا کسی حلة من حلل الجنة ثم اقوم عن یمین العرش لیس احد من الخلائق یقوم ذلک المقام غیری'' یعنی (قیامت کے روز) سب سے پہلے میں زمین سے پھٹ کر اٹھوں گا، اور جنت کا لباس پہنوں گا اور پھر عرش کے دائیں طرف کھڑا ہوں گا اور اس جگہ مخلوقات میں سے میرے علاوہ کسی اور کو کھڑا ہونا نصیب نہ ہوگا''

''میں وہی کہوں گا جو بندہ صالح نے کہا تھا'' مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ قیامت کے دن اپنی قوم کی گمراہی اور بدعقیدگی و بدعملی سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے، اور اپنی گمراہ قوم کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف پر چھوڑ دیں گے، اسی طرح میں بھی یہی کہوں گا کہ! پروردگار! میری امت کے یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں میری موجودگی کے درمیان ایمان و عمل کی سیدھی راہ پر گامزن تھے اور میں ان کا نگہبان و ذمہ دار تھا، لیکن جب میں دنیا سے رخصت ہوگیا تو انہوں نے اپنے نفس اور شیطان میں مبتلا ہو کر گمراہی کو اختیار کر لیا۔

ان کا معاملہ تیرے اوپر موقوف ہے، تیری عادل اور منصف بارگاہ ان کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے، وہ سراسر عادلانہ اور منصفانہ ہوگا۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی اس بات کو واضح کرنے کیلئے حضرت عیسیٰ کے تعلق سے قرآن کریم کی جو آیت کریمہ پڑھی، وہ پوری یوں ہے۔ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ط وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌO اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' یعنی (قیامت کے دن) جب اللہ تعالیٰ نصاریٰ کو سنانے اور ان کو شرمندہ کرنے کیلئے حضرت عیسیٰ سے فرمائے گا کہ کیا تم نے اپنی قوم کو عقیدہ تثلیث یعنی تین خدا ماننے کی تلقین و تبلیغ کی تھی؟ تو حضرت عیسیٰ اپنی برأت کا اظہار کریں گے، اور کہیں گے کہ میں نے تو ان کو صرف تیری بندگی کرنے کی تلقین و تبلیغ کی تھی، اور جب تک میں ان کے درمیان

موجود رہا، ان پر مطلع رہا، (اور ان کی نگہبانی کرتا رہا کہ یہ لوگ صحیح عقیدہ وعمل کی روشنی سے دور نہ جاپڑیں) لیکن جب آپ نے مجھے (اس دنیا) سے اٹھالیا (اور ان کے اوپر سے میری نگہبانی ختم ہوگئی) پھر آپ ان کے احوال پر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ اب اگر (ان کی بدعقیدگی وبدعملی کیلئے) آپ ان کو سزادیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو معاف فرمادیں تو بے شک آپ زبردست حکمت والے ہیں۔''

واضح رہے کہ یہاں حدیث میں ''صحابہ'' سے مراد وہ صحابہ نہیں ہیں، جن کو آپ کی زندگی میں بھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی آپ سے نسبت حاصل رہی اور جن کو حقیقت میں ''صحابہ'' کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کے بارے میں یہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد ان میں سے کوئی بھی صحابی مرتد نہیں ہوا اور نہ کسی نے عقیدہ وعمل کی کوئی ایسی گمراہی اختیار کی جس کی بناء پر انہیں (نعوذ باللہ) دوزخی کہا جاسکے، لہٰذا ''صحابہ'' سے مراد وہ اُجڈ دیہاتی لوگ ہیں جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے، لیکن آپ کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی وغیرہ کی اتباع وپیروی کرنے کے سبب مرتد ہوگئے تھے۔ (مظاہر حق ج۵ ص ۱۲۲ تا ۱۲۴)

عقیدۂ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۵۳: ''وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيْسٰىٓ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ، وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا......) کی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مُمِيْتُكَ نقل کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوچکی ہے، حالانکہ حضرت عیسیٰ کی حیات اور آخر زمانہ میں ان کے نزول الی الارض پر امت کا اجماع ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ حضرت عیسیٰ کو جس وقت آسمان کی طرف اٹھایا گیا تھا، زندہ اٹھایا گیا تھا، یا پہلے ان کو موت دی گئی اور اس کے بعد زندہ کرکے اٹھایا گیا، وھب بن منبہؒ اور ابن حزمؒ ظاہری کی رائے یہ ہے کہ پہلے ان کو موت دی گئی، پھر اس کے بعد ان کو (زندہ) اٹھایا گیا ہے۔

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ سورۃ آل عمران کی آیت ''اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ'' اور سورہ مائدہ کی آیت ''فَلَمَّا توَفَّیْتَنِیْ'' میں توفی سے مراد موت ہے، لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ حیات عیسیٰ علیہ السلام کے قائل نہیں ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کو آسمان کی طرف اٹھانے سے قبل موت دی گئی تھی اور اس کے بعد زندہ کر کے اٹھایا گیا اور آخر زمانہ میں آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب ''اَلمُحلّٰی'' میں اس کی تصریح کی ہے کہ حضرت عیسیٰ آخر وقت میں آسمان سے نازل ہوں گے۔

(المحلّٰی بالآثار ۲۸/۱، کتاب التوحید، الایمان بجمیع الانبیاء فرض)

اور وھب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ بھی حیات عیسیٰ کے قائل ہیں۔

مرزا غلام قادیانی نے چونکہ مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اس لئے وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حیات ہیں، وہ ابن حزمؒ، وھب بن منبہؒ اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس کی مذکورہ تعلیق اور تفسیر سے استدلال کرتا ہے کہ یہ حضرات بھی وفاتِ عیسیٰ کے قائل ہیں۔ علامہ ابن حزمؒ اور وھب بن منبہؒ کے متعلق تو ہم نے یہ بتلا دیا کہ یہ حضرات بھی حیاتِ عیسیٰ کے قائل ہیں، البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ آسمان کی طرف اٹھائے جانے سے قبل حضرت عیسیٰ پر کچھ وقت کیلئے موت طاری کی گئی تھی۔ (تفسیر ابن کثیر ۱/ ۳۶۶) اور اس کے بعد پھر ان کو زندہ کیا گیا، لہٰذا اس سے قادیانی کا استدلال صحیح نہیں ہے۔

جہاں تک حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ تعلیق (روایت) کا تعلق ہے تو اس سے بھی استدلال درست نہیں ہے، ایک تو اس لئے کہ اس تعلیق کی سند میں انقطاع ہے، دراصل یہ تعلیق ابن ابی حاتمؒ نے علی بن ابی طلحہؒ کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ (عمدۃ القاری ۱۸/ ۲۱۵)۔ علی بن ابی طلحہؒ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان واسطہ کا ذکر نہیں ہے۔ جبکہ علی بن ابی طلحہ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے براہِ راست استفادہ کا موقع نہیں ملا۔

جیسا کہ کتب رجال میں اس کی تصریح موجود ہے۔ (دیکھئے: خلاصہ تھذیب

الکمال للخزرجی ۲۷۵ وتاریخ البخاری الکبیر :٦ الترجمة ٢. ٢۴، والجرح والتعدیل، ٦ الترجمة ١٠٣١، وثقات ابن حبان ٣١١/٧، وتاریخ بغداد ۴٢٨/١١، ومیزان الاعتدال: ٣ الترجمة ۵٨٧٠، وتهذیب التهذیب ٣٣٩/٧، تهذیب الکمال ۴٩٠/٢٠)۔ اس لئے اس کی سند میں انقطاع ہے۔

دوسرے یہ کہ مذکورہ تعلیق کو درست بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وفات عیسیٰ کے قائل ہیں، کیونکہ امام شعرانی رحمہ اللہ نے الطبقات الکبریٰ[1] میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو ان کے جسدِ مبارک کے ساتھ ہی آسمان کی طرف اٹھالیا اور وہ اب بھی زندہ ہیں، وہ دنیا کی طرف آئیں گے۔ پھر بادشاہت کریں گے اور اس کے بعد عام لوگوں کی طرح انتقال کریں گے۔(الطبقات الکبریٰ للشعرانی ٢٦/١)

علامہ ابن کثیرؒ، علامہ آلوسیؒ اور صاحب کنز العمال نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس مفہوم کی روایات نقل کی ہیں۔(دیکھئے: روح المعانی ۵٩۵/١، ابن کثیر ۴٩٣/١، کنز العمال ۱۴/ ٦١٨)۔ جن سے یہ بات واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ ''مُتَوَفِّیکَ'' کا ترجمہ ''مُمِیتُکَ'' کرنے سے ان کی مراد یہ ہے کہ قربِ قیامت کے وقت جب حضرت عیسیٰ زمین پر نزول فرمائیں گے، حکومت کریں گے، اس کے بعد اللہ جل شانہ، انہیں موت دیں گے، چنانچہ بہت سے مفسرین نے یہی مطلب مراد لیا ہے۔

صاحب ''مدارک التنزیل'' فرماتے ہیں۔''ممیتک فی وقتک بعد النزول من السماء ورافعک الآن'' یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میں آپ کو آپ کے وقت میں جو آسمان سے اترنے کے بعد ہے، وفات دوں گا اور اب میں آپ کو اٹھالیتا ہوں۔''

مفسر خازن نے بھی اس قول کا یہی مطلب اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

(مدارک التنزیل ٢٣٣/١ تفسیر خازن ٢٣٣/١)

سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ آیت اور سورۂ مائدہ کی آیت ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي ......'' دونوں میں توفّی کے مشہور معنی ''موت'' کے نہیں لئے گئے، بلکہ اس کے معنی ''اخذ

الشيء وافيا" کے کئے گئے ہیں، یعنی کسی چیز کو پورا پورا لینا، اس کی دلیل وہ احادیث متواترہ ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھایا ہے، پھر خود قرآن کریم بھی کہتا ہے۔" وَمَاقَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ"(المائدہ: ۱۵۷) اسی طرح قرآن نے: "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (المائدہ: ۱۵۸) کی صراحت کی ہے۔

یہ امت کا اجماعی عقیدہ ہے اور اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر مستقل ایک دقیق کتاب لکھی ہے جو "التصريح بما تواتر في نزول المسيح" کے نام سے موجود ہے، جو اس باب میں بیش قیمت اور عمدہ کتاب ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے" فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ "کا ترجمہ (تو نے مجھ کو اٹھالیا) سے فرمایا ہے یہ محاورے کے اعتبار سے موت اور رفع الی السماء (آسمان کی طرف اٹھائے جانا) دونوں پر صادق آسکتا ہے، گویا متنبہ کردیا کہ نہ لفظ توفی کیلئے موت لازم ہے اور نہ خاص توفی بصورتِ موت کو مسئلہ زیرِ بحث میں کسی قسم کا دخل ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض لوگوں کی نسبت میں قیامت کے دن اسی طرح کہوں گا جس طرح بندہ صالح (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا تھا، فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ...... اس قسم کی تشبیہات سے یہ نکالنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفّی بہمہ وجوہ یکساں ہونی چاہیے، عربیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔" (تفسير عثماني : ۱۶۹)

آیتِ مبارکہ کی مزید تحقیق اور علمی نکات:

بعض محقق علماء نے سورۂ آلِ عمران کی اس آیت (نمبر ۵۳) سے یہ استدلال کیا ہے کہ اس سے عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیتِ مسیحؑ کی تردید ہوتی ہے، کیونکہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام معبود و خدا اور متصرف و مختار ہوتے تو ان یہودیوں کے مکر و فریب سے خود بخود بچ جاتے، لیکن اس میں وہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے محتاج تھے۔ اور آیت مذکورہ میں "مُتَوَفِّيْ"

کالفظ ''توفّی'' سے اسم فاعل ہے اور ''توفّی'' کا معنی کسی چیز کو پورے طور پر لینے اور وصول کرنے کے ہیں، جیسا کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''التوفی اخذ الشیء وافیاً'' (تفسیر کبیر ج۲ ص ۶۸۹) اور ''رَافِعُکَ'' ماقبل کی تفسیر ہے، مطلب یہ ہے کہ یہودی جب حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کی خفیہ تدبیریں سوچ رہے تھے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ خوشخبری سنائی کہ میں تم کو پورا پورا یعنی روح مع الجسد آسمانوں پر اٹھا لوں گا، اور ان کافروں کے ناپاک منصوبوں سے تم کو بچالوں گا۔

جیسا کہ علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ المراد آخذک وافیاً بروحک وبدنک فیکون ورافعک الیّ کا لمفسر لما قبله'' (روح المعانی ج۳ ص ۱۷۹) اللہ تعالیٰ نے ''رَافِعُکَ'' کے ساتھ اس سے پہلے ''مُتَوَفِّیکَ'' کا اضافہ فرمایا ہے، حالانکہ رفع الی السماء پر دلالت کرنے کیلئے ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' ہی کافی تھا۔

امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اگر صرف ''رَافِعُکَ'' پر ہی اکتفاء کیا جاتا تو اس سے شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کا رفع ہوا ہے، جسد کا نہیں ہوا، اس لئے ''مُتَوَفِّیکَ'' لاکر صراحت فرمادی کہ رفع روح مع الجسد ہوا ہے نہ کہ صرف روح کا۔ (تفسیر کبیر ج۲ ص ۶۸۹)

یہ آیتِ کریمہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمانوں پر اٹھائے جانے کی صریح اور واضح دلیل ہے، اس کے علاوہ اور کئی آیتوں میں بھی اس کی صراحت موجود ہے، اور نزولِ مسیحؑ کے بارے میں حدیثیں تو درجہ تواتر کو پہنچ چکی ہیں، جیسا کہ امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر مفسرینِ کرام نے لکھا ہے۔ (دیکھئے: تفسیر ابن جریر ج۳ ص ۱۸۴)

چنانچہ ایک مرفوع روایت میں ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ ضرور بالضرور تم میں حاکم عادل بن کر نازل ہوں گے۔

الفاظِ حدیث ملاحظہ ہوں: ''ان سعید بن المسیبؒ سمع ابا هریرةؓ قال قال رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده لیو شکن ان ینزل فیکم ابن

مریم حکما عدلا فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة"

(صحیح البخاری : ج ۱ ص ۲۹۶، ج ۱ ص ۳۳۶، ج ۱ ص ۴۹۰)

یہ روایت حدیث کی تمام متداول کتابوں میں موجود ہے۔ نزولِ مسیحؑ کے بارے میں کتبِ حدیث میں جتنی بھی روایتیں موجود ہیں ان سب میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کی صراحت موجود ہے، کسی ایک روایت میں بھی مثلِ عیسیٰ کا لفظ نہیں آیا اور نہ ہی کسی مرفوع حدیث میں اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، اتباع تابعین کے کسی اثر میں حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا ذکر آیا ہے۔ بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے حیاتِ مسیحؑ تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے جو "متوفّیک" کا معنی "مُمِیْتُکَ" بخاری میں منقول ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو یہ روایت منقطع ہے (جیسا کہ پہلے بھی وضاحت گزری ہے)، اور اس کے مقابلہ میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت صحت کے ساتھ منقول ہے، وہ یہ ہے کہ "حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔"

چنانچہ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں کہ:

" والصحیح ان اللّٰہ تعالیٰ رفعه الی السماء من غیر وفاة ولا نوم کما قال الحسنؒ وابن زیدؒ وهو اختیار الطبری وهو الصحیح عن ابن عباس وقاله الضحاکؒ (تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۱۰۰)

ثانیاً اگر روایت بخاری کی صحیح بھی ہو تو بھی اس کا مفہوم یہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ وفات پاچکے ہیں۔ بلکہ اس صورت میں آیت کریمہ میں تقدیم وتاخیر ہوگی، کیونکہ واوٴ مطلق جمع کیلئے آتی ہے، اس میں ترتیب لازم نہیں ہے، اور مطلب یہ ہوگا کہ تجھے اپنی ہی طرف اٹھانے والا ہوں، اور پھر آخر زمانہ میں زمین پر اتار کر تجھے موت دینے والا ہوں جیسا کہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ **عن قتادة قال هذا من المقدم والمؤخر ای رافعک الی ومتوفیک......"** (روح المعانی ج ۳ ص ۱۷۹)

لفظ " توفّی " کے معنی تمام اہلِ لغت کے نزدیک **اخذ الشیء وافیاً** کے

ہیں، اور قرآن مجید میں یہ لفظ حیات کے مقابلہ میں کہیں استعمال نہیں ہوا، حیات کے مقابلہ میں لفظ موت آیا ہے، مثلاً۔ "کُنْتُمْ اَمْوَاتاً فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ"۔

(البقرہ: رکوع :۳)

"اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ کِفَاتاً اَحْیَآءً وَاَمْوَاتاً (المرسلات رکوع ۱) بلکہ "توفّی" کے مقابلہ میں "ہونا اور رہنا" آیا ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔ کُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَادُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ۔

(المائدۃ: رکوع ۱۶)

البتہ اس لفظ کا اطلاق موت پر بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ وہاں بھی اخذ الشیء وافیاً ہوتا ہے تو موت بھی "توفّی" کا ایک فرد ہے، جس طرح بدن کے ساتھ اٹھالینا بھی اس کا فرد ہے، مگر اس آیت کریمہ میں رفع، روح مع الجسد مراد ہے، نہ کہ موت۔

مرزائیوں کا من گھڑت ایک قاعدہ:

مرزائیوں کی طرف سے ایک قاعدہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب "توفی" سے باب تفعل ہو اور فاعل اللہ ہو اور مفعول ذی روح ہو تو وہاں قبض روح کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہوتا، یعنی رفع مع الجسد مراد نہیں ہوتا۔ یہ امتِ مرزائیہ کی طرف سے سراسر فریب اور دھوکہ ہے، اوّل تو اس لئے کہ حضرت عیسیٰؑ کے سوا کسی کا رفع روح مع الجسد ثابت نہیں ہے، اس لئے یہ الفاظ کسی دوسرے کیلئے وارد نہیں ہوئے۔ ثانیاً یہ قاعدہ من گھڑت اور جعلی ہے، کسی لغت کی کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ جب رفع کا فاعل اللہ ہو اور مفعول ذی جسد ہو اور اس کا صلہ "الیٰ" ہو تو وہاں رفع جسد کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہو سکتا۔ قرآن وحدیث اور محاوراتِ عرب سے اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکتا۔

(تفصیل کیلئے دیکھیں: عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام للعلامۃ السید محمد انور شاہ کشمیریؒ)

اس کے بعد ارشاد ہے۔ وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا

اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰـمَةِ "۔

پہلے تین وعدے (متوفیک، رافعک اورمطھرک) حضرت عیسیٰ ؑ کی ذات سے مخصوص تھے، اور یہ وعدہ ان کے متبعین اور ان پر ایمان لانے والوں کے ساتھ ہے۔ "اَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡکَ" سے مسلمان اور سچے عیسائی مراد ہیں اور "اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا" سے مراد یہود بے بہبود ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور ان کے قتل کے درپے ہوئے، فوقیت اور غلبہ سے معنوی اور قوتِ دلائل کے اعتبار سے غلبہ مراد ہے، چنانچہ اس حیثیت سے یہودی ہمیشہ مغلوب رہیں گے، اگر مادی اور سیاسی حیثیت سے فوقیت مراد ہو تو اس اعتبار سے بھی یہودی ہمیشہ ذلیل وخوار اور مقہور ومحکوم ہی رہے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا " ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ "یعنی جب تم سب میدان حشر میں میرے سامنے حاضر ہو جاؤ گے تو عملی اور حتمی فیصلہ تمہارے اختلافات کا میں خود کروں گا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۷)

حیاتِ عیسیٰ ؑ پر علماء نے مستقل کتابیں اور رسائل لکھے ہیں، مثلاً علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف بزبان عربی "عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام"، حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ کی کتاب بزبان اردو "حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام" مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ کی تصنیف "حیاتِ مسیح علیہ السلام" اور علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے حکم سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی جمع کردہ سو احادیث کا مجموعہ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" اور مولانا محمد حسین نیلویؒ کا رسالہ بزبان اردو "القول الاتم فی حیاۃ عیسیٰ ابن مریم" (بحوالہ: کشف الباری عما فی صحیح البخاری مع حاشیۃ مفیدۃ، کتاب التفسیر ص ۱۹۱ تا ۱۹۵)۔

ایک تعارض اور اس کا جواب

مذکورہ بالا روایت (۲۵۲) پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے اشکال ہوتا ہے جو امام ابوداؤد نے نقل کی ہے کہ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے

فرمایا: نئے کپڑے لاؤ، چنانچہ نئے کپڑے انہیں پیش کئے گئے اور انہوں نے وہ کپڑے پہن لئے اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "**ان المیت فیبعث فی ثیابه التی یموت فیها**" (سنن ابی داؤد ۳/۱۹۰ کتاب الجنائز، باب مایستحب من تطهیر المیت عند الموت). اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت بعث بعد الموت ہوگا اس وقت آدمی لباس پہنے ہوئے ہوگا، اور مذکورہ حدیث (۲۵۲) سے معلوم ہو رہا ہے کہ لوگ ننگے بدن ہوں گے؟ اس کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں۔ چند ایک یہ ہیں:

(۱) اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ بعث اور چیز ہے اور حشر دوسری چیز ہے، بعث قبروں سے اٹھنے کو کہتے ہیں اور حشر قیامت کے اجتماع کا نام ہے، حدیث مذکور یعنی حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہ حشر سے متعلق ہے، جبکہ حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بعث سے متعلق ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۲) بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کا تعلق شہداء سے ہے اور یہاں غیر شہداء مراد ہیں۔

(۳) ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ثیاب (کپڑے) سے اعمال مراد ہے کہ آدمی ان اعمال کے ساتھ اٹھایا جائے گا جو اس نے دنیا میں اپنی زندگی میں کئے تھے، لیکن اس پر اشکال ہوگا کہ کیا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ انہوں نے اپنے لئے نئے کپڑے منگوائے؟ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں یہ بات معلوم تھی مگر انہوں نے ظاہرِ حدیث پر عمل کرنے کا اہتمام کیا واللہ اعلم۔ (تفصیل کیلئے دیکھیں: فتح الباری ۱۱/۳۸۳، ۳۸۴، کتاب الرقاق، باب الحشر)

ایک اشکال اور اس کا جواب:

مذکورہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ میں فرمایا گیا کہ "سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا" اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس سے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر فضیلت لازم آتی ہے؟ اس کے بھی متعدد جوابات اور توجیہات کی

گئی ہیں:

(۱) ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ، اللہ جل شانہ، کے لئے سب سے پہلے نمرود کی آگ میں ڈالے گئے تھے، اس لئے قیامت کے دن یہ اعزاز انہیں دیا جائے گا۔ (فتح الباری ۶/۳۹۰، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللّٰہ تعالیٰ، واتخذ اللّٰہ ابراهیم خلیلاً)۔

(۲) بعض روایات میں ہے " لانہ اوّل من لبس السراویل "یعنی چونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے سب سے پہلے سراویل کا استعمال کیا جس میں تستر کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے، اس لئے سب سے پہلے ان کو جوڑا پہنایا جائے گا۔ (فتح الباری ۶/۳۹۰)

(۳) ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لباس پہنایا جائے گا اور بعض روایات میں اتنا اضافہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو لباس پہنایا جائے گا وہ نہایت بیش قیمت ہوگا۔ (فتح الباری ۱۱/۳۸۴، کتاب الرقاق، باب الحشر)۔ لہٰذا اس تاخیر کی تلافی اس طرح کی جائے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو لباس دیا جائے گا وہ اس سے زیادہ قیمتی اور افضل و بہتر ہوگا۔

میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "میں بادشاہ ہوں"

(۲۵۳) حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن انیس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ آپؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ بندوں کو میدانِ حشر میں جمع کریں گے، پھر ان کو ایسی آواز سے پکاریں گے جسے دور والے بھی اسی طرح سنیں گے جس طرح قریب والے سن رہے ہوں گے، میں بادشاہ ہوں، میں بدلہ دینے والا ہوں۔" (صحیح البخاری، کتاب التوحید، قسطلانی ۱۰/۴۲۹)

فائدہ:

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو ایسی آواز سے پکاریں گے جو مخلوق ہوگی، مگر قائم بذاتہٖ تعالیٰ نہیں ہوگی، یا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پکارنے والے کو حکم دیں گے، وہ

پکارے گا اور آواز لگائے گا۔ علیمی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حدیث میں مذکور لفظ "انا الملک، انا الدیّان" اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی سے ماخوذ ہے۔ "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" وہ روز جزا کا مالک ہے۔ "یعنی وہ بدلہ دینے والا اور حساب لینے والا ہے، کسی عمل کرنے والے کے عمل کو رائیگاں اور ضائع نہیں کرتا۔

"الکواکب" میں ہے کہ اس لفظ کو اختیار کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اس میں باری تعالیٰ کی سات صفات کی طرف اشارہ ہے، جو یہ ہیں: حیات، علم، ارادہ، قدرت، سمع، بصر، اور کلام، تاکہ کلیات اور جزئیات کا قول اور فعل دونوں اعتبار سے جزا اور بدلہ ممکن ہو۔

(شرح القسطلانی ج ۱۰ ص ۴۲۹)

اہلِ جنت کی سب سے بڑی تعداد امتِ محمدیؐ پر مشتمل ہوگی

(۲۵۴) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: "(قیامت کے دن میدانِ حشر میں) اللہ تعالیٰ آواز دے گا کہ اے آدمؑ! آدمؑ جواب دیں گے کہ میں حاضر ہوں، تیری تابعداری کے لئے تیار ہوں، اور ساری بھلائیاں تیرے ہی ہاتھوں میں ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آگ والوں کے لشکر کو نکال لو (یعنی ہمیں تمہاری اولاد میں سے جن لوگوں کو دوزخ میں بھیجنا منظور ہے ان کو علیحدہ کرلو) آدمؑ عرض کریں گے: دوزخیوں کے لشکر کی تعداد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے (یعنی دوزخیوں کا تناسب یہ ہے کہ ہر ہزار میں سے ایک آدمی جنت میں اور باقی دوزخ میں ڈالے جائیں گے) یہ حکمِ خداوندی سن کر چھوٹی عمر والا بوڑھا ہو جائے گا اور ہر حاملہ عورت اپنا حمل وضع کردے گی، اور (اس وقت) تم دیکھو گے کہ لوگ گویا نشہ میں مست ہیں، حالانکہ وہ مست نہیں ہوں گے بلکہ عذابِ خداوندی بہت سخت ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے (جب یہ سنا تو) عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ ایک ہم میں کون ہوگا؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: اطمینان رکھو، غم نہ کھاؤ، وہ (جنت میں جانے والا) ایک شخص تم میں سے ہوگا، اور (دوزخ میں جانے والے) ہزار شخص یاجوج و ماجوج میں سے ہوں گے، پھر آپؐ نے فرمایا" اس

ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میں امید رکھتا ہوں کہ تم اہل جنت کی مجموعی تعداد کا چوتھا حصہ ہوگے، ابو سعید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ (یہ سن کر مارے خوشی کے) ہم نے نعرہ تکبیر بلند کیا، (کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ ہم اتنی بڑی تعداد میں جنت کے مستحق ہوں گے)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر (اور بڑی بشارت دینے کیلئے) فرمایا: کہ میں امید رکھتا ہوں کہ تم اہل جنت کی مجموعی تعداد کا تہائی حصہ ہوگے، (یہ سن کر) ہم نے پھر نعرہ تکبیر بلند کیا، پھر آپؐ نے فرمایا لوگوں کے درمیان تمہاری تعداد اتنی کم ہے جیسا کہ سفید بیل کے جسم پر ایک سیاہ تل یا ایک کالے بیل کے جسم پر ایک سفید بال ہو۔''

(صحیح البخاری، سورۃ الحج، باب وتری الناس سکری، ج۲ ص ۹۷، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحشر ص ۴۸۳).

فائدہ:

''ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے'' ان الفاظ کے اعتبار سے یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نقل کردہ اس حدیث کے متعارض ہے جس میں فرمایا گیا کہ ہر سو میں میں ننانوے لوگ دوزخی ہوں گے؟ چنانچہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ ان دونوں روایتوں میں کسی خاص عدد کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ اصل مقصد اہل ایمان کی تعداد کے کم ہونے اور اہل کفر کی تعداد کے زیادہ ہونے کو بیان کرنا ہے! اور یہ احتمال بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ''آگ والوں کے لشکر'' سے مراد کافر ہوں اور ''دوزخ میں جانے والوں'' سے مراد گنہگار ہوں، لہٰذا یہاں ''ہر ہزار میں سے ننانوے'' کا جو تناسب بیان کیا گیا ہے وہ کافروں کے اعتبار سے ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''ہر سو میں سے ننانوے'' کا جو تناسب بیان کیا گیا ہے وہ گنہگاروں کے اعتبار سے ہے۔

اور علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث کے مفہوم کو تو حضرت آدمؑ کی تمام ذریت پر محمول کیا جائے، یعنی یہاں حدیث میں اہل دوزخ کے لئے ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے کا جو

تناسب بیان کیا گیا ہے، وہ از اول تا آخر تمام انسانوں کے اعتبار سے ہے، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اہل دوزخ کے لئے "ہر سو میں سے ننانوے" کا جو تناسب بیان کیا گیا ہے اس کو یاجوج و ماجوج کے علاوہ دوسرے لوگوں پر محمول کیا جائے، اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج کا ذکر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی کی روایت میں ہے نہ کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں، یا یہ کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت کا تعلق تمام مخلوق سے ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا تعلق صرف امتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے،" اور یا پھر یہ کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں "اہل دوزخ کے لشکر" سے مراد تمام کفار اور تمام گنہگار ہیں، جبکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں "اہل دوزخ کے لشکر" سے مراد صرف مسلمان گنہگار ہیں۔

بہر حال! ان تاویلات اور توجیہات سے ان دونوں رواتیوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں رہتا۔ "اور ہر حاملہ اپنا حمل وضع کردے گی" اس کے بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ بات فرض کرنے کے طور پر کہی گئی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بالفرض اس وقت کوئی چھوٹی عمر کا ہو تو وہ اس صورتِ حال کی ہیبت اور اس فیصلہ خداوندی کے صدمہ وخوف سے بوڑھا ہو جائیگا، اسی طرح اس وقت اگر کوئی عورت حمل سے ہو تو مارے ہیبت کے اس کا حمل گر پڑے گا۔

بعض حضرات نے یہ احتمال بیان کیا ہے کہ جو عورتیں حمل کی حالت میں فوت ہوئی ہوں گی وہ اپنے حمل کے ساتھ اٹھ کر میدان حشر میں آئیں گی، اور اس وقت وہ حکم خداوندی سن کر مارے ہیبت کے ان کا حمل گر پڑیگا، اسی طرح چھوٹی عمر والے اٹھ کر میدان حشر میں آئیں گے وہ بھی مارے ہیبت کے بوڑھے ہو جائیں گے، یہ اور بات ہے کہ وہ جنت میں جاتے وقت جوان ہو جائیں گے۔ (تفسیر قرطبی)

"اطمینان رکھو غم نہ کھاؤ" کے ذریعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خوف وخدشہ کو دور فرمایا کہ دراصل یاجوج و ماجوج کی قوم کے لوگ اتنی کثرت میں ہوں گے اگر تمہاری اور ان کی تعداد کا تناسب نکالا جائے تو وہ اس طرح ہوگا کہ ان میں سے ایک ہزار

شخص اور تم میں سے صرف ایک شخص، اور اس صورتِ حال میں بھی اہل جنت کی تعداد کچھ کم نہیں ہوگی، بلکہ بہت ہوگی، لہٰذا تمہیں اس خدشہ میں نہ پڑنا چاہئے کہ جنت میں جانے والوں کا تناسب، دوزخ میں جانے والوں کے تناسب سے اس قدر کم ہوگا تو ہم میں سے بہت ہی کم لوگ جنت میں جائیں گے! تاہم اس بات سے یہ ضرور واضح ہوگیا کہ مجموعی طور پر دوزخ میں جانے والوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور جنت میں جانے والوں کی تعداد کم، لیکن اگر اہل جنت میں ملائکہ اور حوروں کو بھی شامل کرلیا جائے تو شاید اہل جنت کی تعداد اہل دوزخ کی تعداد سے بڑھ جائے گی۔ اور اس صورت میں حدیثِ قدسی ''غلبت رحمتی علیٰ غضبی'' (میری رحمت میرے غضب پر غالب ہوئی) کے معنی بھی صحیح ہوں گے۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہلِ جنت میں امتِ محمدیؐ کا جو تناسب بیان فرمایا ہے اس کو آپؐ نے بتدریج ذکر فرمایا، یکبارگی ذکر نہیں کیا، تاکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل خوشی کے مارے پھٹ نہ جائیں۔ یا بتدریج ذکر اس بناء پر فرمایا کہ شاید امتِ محمدیؐ کے لوگ کئی مراحل میں اسی تناسب کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے۔ یعنی پہلے مرحلہ میں جو لوگ جنت میں جائیں گے وہ اہل جنت کی مجموعی تعداد کا چوتھا حصہ ہوں گے، اس کے بعد جو لوگ داخل ہوں گے ان کو ملا کر اہل جنت کی مجموعی تعداد کا تہائی حصہ بنے گا، یہاں تک کہ جب سب لوگ جنت میں پہنچ جائیں گے تو پھر امتِ محمدیؐ کے لوگ اہل جنت کی مجموعی تعداد کا آدھا حصہ ہوں گے۔ اور یا پھر یہ کہ اس سلسلہ میں آپ پر متعدد بار وحی نازل ہوئی اور مذکورہ تناسب کو اسی تدریج کے ساتھ بیان کیا گیا۔ چنانچہ جب بھی وحی نازل ہوتی اور اس میں جس تناسب کا ذکر ہوتا آپؐ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بشارت دینے کیلئے اسی کو بیان فرمادیتے۔!

بہرحال! یہ احتمالات مذکورہ تناسب کو بتدریج ذکر کرنے کے سلسلہ میں ہیں، جو اصل بات ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امتِ محمدیؐ کے لوگ اہل جنت کی مجموعی تعداد کا نصف ہوں گے! حالانکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جنت میں امتِ محمدیؐ کی تعداد دو تہائی ہوگی۔ چنانچہ یہ ثابت ہے کہ اہل جنت کی ایک سو بیس (۱۲۰) صفیں ہوں گی، جن میں سے اسّی (۸۰) صفیں آنحضرت ﷺ کی امت پر مشتمل ہوں گی اور چالیس صفیں

باقی تمام امتوں کی ہوں گی۔‘‘(سنن الترمذی ۔ صفة الجنة ، باب ماجاء فی صف اهل الجنة رقم الحدیث: ۲۵۴۶)۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب یہ حدیث (کہ جس سے امت محمدیؐ کا اہل جنت کی مجموعی تعداد کا نصف حصہ ہونا معلوم ہوتا ہے) ارشاد فرمائی تھی تو اس وقت تک آپؐ کو یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ امت محمدیؐ، اہل جنت کی کل تعداد کا دوتہائی حصہ ہوگی! اور نیز یہ بھی احتمال ہے کہ آپؐ نے ’’نصف حصہ‘‘ والی بات ابتدائی مرحلہ میں جنت میں جانے والوں کے تناسب کے اعتبار سے فرمائی ہو۔

(مظاهر حق ج۵ ص ۱۲۸ تا ۱۲۹ ، تفصیل کیلئے دیکھیں :فیض الباری ۴/۲۰۹)

(۲۵۵) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر جب یہ آیت نازل ہوئی: ’’یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ..... وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ (الحج ۲،۱)‘‘اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہے......... بلکہ اللہ کا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔‘‘ تو آپؐ اس وقت سفر میں تھے آپؐ نے فرمایا: ’’کیا تم جانتے ہو کہ یہ کونسا دن ہوگا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ خوب جانتے ہیں! آپؐ نے فرمایا ’’یہ وہ دن ہوگا جس دن اللہ تعالیٰ، حضرت آدمؑ سے فرمائیں گے’’دوزخ کے لشکر کو بھیج دو، وہ عرض کریں گے: اے میرے پروردگار! دوزخ کا لشکر کون سا ہے؟ فرمایا کہ نوسو ننانوے دوزخ میں اور ایک جنت میں جائے گا، مسلمان یہ سن کر رونے لگے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا’’ قریب رہو اور (اپنے اعمال کو) ٹھیک کرتے رہو، اس لئے کہ جب بھی نبوت آئی اس سے پہلے جاہلیت ضروری موجود تھی، فرمایا: یہ تعداد جاہلیت والوں میں سے لی جائے گی، اگر تعداد پوری ہوگئی تو ٹھیک، ورنہ منافقوں کے ذریعہ اسے پورا کیا جائے گا، اور تمہاری اور دوسری امتوں کی مثال ایسی ہے جیسے جانوروں کے ہاتھ پر نشان یا اونٹ کی کمر پر تل، پھر آپؐ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ تم جنت والوں میں سے ایک تہائی حصہ ہوگے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کی، پھر آپؐ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ تم اہل جنت کے نصف حصہ ہوگے۔‘‘ (راوی) کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ دوتہائی فرمایا، یا نہیں۔‘‘ (جامع الترمذی، باب سورة الحج ۲/۱۹۹،۲۰۰)

(۲۵۶) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا ''ایک سفر میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، آپؐ کے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم چلتے ہوئے آگے پیچھے ہو گئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آیتیں بآواز بلند پڑھیں۔ يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ.........وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ. (الحج: ۱، ۲) ''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہے......... بلکہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ سنا تو اونٹنیوں کو تیز بھگایا اور یہ سمجھ گئے کہ آپ کچھ فرمانا چاہتے ہیں، آپؐ نے فرمایا ''یہ اس دن ہوگا جس دن اللہ تعالیٰ، حضرت آدمؑ کو آواز دیں گے: اللہ تعالیٰ ان سے فرمائیں گے: اے آدم! دوزخ کے لشکر کو بھیج دو' وہ عرض کریں گے کہ اے پروردگار! دوزخ کا لشکر کون سا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے دوزخ میں ہوں گے، اور ایک جنت میں! لوگ یہ سن کر پریشان ہو گئے، کسی کے چہرے پر خوشی کے آثار نہ تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کیفیت میں دیکھا تو آپؐ نے فرمایا ''عمل کرتے رہو اور خوشخبری سنو! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! تم ایسی دو مخلوقوں کے ساتھ ہو کہ وہ جس کے ساتھ بھی ہوں گے اس پر غالب آجائیں گے اور وہ یاجوج و ماجوج ہیں، اور وہ جو آدم علیہ السلام کی اولاد اور شیطان کی ذریت میں سے مر گئے ہیں، چنانچہ لوگوں پر جو خوف و دہشت طاری تھی (یہ سن کر) وہ دور ہو گئی، پھر آپؐ نے فرمایا ''عمل کرتے رہو اور خوشخبری سنو! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! لوگوں کے درمیان تم ایسے ہو جیسے اونٹ کے پہلو پر تل یا چوپایہ کے ہاتھ میں نشان۔'' (جامع الترمذی، سورۃ الحج ۲/۱۹۹، ۲۰۰)

آیت مبارکہ کی توضیح:

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، سورۃ الحج کی مذکورہ آیات (۱،۲) کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''قیامت کے عظیم الشان زلزلے (بھونچال) دو ہیں: ایک عین قیام قیامت کے وقت یا نفخہ ثانیہ کے بعد، دوسرا قیامت سے کچھ پیشتر، جو علاماتِ قیامت میں

سے ہے، اگر یہاں دوسرا مراد ہو تو آیت اپنے ظاہری معنی پر رہے گی، اور پہلا مراد ہو تو دونوں احتمال ہیں، حقیقۃً زلزلہ آئے اور دودھ پلانے والی یا حاملہ عورتیں اپنی اسی ہئیات پر محشور ہوں، یا زلزلہ سے مراد وہاں کے اہوال وشدائد ہوں اور" يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ کو تمثیل پر حمل (محمول) کیا جائے، یعنی اس قدر گھبراہٹ اور سختی ہوگی کہ اگر دودھ پلانے والی عورتیں موجود ہوں تو مارے گھبراہٹ اور شدتِ ہول کے اپنے بچوں کو بھول جائیں اور حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں، اس وقت لوگ اس قدر مدہوش ہوں گے کہ دیکھنے والا شراب کے نشہ میں گمان کرے، حالانکہ وہاں نشہ کا کیا کام! خدا کے عذاب کا تصور اور اہوال وشدائد کی سختی ہوش گم کر دے گی۔

(تنبیہ) اگر یہ گھبراہٹ سب کو عام ہو تو لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ" میں نفی باعتبار اکثر احوال کے اور یہاں اثبات باعتبار ساعتِ قلیلہ کے لیا جائے گا، اور اگر آیت حاضرہ اکثر ناس کے حق میں ہو، سب کے حق میں نہ ہو تو سرے سے اشکال ہی نہیں۔" (تفسیر عثمانی ص ۴۲۹، فائدہ نمبر ۵)

سورۃ الحج کی ابتداء ہی میں اصل مضمون سے پہلے قیامت کا لرزہ خیز اور ہولناک منظر پیش کیا گیا ہے، تاکہ پڑھنے والوں کے دلوں میں خشیت الٰہی کی وجہ سے انابت وطاعت کا جذبہ پیدا ہو جائے اور ان کے قلوب، قبولِ حق کے لئے مستعد ہو جائیں اور "إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ "الخ ماقبل کی علت ہے، پہلے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہاں قیامت کے ہولناک منظر اور تباہ کن زلزلے کو بطورِ مثال پیش کیا گیا، اور اس سے مقصد یہ ہے کہ قیامت کے ہولناک عذاب سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ انسان لباسِ تقویٰ زیبِ جان کرے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اتباع کرے اور اس کے محظورات (منع کردہ کاموں) سے اجتناب کرے۔

(تفسیر ابی السعود ج ٦ ص ٣٠٢)

''زلزلۃ الساعۃ'' سے کیا مراد ہے؟

''زلزلۃ الساعۃ'' کی مراد کے بارے میں مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا تو اس وقت شدید زلزلہ آئے گا۔ اس طرح یہ زلزلہ قیامت کی ایک عظیم نشانی ہوگی۔ یہ قول علقمہؒ اور شعبیؒ کا ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۰۲، البحر ج۶ ص ۳۴۹)

(۲) اس سے مراد وہ زلزلہ ہے جو نفخہ اولیٰ کے ساتھ آئے گا اور اس سے تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا، اور پھر قیامت برپا ہو جائے گی، یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (تفسیر خازن و معالم ج ۵ ص ۲)

بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد وہ زلزلہ ہے جو قیامت اور لوگوں کے قبروں سے اٹھنے کے بعد آئے گا، اس کی تائید ایک مرفوع حدیث سے ہوتی ہے کہ حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت انسؓ بن مالکؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ''یہ زلزلہ کب آئے گا'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں! آپؐ نے فرمایا: یہ قیامت کے دن ہوگا، جب اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا کہ ''اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ، دوزخ کی طرف بھیج دے الخ۔ (تفسیر ابن کثیر ج۳ ص ۳۰۵، و تفسیر مدارک التنزیل ج۳ ص ۷۲)

(۳۴) ﴿اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ﴾

(۲۵۷) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''یہود کے عالموں میں سے ایک عالم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے محمد! ہم (تورات میں) پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کو ایک انگلی پر اٹھالیں گے اور زمینوں کو ایک انگلی پر، اور درختوں کو ایک انگلی پر، اور پانی اور مٹی کو ایک انگلی پر، اور تمام مخلوق کو ایک انگلی پر، پھر فرمائیں گے، میں بادشاہ ہوں، (یہ سُن کر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس یہودی عالم کی تصدیق میں ہنسے، یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ''. ''اور ان لوگوں نے اللہ کی عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنی چاہئے تھی اور حال یہ ہے کہ (الزمر: ۶۷) ساری زمین اسی کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن، اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے وہ پاک ہے، اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے''۔ (صحيح البخاري، كتاب التفسير، سورة الزمر، ج۶ ص ۱۲۶)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کتاب التوحید میں بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، اور اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ'' پھر ان سب کو ہلا کر فرمائے گا کہ: میں ہی بادشاہ ہوں، میں ہی بادشاہوں''۔ صحيح مسلم، باب صفة القيامة والجنة والنار میں یہ روایت موجود ہے۔

فائدہ:

''لپیٹنے'' کے ایک معنی کاغذ تہہ کرنے کے بھی آتے ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:'' يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ'' (الانبياء: ۱۰۴) ''جس روز ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جس طرح طومار کاغذات کو لپیٹ لیا جاتا ہے۔''

اور اس کے معنی فنا اور ختم کرنے کے بھی آتے ہیں، جیسے اہل عرب کہتے ہیں:'' طويت فلاناً بسيفي'' یعنی میں نے اسے اپنی تلوار سے فنا اور ختم کر دیا۔''

قاضی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ ان آسمانوں اور زمین کو اپنی قدرت سے فنا کردیں گے، تاکہ کسی کے لیے یہ ٹھکانہ نہ بن سکیں۔

بہر حال! صفاتِ باری والی آیات واحادیث پر ایمان لانا واجب ہے، اور اس سلسلہ میں یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جو معنی بھی مراد ہیں وہ برحق ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ذات، جسم اور جسمیات سے منزہ اور پاک ہے، جو معنی اس کی شایانِ شان ہیں وہی مراد ہیں۔

"یہودی عالم کی تصدیق میں ہنسے" علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ (شارحِ بخاری) فرماتے ہیں کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہود چونکہ مشبہین میں سے ہیں اس لئے وہ اس طرح کے الفاظ کو تشبیہ پر محمول کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں کا یہ مذہب نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس کے قائل ہیں، امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے، مزید لکھتے ہیں کہ "اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے عبیدہؒ کے طریق سے بہت سے راویوں نے نقل کیا ہے، لیکن اس میں انہوں نے یہ الفاظ ذکر نہیں کیے کہ: "اس عالم یہودی کی تصدیق میں ہنسے" چنانچہ ممکن ہے کہ یہ راوی کا اپنا خیال ہو، آپ کا ہنسنا اس یہودی عالم کی دروغ گوئی پر مبنی تھا، راوی یہ سمجھے کہ آپ کا تعجب کرنا اس کی تصدیق کی وجہ سے تھا، حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں کہ: خطابیؒ نے انگلی کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ لفظ نہ قرآنِ حکیم میں آیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں، اور یہ امر طے شدہ ہے کہ جس ہاتھ کی نسبت اللہ جل شانہ، کی طرف ہوتی ہے وہ ہمارے ہاتھ کی طرح کا عضو نہیں ہے، جس سے انگلیوں کا اثبات کیا جائے، بلکہ شارع نے ہاتھ کا اطلاق کیا ہے، ہمیں نہ اس کی حقیقت معلوم ہے اور نہ ہم کسی دنیوی ہاتھ سے اسے تشبیہ دیں گے، ممکن ہے، انگلیوں کا ذکر ان یہود کی سازش ہو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو تشبیہ دیتے ہیں۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ "المفہم" میں لکھتے ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (دراصل) اس یہودی عالم کی جہالت پر ہنسے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے اس موقع پر آیت کریمہ: "وَمَاقَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ" تلاوت فرمائی، صحیح اور تحقیقی قول یہی ہے، جس راوی نے

تصدیق والے الفاظ زیادہ ذکر کیے ہیں اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے، یہ راوی کا اپنا قول ہے اور باطل ہے، اس لئے کہ رسولِ اکرم ﷺ ناممکن بات کی تصدیق نہیں فرما سکتے، یہ اوصاف اللہ جل شانہ کے حق میں محال اور ناممکن ہیں، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ انگلیوں والا ہوتا اور اعضاء ہوتے تو وہ انسانوں کی طرح ہوتے اور اگر وہ انسانوں کی طرح ہوتا تو وہ معبود نہیں بن سکتا، بس یہودی کا مذکورہ قول محال اور جھوٹ پر مبنی ہے۔

بعض حضرات نے اس قول پر گرفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ انگلیوں کا ذکر احادیث میں آتا ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ ''ابنِ آدم کا دل، رحمان کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان میں ہے۔''

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ کتاب التفسیر میں امام خطابی رحمہ اللہ اور قرطبی رحمہ اللہ کا کلام نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روایات کو زیادہ سمجھتے تھے، اور وہ یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اس یہودی کی تصدیق کی وجہ سے ہنسے تھے، اور یہ بات صحیح حدیث میں آتی ہے کہ ''ہر دل رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہے'' جیسا کہ رب ذوالجلال کے بہترین صورت میں آنے، اپنا دستِ قدرت حضور اکرم ﷺ کے سینہ مبارک پر رکھنے کا ذکر بخاری ومسلم میں آتا ہے، جو حدیث متواتر کی طرح ہے، لہٰذا جب یہ امور ثابت ہیں تو یہ بھی دوسرے متشابہات کی طرح ہیں، جیسے ہاتھ، قدم، ساق، اور پہلو وغیرہ۔

ہمارے ائمہ کرام کا ایسے متشابہات کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی تاویل کی جائے یا پھر اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے معنیٰ کو سپرد کر دیا جائے! سلفِ صالحین تو ان کے معنیٰ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں اور یہ طریقہ زیادہ محفوظ اور صحیح ہے، اور اخلاف (متاخرین) ان کی تاویل کرتے ہیں، تاکہ گمراہ کن لوگوں کو گمراہ کرنے کا موقع نہ ملے، چنانچہ وہ انگلی کی تاویل قدرت سے کرتے ہیں۔

ابن فورک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ احتمال بھی ہے کہ ''انگلی'' سے مراد کسی مخلوق کی انگلی ہو۔ (شرح القسطلانی ج۷ ص ۳۲۰، فتح الباری ۸/۵۵۱)

(۲۵۸) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کچھ اضافہ کے ساتھ یوں نقل کرتے ہیں کہ " حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آسمانوں کو لپیٹ کر اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑ لیں گے، پھر فرمائیں گے، میں بادشاہ ہوں، جابر لوگ کہاں ہیں؟ متکبر لوگ کہاں ہیں؟ پھر زمین کو اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑیں گے اور فرمائیں گے: میں بادشاہ ہوں، جابر لوگ کہاں ہیں؟ متکبر لوگ کہاں ہیں۔" (صحیح مسلم ، باب صفة القيامة والجنة والنار)

(۲۵۹) نیز امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبید اللہ بن مقسمؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو کس طرح بیان کر رہے ہیں، فرمایا کہ " اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو ایک ہاتھ میں پکڑیں گے اور فرمائیں گے: میں اللہ ہوں، اور اپنی انگلیوں کو کھولیں گے اور بند کریں گے، میں بادشاہ ہوں، یہاں تک کہ میں نے منبر کو دیکھا کہ وہ نیچے تک ہلنے لگا، یہاں تک کہ میں یہ کہنے لگا کہ کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر گرنے والا ہے۔ (ایضاً)

مذکورہ روایات کو امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی " سنن ابی داود، باب الرؤية، ج ۴ص ۱۸۳ پر اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سنن ابن ماجه، باب فيما انكرت الجهمية ج ۱ص ۴۵ پر ذکر کیا ہے۔

(۳۵) ﴿شفاعت سے متعلق احادیثِ نبویہ﴾

آنحضور ﷺ کی شفاعت کا ذکر:

(۲۶۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں (پکا ہوا) گوشت لایا گیا، اس میں سے دست کا گوشت آپؐ کو پیش کیا گیا جو آپ ﷺ کو بہت پسند اور مرغوب تھا، آپ نے اس میں سے دانتوں سے نوچ نوچ کر کھایا، اور فرمانے لگے، ''میں قیامت کے روز، جبکہ دو جہاں کے پروردگار (کا فیصلہ سننے کے انتظار میں) کے سامنے کھڑے ہوں گے، تمام لوگوں کا سردار ہوں گا، اس دن سورج (لوگوں کے سروں کے) بہت قریب ہوگا اور لوگوں کی حالت (مسلسل کھڑے رہنے، گرمی کی تپش وسختی اور وہاں کے ہولناک ماحول کے اثر سے) اس قدر کربناک اور غم وفکر سے بوجھل ہوگی کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں گے۔ (یعنی صبر واستقامت پر قادر نہیں ہوں گے اور نہایت حیرانی وپریشانی کے عالم میں) ایک دوسرے سے کہتے پھریں گے کہ آخر تم کسی ایسے شخص کی تلاش کیوں نہیں کرتے جو تمہارے پروردگار سے تمہاری سفارش کردے، چنانچہ لوگ حضرت آدمؑ کے پاس آئیں گے، اسکے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یا خود آنحضرت ﷺ نے شفاعت کے سلسلہ میں حدیث کے (وہی) اجزاء بیان کیے (جو ایک حدیث میں بیان ہو چکے ہیں، کہ لوگ یکے بعد دیگرے تمام انبیاء کے پاس جا کر شفاعت کی درخواست کریں گے اور وہ سب جواب دیں گے کہ ہم اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے، اور پھر وہ لوگ شفاعت کی درخواست لے کر میرے پاس آئیں گے، یہ ذکر کرنے کے بعد) آپؐ نے فرمایا: پس میں (لوگوں کے پاس سے) روانہ ہوں گا اور عرش کے نیچے آؤں گا اور وہاں (بارگاہ رب العزت میں) اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی حمد وثناء کے وہ الفاظ واسلوب منکشف کردے گا جو مجھ سے پہلے اس نے کسی پر منکشف نہیں کیے ہوں گے (یعنی اس موقع پر میرے دل میں اپنی حمد وثناء کے وہ الفاظ اور آداب حضوری کے وہ طریقے القاء فرمائے گا جو اس نے مجھ سے پہلے کسی اور کو القاء نہیں کیے ہوں گے بلکہ اس

وقت سے پہلے مجھ کو بھی ان کا کوئی علم نہیں ہوگا) پھر پروردگار فرمائے گا: اے محمدؐ! اپنا سر اٹھاؤ! جو چاہتے ہو مانگو، میں دوں گا، شفاعت کرنا چاہتے ہو تو کرو، میں قبول کروں گا، چنانچہ میں اپنا سر اٹھاؤں گا، اور عرض کروں گا کہ اے میرے پروردگار! میری امت کو بخش دیجئے، اے میرے پرودگار! میری امت کو بخش دیجئے، اے میرے پروردگار! میری امت کو بخش دیجئے۔ تب کہا جائے گا کہ اے محمدؐ! آپؐ اپنی امت میں سے ان لوگوں کو جن سے حساب کتاب نہیں لیا جائے گا (اور جو حساب کتاب کے بغیر جنت کے مستحق ہیں) جنت کے دائیں جانب کے دروازے سے جنت میں داخل کردیجئے، اور وہ لوگ اس دروازے کے علاوہ دوسرے (اطراف کے) دروازوں (کے استعمال کے حق میں بھی) لوگوں کے ساتھ شریک ہیں، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے! جنت کے دروازوں میں سے ہر ایک دروازہ کے دونوں کواڑ ں کے درمیان کا فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا کہ مکہ اور ہجر کے درمیان ہے۔"

(صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب قول اللّٰہ تعالیٰ انا ارسلنا نوحاً الی قومہ ان انذر قومک ج۴ ص ۳۴)

شفاعت کا مطلب:

"شفاعت" کا مطلب ہے گناہوں کی معافی کی سفارش کرنا" چنانچہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس دن بارگاہِ رب العزت میں گنہگار اور مجرم بندوں کے گناہوں اور جرموں کے معاف کیے جانے کی درخواست پیش کریں گے، اس لیے عام طور پر "شفاعت" کا لفظ اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے، ویسے "شفاعت" کا لفظ شفعٌ سے ماخوذ (نکلا) ہے جس کے اصل معنی جوڑا (جفت) کرنے، کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ ملانے کے ہیں، وتر (طاق) کے مقابلہ پر شفع (جفت) کا جو لفظ آتا ہے وہ اس معنی کے اعتبار سے ہے۔ اسی طرح زمین یا مکان میں ہمسائیگی کی وجہ سے جو حق خرید حاصل ہوتا ہے، اس کو بھی "شفعہ" اسی معنی کی مناسبت سے کہا جاتا ہے، پس "شفاعت" میں بھی یہ معنی اس اعتبار سے موجود ہیں کہ شفاعت کرنے والا جرم و گناہ کرنے والے کی معافی کی درخواست پیش کر کے گویا خود کو اس

مجرم و گنہگار کے ساتھ ملاتا ہے۔

شفاعت کی قسمیں:

جن لوگوں نے اس دنیا میں صغیرہ و کبیرہ گناہ کئے ہوں گے ان کے حق میں آنحضرت ﷺ کی شفاعت کا قبول ہونا اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

واضح رہے کہ شفاعت کی مختلف نوعیتیں ہوں گی، اور وہ تمام نوعیتیں، آنحضرت ﷺ کی ذاتِ عالیٰ کے لئے ثابت ہیں، چنانچہ ان میں سے بعض شفاعتیں تو ایسی ہیں جو صرف آنحضرت ﷺ کی ذات سے مخصوص ہوں گی، اور بعض ایسی ہیں جن میں دوسروں کے ساتھ مشارکت ہوگی، لیکن شفاعت کا دروازہ چونکہ سب سے پہلے آپ ہی کھولیں گے، اس لئے حقیقت میں تمام شفاعتیں لوٹ کر آپ ہی کی طرف منسوب ہوں گی، اور علی الاطلاق تمام شفاعتوں کے والی آپ ہی ہیں۔

(۱) شفاعت کی سب سے پہلی قسم ''شفاعتِ عظمیٰ'' ہے اور یہ وہ شفاعت ہے جو تمام مخلوق کے حق میں ہوگی۔ اور یہ شفاعت کرنے کا شرف و اعزاز ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو حاصل ہوگا۔ انبیائے کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین میں سے بھی کسی کو اس شفاعت کی مجال اور جرأت نہیں ہوگی، اور اس ''شفاعت عظمیٰ'' سے مراد ہے تمام میدانِ حشر کے لوگوں کو راحت دینے، وقوف کی شدت وطوالت کو ختم کرنے، حساب کتاب اور پروردگار عالم کے آخری فیصلہ کو ظاہر کرنے اور تمام لوگوں کو محشر کی ہولناکیوں، شدتوں اور سختیوں سے چھٹکارا دینے کی سفارش کرنا۔

(۲) شفاعت کی دوسری قسم وہ ہے جس کے ذریعہ ایک طبقہ کو حساب کتاب کے بغیر جنت میں پہنچانا مقصود ہوگا، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں اس کا ثبوت ملتا ہے، بلکہ بعض حضرات کے نزدیک یہ شفاعت بھی آنحضرت ﷺ ہی کی ذات کے لئے مخصوص ہے۔ (۳) شفاعت کی تیسری قسم وہ ہے جس کی مدد سے ان لوگوں کو جنت میں پہنچانا مقصود ہوگا جن کے نامہ اعمال میں ثواب اور گناہ مساوی طور پر ہوں گے۔ (۴) شفاعت کی چوتھی

قسم وہ ہے جس کے ذریعہ ان لوگوں کو جنت میں پہنچانا مقصود ہوگا جو اپنے گناہ اور جرائم کی سزا بھگتنے کیلئے دوزخ کے مستوجب قرار پائیں گے۔ آنحضرت ﷺ ان لوگوں کے حق میں شفاعت کریں گے اور ان کو جنت میں داخل کرائیں گے۔ (۵) شفاعت کی پانچویں قسم وہ ہے جس کے ذریعہ کچھ لوگوں کے درجات اور مراتب اور ان کے اعزاز و اکرام میں ترقی اور اضافہ کرانا مقصود ہوگا۔ (۶) شفاعت کی چھٹی قسم وہ ہے جو ان گنہگاروں کے حق میں ہوگی جنہیں دوزخ میں ڈالا جائے گا اور وہ اس شفاعت کے بعد وہاں سے نکال کر جنت میں پہنچائے جائیں گے، اس شفاعت کا حق مشترکہ ہوگا، یعنی آنحضرت ﷺ کے علاوہ دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام، ملائکہ عظام، علماء کرام اور شہداء بھی اپنے اپنے طور پر اور اپنے اپنے لوگوں کیلئے یہ شفاعت کریں گے۔ (۷) شفاعت کی ساتویں قسم وہ ہے جس کے ذریعے ان لوگوں کے عذاب میں تخفیف کرانا مقصود ہوگا جو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عذاب و دوزخ کے مستوجب قرار دیئے جا چکے ہوں گے۔ (۸) شفاعت کی آٹھویں قسم وہ ہے جو صرف اہلِ مدینہ کے حق میں ہوگی۔ (۹) شفاعت کی نویں قسم وہ ہے جو امتیاز و اختصاص کے طور پر صرف ان لوگوں کے حق میں ہوگی جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے روضہ اقدس کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہوگا۔

شفاعت کے متعدد مواقع:

علماء نے لکھا ہے کہ شفاعت کے متعدد مواقع و محل ہوں گے، شفاعت کا سب سے پہلا موقع و محل تو وہ ہوگا جب لوگوں کو بارگاہ رب العالمین میں پیش کرنے کیلئے میدانِ محشر میں لاکر کھڑا کر دیا جائے گا، اس وقت لوگ خوف و خجالت کے پسینہ میں غرق ہوں گے، ہر ایک پر ہیبت و دہشت چھائی ہوگی، ہر شخص مؤاخذہ اور عذاب کے خوف سے کانپ رہا ہوگا، اس وقت شفیع المذنبین اور شافعِ روزِ محشر ﷺ شفاعت کریں گے، تاکہ لوگوں کو کچھ اطمینان و راحت مل جائے اور وہ بیٹھ کر دم لے سکیں۔ پھر جب بارگاہِ رب العزت سے حکم ہوگا کہ ان سب کو لے جایا جائے اور حساب کتاب لیا جائے تو اس موقع پر بھی آنحضور ﷺ

درخواست کریں گے کہ ان کو حساب سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور یوں ہی معاف فرما دیا جائے اور اگر سب کا حساب کتاب ضروری لیا جانا ہو تو سرسری حساب پر اکتفاء کرلیا جائے، حساب میں شدت وسختی اور سخت باز پرس نہ کی جائے، کیونکہ جو بھی سخت حساب سے دو چار ہوگا، اس کا عذاب سے بچنا ممکن نہیں ہوگا۔ پھر حساب کتاب کے بعد جو لوگ مستوجب عذاب قرار پائیں گے، ان کو دوزخ میں بھیجا جائے گا تو یہ موقع بھی شفاعت کا ہوگا، تا آنکہ ان کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا، آنحضرتؐ شفاعت کریں گے اور ان کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں پہنچوائیں گے۔

غرضیکہ ان ہولناک مواقع پر شروع سے لے کر آخر تک رسول کریم ﷺ کی شفاعت اور غفار وکریم پروردگار کی رحمت وعنایت سے عفو وکرم کی بہت کچھ امید رکھنی چاہئے، ویسے جو کچھ بھی فیصلۂ خداوندی صادر ہو۔

اب مذکورہ بالا حدیث کی وضاحت ملاحظہ ہو:

''میں قیامت کے دن تمام لوگوں کا سردار ہوں گا۔'' اس جملہ میں ''تمام لوگوں'' کا اطلاق پوری نوعِ انسانی پر ہے، جس میں انبیاء کرامؑ بھی شامل ہیں، اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے۔ ''**انا سید ولد آدم یوم القیامة**'' یعنی میں قیامت کے دن تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا۔'' اور یہ بات آپ ﷺ نے اس اعتبار سے ارشاد فرمائی کہ اس توقیر وعزت کی بناء پر کہ جو آپ کو بارگاہ خداوندی میں سب سے زیادہ قرب ومحبوبیت کی وجہ سے حاصل ہوگی، اس دن ہر ایک آپ ﷺ کی شفاعت کا محتاج ہوگا، جب سب لوگ نہایت مضطرب اور پریشان ہوں گے تو آخر میں آپؐ ہی کے پاس شفاعت کی درخواست لے کر آئیں گے، اور صرف آپؐ ہی ان کی شفاعت کا حوصلہ کریں گے۔

''عرشِ الٰہی کے نیچے آؤں گا۔'' یہ جملہ بظاہر اس حدیث کے خلاف ہے جس میں ''اپنے پروردگار کے گھر میں آنے'' کے الفاظ ہیں، چنانچہ ان دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا گھر جنت ہے اور جنت عرشِ الٰہی کے نیچے ہی

ہے، لہٰذا دونوں حدیثوں کے الفاظ میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں ہے۔

''میرے پروردگار میری امت کو بخش دیجئے'' ان الفاظ کو تین بار کہنا یا تو اپنی عرض کو زیادہ سے زیادہ اہم اور قابل توجہ بنا کر پیش کرنے کیلئے ہوگا، جیسا کہ جب کوئی شخص اپنے حاکم اور آقا سے کسی اہم مقصد کی بارآوری چاہتا ہے تو وہ اپنی عرض کو اس کے سامنے بار بار دُہراتا ہے۔ یا ان الفاظ کو بار بار دھرانے سے گنہگاروں کے طبقوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوگا، جیسا کہ ایک حدیث میں بیان ہوا کہ آپ کی ایک دفع کی شفاعت کسی ایک طبقہ کے ساتھ مختص ہوگی، اور پھر دوسری مرتبہ کی شفاعت کسی دوسرے طبقہ کے ساتھ، اور اس طرح متعدد دفعوں میں سب کی شفاعت پوری ہوگی۔

(مظاہر حق ج۵ ص ۱۵۶، ۱۵۷ و ص ۱۷۱)

ایک اشکال اور اس کا جواب:

یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ ساری مخلوق آپ ﷺ کے پاس آئی تھی اور آپ ﷺ نے سفارش کا وعدہ بھی فرمایا تھا، تو پھر آپؐ نے صرف اپنی امت کی سفارش کیوں کی، دوسرے تمام لوگوں کی سفارش کیوں نہیں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں روایت میں اختصار ہے، ورنہ حضور ﷺ حساب کے آغاز کیلئے تمام لوگوں کی سفارش کریں گے، روایات میں اس کا ذکر آتا ہے، اور وہ ''شفاعت کبریٰ'' ہوگی۔ یہاں روایت میں اپنی امت کیلئے شفاعت صغریٰ کا ذکر ہے۔ (فیض الباری ۴/۱۹۸)

''جنت کے دائیں جانب کے دروازے سے جنت میں داخل کر دیجئے۔''

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے اعزاز و تکریم کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے از راہ عنایت جنت کے دائیں جانب کا دروازہ انہی لوگوں کے لئے مخصوص ہوگا، ان کے علاوہ کسی اور کو اس دروازہ سے داخلہ کی اجازت نہیں ہوگی۔

اس دروازہ کے علاوہ باقی اور جو تمام دروازے ہوں گے وہ دوسرے سب لوگوں کے لئے مشترک ہوں گے اور مذکورہ لوگ بھی ان دروازوں کو استعمال کرنے کا حق رکھیں

گے۔(مظاہر حق ج۵ ص ۱۷۱)

''اس دن سورج بہت قریب ہوگا''بعض روایات میں''قدر المیل''(ایک میل کے برابر) کا اضافہ بھی ہے۔(فتح الباری ۳۹۶/۸)یعنی سورج ایک میل کے بقدر قریب ہو جائے گا۔ راوی نے کہا کہ یہ متعین نہیں کرسکتا کہ اس میل سے مسافت والا میل مراد ہے یا مکحلہ (سرمہ دانی) کے اندر جو سلائی ہوتی ہے، اسے بھی''میل'' کہتے ہیں، مراد ہے! بہرحال! مسافت والا میل بھی مراد ہو تب بھی اس کی گرمی کی شدت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے، آج سورج کا فاصلہ لاکھوں میل سے بھی زائد ہے، لیکن اس کی سوزش اور تپش سے انسان بدحواس ہو جاتے ہیں تو اس وقت گرمی کا کیا عالم ہوگا!!!

''ہجر''ایک جگہ کا نام ہے جو جزیرہ نما عرب کے مشرقی ساحل پر(سعودی عرب کے)اس علاقہ میں واقع ہے جس کو اب''احساء'' کہا جاتا ہے، اور پہلے زمانہ میں''بحرین'' اسی علاقہ کو کہتے تھے۔

بہرحال! اس جملہ کا مقصود جنت کے دروازوں کی چوڑائی اور وسعت کو بیان کرنا ہے کہ جنت کے ہر دروازے کی چوڑائی اس فاصلہ کے بقدر ہے جو مکہ اور ہجر کے درمیان ہے، لیکن اس سے مراد تحدید و تعیین ہرگز نہیں ہے، بلکہ تخمیناً فرمایا گیا ہے، تاکہ لوگوں کو آسانی کے ساتھ جنت کے دروازوں کی چوڑائی اور وسعت کا اندازہ ہو جائے، جہاں تک حقیقت حال کا تعلق ہے وہ کچھ اور ہے۔(مظاہر حق ج۵ ص۱۷۱)

اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے مختلف شہروں کے نام لئے ہیں، بخاری ہی کی ایک روایت میں مکہ اور بصریٰ کے بقدر فاصلہ کا ذکر آتا ہے، تو یہ اس اعتبار سے ہے کہ جس علاقہ کے لوگ آپ سے مخاطب ہیں وہ اپنے علاقہ کے شہروں کے فاصلوں کو جانتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا جواب:

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اتنا بڑا دروازہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں دروازوں کے چھوٹے بڑے اور اس کے مناسب اور حسین ہونے کا تعلق

اور انحصار عمارت کے چھوٹے اور بڑے ہونے پر ہے، عمارت اگر بہت بڑی ہو تو اس کا چھوٹا دروازہ اچھا نہیں لگتا، اور ظاہر ہے کہ جنت کی عمارات تو بڑی عظیم ہوں گی اس لئے ان کے دروازے بھی اسی مناسبت سے بڑے ہوں گے۔

شفاعت سے تمام انبیاءؑ کا انکار:

(۲۶۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن (میدانِ محشر میں) مومنین کو روک دیا جائے گا (یعنی سب کو کسی ایک جگہ اس طرح محصور کر دیا جائے گا کہ کوئی شخص بھی کسی طرح کی نقل وحرکت نہیں کر سکے گا اور ہر شخص سکتے کی سی کیفیت میں ٹھہرا رہے گا) یہاں تک کہ سارے لوگ اس کی وجہ سے سخت فکر وتردد میں پڑ جائیں گے، پھر وہ آپس میں تذکرہ کریں گے کہ کاش ہمیں کوئی ایسا شخص مل جاتا جو ہمارے پروردگار سے ہماری شفاعت کرتا اور ہمیں اس سختی اور پریشانی سے چھٹکارا دلاتا اور پھر (کچھ لوگ سب کی نمائندگی کرتے ہوئے) حضرت آدمؑ کے پاس آئیں گے اور ان سے کہیں گے: آپ آدم ہیں، تمام لوگوں کے باپ، آپ کو اللہ تعالیٰ نے (بلا کسی واسطہ اور وسیلہ کے) اپنے ہاتھ سے (یعنی اپنی قدرتِ کاملہ سے) پیدا کیا، آپ کو جنت کی سکونت عطا فرمائی، اپنے فرشتوں سے سجدہ آپ کو کرایا، اور آپ کو ہر چیز کے نام سکھائے، براہِ کرم آپ اپنے پروردگار سے (کہ جس نے آپ کو اتنی زیادہ فضیلتیں اور اعزازات بخشے ہیں) ہماری سفارش کر دیجئے کہ وہ ہم کو اس (سخت ہولناک اور پریشان کن) جگہ سے نکال کر راحت واطمینان بخشے، حضرت آدم (یہ سُن کر) کہیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں، (یعنی میں یہ مرتبہ ودرجہ نہیں رکھتا کہ آج کے دن بارگاہ کبریائی میں شفاعت کرنے کا حوصلہ کروں) پھر حضرت آدمؑ اپنی اس لغزش کا ذکر کریں گے جو انہوں نے (گندم کا) درخت کھانے کی صورت میں کی تھی، حالانکہ ان کو اس درخت کے قریب بھی جانے سے منع کر دیا تھا، (اس کے بعد وہ کہیں گے کہ) تم لوگوں کو نوح علیہ السلام کے پاس جانا چاہیے۔ (وہ تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں)، کیونکہ وہ پہلے پیغمبر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا والوں کی

ہدایت کے لئے مبعوث کیا تھا، وہ لوگ حضرت نوحؑ کے پاس آئیں گے، (اور ان سے شفاعت کے لئے درخواست کریں گے)، حضرت نوحؑ جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں، اور وہ اپنی اس لغزش کا ذکر کریں گے جو انہوں نے بے جانے بوجھے اللہ تعالیٰ سے (اپنے بیٹے کو غرق ہونے سے بچالینے کی درخواست کرنے کی صورت میں) کی تھی، (پھر وہ مشورہ دیں گے) تم لوگوں کو ابراہیم علیہ السلام کے پاس، جو اللہ تعالیٰ کے خلیل ودوست ہیں، جانا چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ لوگ (یہ سن کر) ابراہیم خلیل اللہؑ کے پاس آئیں گے (اور ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے) حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں، وہ دنیا میں تین مرتبہ اپنے جھوٹ کا ذکر کریں گے، (پھر وہ مشورہ دیں گے کہ) تم لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، جو خدا کے ایسے بندے ہیں جن کو خدا نے (اپنی عظیم الشان کتاب) تورات عطا کی، (اور بنی اسرائیل کے تمام انبیاء کو ان کے تابع بنایا)، اور جن کو خدا نے براہِ راست اپنی ہمکلامی کے شرف سے نوازا، اور ان کو (اپنا کمالِ قرب عطا فرما کر) اپنا محرم اسرار بنایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ لوگ (یہ سُن کر) حضرت موسیٰؑ کے پاس آئیں گے، (اور ان سے شفاعت کیلئے درخواست کریں گے)، حضرت موسیٰؑ ان کو جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں اور وہ اپنی لغزش کا ذکر کریں گے جو (ایک قبطی کو) قتل کرنے کی صورت میں سرزد ہوگئی تھی، (یعنی انہوں نے طیش میں آکر ایک قبطی کو مکا مار دیا تھا جس سے اس کا کام تمام ہوگیا تھا، پھر مشورہ دیں گے کہ) تم کو عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جانا چاہئے، جو خدا کے بندے اور اس کے رسولؑ ہیں، اور وہ روح ہیں (کہ جسمانی مادہ کے بغیر محض خدا کی قدرت سے پیدا ہوئے تھے اور دوسروں کی جسمانی حیات کا سبب بنتے تھے بایں طور کہ مُردوں کو بھی زندہ کرتے تھے)، اور وہ اللہ کا کلمہ ہیں (کہ ایک کلمہ کُنْ سے پیدا ہوئے تھے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ لوگ (یہ سُن کر) حضرت عیسیٰؑ کے پاس آئیں گے۔ (اور ان سے شفاعت کیلئے کہیں گے) حضرت عیسیٰؑ جواب دیں گے کہ میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں ہوں، البتہ تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ، جو خدا کے ایسے بندے ہیں جن کے

اگلے پچھلے سارے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تب لوگ (شفاعت کی درخواست لے کر) میرے پاس آئیں گے اور میں (ان کی شفاعت کیلئے تیار ہو جاؤں گا اور مقصد کی خاطر) بارگاہِ رب العزت کے گھر میں پہنچ کر اجازت طلب کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے اپنی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت مرحمت فرمائے گا، میں جب (اس کے حضور میں پہنچ کر) اس کو دیکھوں گا تو (اس کی ہیبت وخوف کے مارے اور اس کی تعظیم کرنے کیلئے) سجدہ میں گر پڑوں گا، اور اللہ تعالیٰ جتنا عرصہ مناسب سمجھے گا اتنے عرصہ کیلئے مجھے سجدے میں پڑا رہنے دے گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ "اے محمد! ﷺ سر اٹھاؤ! جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، تم (جس کے حق میں چاہو) شفاعت کرو، تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی اور جو چاہتے ہو مانگو، میں تمہیں عطا کروں گا،" آنحضرت ﷺ نے فرمایا (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اس حمد وثناء کے ساتھ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا، اس کی حمد وثناء بیان کروں گا، پھر میں شفاعت کروں گا، اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائیگی، اس کے بعد میں (بارگاہِ رب العزت سے) باہر آؤں گا، اور اس (متعینہ) جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا، پھر دوسری مرتبہ (دوسری جماعتوں کے حق میں شفاعت کرنے کیلئے) بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو کر (اسکی خدمت میں پیش ہونے کی) اجازت طلب کروں گا، مجھے (اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی) اجازت عطا کی جائے گی، اور جب میں (اس کے حضور میں پہنچ کر) اس کو دیکھوں گا تو سجدہ میں گر پڑوں گا۔ اور اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا، مجھے سجدے میں پڑا رہنے دے گا، پھر فرمائے گا: اے محمد! ﷺ اپنا سر اٹھاؤ! جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، شفاعت کرو، میں قبول کروں گا، اور مانگو میں عطا کروں گا۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اس حمد وثناء کے ساتھ جو پروردگار مجھے سکھائے گا، اس کی حمد وثناء بیان کروں گا، پھر میں شفاعت کروں گا، اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔

اس کے بعد میں (بارگاہِ رب العزت سے) باہر آؤں گا، اور اس (متعینہ)

جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا، اور پھر میں تیسری مرتبہ بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہو کر اس کی خدمت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا، مجھے اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کی اجازت عطا کی جائے گی۔ اور جب میں (پروردگار کے حضور پہنچ کر) اس کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا، اور اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا، مجھے سجدہ میں پڑا رہنے دے گا، پھر فرمائے گا "اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر اٹھاؤ جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، شفاعت کرو، میں قبول کروں گا، اور مانگو میں عطا کروں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" (یہ سن کر) میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اس حمد وثناء کے ساتھ، جو پروردگار مجھے سکھائے گا، اس کی حمد وثناء بیان کروں گا، پھر میں شفاعت کروں گا، اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی، اس کے بعد میں (بارگاہِ رب العزت سے) باہر آؤں گا، اور اس (متعینہ) جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا۔ یہاں تک کہ دوزخ میں ان کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں رہ جائے گا، جن کو قرآن نے روکا ہوگا، (یعنی اس آخری شفاعت کے بعد دوزخ میں وہی لوگ باقی رہ جائیں گے جن کے بارے میں قرآن کریم نے خبر دی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے)، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (یا حضرت انس رضی اللہ عنہ یا حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے اس بات کو مستند کرنے کیلئے) قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی: "**عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا**"، یعنی امید ہے کہ آپ کا رب آپؐ کو "مقام محمود" میں جگہ دے گا"۔ پھر فرمایا کہ یہی وہ مقامِ محمود ہے جس کا وعدہ خدا نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے۔"

(صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ، باب : وعلم اٰدم الاسماء کلھا ج٦ ص ١٧، ١٨، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحوض والشفاعۃ ص ٤٨٨)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو **کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ تعالیٰ: وجوہ یومئذ ناضرۃ** (ج ۲ ص ۱۳۱) پر بھی ذکر کیا ہے اور نیز امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو **کتاب الرقاق، باب صفۃ الجنۃ والنار** ج ۸ ص ۱۱۲ پر بھی نقل کیا ہے۔

فائدہ:

''آپ تمام لوگوں کے باپ، اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا''
بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں ''ید'' (ہاتھ) سے مراد قدرت ہے، اگر قدرت مراد ہو تو پھر حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کیا ہوئی؟ ابلیس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے؟ اس لئے اکثر علماء کہتے ہیں کہ ''ید'' (ہاتھ) سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفت ذاتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق میں اپنی خاص صفت ذاتی کو اس طرح استعمال فرمایا تھا کہ اس میں ''کسی قسم کے واسطہ کو حائل نہیں فرمایا۔ (فتح الملہم ۱/۳۶۲)

''اپنے فرشتوں سے سجدہ آپ کو کرایا'' یہاں دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ اس سجدہ سے کونسا سجدہ مراد ہے؟ دوئم یہ کہ سجدہ تمام فرشتوں نے کیا تھا یا بعض فرشتوں نے؟ سجدہ کے متعلق تو بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے خضوع اور تذلل مراد ہے، حقیقی سجدہ ''زمین پر پیشانی رکھنا'' مراد نہیں ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ۱/۲۹۳)، لیکن مشہور یہی ہے کہ اس سے حقیقی سجدہ مراد ہے (ایضاً)، پھر اس کی نوعیت میں اختلاف ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سجدہ تحیہ اور سجدۂ تعظیم تھا اور حضرت آدم علیہ السلام حقیقۃً مسجود تھے (تفسیر ابن کثیر ۱/۷۸)۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ سجدۂ عبادت تھا، معبود برحق اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس تھی، حضرت آدم علیہ السلام کی حیثیت قبلہ کی سی تھی۔ (تفسیر القرطبی ۱/۲۹۳)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

دوسری بات کے متعلق ابن حزمؒ اور حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ یہ سجدہ تمام ملائکہ نے کیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ۱/۷۸) اور بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ سجدہ صرف ان فرشتوں نے کیا تھا جن کا تعلق زمین سے ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ۱/۲۳۸)

''اور آپ کو ہر چیز کے نام سکھائے'' اس میں اقوال مختلف ہیں کہ وہ نام کن چیزوں کے تھے؟ بعض کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد و ذریت کے نام تھے۔

بعضوں نے کہا کہ ملائکہ کے نام تھے، اور بعض کہتے ہیں کہ اجناس اشیاء کے نام تھے اور بعض کے نزدیک زمین کی تمام چیزوں کے نام تھے۔ (عمدة القاری ۱۸/۸۳، فتح الباری ۱۲۲/۸)

اور علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے ان اشیاء کے نام مراد ہیں جن کا علم ہونا ضروری ہے۔ (فیض الباری ۴/۱۵۵)

ایک اشکال اور اس کا جواب:

یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امتحان لیتے وقت حضرت آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر غلبہ کی یہ صورت ظاہر فرمائی کہ ان کو اسماء (نام) سکھا دیئے، فرشتوں سے سوال کیا تو انہوں نے کہا: "لَاعِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا"۔ حضرت آدم علیہ السلام سے سوال کیا تو انہوں نے اسماء (نام) بتلا دیئے، اللہ جل شانہٗ نے فرشتوں سے فرمایا: اَلَمْ اَقُلْ لَكُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی تھی اور فرشتوں کو ان اسماء (نام) کی تعلیم نہیں دی گئی تھی تو فرشتوں کا اس امتحان میں پاس ہونا کیونکر ممکن تھا؟ فرشتوں کو بھی اگر ان اسماء کی تعلیم دی جاتی تو وہ بھی بتلا دیتے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سوال و جواب سے مقصود فرشتوں پر یہ حقیقت آشکارا کرنا تھی کہ اس پتلۂ خاکی میں اتنی بڑی صلاحیت اور استعداد موجود ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اس کو تم پر فوقیت دے دیں اور بعض ایسے علوم سکھا دیں کہ جن کا تمہیں علم نہیں، چنانچہ اس امتحان میں حضرت آدم علیہ السلام کی علمی صلاحیت اجاگر ہوئی۔ (روح المعانی ۱/۲۲۵۔۲۲۷)

بعض کہتے ہیں کہ اس سوال و جواب سے حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ بتانا مقصود تھا کہ ان میں تعلم کی استعداد اور صلاحیت موجود ہے اور فرشتوں میں نہیں، لیکن یہ جواب اس لئے درست نہیں کہ فرشتوں نے جواب میں "لَاعِلْمَ لَنَا اِلَّامَا عَلَّمْتَنَا" کہا تھا، یعنی ہمیں تو کوئی علم نہیں مگر جو آپ ہی ہمیں سکھا دیں"۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعلم کی صلاحیت فرشتوں میں بھی موجود تھی۔ "میں اس مرتبہ کا سزاوار نہیں"۔ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ بات از راہِ تواضع وانکساری کے کہی، ورنہ وہ اللہ تعالیٰ

کے نبی اور پیغمبر ہیں، اور اس بات کے یقیناً قابل اور لائق ہیں کہ بارگاہِ رب العزت میں سفارش کریں اور اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ کام دوسرے کے لئے مقرر ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا ہے کہ یہ سفارش کس کو کرنی ہے، لہٰذا میں یہ کام نہیں کر سکوں گا۔

(فتح الباری ۱۱/ ۴۳۳، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، اکمال اکمال المعلم ۱/ ۳۵۵، مکمل اکمال الاکمال ۱/ ۳۵۵)

ایک اشکال اور اس کا جواب:

''وہ پہلے پیغمبر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا والوں کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا تھا'' اس جملہ سے یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت نوحؑ سے پہلے تین نبیؑ، حضرت آدمؑ، حضرت شیثؑ اور حضرت ادریسؑ دنیا میں آ چکے تھے، تو پھر حضرت نوحؑ دنیا والوں کی طرف آنے والے پہلے نبی اور پیغمبر کیونکر ہوئے؟ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ پہلے تینوں نبیؑ جب دنیا میں آئے تو تمام روئے زمین صرف اہل کفر کی آماجگاہ نہیں تھی، بلکہ اس دنیا میں اہل ایمان بھی موجود تھے اور گویا ان تینوں نبیوں کے مخاطب اہل ایمان اور اہل کفر دونوں تھے، ان کے برخلاف جب حضرت نوحؑ دنیا والوں میں آئے تو تمام روئے زمین پر صرف کافر ہی کافر تھے، اہل ایمان کا وجود نہیں تھا، اس اعتبار سے حضرت نوحؑ دنیا میں آنے والے پہلے نبیؑ ہیں جن کا واسطہ صرف کافروں سے تھا۔

بعض علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو پہلے نبیؑ اور پیغمبر طوفانِ نوح کے بعد ہونے کی حیثیت سے کہا گیا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد حضرت نوح علیہ السلام ہی روئے زمین پر اللہ کے پہلے پیغمبر تھے۔ اس اشکال کے کچھ اور جواب بھی علماء نے لکھے ہیں لیکن وہ زیادہ مضبوط نہیں ہیں، پہلا جواب زیادہ مضبوط ہے۔

ایک خاص نکتہ:

اس مقام پر ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے، یہ جو فرمایا گیا ہے

کہ جب تمام لوگ ابتدائی اور سب سے پہلے حضرت آدمؑ کے پاس اور پھر یکے بعد دیگرے ایک ایک نبیؑ کے پاس جائیں گے، یہاں تک کہ آخر میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شفاعت کی درخواست کریں گے اور آپؐ ان کی درخواست قبول کرلیں گے تو سوال یہ ہے کہ جب سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا کہ وہی ان لوگوں کے دلوں میں کسی شفاعت کرنے والے کے پاس جانے کا خیال ڈالے گا، اور پہلا خیال حضرت آدمؑ کے بارے میں ہوگا کہ وہی ان لوگوں کے دلوں میں آنحضرت ﷺ کا خیال ڈال دے اور وہ ایک ایک نبیؑ کے پاس جانے کے بجائے صرف آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ جائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طولِ عمل میں اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہوگی اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کا سب سے افضل و برتر ہونا تمام مخلوق خدا کے سامنے ظاہر ہو جائے، اگر ایسا ہو تو لوگ ابتدائی مرحلہ ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچ کر شفاعت کی درخواست کریں اور آپؐ ان کی شفاعت کردیں تو یہ احتمال باقی رہے گا کہ دوسرے بھی شفاعت کی جرأت رکھتے ہوں گے اور اگر کسی اور نبیؑ سے بھی شفاعت کی درخواست کی جاتی تو وہ بھی شفاعت کر دیتا! لیکن جب وہ لوگ ایک ایک نبیؑ کے پاس جا کر ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے اور ہر ایک شفاعت سے انکار کردے گا اور پھر آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی جائے گی، جس کو آپؐ قبول فرما کر ان کا مقصد پورا کردیں گے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے عالی مرتبت ہونا اور بارگاہ کبریائی میں کمال قرب رکھنا واضح طور پر ثابت ہو جائے گا، اور ہر ایک پر یہ عیاں ہو جائے گا کہ آپؐ کے مرتبہ و مقام کا اور کوئی نہیں ہے، اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تمام مخلوق، حتیٰ کہ انسانوں، فرشتوں اور تمام انبیاءؑ تک پر فضیلت رکھتے ہیں، کیونکہ شفاعت جو اتنا بڑا درجہ اور اتنا اہم کام ہے کہ کوئی بھی، خواہ وہ فرشتہ یا پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی جرأت اور حوصلہ نہیں کرے گا، صرف آنحضرت ﷺ کریں گے۔

حضرت نوحؑ نے اپنی جس لغزش کا ذکر کیا، اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کو

مسلسل جھٹلانے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی سزا میں دنیا والوں پر پانی کا عذاب نازل ہوا اور تمام روئے زمین پر ہلاکت خیز پانی ہی پانی پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت نوحؑ اپنے گھر والوں اور اپنے ماننے والوں کی ایک مختصر تعداد کو لے کر ایک کشتی میں بیٹھ گئے، تاکہ وہ سب طوفانی سیلاب کی ہلاکت خیزی سے محفوظ رہیں، اس وقت انہوں نے اپنے بیٹے کو، جو کافروں کے ساتھ تھا، بلایا اور کہا کہ تم کافروں کا ساتھ چھوڑ دو، اب بھی ایمان لے آؤ۔ اور میرے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ، مگر ان کا وہ بیٹا نہ مانا اور آخر کار دوسرے تمام لوگوں کے ساتھ وہ بھی غرق ہو گیا! اس موقع پر حضرت نوحؑ نے اپنے اس بیٹے کے حق میں غرقابی سے نجات کی دعا مانگی تھی، اور بارگاہ رب العزت میں یوں عرض کیا تھا کہ ''رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ، وَاَنْتَ اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ'' یعنی اے میرے پروردگار! میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے، (اس کو نجات دے) بے شک آپ کا وعدہ بالکل سچا ہے اور آپ احکم الحاکمین ہیں''۔

اللہ تعالیٰ سے حضرت نوحؑ کی یہ درخواست چونکہ ایک ایسا امر تھا جس کو انہوں نے جانے بوجھے بغیر ظاہر کیا تھا اور اس بات کی تحقیق نہیں کر لی تھی کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی دُعا مانگنی چاہئے تھی یا نہیں؟ اس لئے ان پر بارگاہ خداوندی سے عتاب نازل ہوا کہ نوحؑ! ہم سے وہ چیز نہ مانگو جس کی حقیقت کا تمہیں علم نہیں ہے، اور جس کے بارے میں تم نہیں جانتے کہ وہ چیز مانگی جانی چاہئے یا نہیں!

''اور وہ دنیا میں تین جھوٹ بولنے کا ذکر کریں گے'' حضرت ابراہیمؑ جن باتوں کو ''جھوٹ'' سے تعبیر کریں گے، حقیقت میں ان پر جھوٹ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ گو ظاہری حیثیت کے اعتبار سے وہ جھوٹ کی سی صورت رکھتی ہوں، لیکن انبیائے کرام علیہم السلام جس عالی مرتبہ کے ہوتے ہیں اور ان کا جو سب سے اونچا مقام ہوتا ہے، اس کے پیش نظر ان کی اس طرح کی باتوں کو بھی جو ان کے مقام سے فروتر ہوں، بارگاہِ رب العزت میں نظر انداز نہیں کیا جاتا، اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ ''حسنات الابرار سیئات المقربین'' (یعنی بعض باتیں نیک لوگوں کے حق میں تو نیکیاں ہوتی ہیں لیکن مقربین کے حق میں برائیاں ہوتی

ہیں)، اس بات کو اگر اور زیادہ خوبصورت انداز میں کہنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس مقام پر "کذب" سے مراد یہ ہے کہ "ایسا کلام جو صحیح اور پاکیزہ مقصد کے لئے بولا گیا ہو، لیکن مخاطب اس کا وہ مطلب نہیں سمجھے جو متکلم کی مراد ہو، بلکہ ان الفاظ کو اپنی ذہنی مراد کے مطابق سمجھے"۔ یہ اندازِ کلام تعریض (اشارے، کنائے کے پیرایۂ بیان) کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے، اور فصحاء و بلغاء کے ہاں اکثر رائج ہے، اس ضمن میں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہاں حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق اس طرح کی صرف تین باتوں کا ذکر ہے، چوتھی بات کا ذکر نہیں ہے جو انہوں نے کواکب کو دیکھ کر کہی تھی کہ "هٰذَا رَبِّيْ" (یہ میرا رب ہے)، اور اس کے ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات ایام طفولیت میں کہی تھی، اس وقت چونکہ وہ کسی بھی امر کے مکلف نہیں تھے اس لئے اس چوتھی بات کا اعتبار نہیں۔

رہی یہ بات کہ وہ تین باتیں کیا تھیں جن کو حضرت ابراہیمؑ "جھوٹ" کے طور پر اپنی لغزش میں بتائیں گے تو ان میں سے ایک تو ان کا یہ کہنا تھا کہ "اِنِّيْ سَقِيْمٌ" (میں آج کچھ علیل سا ہوں)۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر اور اپنی قوم کے لوگوں کو ہر طرح سے بت پرستی کی خرابیوں کو ظاہر کر کے اس سے باز رکھنے کی سعی کر لی اور ہر قسم کے پند و نصائح کے ذریعہ ان کو یہ باور کرانے میں اپنی پوری طاقت صرف کر لی کہ یہ بُت نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، اور آزر اور قوم کے دلوں پر کسی بھی پند و نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو انہوں نے یہ تدبیر سوچی کہ اب مجھ کو ارشاد و ہدایت کا ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے ان لوگوں کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ ہم لکڑیوں اور پتھروں کی جن مورتیوں اور بتوں کو پوجتے ہیں وہ ہمارے لئے کسی بھی طرح کارگر اور فائدہ مند نہیں ہیں، اور نہ ان کی ذات سے ہمیں کوئی رنج و نقصان پہنچ سکتا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ قوم کا ایک اہم مذہبی میلہ لگنے والا تھا اور سب لوگ اس میں شرکت کے لئے چلنے لگے تو کچھ لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ سے اصرار کیا کہ وہ بھی سیر کے لئے میلہ چلیں، حضرت ابراہیمؑ تو اس طرح کے موقع کے انتظار میں تھے، کہ سب لوگ یہاں سے چلے جائیں تو ان کے تمام بتوں کو توڑ پھوڑ کر اپنے ارادہ کو عملی جامہ

پہناؤں، چنانچہ انہوں نے پہلے تو ان لوگوں کے ساتھ جانے سے صاف انکار کیا، مگر جب ان کا اصرار بہت بڑھا تو اس وقت انہوں نے کہا: اِنِّیْ سَقِیْمٌ ''(میں آج کچھ علیل سا ہوں)، ان کی یہ بات بظاہر خلاف واقعہ اور ''جھوٹ'' معلوم ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس وقت واقعۃً علیل نہیں تھے، بلکہ ان کے ساتھ نہ جانے کے لئے علالت کا بہانہ کیا تھا۔ اس کی تاویل علماء یہ کرتے ہیں کہ

(۱) ''اِنِّیْ سَقِیْمٌ'' کہنے سے حضرت ابراہیمؑ کی مراد یہ تھی کہ ہر انسان کی طرح میرے ساتھ بھی بیماری آزاری لگی رہتی ہے، اور وقتاً فوقتاً بیمار ہو جایا کرتا ہوں، پس انہوں نے ایسی مبہم بات کہی کہ اس کے ظاہری اسلوب سے تو یہ مفہوم ہوا کہ میں اس وقت بیمار ہوں! تمہارے ساتھ کیسے جاسکتا ہوں؟ لیکن حقیقت میں ان کی مراد اس کے برعکس تھی۔

(۲) بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کو چونکہ کواکب پرستی کی وجہ سے علمِ نجوم میں کمال واعتقاد تھا اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے ایک خاص انداز سے مذکورہ بات کہہ کر ان کا دھیان ستاروں کی طرف متوجہ کر دیا تھا، چنانچہ قوم کے لوگ اپنے عقیدہ کے لحاظ سے یہ سمجھے کہ ابراہیمؑ کسی نحس ستارے کے اثر بد میں مبتلا ہیں، اور انہوں نے علم نجوم کے ذریعہ معلوم کر لیا ہے کہ وہ عنقریب بیمار ہونے والے ہیں۔ (تفسیر عثمانی ص۵۹۸ فائدہ نمبر ۸)

اس تاویل کا قرینہ قرآن کریم کی اس آیت کا سیاق ہے جس میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔

(۳) ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس جملہ ''اِنِّیْ سَقِیْمٌ'' سے اپنی جسمانی، علالت مراد نہیں لی تھی، بلکہ ''قلب کی ناسازی'' مراد لی تھی کہ تمہارے کفر وطغیان نے مجھے دکھی کر دیا ہے اور میرے دل کی حالت سقیم ہے، ایسے میں تمہارے ساتھ میرے جانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

(۴) ایک قول یہ بھی ہے کہ اصل میں یہ کذب (جھوٹ) نہیں تھا، توریہ تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''اِنِّیْ سَقِیْمٌ'' فرمایا، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ میں سقیم الحجت ہوں، یعنی میں اپنے نہ جانے کی کوئی دلیل پیش کرنے سے قاصر ہوں جس کو تم مان لو، میں تمہیں قائل نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اگر یہ کہتے کہ تم عید منانے کے لئے جا

رہے ہو، وہاں شرک کا ارتکاب کرو گے، اللہ تعالیٰ کی توحید کے عقیدے کے خلاف کرو گے، اور یہ جائز اور درست نہیں ہے تو لوگ اس بات کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتے۔

(فتح الباری ۳۹۱/۶، کتاب الانبیاء، و اتخذ اللّٰہ ابراهیم خلیلاً، رقم الحدیث: ۳۳۵۸)

(۵) اور یہ بھی ممکن ہے کہ "اِنِّیْ سَقِیْمٌ" سے وقتی طور پر فی الحال بیمار ہونا مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ میں مستقبل میں بیمار ہونے والا ہوں، "سَقِیْمٌ" اسم فاعل کا صیغہ ہے، اور اسم فاعل کا صیغہ مستقبل کے لئے بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ (ایضاً)

دوسرا کہنا یہ تھا کہ "بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا" (بلکہ یہ کام بڑے بت نے کیا ہے)، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس بات کا تعلق بھی مذکورہ بالا پہلے واقعہ ہی سے ہے، ہوا یہ کہ جب ان کی قوم کے لوگ اس سلسلہ میں چلے گئے اور بستی خالی ہوگئی تو وہ اٹھے اور سب سے بڑے بت کے ہیکل (مندر) میں پہنچے، دیکھا تو وہاں بتوں کے سامنے طرح طرح کے حلوؤں، پھلوں، میوؤں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے ہوئے تھے، حضرت ابراہیمؑ نے طنزیہ لہجے میں چپکے چپکے ان مورتیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ سب کچھ موجود ہے، ان کو کھاتے کیوں نہیں؟ اور پھر کہنے لگے کہ میں تم سے مخاطب ہوں، کیا بات ہے کہ تم جواب نہیں دیتے؟ اس کے بعد انہوں نے سب مورتیوں کو توڑ پھوڑ ڈالا، اور سب سے بڑے بُت کے کاندھے پر کلہاڑا رکھ کر واپس چلے گئے۔ قوم کے لوگ میلے سے واپس آئے تو انہوں نے مندر میں اپنے دیوتاؤں (بتوں) کو اس خراب حالت میں پایا، اور سخت برہمی کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کس کی حرکت ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہو نہ ہو، یہ ابراہیمؑ کا کام ہے، وہی شخص ہے جو ہمارے دیوتاؤں کی برائی کہتا ہے، اور اس بستی میں اس کے علاوہ کوئی موجود بھی نہیں تھا۔

چنانچہ بڑے بڑے پجاری سرداروں کے سامنے ان کی طلبی ہوئی، اور مجمع عام میں ان سے پوچھا گیا کہ ابراہیمؑ! تم نے ہمارے ان دیوتاؤں کے ساتھ یہ کیا حرکت کی ہے؟ اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات کہی کہ "بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ" (بلکہ یہ کام ان سب کے بڑے بت نے کیا ہے) پس حضرت ابراہیمؑ کا یہ جواب بھی گویا خلاف واقعہ تھا، لیکن

حقیقت میں ان کے اس جواب کو ''جھوٹ'' سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان کی اصل غرض اپنی قوم کے گمراہ لوگوں کو متنبہ کرنا اور اس طرح لاجواب کر دینا تھا کہ ان کے غلط عقائد کی قلعی کھل جائے۔

(۱) چنانچہ اپنے حریف کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنے اور اس کو راہ راست پر لانے کے لئے ایک بہترین طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ مناظرہ اور تبادلہ خیالات کا موقع آ جائے تو اس کے مسلمات میں سے کسی مسلمہ عقیدہ کو صحیح فرض کر کے اس طرح اس کا استعمال کرے کہ اس کا ثمرہ اور نتیجہ حریف کے خلاف اور اپنے موافق ظاہر ہو، اور حضرت ابراہیمؑ نے مذکورہ واقعہ میں اسی طریقہ کو اختیار کیا۔ ان کی قوم خدائے واحد کے علاوہ بے شمار دیوتاؤں اور بتوں کو پوجتی تھی، ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ یہ دیوتا اور بُت سب کچھ سنتے اور دیکھتے ہیں۔ اور ہماری مرادوں کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اپنے ماننے والوں اور اپنے پجاریوں سے خوش ہوتے ہیں، اور اپنے دشمنوں، اور مخالفوں سے انتقام لیتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے لوگوں کو اس خام خیالی اور بدعقیدگی کو عملاً ان پر ظاہر کرنے کے لئے، ان کے بتوں اور مورتیوں کو توڑ پھوڑ ڈالا، اور بڑے بت کو چھوڑ دیا، پھر جب پوچھ گچھ کی نوبت آئی تو انہوں نے مناظرہ کا وہی بہترین طریقہ اختیار کیا جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی قوم پر یہ بات پوری طرح عیاں ہوگئی کہ جو بت اپنے کو شکست و ریخت سے نہ بچا سکے اور اپنے کسی دشمن کی توڑ پھوڑ کا مقابلہ نہ کر سکے وہ کسی دوسرے کو کیا نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں اور عبادت اور پرستش کے قابل کیسے ہو سکتے ہیں!

(۲) بعض حضرات نے حضرت ابراہیمؑ کے مذکورہ جواب کی ایک اور تاویل کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو یہ کہا کہ "بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ" تو "كَبِيرُهُمْ" سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کی ذات تھی، گویا اس جملہ کا مطلب یہ تھا کہ ان بتوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اس ذات (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے ہوا ہے جو سب سے بڑا ہے، اور جس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔

(۳) بعض نے یہ تاویل کی ہے کہ اس میں بھی پہلے جملہ کی طرح توریہ ہے، اور

یہ مشروط ہے "اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ" کے ساتھ، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ بت بول سکتے ہیں تو پھر اس بڑے نے یہ حرکت کی ہے اور اگر نہیں بول سکتے تو پھر کسی اور نے یہ کام کیا ہوگا۔

(فتح الباری ۳۹۲/۶، کتاب احادیث الانبیاء "واتخذ اللّٰہ ابراھیم خلیلاً")

(۴) علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ابراہیم کا مقصود بڑے بت کے لئے اس فعل کا اثبات نہیں، بلکہ فعل کو اپنی ہی طرف ایک بلیغ تعریفی اسلوب میں منسوب کرنا تھا جس میں کفار کے ساتھ تمسخر بھی تھا، اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ آپ مثلاً بہترین خطاط ہیں، آپ نے ایک تحریر لکھی، آپ کے ایک اور ساتھی نے، جس کو قلم پکڑنا بھی صحیح نہیں آتا، آپ سے پوچھا کہ یہ تحریر کس نے لکھی ہے؟ آپ اس سے کہیں کہ "یہ آپ نے لکھی ہے" اس جواب سے مقصود ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ واقعتہً اس نے لکھا ہے، بلکہ اس میں تحریر کی نسبت اپنی ہی طرف کرنا مقصود ہے اور ساتھ ساتھ مخاطب کے ساتھ تمسخر بھی مقصود ہوتا ہے۔

(الکشاف ۱۲۴/۳)

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا "بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا" ان کو سمجھنا چاہئے تھا کہ کرنے والا موجود ہے، پھر کیوں پوچھ رہے ہو، اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے استہزاءً فرمایا: "فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ"۔

(۵) امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک اور توجیہ کی ہے کہ "فَعَلَهٗ" الگ جملہ ہے۔ "كَبِيْرُهُمْ" اس کا فاعل نہیں ہے، بلکہ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا" مستقل جملہ مستانفہ ہے، یعنی فَعَلَهٗ مَنْ فَعَلَهٗ، کہ یہ کام کیا جس نے کیا اور ان بتوں کا بڑا یہ ہے، لیکن اس توجیہ میں جو تکلف ہے وہ ظاہر ہے۔

(فتح الباری ۳۹۲/۶، کتاب الانبیاء، باب، و اتخذ اللّٰہ ابراھیم خلیلاً")

اب تیسرے "جھوٹ" کو لے لیجئے، حضرت ابراہیمؑ نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ کہا کہ "ھذہ اختی" (یہ میری بہن ہے)، یہ بات انہوں نے اپنی بیوی یعنی حضرت سارہؓ کو ایک بدکار کافر کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے کہی تھی کہ یہ عورت میری بہن ہے، یہ بات بھی بظاہر "جھوٹ" کے دائرہ میں آتی ہے، لیکن اگر اس بات کو حضرت

ابراہیمؑ کی اصل مراد کے سیاق میں دیکھا جائے تو ان کا یہ کہنا کہ ''یہ میری بہن ہے'' خلاف حقیقت نہیں ہوگا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہؓ ہم مذہب ہونے کی حیثیت سے دینی بہن بھائی تھے، جیسا کہ خود قرآن کریم نے فرمایا ہے: ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ'' (تمام اہل ایمان ایک دوسرے کے ساتھ اخوت کا تعلق رکھتے ہیں)، اور ظاہر ہے کہ بیوی کا رشتہ قائم ہو جانے سے دینی اخوت کا رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا۔ علاوہ ازیں حضرت سارہؓ، حضرت ابراہیمؑ کے چچا حاران کی بیٹی تھیں، اور اس اعتبار سے ان کو بہن کہنا ایسی بات ہرگز نہیں ہے جس پر حقیقی جھوٹ کا اطلاق ہو سکے۔

خلاصہ یہ کہ انہوں نے توریہ کے طور پر اس کو اپنی بہن کہا تھا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

البتہ یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ جب یہ باتیں جھوٹ کے زمرے میں نہیں آتیں اور حقیقتۃً جھوٹ نہ تھیں، بلکہ توریہ کے زمرے میں داخل تھیں تو پھر ابراہیمؑ نے ان کو ''جھوٹ'' سے کیوں تعبیر کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ توریہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عالی مرتبت ہونے کے لحاظ سے خلاف اولیٰ تھا، اس لئے بقاعدہ **حسنات الابرار سیئات المقربین** اس کو آپ نے کذب ''جھوٹ'' قرار دیا۔

''اور وہ (عیسیٰؑ) اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں'' حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے کلمہ ''کُنْ'' سے پیدا کیا ہے۔ توالد و تناسل کے ظاہری واسطہ کی نوبت آپ کے پیدا ہونے میں نہیں آئی۔

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ''کلمہ'' کہتے ہیں: **لفظٌ وُضِعَ لمعنًی مفردٍ** '' کو، جس طرح کلمہ کے اندر معنی مستور ہوتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ میں حقیقت مَلَکِیہ مستور تھی، صورت کے اعتبار سے تو وہ بشر تھے، لیکن ان کے اندر حقیقت ملکیہ موجود تھی، یعنی صورت کے لحاظ سے انسان، لیکن حقیقت میں صفات جبرائیلؑ کے ساتھ موصوف، نہ خواہشات کا غلبہ اور نہ قیل و قال کی حجت بازی، اور چونکہ حضرت عیسیٰؑ کو

کلمۃ اللہ کہا گیا ہے اور قرآن مجید نے کہا "اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ" اس لئے آپ کو بھی آسمان کی طرف اٹھالیا گیا۔

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دنیوی ولادت، شکم مادر میں ہوئی، جیسا کہ "اَلْقَاهَا اِلٰی مَرْيَمَ" سے معلوم ہوتا ہے، لیکن اصل مولد چونکہ ان کا عَالِمَ قدس تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تھوڑے عرصہ کے بعد ان کو واپس اصل وطن عالمِ قدس میں بلالیا۔ اور "اس کی روح ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص حکم سے حضرت عیسیٰ کی روح کو پیدا کیا۔ "رُوْحٌ مِنْه" میں من ابتدائیہ ہے، تبعیضیہ نہیں ہے۔ (دیکھئے معالم التنزیل ۱/۵۰۲، احکام القرآن لابن العربیؒ ۱/۵۱۷)

اس جملہ سے مقصد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں مادے کا دخل نہیں ہے، صلب والد کا دخل نہیں پایا گیا اور چونکہ روح کی پرواز آسمان کی طرف ہوتی ہے، اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان کی طرف اٹھایا۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود بھی لوگوں کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے تو اس سے ایک حدیث کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا کہ "عیسیٰ تمام انبیائے کرامؑ میں مجھ سے اقرب ہیں۔"

(جامع الاصول فی احادیث الرسول ۸/۵۲۳)

حضرت عیسیٰؑ کے عذر خواہی نہ کرنے کی وجہ:

دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے برخلاف حضرت عیسیٰ شفاعت کی درخواست لے کر آنے والوں کے سامنے اپنے کسی عذر کو بیان نہیں کریں گے، اور نہ ہی اپنی کسی لغزش کا ذکر کریں گے، اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ حضرت عیسیٰ اس وقت اپنا کوئی عذر بیان کرنے میں توقف شاید اس لئے کریں گے کہ وہ اس تہمت کی وجہ سے جو عیسائیوں کی طرف سے ان کو اللہ کا بیٹا کہے جانے کی صورت میں ان پر تھوپی گئی ہے، اس درجہ شرمسار اور نادم ہوں گے کہ وہ اپنی خاموشی ہی کو زبان حال سے عذر بنالیں گے۔ ویسے بعض روایتوں میں

ان کے کچھ عذر بھی نقل کیے گئے ہیں۔ بہرحال! اصل بات یہ ہے کہ شفاعت کا درجہ صرف ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوگا، جو سید الانبیاء والمرسلین اور امام النبیین ہیں، آپؐ کے علاوہ دوسرے تمام انبیاءؑ اور رسول صلوات اللہ علیہم اجمعین شفاعت کے مقام پر کھڑا ہونے اور بارگاہ رب العزت میں شفاعت کرنے سے عاجز وقاصر ہیں، ان کو یہ بلند و بالا مرتبہ عطا ہی نہیں ہوا ہے، لہٰذا شفاعت کی درخواست لے کر آنے والوں کے سامنے انہیں کوئی عذر بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، اگر وہ سب یا ان میں سے کچھ انبیاءؑ کوئی عذر بیان بھی کریں گے تو اس کا تعلق صرف ظاہری طور پر اپنی صوابدید سے ہوگا، اسی لئے دوسری احادیث میں یہ آیا ہے کہ سارے انبیاءؑ کوئی عذر بیان کئے بغیر صرف یہی کہیں گے کہ ہم اس عظیم الشان امر کے اہل نہیں ہیں۔

''جن کے اگلے پچھلے سارے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیئے ہیں'' اس جملہ کے سلسلہ میں واضح رہے کہ تمام ہی انبیاء کرامؑ معصوم عن الخطاء، یعنی گناہوں سے محفوظ ہیں، چہ جائیکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کہ آپؐ تو بدرجہا اولیٰ اس سے پاک ومنزہ ہیں کہ کسی گناہ کی نسبت بھی آپؐ کی طرف ہو، پس یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ کے بارے میں یہ کہنا کہ ''ان کے سارے اگلے پچھلے گناہ، اللہ تعالیٰ نے بخش دیئے ہیں'' کیا معنی رکھتا ہے، اس بارے میں علماء نے مختلف باتیں کہی ہیں اور اس جملہ کی متعدد تاویلیں ان سے منقول ہیں۔

(۱) بعض علماء نے اس کی تاویل یہ کی ہے (اور یہ زیادہ واضح تاویل ہے) کہ یہ جملہ دراصل بارگاہ رب العزت کی جانب سے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز اور آپؐ کی برتر فضیلت کے اظہار کا ذریعہ ہے، قطع نظر اس امر کے کہ آپؐ سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اس کی بخشش کی جائے، اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب کوئی آمر مطلق اور بادشاہ رعایا کے لوگوں کے درمیان اس خاص مصاحب کی امتیازی اور مخصوص حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے یہ کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں معاف کیا خواہ تم نے کچھ ہی کیا ہو اور آئندہ تم جو بھی کرو وہ بھی معاف، تم پر کوئی مواخذہ اور گرفت نہیں۔

(۲) علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ خطاب تشریف ہے، اور

مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دنیا میں یہ تسلی دیدی ہے کہ آخرت میں آپؐ سے کسی بات کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ تو گویا آپؐ شفاعت اور سفارش کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوسکیں گے۔ (فیض الباری ۹۱/۴، تحت قولہ تعالیٰ و اعملوا ما شئتم)

(۳) بعض حضرات کہتے ہیں کہ قاعدہ ہے کہ جن حضرات سے صدورِ ذنب ہوتا ہے ان کا رتبہ اس کے برابر نہیں ہوسکتا جس سے صدور ذنب نہ ہوا ہو۔ دوسرے انبیائے کرامؑ سے چونکہ ان کے اپنے رتبہ کے اعتبار سے صدور ذنب ہوا تھا اس لئے وہ شفاعت کی جرأت نہ کریں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ صدورِ ذنب سے محفوظ تھے، اس لئے آپؐ شفاعت پر آمادہ ہوجائیں گے۔

لیکن حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی اتباع و پیروی میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس قاعدہ کو رد کیا ہے کہ جس شخص سے صدور ذنب ہوا ہو وہ اس شخص کے برابر نہیں ہوسکتا جس سے صدور ذنب نہ ہوا ہو، کیونکہ بسا اوقات گناہ صادر ہونے کے بعد آدمی توبہ کرتا ہے تو اس کا رتبہ و درجہ اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جس سے گناہ کا صدور نہ ہوا ہو، بلکہ اس سے بڑھ بھی سکتا ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے "مناقبِ شافعی" میں لکھا ہے کہ "ماتقدم من ذنبک" سے وہ قصور مراد ہے جو نبوت سے پہلے صادر ہوئے اور "ماتأخر" سے مراد عصمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا کرنے کے بعد آپ کو معصوم بنایا اور پھر آپؐ سے کوئی گناہ اور قصور صادر نہیں ہوا۔ (النووی شرح صحیح مسلم ۱۰۹/۱، احکام القرآن للشافعی: ۳۸)

(۴) بعض حضرات کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اگلی پچھلی خطائیں، اللہ تعالیٰ معاف کرچکے ہیں، اس لئے حضرت عیسیٰؑ، آپؐ کے پاس آنے کا (لوگوں کو) مشورہ دیں گے کہ اس مقام شفاعت میں بالفرض اگر کوئی تقصیر بھی ہوجائے تو وہ بھی عفو عام کے تحت پہلے ہی آچکی ہے۔ (دیکھئے فتح الملہم ۳۶۴/۱)

"اور میں بارگاہ رب العزت میں پہنچ کر اس کی خدمت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا" یہ جملہ حدیث کی عبارت کا بامحاورہ ترجمہ ہے۔ اگر اس حدیث میں

موجود لفظ "في داره" کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ یوں ہوگا کہ "پس میں اپنے پروردگار کے پاس اس کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کروں گا" اس صورت میں کہا جائے گا کہ "اس کے گھر" سے مراد اس کی طرف سے عطا ہونے والے اجر وثواب کی جگہ یعنی جنت ہے، لیکن زیادہ واضح مطلب وہ ہے جو علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے "انہوں نے لکھا ہے کہ "پروردگار کے پاس اس کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنے" سے مراد یہ ہے کہ آپ، اللہ تعالیٰ سے یہ اجازت طلب کریں گے کہ وہ آپ کو اس مقام میں داخل ہونے کی اجازت عطا کرے جہاں کسی کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، جہاں پہنچ کر جو بھی عرض ودعا کی جائے، اس کا منظور ومقبول ہونا یقینی ہے، اور جہاں پہنچ کر کھڑے ہونے والے اور پروردگار کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں ہے، اور یہ وہ مقام ہے جس کو "مقامِ محمود" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی کو "مقام شفاعت" بھی کہتے ہیں۔

اشکال اور جواب:

رہی یہ بات کہ پروردگار تو مکان ولا مکان کی قید سے پاک ہے، اس کو جہاں بھی پکارا جائے اور جس جگہ بھی اس سے عرض ودعا کی جائے۔ وہ وہیں موجود ہے، اور وہیں سنتا اور دیکھتا ہے، تو پھر اس کی کیا ضرورت ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میدان حشر میں جس جگہ لوگوں کی شفاعت کی درخواست قبول کریں گے وہاں سے چل کر اس مقام خاص پر بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کریں گے اور پھر عرض ومعروض کریں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ موقف (یعنی میدان حشر جہاں لوگ ٹھہرے ہونگے) دراصل ایک ایسے ملکی نظام کی طرح ہوگا جو کسی باقاعدہ اور مہذب حکومت کے تحت ہو، جہاں ہر شخص مرتبہ و درجہ کے مطابق طریق کار اور نظمِ عمل کا اصول کارفرما ہو، چنانچہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "شافع" کی حیثیت رکھیں گے اور "شافع" کا یہ حق ہے کہ وہ اعزاز واکرام کی جگہ آکر کھڑا ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ بات القاء کرے گا کہ وہ اس جگہ سے چل کر

کہ جو خوف و ہولناکی اور وحشت و گھبراہٹ سے گھری ہوگی، اس جگہ آئیں جو آپؐ کے اعزاز و اکرام کا مقام ہے، تاکہ آپؐ وہاں اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ عرض و معروض کر سکیں۔

''اور اس حمد وثناء کے ساتھ جو پروردگار مجھے سکھلائے گا۔'' اس جملہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اس وقت میں جن الفاظ، جس اسلوب اور جس انداز میں اللہ رب العزت کی تعریف وتوصیف بیان کروں گا، وہ کیا ہوگا، اس وقت اس کا علم مجھے بھی نہیں ہے وہ سب کچھ مجھے اس وقت سکھایا اور بتایا جائے گا، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف اس موقع اور اس مقام کی مناسبت سے جس قدر وسعت و گہرائی رکھتی ہے اس کا ادراک یہاں کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اس اعتبار سے اس مقام کو ''مقام حمد'' اور ''مقام محمود'' کہتے ہیں۔

حدیث کے اس جملہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جو شخص کسی سے سفارش کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ پہلے اس کی تعریف وتوصیف کرے، تاکہ اس کا قرب اور اس کی توجہ حاصل کر سکے اور قبول سفارش سے نوازا جائے۔

''پھر میں شفاعت کروں گا'' کے ضمن میں قاضی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی خوب حمد وثناء کریں گے اور پھر اس حمد وثناء کے بعد شفاعت کی اجازت پاکر امتی امتی کہنا شروع کریں گے۔

''اور میرے لئے شفاعت کی ایک حد مقرر کردی جائے گی'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے سامنے یہ متعین فرمادے گا کہ ایسے ایسے گنہگاروں کی شفاعت کرو، مثلاً وہ فرمائے گا کہ اپنی امت کے ان لوگوں کی شفاعت کرو جو زنا کار تھے یا جو بے نمازی تھے اور یا جو شراب نوش تھے، چنانچہ میں اسی تعیین کے ساتھ شفاعت کروں گا، اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے زانیوں کے حق میں تمہاری سفارش قبول کی، پھر فرمائے گا کہ میں نے بے نمازیوں کے حق میں تمہاری شفاعت قبول کی۔ اسی پر دوسرے طبقوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا

ہے۔

اشکال اور جواب:

''اور اس جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا''۔

اس موقع پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث کے شروع میں تو یہ مذکور ہے کہ شفاعت کی درخواست کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کو میدان حشر میں محصور کیا گیا ہوگا اور وہاں کی تنگی وسختی اور کرب وہولنا کی سے تنگ آکر آپ کی سفارش چاہیں گے، تاکہ آپ انہیں اس جگہ کی پریشانیوں اور ہولنا کیوں سے نجات دلائیں، لیکن یہاں حدیث کے اس جزو ''جب بارگاہ خداوندی میں حضور ﷺ کی شفاعت کرنے اور آپ کی شفاعت قبول ہونے'' کا ذکر آیا اور آپ نے فرمایا کہ میں اس جماعت کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کراؤں گا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ سے شفاعت کی درخواست کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جنہیں دوزخ میں بھیجا جا چکا ہوگا؟ اس اشکال کے دو جواب ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ شاید اہل ایمان کے دو طبقے ہوں گے، ایک طبقہ کو تو (جو اپنے گناہوں کے سبب سزا کا مستوجب ہوگا) میدان حشر میں محصور کئے بغیر دوزخ میں بھیج دیا جائے گا اور یہی طبقہ آنحضرت ﷺ سے شفاعت کی درخواست کرے گا، چنانچہ آپ شفاعت کے ذریعہ اس طبقہ کو اس بدترین حال سے، کہ جس میں وہ گرفتار ہوگا، نجات دلا کر جنت میں پہنچوائیں گے، اور پھر اس کے بعد آپ اس طبقہ کے حق میں جماعت جماعت کر کے شفاعت فرمائیں گے جو دوزخ میں ڈالا جا چکا ہوگا اور متعدد باران کو دوزخ سے نکلوا کر جنت میں داخل کروائیں گے! اس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ آنحضرت نے اس حدیث میں یہاں صرف اسی ایک طبقہ کا ذکر فرمایا اور اختصارِ کلام کے طور پر دوسرے طبقہ کے ذکر کو حذف فرمادیا، کیونکہ اس ایک طبقہ کو نجات دلانے کے ذکر سے دوسرے طبقہ کو نجات دلانا بطریقِ اولیٰ مفہوم ہو جاتا ہے، (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں یہاں ''نار'' (آگ) کا لفظ منقول ہے، جس کا ترجمہ ''دوزخ'' کیا گیا ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ ''نار'' یعنی آگ سے

مراد ''دوزخ'' نہ ہو، بلکہ وہ سخت تپش اور گرمی مراد ہو جو میدان حشر میں سورج کے بہت قریب آ جانے کی وجہ سے وہاں محسوس کی جائے گی اور ''نکلوانے'' سے مراد اس سخت تپش اور گرمی سے لوگوں کو چھٹکارا دلانا ہو، اس صورت میں حدیث کے اس جملہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں شاعفت قبول ہونے کے بعد بارگاہ رب العزت سے باہر آؤں گا اور لوگوں کو سخت ترین تپش اور گرمی سے چھٹکارا دلا کر جنت میں پہنچواؤں گا۔

یہ جواب اگر چہ ایک ایسی وضاحت ہے جس پر مجازی اسلوب کا اطلاق ہوسکتا ہے، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہی جواب حقیقت امر کے بہت قرین ہے، اور حدیث کے اصل موضوع کے نہایت مناسب، کیونکہ اس ارشاد گرامی میں جس شفاعت کا ذکر ہو رہا ہے اس سے ''شفاعت عظمیٰ'' مراد ہے، جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ارشاد گرامی "ومن دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ" کے بموجب مقام محمود اور لوائے ممدود سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس شفاعتِ عظمیٰ کا اصل مقصد تمام مخلوق کو میدان حشر کی ہولنا کیوں اور پریشانیوں سے چھٹکارا دلانا، جہاں وہ حساب و کتاب کے انتظار میں کھڑے ہوں گے اور ان کا حساب جلد کرانا ہوگا، نیز یہی وہ شفاعت ہے جو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مخصوص ہے، اس کے بعد پھر خود آنحضرتؐ، دوسرے انبیاء کرام، اولیاء، علماء، صلحاء، شہداء، اور فقراء کی طرف سے متعدد شفاعتیں ہوں گی۔

''مقام محمود'' اور اس کی وجہ تسمیہ:

''یہی وہ مقام ہے ..... الخ'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں آنحضور کیلئے جس ''مقام محمود'' کا وعدہ کیا ہے وہ اسی ''شفاعتِ عظمیٰ'' کا مقام ہے جو آپؐ کے سوا کسی اور کو عطا نہیں ہوگا۔ واضح رہے کہ اس مقام کی صفت ''محمود'' کے ساتھ یا تو اس اعتبار سے ہے کہ اس مقام پر کھڑا ہونے والا اس کی تعریف کرے گا اور اس کو پہچانے گا، یا اس اعتبار سے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر کھڑے ہو کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمد وثناء بیان کریں گے، اور یا اس اعتبار سے ہے کہ وہ مقام عطا ہونے کی وجہ سے

آنحضرت ﷺ کی تعریف وتوصیف تمام اولین وآخرین مخلوق کی زبان پر ہوگی۔

(مظاہر حق ج۵ص۱۶۴تاص۶۶)

قیامت کے دن شفاعت وغیرہ سے متعلق کچھ مزید باتیں:

(۲۶۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن مجلس نبویؐ میں) کچھ لوگوں نے کہا کہ یارسول اللہ! کیا قیامت کے دن ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "ہاں، دیکھو گے" (پھر آپؐ نے دیدار الٰہی کے ثبوت کو واضح کرنے کے لئے لوگوں سے سوال کیا کہ) کیا تم لوگ دوپہر کے وقت، جبکہ آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا بھی نہ ہو سورج کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ وتکلیف محسوس کرتے ہو اور کیا تم لوگ شفاف چودھویں رات میں چاند کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ وتکلیف محسوس کرتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں، یارسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: "تو پھر قیامت کے دن تم اللہ تعالیٰ کو دیکھنے میں بھی کوئی رکاوٹ وتکلیف محسوس نہیں کرو گے، ہاں جیسا کہ تم ان دونوں (سورج وچاند) میں سے کسی کو دیکھنے میں رکاوٹ وتکلیف محسوس کرتے ہو، (اس کے بعد آپؐ نے فرمایا) جب قیامت کا دن برپا ہوگا (اور تمام مخلوق میدان حشر میں جمع ہوگی) تو ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ جو طبقہ (دنیا میں) جس چیز کی عبادت کرتا تھا وہ اسی کے پیچھے رہے، چنانچہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بجائے بتوں اور انصاب کو پوجتے تھے، ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہیں بچے گا اور سب کے سب دوزخ میں جاگریں گے۔ (کیونکہ انصاب اور بت کہ جن کی پوجا ہوتی تھی، دوزخ میں پھینکے جائیں گے، لہٰذا ان کے ساتھ ان کی پوجا کرنے والے بھی دوزخ میں ڈالے جائیں گے)، یہاں تک کہ جب ان لوگوں کے سوا کوئی موجود نہیں رہے گا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے وہ خواہ نیک ہوں یا بد، تو تمام جہانوں کا پروردگار ان کے پاس آئے گا، اور فرمائے گا کہ تم کس کے منتظر ہو؟ ہر طبقہ اس چیز کے پیچھے پیچھے چلا جارہا ہے جس کی وہ عبادت کرتا تھا (تو تم پھر یہاں کیوں کھڑے ہو، تم بھی کیوں نہیں چلے جاتے) وہ لوگ جواب دیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم نے دنیا میں ان لوگوں

سے (جو دنیا میں غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے اور اب اپنے معبودوں کے پیچھے پیچھے دوزخ میں چلے جائیں گے) پوری طرح جدائی اختیار کر رکھی تھی، حالانکہ ہم (اپنی دنیاوی ضرورتوں میں)ان لوگوں (کی مدد واعانت) کے ضرورت مند تھے، لیکن ہم نے کبھی ان کی صحبت وہمنشینی کو گوارا نہیں کیا، (اور نہ کبھی ان کی اتباع کی، بلکہ ہمیشہ ان کے مدمقابل رہے اور صرف تیری رضا کی خاطر ان سے جنگ وجدال کرتے رہے، پس اب جبکہ ہم ان کے کسی طرح سے ضرورت مند بھی نہیں ہیں، اوران سب کی منزل بھی دوزخ ہے تو ہم ان کے ساتھ کیسے چلے جاتے)، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہاں یوں نقل کیا گیا ہے کہ وہ لوگ (جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے) یہ کہیں گے کہ ہم یہاں سے اس وقت تک نہیں جائیں گے جب تک ہمارا پروردگار ہمارے پاس نہیں آئے گا، (یعنی جب تک وہ ہم پر اس طرح سے تجلی نہ فرمائے جس کے سبب ہم اس کو پہچان لیں کہ یہی ہمارا پروردگار ہے)، اور جب ہمارا پروردگار (اپنی تجلی وصفات کے اظہار کی صورت میں کہ جس کے سبب ہم اس کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں) ہمارے پاس آئے گا تو ہم اس کو پہچان لیں گے۔ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان وہ نشانی ہے جس کے ذریعہ تم اس کو پہچان لو گے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں وہ نشانی ہے، تب اللہ تعالیٰ کی پنڈلی کھولی جائے گی اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ ہر شخص کو سجدہ کی اجازت اور توفیق عطا فرمائے گا جو (دنیا میں کسی کو دکھانے سنانے اور کسی خوف اور لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ) خود اپنے نفس کے تقاضے (یعنی اخلاص و عقیدت) کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا تھا اور ہر وہ شخص کہ (جو دنیا میں) کسی خوف سے یا لوگوں کے دکھانے سنانے کیلئے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا تھا، اللہ تعالیٰ اس کی کمر کو ایک پورا تختہ بنا دے گا (یعنی اس کی پیٹھ و کمر کی ہڈیوں کے جوڑ بالکل ختم کر دیئے جائیں گے اور اس کی پوری پیٹھ ایک تختہ بن جائے گی تاکہ وہ جھک نہ سکے اور نہ سجدہ کر سکے) چنانچہ وہ سجدہ میں جانے کے لئے جھکنا چاہے گا تو چت گر پڑے گا، پھر دوزخ کے اوپر (اس کے بیچوں بیچ) پل صراط کو رکھا جائے گا، اور شفاعت کی اجازت عطا کی جائے گی، چنانچہ تمام انبیاء (اپنی اپنی

امتوں کے حق میں طلب استقامت وسلامتی کیلئے) یہ دعا کریں گے کہ: اے اللہ! ان کو (پل صراط کے اوپر سے) سلامتی سے گزار دے، ان کو دوزخ میں گرنے سے محفوظ رکھ، پس مسلمان لوگ (پل صراط کے اوپر سے) اس طرح گزریں گے کہ بعض تو پل جھپکتے ہی گزر جائیں گے اور بعض بجلی کی طرح گزر جائیں گے، بعض ہوا کے جھونکے کی مانند، بعض پرندوں کی اڑان کی مانند، بعض تیز رو اور خوش رفتار گھوڑے کی مانند، اور بعض اونٹ کی چال کی مانند گزریں گے، پس ان میں سے تو کچھ مسلمان تو وہ ہونگے جو دوزخ کی آگ سے بالکل سلامتی اور نجات پائے ہونگے، (یعنی پل صراط کے اوپر سے گزرنے کے وقت ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا)، اور کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو زخم کھا کر نکلیں گے اور (دوزخ کی آگ سے) نجات پائیں گے، نیز کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو پارہ پارہ کئے جائیں گے اور دوزخ میں دھکیل دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ جب مومن دوزخ کی آگ سے نجات پالیں گے، تو قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی بھی شخص ظاہر و ثابت شدہ حق کے حصول میں اتنی شدید جدوجہد اور سختی نہیں کرتا جتنی شدید جدوجہد مومن قیامت کے دن اپنے ان بھائیوں کی نجات کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں کریں گے، جو دوزخ میں ہونگے، وہ مومن کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! یہ لوگ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ حج کرتے تھے (یعنی ان کی نماز ہماری نمازوں کی طرح ہوتی تھی اور ان کا حج بھی ہمارے ہی حج کی طرح ہوتا تھا پس تو ان کو بھی دوزخ سے نجات دیدے)، ان سے کہا جائے گا کہ جاؤ! اور جن لوگوں سے تم (اپنی مذکورہ شہادت کی روشنی میں) پہچانتے ہو انہیں (دوزخ سے) نکال لو، پس دوزخ کی آگ پر ان کی صورتوں کو حرام کر دیا جائیگا، چنانچہ وہ مومن بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے، پھر کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! جن لوگوں کو تو نے (دوزخ) سے نکالنے کا حکم دیا تھا (یعنی اہل نماز، اہل زکوٰۃ اور اہل حج وغیرہ) ان میں سے اب دوزخ میں کوئی باقی نہیں رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اچھا! پھر جاؤ! اور ہر اس شخص کو بھی دوزخ سے نکال لو، جس کے دل میں تم دینار برابر بھی نیکی پاؤ، پس (وہ مومن جائیں گے) اور بہت سے لوگوں کو دوزخ

سے نکال لائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ جاؤ! اور اب اس شخص کو دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں تم ذرہ برابر بھی کوئی نیکی پاؤ، (پس وہ مومن جائیں گے) اور وہ بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نکال لائیں گے، وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے دوزخ میں بھلائی کو باقی نہیں رہنے دیا ہے (یعنی دوزخ میں اب ایسا کوئی شخص باقی نہیں بچا ہے جس کے دل میں ایمان کے علاوہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی اور ذرہ برابر بھی بلکہ ذرہ سے بھی کمتر کوئی نیکی ہو، خواہ اس کا تعلق اعمال سے ہو یا افعال قلب سے)، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتوں نے شفاعت کرلی اور پیغمبروں نے بھی شفاعت کرلی اور مومنوں نے بھی شفاعت کرلی، (اور ان سب کی شفاعت کا تعلق ان لوگوں سے تھا جن کے نامہ اعمال میں کوئی نہ کوئی نیکی ضرور تھی خواہ وہ نیکی ذرہ کے برابر یا اس سے بھی کمتر درجہ ہی کی کیوں نہ ہو اور اس طرح) اب ایسی کوئی ذات باقی نہیں رہ گئی ہے (جو خود بھلائی پہنچانے یا بھلائی پہنچانے والے سے سفارش کے ذریعہ کسی کے ساتھ رحم ومروت اور عنایت وہمدردی کا معاملہ کرے) لیکن ابھی ارحم الراحمین کی ذات باقی ہے (جس کی رحمت، جس کا کرم اور جس کی عنایت ہر ایک پر سایہ فگن ہے، اور اس کی رحمت وعنایت کے اثرات کے مقابلہ پر ہر ایک رحمت و عنایت ہیچ ہے) اور (یہ فرما کر) اللہ تعالیٰ دوزخ میں سے اپنی مٹھی بھر کر (ان لوگوں کو) نکال لے گا جنہوں نے کبھی بھی کوئی نیکی کی ہی نہیں ہوگی، یہ لوگ دوزخ میں (جلتے رہنے کی وجہ سے) کوئلہ بن چکے ہوں گے چنانچہ ان کو اس نہر میں ڈالے گا جو جنت کے دروازوں کے سامنے ہے، اور جس کو "نہرِ حیات" کہا جائے گا، اور پھر یہ لوگ اس نہر سے اس طرح تر و تازہ نکلیں گے جس طرح دانہ سیلاب کے کوڑے کچرے میں اُگتا ہے، پھر یہ لوگ (اس نہر سے) موتی کی مانند پاک وشفاف باہر آئیں گے، ان کی گردنوں میں مہریں لٹکی ہوئی ہونگی، چناچہ (جب اہل جنت ان لوگوں کو ان کی امتیازی علامتوں کے ساتھ دیکھیں گے تو) کہیں گے کہ یہ وہ (خوش نصیب) لوگ ہیں جو خود خدائے رحمان کے آزاد کردہ ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے (اپنے خاص فضل وکرم کے تحت) اس امر کے باوجود جنت میں داخل کیا ہے کہ انہوں نے (دنیا میں) کوئی نیک عمل کیا تھا اور نہ انہوں نے (کم سے کم افعال قلب ہی کی صورت

میں) کوئی نیکی کر کے آگے بھیجی تھی، اور پھر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان نو آزاد لوگوں سے) کہا جائے گا کہ جنت میں تم جو کچھ دیکھ رہے ہو نہ صرف یہ بلکہ ان ہی جیسی اور بہت سی نعمتیں بھی سب تمہارے لئے ہیں''۔

(صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ تعالیٰ، وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ، ج۹ص۱۲۹، و صحیح مسلم، باب اثبات رؤیۃ المؤمنین فی الآخرۃ لربھم سبحانہ و تعالیٰ ج۲ص۱۰۷ حاشیۃ القسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحوض و الشفاعۃ، ص۴۸۹، ۴۹۰)

فائدہ: دیدارالٰہی:

''ہاں دیکھو گے'' امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیفات میں لکھا ہے کہ قیامت کے روز موقف میں ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، یہاں تک کہ بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دفعہ کے لئے تو وہ دیدار منافقوں اور کافروں کو بھی حاصل ہوگا، لیکن پھر فوراً ہی ان کو محجوب کر دیا جائے گا تاکہ وہ ہمیشہ اس دیدار کی حسرت اور اپنی محرومی کے غم میں مبتلا رہیں، تاہم منافقوں اور کافروں کو دیدار حاصل ہونے کی یہ بات زیادہ واضح نہیں ہے، بلکہ اس میں کلام ہے، کیونکہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ "کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ"۔ (یعنی ہرگز نہیں، یقیناً کفار اس دن اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے)۔

اور جہاں تک جنت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کا سوال ہے تو اس بارے میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ وہاں حق تعالیٰ کا دیدار ہر امت کے نبیوں، رسولوں، صدیقوں اور اس امت محمدیؐ کے افراد میں سے تمام مومن مردوں کو حاصل ہوا کرے گا، امت محمدیؐ کی عورتوں کے سلسلہ میں دو قول ہیں: (۱) ایک تو یہ کہ ان کو وہاں دیدار نصیب نہیں ہوگا، (۲) دوسرا یہ کہ ان کو بھی وہاں دیدار نصیب ہوا کرے گا مگر تمام دنوں میں نہیں بلکہ چند مخصوص دنوں مثلاً عید وغیرہ کے دنوں میں۔

فرشتوں کے بارے میں بھی دو قول ہیں (۱) ایک قول تو یہ ہے کہ وہ اپنے رب کو

نہیں دیکھیں گے (۲) اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ بھی اپنے رب کا دیدار کیا کریں گے، اسی طرح جنات کے بارے میں بھی اختلافی اقوال ہیں۔

"کیا تم لوگ دوپہر کے وقت .... الخ" اس سوال کے ذریعہ آپؐ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو چیز عام طور پر مشکل سے نظر آتی ہے اور لوگ اس کے دیدار کے تمنائی ہوتے ہیں۔ اس کو دیکھنے میں دھکم پیل اور مشقت وضرر کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن جس طرح آفتاب و ماہتاب کو دیکھنے میں کسی قسم کی مشقت وضرر اور تکلیف ورکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیدار کے وقت کسی طرح کی دھکم پیل یا مشقت وضرر کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

"ہاں جیسا کہ تم ان دونوں میں سے کسی کو دیکھنے میں رکاوٹ و تکلیف محسوس کرتے ہو" یہ جملہ دراصل تعلیق بالمحال کے طور پر پچھلے جملہ کو زیادہ سے زیادہ زوردار بنانے کے لئے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اگر تم سورج و چاند کو دیکھنے میں کوئی رکاوٹ وتکلیف محسوس کرتے ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے دیدار میں بھی رکاوٹ وتکلیف محسوس کروگے، لیکن جب یہ بات طے ہے کہ ان دونوں (سورج و چاند) میں سے کسی کو بھی دیکھنے میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ رکاوٹ وتکلیف کا سامنا کرنا نہیں پڑتا تو جانو کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے میں بھی کوئی ادنیٰ سی رکاوٹ وتکلیف پیش نہیں آئے گی۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہاں جس دیدار الٰہی کے بارے میں ذکر ہے وہ اس دیدار الٰہی کے علاوہ ہے جو جنت میں اہل ایمان کو اعزاز و اجر کے طور پر نصیب ہوگا، یہ دیدار تو محض امتحان وآزمائش کے طور پر ہوگا، تاکہ دنیا میں جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی اور جن لوگوں نے غیر اللہ کو اپنا معبود بنایا، ان دونوں قسم کے لوگوں کے درمیان فرق و امتیاز ہوجائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آخرت میں بھی بندوں کو امتحان وآزمائش میں مبتلا کرنے کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ حساب وکتاب کے بعد ہر ایک کے حق میں آخری فیصلہ نہ ہوجائے گا کہ کون اجر و جزا کا سزاوار ہے، اور کون عذاب وسزا کا مستوجب!

پس آخرت اگر چہ دار الجزاء ہے، لیکن وہاں کبھی کبھی امتحان و آزمائش کا مرحلہ بھی پیش آئے گا، جس طرح کہ یہ دنیا اگر چہ ''امتحان و آزمائش کا گھر'' ہے، لیکن یہاں کبھی کبھی اجر و بدلہ بھی مرتب ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: ''وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ'' (اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ دراصل تمہاری شامتِ اعمال ہوتی ہے)۔

''جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بجائے بتوں اور انصاب کو پوجتے تھے'' اس جزو میں انصاب دراصل ''نصب'' کی جمع ہے اور ''نصب'' اس پتھر کو کہتے ہیں جو کسی خاص جگہ پر اس خاص مقصد کیلئے گاڑا جائے کہ اس کی پوجا پاٹ ہو، اور اس کے سامنے قربت و نیکی کی نیت سے جانور ذبح کیا جائے، پس ہر وہ چیز کہ جو اس مقصد کیلئے نصب کی جائے اور اس کی پرستش و تعظیم کا عقیدہ رکھا جائے خواہ وہ پتھر ہو یا لکڑی اور یا کوئی دوسری چیز وہ ''نصب'' ہی کہلائے گی۔

''تمام جہانوں کا پروردگار ان کے پاس آئے گا'' مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمال قرب کے ساتھ ان پر تجلی ڈالے گا، یہ تو اس جملہ کی سیدھی سی تاویل ہے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ ''آنا'' پروردگار کی صفات میں سے ہے جس کو اس نے اپنے کلام پاک میں اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے، اور حدیث مقدس میں بھی اسی طرح ذکر ہے، نیز ہم اس کی حقیقت و کیفیت جانے بغیر جوں کے توں اس پر عقیدہ رکھتے ہیں، اور اس بات کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی ذات پاک اس نقل و حرکت سے منزہ ہے جو ''آنے'' میں ہوتی ہے، لہٰذا یہ بات متشابہات میں سے ہے اور ہم پر واجب اور ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں زیادہ نہ الجھیں، بلکہ حقیقت حال کا علم بس اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں، اس جملہ کی کچھ اور بھی تاویلیں کی گئی ہیں: مثلاً ''آنے'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ آئے گا، یا یہ کہ ان لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کا حکم آئے گا، جیسا کہ اگلے جملہ سے یہ بات اشارۃً معلوم بھی ہوتی ہے۔

''جب اللہ تعالیٰ کی پنڈلی کھولی جائے گی'' اس کے بارے میں بعض حضرات

نے یہ کہا ہے کہ "پنڈلی کے کھلنے" سے مراد خوف و دہشت اور گھبراہٹ و ہول کا جاتا رہنا ہے۔ (فتح الباری ۸/۶۶۴، عمدۃ القاری ۱۹/۲۵۷)

اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "پنڈلی کھلنے" سے مراد ایک عظیم نور کا ظاہر ہونا ہے یا یہ کہ فرشتوں کی جماعت کا ظاہر ہونا مراد ہے۔

اور علامہ ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ فوائد و الطاف مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو بار بار حاصل ہوں گے، لیکن سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس بارہ میں بھی توقف ہی کیا جائے گا کہ یہ الفاظ بھی متشابہات میں سے ہیں، اور اس جملہ کی کوئی تاویل کرنے کی بجائے اس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

حدیث میں جہاں اللہ تعالیٰ کی پنڈلی کھلنے، لوگوں کو سجدہ کا حکم ملنے، اور پھر کچھ لوگوں کے سجدہ کرنے اور کچھ لوگوں کے سجدہ پر قادر نہ ہونے کا حکم ہے، وہاں پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں کہ حدیث کے اس جزو سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ آخرت میں منافقین بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گمان کوئی بنیاد نہیں رکھتا، کیونکہ حدیث کے مذکورہ الفاظ میں یہ صراحت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس دیدار سے منافقین بھی مشرف ہونگے، بلکہ اس موقع پر صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے کہ جن میں مخلص مومن بھی ہوں گے اور منافق بھی، اپنا حجاب ہٹا دے گا اور پھر امتحان و آزمائش کیلئے سب کو سجدہ کا حکم دے گا، پس جو شخص مخلص ہوگا سجدہ کرے گا، اور جو شخص منافق ہوگا وہ سجدہ نہیں کر سکے گا۔ اس بات سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ منافق بھی اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔

"پس مسلمان لوگ گزریں گے" یعنی اس پل صراط کے اوپر سے تمام مسلمانوں اس طرح گزریں گے کہ دنیا میں جو شخص عقیدہ و ایمان، عمل و کردار اور دین و شریعت پر استقامت کے اعتبار سے جس درجہ کا رہا ہوگا، اس کے مطابق آسانی کے ساتھ یا دشواری کے ساتھ اس مرحلہ کو پار کرے گا، جس کی طرف حدیث کے اگلے جملہ میں اشارہ کیا گیا ہے، پس وہ پل صراط گویا دین و شریعت کے صراطِ مستقیم کی طرح ہے، جو معنوی طور پر تلوار کی

دھار سے زیادہ باریک ہے اور جس پر چلنا دشوار ہے، لیکن ساتھ ہی یہ صراطِ مستقیم اس قدر روشن اور واضح ہے کہ جو شخص صدقِ نیت اور اخلاصِ قلب کے ساتھ اس پر چلنا چاہے تو اس کے لئے کوئی دشواری نہیں ہے۔

''اور کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو زخم کھا کر نکلیں گے اور دوزخ کی آگ سے نجات پائیں گے'' اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان گنہگار ہوں گے وہ اس پل صراط پر سے گزرنے میں سخت دشواری اور تکلیف واذیت کا شکار ہوں گے، مثلاً پل صراط کے دونوں طرف جو فولادی آنکڑے ہونگے وہ ان کو زخمی کریں گے، ان کا راستہ روکیں گے اور ان کے جسم کو چھیلیں گے، لیکن وہ مسلمان زخمی ہو کر اور چھل چھلا کر کسی نہ کسی طرح پل کو پار کر ہی لیں گے، اور جنت میں پہنچ جائیں گے، اس طرح وہ لوگ دوزخ میں نہیں گریں گے، بلکہ پل صراط کے اوپر ہی تکلیف اور مشقت اٹھا کر نجات پائیں گے یہ مطلب حدیث کے ظاہری اسلوب کے زیادہ مطابق ہے، اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ پہلے تو پل صراط پر اس کے آنکڑوں سے زخمی ہوں گے، سخت پریشانیوں سے دوچار ہوں گے، اور پھر دوزخ میں گرا دیئے جائیں گے، جہاں وہ اپنے گناہوں کے بقدر سزا پانے کیلئے ایک مدت تک رہیں گے، اور پھر ان کو دوزخ کی آگ سے نجات دے کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔

''کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو پارہ پارہ کئے جائیں گے اور دوزخ میں دھکیل دیئے جائیں گے'' یہ ان گنہگار مسلمانوں کا ذکر ہے جن کو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کیلئے بہرحال دوزخ کے سپرد کیا جائیگا۔ چنانچہ یہ لوگ نہ صرف پل صراط پر گزرتے وقت سخت زخمی، تباہ حال اور مصیبت زدہ ہونگے، بلکہ ان کو دوزخ میں بھی گرا دیا جائے گا، تاکہ وہ وہاں اس وقت تک عذاب پاتے رہیں جب تک ان کا خدا چاہے، بعض روایتوں میں ''مکدوش'' کی بجائے ''مُکَرْدَسٌ'' کا لفظ منقول ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ان سب کو باندھ باندھ کر، ہاتھوں اور پیروں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر دوزخ میں اس طرح اکٹھا پھینکا جائے گا کہ وہ ایک دوسرے پر جا کر گریں گے۔

''یہاں تک کہ جب مومن دوزخ سے نجات پالیں گے'' اس جملہ میں مذکور لفظ ''حَتّٰی'' (یہاں تک کہ) اس مرحلہ کے ذکر کی غایت ہے جس میں تمام مومن پل صراط پر سے گزریں گے، اور پھر ان میں سے کچھ لوگ تو پل کو پار کر جائیں گے اور کچھ لوگ دوزخ میں جا گریں گے، لیکن علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ لفظ ''حَتّٰی'' دراصل (حدیث میں مذکور الفاظ) ''مکدوش فی نار جهنم'' کی غایت ہے۔ اس صورت میں پوری عبارت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ کچھ مسلمان وہ ہوں گے جو پارہ پارہ کئے جائیں گے اور دوزخ میں دھکیل دیئے جائیں گے، اور پھر آخر کار ان کو بھی (اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد یا کسی کی شفاعت سے اور یا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے) دوزخ سے نجات مل جائیگی۔

''پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے.......... الخ'' اس سے معلوم ہوا کہ گنہگار مومن ہمیشہ کیلئے دوزخ کے عذاب میں مبتلا نہیں رہیں گے، اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر کار دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیئے جائیں گے، بلکہ وہ جنت میں پہنچنے کے بعد ان دوسرے مومنوں کی بھی شفاعت کریں گے، اور بارگاہ رب العزت میں ان کو عذاب سے چھٹکارا دلانے کی سخت ترین جدوجہد کریں گے، جو اپنے گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے اس وقت دوزخ سے چھٹکارا نہیں پا سکے ہوں گے، جیسا کہ حضورؐ نے اپنے مذکورہ ارشاد کے ذریعہ واضح فرمایا۔

''تم میں سے کوئی بھی شخص ظاہر اور ثابت شدہ حق کے حصول میں...... الخ'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص پر تمہارا کوئی حق بالکل ظاہری دلائل و شواہد کے ذریعہ واجب ہوتا ہے اور تم اس حق کو پانے کا بہر صورت استحقاق رکھتے ہو تو اس شخص سے اپنا وہ حق حاصل کرنے کیلئے تم جتنا شدید مطالبہ اور تقاضا کرتے ہو اور اس کے حصول کی جدوجہد میں جس طرح سعی و کوشش کی آخری سے آخری حد تک چلے جاتے ہو، اس سے بھی زیادہ شدید تمہارا مطالبہ اس دن بارگاہ رب العزت میں اپنے ان مسلمان بھائیوں کی نجات کیلئے ہوگا جو دوزخ میں پڑے ہونگے، اور تم ان کو وہاں سے نکلوانے کیلئے اللہ تعالیٰ سے عرض و معروض اور درخواست و شفاعت میں سعی و کوشش کی آخری سے آخری حد تک چلے جاؤ گے۔

''پس دوزخ کی آگ پر ان کی صورتوں کو حرام کر دیا جائے گا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ دوزخ کی آگ کو اس بات سے منع کر دیا جائے گا کہ وہ ان اہل ایمان کو اس طرح جلائے یا نقصان پہنچائے کہ ان کے چہرے مسخ ہو جائیں اور وہ پہچان میں نہ آسکیں۔

حاصل یہ کہ اس وقت تک جو اہل ایمان دوزخ میں ہوں گے ان کے چہرے نہ تو جلیں گے اور نہ سیاہ ہوں گے۔ لہٰذا ان کی شفاعت کرنے والے مومن اس علامت کے ذریعہ ان کو آسانی کے ساتھ پہچان لیں گے اور دوزخ سے نکلوالیں گے۔

''جس کے دل میں تم دینار کے برابر بھی نیکی پاؤ'' یہاں اور اس طرح آگے کے جملہ میں ''نیکی'' سے مراد وہ چیز ہے جو اصلِ ایمان سے زائد ہوگی، کیونکہ اصلِ ایمان کہ جس کو تصدیق کہتے ہیں، ایک ایسا جوہر ہے جو اجزاء اور حصوں میں نا قابل تقسیم ہے اور اس پر کمی وبیشی وغیرہ کا اطلاق نہیں ہوتا، جس نیکی کو اجزاء اور حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یا جس پر کمی وبیشی کا اطلاق ہوتا ہے وہ اصلِ ایمان سے زائد اور ایمان کے ثمرہ اور نتیجہ کے طور پر ایک الگ شے ہوتی ہے، پس ''دل میں دینار برابر یا آدھے دینار برابر نیکی ہونے'' کا مطلب یہ ہے کہ جن کے پاس معمولی درجہ کا بھی ایسا عمل صالح ہو کہ جس کے فعل کا تعلق دل سے ہے، جیسے ذکر خفی یا کسی غریب و مسکین پر شفقت کرنا یا خوف الٰہی اور نیت صادقہ وغیرہ تو ان کو دوزخ سے نکلوالو۔ (قاضی عیاضؒ حاشیہ فضل الباری ج ا ص ۳۸۰)

''جنہوں نے کبھی بھی کوئی نیکی کی ہی نہیں ہوگی'' یہاں بھی ''نیکی'' سے مراد وہ چیز ہے جو اصلِ ایمان سے زائد ہو، پس یہ لوگ کہ جن کو ارحم الراحمین محض اپنی خصوصی رحمت کے تحت دوزخ سے نکالے گا جو اپنے پاس افعال قلب میں سے بھی کوئی چھوٹی یا بڑی نیکی نہیں رکھتے ہوں گے، البتہ اصل ایمان (تصدیق) کے حامل ضرور ہونگے اور ان لوگوں کی شفاعت کی اجازت کسی کو حاصل نہیں ہوگی۔

''ان کی گردنوں میں مہریں لٹکی ہوئی ہوں گی'' اس جملہ میں ''مُہر'' سے مراد سونے وغیرہ کا وہ زیور ہے جو گلے میں لٹکایا جاتا ہے، حاصل یہ کہ علامت کے طور پر ان کے گلوں میں کچھ مخصوص قسم کے ہار پڑے ہوں گے جن کے ذریعہ وہ دوسرے لوگوں سے ممتاز

نظر آئیں گے۔(مظاہرِ حق ج۵ص۱۷۶تا ص۱۷۹)۔

وہ لوگ جن کو دوزخ میں سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا:

(۲۶۳) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں پہنچا دیا جائے گا (اور ہر شخص اپنے اپنے عمل کے مطابق جنت یا دوزخ میں اپنی جگہ پہنچ جائے گا) تو اللہ تعالیٰ (انبیاءؑ سے یا شفاعت کرنے والوں سے اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ فرشتوں سے) فرمائے گا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان (نیکی و بھلائی) ہو تو اس کو دوزخ سے نکال لو، چنانچہ ان لوگوں کو دوزخ سے باہر لایا جائے گا، اور اس وقت ان کی حالت یہ ہوگی کہ وہ جل جلا کر کوئلہ کی طرح ہو گئے ہونگے، پھر ان کو نہرِ حیات میں ڈالا جائے گا اور وہ (اس نہر سے) اس طرح تروتازہ نکلیں گے جیسے سیلاب کے کوڑے کچرے میں گھاس کا دانہ اُگتا ہے" کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ دانہ کس طرح لپٹا ہوا زرد نکلتا ہے (یعنی کتنا زیادہ تروتازہ اور کتنی جلدی باہر آتا ہے"؟۔

(صحیح مسلم، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحوض و الشفاعۃ ص۴۹۰، باب اثبات الشفاعۃ و اخراج الموحدین من النار ج۲ص۱۲۸، حاشیہ القسطلانی)

فائدہ:

اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ پچھلی حدیث میں جو یہ فرمایا گیا تھا کہ "آخر میں ارحم الراحمین اپنی مٹھی بھر کر ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لے گا جنہوں نے کبھی بھی کوئی نیکی نہیں کی ہوگی۔" تو وہاں وہی لوگ مراد ہیں جن کا تعلق اہلِ ایمان سے ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے نامہ اعمال میں کوئی بھی نیکی یا بھلائی نہیں ہوگی۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس موقع پر حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ وہم ہو سکتا ہے کہ وہ کافر لوگ ہوں گے، چنانچہ اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ کوئی بھی کافر کسی بھی صورت میں دوزخ سے نہیں نکالا جائے گا۔ (مظاہر حق ج۵ص۱۷۹)

''نہر حیات'' سے کیا مراد ہے؟

قاسمِ ثانی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ: ''حیات بارش کو کہتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بارش سے بھی زندگی ملتی ہے، اس لئے اس کو بارش کی نہر یا زندگی کی نہر کہا گیا ہے، حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جہنم سے نکال کر فوراً ہی جنت میں داخل نہیں کئے جائیں گے، بلکہ جنت کے دروازے پر ایک نہر ہے جس کا یہ نام ہے، پہلے اس میں ڈالے جائیں گے، تا کہ جہنم کی آگ سے جھلنے کے بعد انسانوں میں زندگی اور تر و تازگی آ جائے، حدیث میں مذکور لفظ فینبتون (اس طرح تر و تازہ نکلیں گے) سے معلوم ہوتا ہے کہ نہر میں ڈالتے ہی تازگی اور نشو و نما شروع ہو جائے گی، کیونکہ فا تعقیب مع الوصل کیلئے ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مثال بیان فرمائی کہ اگر گھاس کا دانہ سیلاب کے کنارے کی مٹی میں پڑ جائے تو چلتے چلتے نمو ہو جاتا ہے، کچھ دیر نہیں لگتی، سرعت نمو کیلئے اس مثال کو بیان فرمایا۔''

(فضل الباری شرح صحیح البخاری ج۱ ص۳۸۰)

اور علامہ طاہر صدیقی پٹنی گجراتیؒ لکھتے ہیں کہ: ''اس کو نہر حیات اس لئے کہتے ہیں کہ جو اس میں غوطہ لگائے گا (گویا) زندہ ہو جائے گا۔ (مجمع البحار ج۱ ص۵۹۹)

دوزخیوں کی نجات کا ذکر:

(۲۶۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا قیامت کے دن ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مضمون کے اعتبار سے وہی حدیث بیان کی جو پیچھے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی ہے، (دونوں روایتوں میں الفاظ کا اختلاف ہے)، ہاں البتہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پنڈلی کھلنے کا ذکر نہیں کیا، اور پھر فرمایا کہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا) ''جب دوزخ کے اوپر پل صراط کھڑا کیا جائے گا تو تمام رسولوں میں اس پل کو اوپر سے اپنی امت کے ساتھ گزرنے والا سب سے پہلا رسولؐ میں ہوں گا، اور اس وقت (رسولوں کے علاوہ)، کوئی بھی شخص زبان سے بات نکالنے کی جرات نہیں کرے گا، اور

رسول بھی صرف اتنا کہیں گے کہ اے اللہ! سلامتی کے ساتھ رکھ! نیز (اس پُل کے دونوں طرف) جہنم میں سعدان کے کانٹوں جیسے آنکڑے ہوں، ان آنکڑوں کی لمبائی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، وہ آنکڑے لوگوں کو ان کے برے اعمال کے سبب اچک لیں گے، پس ان لوگوں میں سے بعض تو وہ ہوں گے جو اپنے اعمال کی پاداش میں ہلاک ہوں گے (یعنی دوزخ میں جا گریں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عذاب میں مبتلا رہیں گے جیسے کافر) اور بعض وہ ہوں گے جو (ان آنکڑوں کی گرفت کی وجہ سے) پاش پاش ہو جائیں گے، لیکن پھر نجات پا جائیں گے۔ (یعنی آنکڑوں کے اچکنے کی وجہ سے ان کے جسم کا گوشت جگہ جگہ سے کٹ جائے گا اور پورا بدن بری طرح زخمی ہو جائے گا، اور پھر وہ اسی حالت میں کسی نہ کسی طرح پل کو پار کر ہی لیں گے یا اگر دوزخ میں جا گریں گے تو وہاں کچھ عرصہ تک اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر کار ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نجات پا جائیں گے، پس یہ گنہگار اور فاسق مسلمانوں کا حال بیان کیا گیا ہے)، پھر جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلے سے فارغ ہو جائے گا (کہ اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے جو جنت کا مستحق ہوگا اسے جنت میں بھیج دیا جائے گا اور جو دوزخ کا مستوجب ہوگا اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا) اور یہ ارادہ کرے گا کہ جن لوگوں نے لآ الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کی گواہی دی ہے ان میں سے جن کو وہ چاہے وہ دوزخ سے نکال لے، تو فرشتوں کو حکم دے گا کہ ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو معبود مانتے تھے (اور اس کے علاوہ کسی اور کی معبودیت پر ایمان نہیں رکھتے تھے)، چنانچہ فرشتے ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے اور ان کی پیشانیوں پر سجدہ کے نشانات کے ذریعہ ان کو شناخت کریں گے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے کہ وہ سجدوں کے نشان کو کھائے، اس لئے دوزخ کی آگ ابن آدم کے سارے جسم کو کھا جائے گی (یعنی جلا ڈالے گی) مگر سجدوں کے نشان کو نہیں کھائے گی، بہر حال! وہ لوگ دوزخ سے اس حالت میں باہر لائے جائیں گے کہ وہ آگ میں جل کر سیاہ ہو چکے ہوں گے، پس ان پر آبِ حیات چھڑکا جائے گا، اور وہ (اس پانی کے اثر سے) اس طرح تر و تازہ ہو جائیں گے جس طرح سیلاب کے کوڑے کچرے

میں پڑا ہوا دانہ (فوراً) اُگ آتا ہے، اور (اس وقت ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہوگا کہ) ایک شخص جو دوزخیوں میں سے جنت میں داخل ہونے والا آخری شخص ہوگا، جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا رکھا جائے گا، اس کا منہ دوزخ کی طرف ہوگا، وہ عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار! (بس اتنا کرم کردے کہ) میرا منہ دوزخ کی طرف سے پھیر دے، دوزخ کی آگ کی بدبو نے مجھے سخت اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے، اور اس کے شعلوں کی تیزی اور گرمی مجھے بھسم کیے جارہی ہے! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ "اگر میں ایسا کردوں (یعنی تیرا منہ دوزخ کی طرف سے پھیر دوں) تو ہوسکتا ہے کہ تو پھر کچھ اور بھی مانگنے لگے" وہ عرض کرے گا کہ تمہیں تیری عزت کی قسم! میں اور کچھ نہیں مانگوں گا، پھر وہ کچھ اور عہد و پیان کرے گا جو اللہ تعالیٰ چاہے گا، اور اللہ تعالیٰ اس کا منہ دوزخ کی طرف سے پھیر دے گا، مگر جب اس کا منہ (دوزخ کی طرف سے) جنت کی طرف پھیر دے گا، اور وہ جنت کی زیبائش و آرائش اور تروتازگی دیکھے گا تو اس وقت تک خاموش رہے گا جب تک خدا چاہے گا، اور پھر عرض کرے گا کہ "اے میرے پروردگار! مجھے جنت کے دروازے تک پہنچا دے" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا تو نے یہ عہد و پیان نہیں کیا تھا کہ تو اپنی اس درخواست کے علاوہ کوئی اور درخواست پیش نہیں کرے گا" وہ گڑگڑائے گا، "اے میرے پروردگار! تو مجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بدنصیب نہ بنا" (کہ تیری یہ ساری مخلوق تو جنت کے اندر ہے اور میں اتنا حرمانِ نصیب ہوں کہ جنت کے دروازے تک نہیں پہنچ سکتا، مجھے اس کے دروازے تک پہنچا دے) مگر جب وہ جنت کے دروازے تک پہنچے گا اور جنت کی چمک دمک اور اس کے اندر کی چیزوں (جیسے عالیشان محلات، عیش و عشرت کے اسباب، حور و غلمان اور جنت میں رہنے والوں) کے ٹھاٹ باٹ دیکھے گا تو پہلے اس وقت تک خاموش رہے گا جب تک خدا چاہے گا، اور پھر عرض کرے گا: "اے میرے پروردگار! مجھے جنت کے اندر پہنچا دیجئے" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "ابن آدم! افسوس! تو کس قدر عہد شکن اور وعدہ فراموش ہے، کیا تو نے عہد و پیان نہیں کیا تھا کہ تو اپنی اس درخواست کے علاوہ (جو تیری خواہش کے مطابق منظور کر لی گئی تھی) کوئی اور درخواست پیش نہیں کرے گا" وہ عرض کرے گا: "اے میرے پروردگار!

(بے شک میں نے عہد و پیمان کیا تھا لیکن جب میں نے تیری شان عفو اور تیری بے کراں رحمت کی طرف دیکھا اور اس بات پر غور کیا کہ خود تو نے اپنے کلام مجید میں فرمایا ہے: "لاَ تَيْئَسُوْا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ" تو مجھے معلوم ہوا کہ میں ان کافروں کی طرح نہیں ہوں جو تیری رحمت سے ناامید ہو گئے ہیں، میں تیرے کرم اور تیری وسعت رحمت سے ہر لمحہ امید رکھنے والا ہوں، پس تیرا دامن رحمت تھام کر عرض کرتا ہوں کہ) مجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بدنصیب نہ بنا"۔ غرض یہ کہ وہ اسی طرح گڑگڑاتا رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ جب راضی ہو جائے گا تو اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت دیدے گا، پھر فرمائے گا کہ: تو اور جو کچھ آرزو اور خواہش رکھتا ہو تو تُو اس کو ظاہر کر اور جو کچھ مانگنا چاہتا ہے مانگ لے" چنانچہ وہ اپنی آرزوئیں بیان کرے گا اور جب اپنی آخری سے آخری آرزو بھی پوری کرا لے گا، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فلاں فلاں چیز کی بھی خواہش کیوں نہیں ظاہر کرتا، گویا پروردگار اس کو یاد دلانا چاہے گا، (تو نے فلاں فلاں چیز تو مانگی ہی نہیں، ان چیزوں کو بھی مانگ لے، میں تجھے ہر چیز عطا کروں گا) یہاں تک کہ جب وہ آرزوئیں بھی پوری ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "نہ صرف یہ تمام چیزیں تیرے لئے ہیں، بلکہ ان ہی جیسی مزید نعمتیں تجھے عطا کی جاتی ہیں" اور ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "نہ صرف یہ تمام چیزیں تیرے لئے ہیں، بلکہ ان کے ساتھ دس گنا اور نعمتیں تجھے عطا کی جاتی ہیں"۔

(صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الصراط، جسر جهنم ج ۸ ص ۱۱۷، صحیح مسلم، باب اثبات رؤية المؤمنين في الآخرة لربهم سبحانه و تعالىٰ ج ۲ ص ۱۰۷ حاشیه القسطلانی، مشكوة المصابيح، باب الحوض و الشفاعة ص ۴۹۰)

فائدہ:

"مگر سجدوں کے نشان کو نہیں کھائے گی" اس جملہ کے ضمن میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دوزخ کی آگ جسم کے ان اعضاء کو نہیں

جلائیگی جن سے سجدہ کیا جاتا ہے اور وہ جسم کے سات حصے ہیں، یعنی پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں رانوں اور دونوں پاؤں، جبکہ بعض حضرات (قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ) کہتے ہیں کہ اس سے مراد صرف پیشانی ہے کہ اسے نہ جلایا جائے گا۔ لیکن علماء نے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی بات کو زیادہ پسند کیا ہے۔ (دیکھئے شرح النووی علی صحیح مسلم ج۲ص۱۰۸)

''چنانچہ ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا'' یہ حدیث بظاہر اس حدیث (مذکور) کے خلاف ہے جس میں یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کو نہر حیات میں ڈالا جائے گا، لیکن حقیقت میں ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو نہر حیات میں غوطہ دلوایا جائے گا اور کچھ لوگوں پر اس نہر کا پانی چھڑکنا ہی کافی قرار دیا جائے گا۔

''تیری عزت کی قسم! میں کچھ نہیں مانگوں گا'' اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص جب اپنی قسم اور اپنے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرے گا تو اس پر قسم اور عہد توڑنے کا عتاب کیوں نہیں ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص کا حال ایک مجنون اور از خود رفتہ شخص کا سا ہوگا، اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص ''معذور'' سمجھا جاتا ہے، یا یہ کہ یہ بات جس جگہ سے تعلق رکھتی ہے وہ ایک ایسی جگہ (آخرت) ہے جہاں کے کسی عمل کا کوئی شخص مکلّف ہی نہیں ہوگا، پس اس سے مؤاخذہ کس بناء پر کیا جائے گا۔ (مظاہر حق ج۵ص۱۸۱تاص۱۸۲)

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قیامت کے روز شفاعت کرنا:

(۲۶۵) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب قیامت کا دن ہوگا تو (میدان حشر میں) لوگ ایک دوسرے کے ساتھ عجب اضطراب اور افراتفری کی حالت میں ہوں گے، (یعنی وہاں کی سختی اور ہولناکی سے بیتاب ہوکر ادھر ادھر بھاگے پھریں گے، اور آپس میں صلاح و مشورے کریں گے کہ اس ہولناکی سے چھٹکارے کی کیا راہ نکالی جائے) چنانچہ وہ حضرت آدمؑ کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے کہ آپ اپنے پروردگار سے شفاعت کر دیجئے (کہ وہ ہمارے حساب د

کتاب کا حکم جاری فرمادے اور ہمیں اجر وثواب یا عذاب دے کر ہمارا معاملہ ایک طرف کرے)، حضرت آدمؑ جواب دیں گے کہ میں شفاعت کا اہل نہیں ہوں، البتہ تم لوگ ابراہیمؑ کے پاس جاؤ، وہ اللہ کے دوست ہیں، (اور تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں)، وہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئیں گے اور حضرت ابراہیم بھی انہیں یہ جواب دیں گے کہ میں شفاعت کا اہل نہیں ہوں، البتہ تم لوگ (حضرت) موسیٰ کے پاس جاؤ، وہ اللہ کے کلیم ہیں، (اور تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں) وہ لوگ حضرت موسیٰ کے پاس آئیں گے اور حضرت موسیٰ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں شفاعت کا اہل نہیں ہوں، البتہ تم لوگوں کو (حضرت) عیسیٰ کے پاس جانا چاہئے، جو اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں، (اور وہ تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں) وہ لوگ حضرت عیسیٰ کے پاس آئیں گے اور حضرت عیسیٰ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں شفاعت کا اہل نہیں ہوں، اور تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جانا چاہئے، (وہی تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تب لوگ میرے پاس آئیں گے (اور مجھ سے شفاعت کی درخواست کریں گے) میں ان سے کہوں گا کہ ہاں، بے شک میں شفاعت کا اہل ہوں، پھر میں بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے کی اجازت طلب کروں گا، مجھے پیش ہونے کی اجازت عطا کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ میرے دل میں اپنی حمد وثناء کے الفاظ ڈالے گا جس کے ذریعہ میں اس کی حمد وثناء کروں گا، اور وہ حمد وثناء (کن الفاظ اور کس اسلوب میں ہوگی) اس وقت مجھے معلوم نہیں ہے، بہر حال! (جب میں اس کی بارگاہ میں پیش ہوں گا اور اس کو دیکھوں گا تو) سجدہ میں گر پڑوں گا اور اس کی وہی حمد وثناء بیان کروں گا، پھر مجھ سے کہا جائے گا: ''اے محمدؐ! اپنا سر اٹھاؤ! جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو تمہاری بات سنی جائیگی، جو مانگنا چاہتے ہو مانگو میں دوں گا، اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو، میں قبول کروں گا، میں (سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد یا سجدہ ہی میں) عرض کروں گا کہ اے میرے پروردگار! میری امت کو بخش دیجئے، میری امت پر رحم فرمایئے (یا یہ مطلب ہے کہ میرے پروردگار میں اپنی امت کے بارے میں شفاعت کرتا ہوں، میں اپنی امت کے بارے میں شفاعت کرتا ہوں) مجھ

سے کہا جائے گا کہ جاؤ! ہر اس شخص کو (دوزخ سے) نکال لو جس کے دل میں جو برابر بھی ایمان ہے، پس میں جاؤں گا، اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا، اس کے بعد میں پھر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور ان ہی الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرتا ہوا سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر مجھ سے کہا جائے گا: ''اے محمدؐ! اپنا سر اٹھاؤ جو کہنا چاہتے ہو کہو تمہاری بات سنی جائے گی، جو مانگنا چاہتے ہو مانگو میں دوں گا، اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو میں قبول کروں گا، میں عرض کروں گا کہ اے میرے پروردگار! میری امت کو بخش دیجئے، میری امت پر رحم فرمایئے! مجھ سے کہا جائے گا کہ جاؤ! اور ہر اس شخص کو دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں ذرّے یا رائی کے برابر بھی ایمان ہے، پس میں جاؤں گا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا، اس کے بعد پھر میں بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا، اس کے بعد پھر میں بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور ان ہی الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرتا ہوا سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ ''اے محمدؐ! اپنا سر اٹھاؤ جو کہنا چاہتے ہو کہو تمہاری بات سنی جائے گی، جو مانگنا چاہتے ہو مانگو میں دوں گا، اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو میں قبول کروں گا'' میں عرض کروں گا کہ ''اے میرے پروردگار! میری امت کو بخش دیجئے، میری امت پر رحم فرمایئے، مجھ سے کہا جائے گا کہ جاؤ! اور ہر اس شخص کو دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں رائی کے ادنیٰ سے ادنیٰ دانہ کے برابر بھی ایمان ہو، پس میں جاؤں گا اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا، اس کے بعد میں پھر چوتھی مرتبہ بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور ان ہی الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرتا ہوا سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر مجھ سے پوچھا جائے گا کہ ''اے محمدؐ! اپنا سر اٹھاؤ! جو کہنا چاہتے ہو کہو تمہاری بات سنی جائے گی جو مانگنا چاہتے ہو مانگو میں دوں گا، اور جو شفاعت کرنا چاہتے ہو کرو میں قبول کروں گا'' میں عرض کروں گا'' اے میرے پروردگار! (اب) مجھے اس شخص کی بھی شفاعت کی اجازت مرحمت فرما دیجئے جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو، پروردگار فرمائے گا کہ نہیں، اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ مجھے اپنی عزت وجلال اور اپنی ذاتی وصفاتی

عظمت و بڑائی کی قسم! اس شخص کو میں دوزخ سے نکالوں گا جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو گا‘‘۔

(صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب کلام الرب عزوجل یوم القیامۃ مع الانبیاء ج۹ ص ۱۳۶، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحوض والشفاعۃ ص ۴۸۸)

فائدہ:

’’جس کے دل میں جو برابر بھی ایمان ہو‘‘ واضح رہے کہ اس طرح کے جملوں (یعنی جس کے دل میں جو برابر یا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر اور یا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو) کی توضیح و تاویل میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، اور یہ اختلاف احوال پر مبنی ہے، اس موقع پر صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ مذکورہ جملوں میں جس چیز کو جو یا رائی یا ذرہ کے برابر فرمایا گیا ہے، اس سے حقیقی ایمان مراد نہیں ہے بلکہ خیر و بھلائی کی قسم میں سے وہ چیز مراد ہے جو ایمان کے ثمرات و نتائج، ایقان کی روشنی اور عرفان کے نور سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس چیز پر حقیقت ایمان کا اطلاق اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ اصلِ ایمان، جو تصدیق قلبی اور ایسے ہی اقرار لسانی کا نام ہے، ایک ایسا جوہر ہے جس کو اجزاء اور حصوں میں تقسیم ہی نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس پر کمی و زیادتی کا اجراء ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصل ایمان (تصدیق قلبی) نہ تو گھٹتا بڑھتا ہے اور نہ اس کو کسی مقدار یا حصہ میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پس جو علماء یہ کہتے ہیں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے اور اس پر کمی و بیشی کا اطلاق ہو سکتا ہے اگر ان کے اس قول کو اچھے اور بُرے اعمال کے اعتبار سے ایمان کے ثمرات و درجات میں کمی و زیادتی پر محمول کیا جائے تو اس صورت میں معلوم ہو گا کہ مذکورہ مسئلہ سے متعلق علماء کے درمیان درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ ان کے اختلافی اقوال محض لفظی اختلاف اور صوری نزاع ہے۔

’’جس کے دل میں رائی کے ادنیٰ سے ادنیٰ دانہ کے برابر بھی ایمان ہے‘‘ یہ دراصل اللہ جل شانہٗ کی طرف سے انتہائی فضل و کرم کا اظہار ہو گا کہ اس شخص کو بھی دوزخ سے نکال لو جو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا مومن ہے۔

''جس نے لآ الہ الا اللہ کہا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان لوگوں کی بھی شفاعت کرنا چاہتا ہوں جس کے نامہ اعمال میں اس کلمہ طیبہ کے علاوہ اور کوئی بھی نیکی نہیں ہے، اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی وضاحت کے مطابق اگر چہ انہوں نے اپنے ایمان کی حالت میں یا ایمان لانے کے بعد اپنی پوری زندگی میں کلمہ طیبہ بھی صرف ایک مرتبہ کیوں نہ زبان سے ادا کیا ہو۔

حاصل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری مرتبہ جن لوگوں کی شفاعت کریں گے وہ اس درجہ کے مومن ہوں گے کہ ان کے نامہ اعمال میں کوئی بھی نیکی اور کوئی بھی اچھا کام نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کبھار اپنی زبان سے کلمہ طیبہ ادا کیا ہوگا، بلکہ بعض تو ایسے بھی ہوں گے جن کی زبان پر پوری عمر میں صرف ایک ہی مرتبہ یہ کلمہ آیا ہوگا، اور ان کے بارے میں یہ شفاعت بھی آپؐ اس امید پر کرنا چاہیں گے کہ زبان سے لآ الہ الا اللہ کہنا بھی بہر حال ایک نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ کسی بھی نیکی کو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی اور کتنے ہی کم درجہ کی کیوں نہ ہو، ضائع نہیں جانے دے گا، بلکہ اول یا آخر اس کا اجر ضرور دے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے کہ ''**من قال لآ اله الا اللّٰه دخل الجنة**'' یعنی جس نے لآ الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں جائے گا۔'' امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اس حدیث میں ''جو اور رائی وغیرہ کی مقدار'' کے ذریعہ جس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے وہ اصلِ ایمان مراد نہیں ہے جس کو ''تصدیق قلبی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ اس سے ایمان کے علاوہ کچھ اور مراد ہے اور وہ ''کچھ اور'' نیکی اور بھلائی کی قسم میں سے وہ چیز ہے جو ایمان کے ثمرہ کے طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے۔

''نہیں اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں الخ'' اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کے نامہ اعمال میں لآ الہ الا اللہ کہنے کے علاوہ اور کوئی بھی نیکی نہیں ہے اس کو دوزخ سے نکالنے کی شفاعت کا حق بھی گو آپ کو حاصل ہے اور آپؐ شوق سے ایسے شخص کی شفاعت بھی کیجئے، ہم اس کو قبول کریں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو دوزخ سے نکلوانا آپؐ

کے ذمہ نہیں ہے۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ بے شک ہم اس شخص کو بھی دوزخ سے نکالیں گے مگر ایسا ہم آپ ﷺ کی شفاعت کی وجہ سے نہیں کریں گے بلکہ اس وجہ سے کریں گے کہ اپنے فضل و کرم کو ظاہر کرنے کیلئے ہم خود اس کو دوزخ سے نکالنا پسند کریں گے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس مومن کے دوزخ سے نکالے جانے کا معاملہ، کہ جس نے اپنی پوری عمر میں کوئی بھی نیکی و بھلائی نہیں کی ہے، شفاعت کے دائرہ سے باہر ہوگا بلکہ وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے متعلق ہوگا۔

ایک تعارض اور اس کا جواب:

اس صورت میں یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جو روایت اسعد الناس الخ (میری شفاعت کا سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہوگا جس نے خلوص دل سے لا الہ الا اللہ کہا ہوگا" (رواہ البخاری) کے الفاظ سے آتی ہے، پھر اس کا کیا مفہوم ہوگا اور مذکورہ مطلب مراد لینے کی صورت میں دونوں کے درمیان (اس روایت اور مذکورہ حدیث) تطبیق کیا ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہاں پہلا مطلب مراد لیا جائے تو ان دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تعارض ہی نہیں رہے گا، کیونکہ مذکورہ شخص کو اللہ تعالیٰ بہر حال آنحضرت ﷺ کی شفاعت ہی کے سبب دوزخ سے نکالے گا، اور اگر دوسرا مطلب مراد لیا جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ یہاں حدیث میں "جس شخص نے لآ الہ الا اللہ کہا ہو" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے نبی ﷺ پر ایمان تو لائے تھے لیکن کوئی بھی عمل خیر نہ رکھنے اور اپنی بدعملیوں کی بناء پر دوزخ کے مستوجب قرار دیئے گئے ہوں گے، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت (اسعد الناس والی) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنے نیک اعمال کو اپنے برے اعمال کے ساتھ اس طرح خلط ملط کیا ہوگا کہ ان کی نیکیاں ہلکی اور برائیاں بھاری پڑ گئی ہوں گی، اور وہ دوزخ کے مستوجب قرار دیئے گئے ہوں گے۔ (مظاہر حق حق ج ۵ ص ۱۶۸ تا ص ۱۶۹)

جنت میں سب سے بعد میں جانے والا شخص:

(۲۶۶) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت میں سب سے آخر میں داخل ہونے والا جو شخص ہوگا وہ جب (دوزخ سے باہر نکل کر) روانہ ہوگا تو ایک مرتبہ (یعنی ایک قدم) آگے چلے گا اور دوسری مرتبہ (یعنی دوسرے قدم پر) منہ کے بل گر پڑے گا اور تیسری مرتبہ (یعنی تیسرے قدم پر) دوزخ کی آگ اس کے جسم کو جھلس ڈالے گی، (جس کی وجہ سے اس کے بعض اعضاء جل جائیں گے اور اس کی جلد کا رنگ بدل جائے گا) پھر جب وہ (اسی طرح گرتا پڑتا اور جھلستا ہوا) دوزخ (کی گرمی و تپش کی زد) سے آگے گزر جائے گا تو مڑ کر دیکھے گا اور کہے گا کہ خدا کی ذات بزرگ و برتر ہے جس نے مجھے تجھ سے چھٹکارا دلایا، خدا کی قسم! میرے پروردگار نے مجھے وہ چیز عطا کی ہے جو اس نے اگلے پچھلے لوگوں میں سے کسی کو عطا نہیں کی، پھر اس کی نظر کے سامنے ایک درخت کھڑا کیا جائے گا (جس کے نیچے پانی کا چشمہ ہوگا) وہ (اس درخت اور چشمہ کو دیکھ کر) عرض کرے گا کہ ''اے میرے پروردگار! مجھے اس درخت کے قریب پہنچا دے، تاکہ میں اس کا سایہ حاصل کرسکوں، اور اس کے چشمہ سے پانی پیوں،'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ابن آدم! اگر میں تیری یہ آرزو پوری کر دوں تو ہوسکتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ اور مانگنے لگو'' وہ عرض کرے گا کہ ''اے میرے پروردگار! ایسا نہیں ہوگا، اس کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے اس بات کا عہد کرے گا کہ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگے گا، چونکہ وہ شخص ایک ایسی چیز دیکھے گا جو اس کو بے صبر کر دے گی، اس لئے اس کا پروردگار اس کو معذور جان کر اس سے درگزر کرے گا اور اس کو درخت کے پاس پہنچا دے گا! وہ شخص اس درخت کے سایہ میں بیٹھے گا اور اس کے چشمہ سے پانی پیئے گا، پھر (اس کو اور زیادہ آگے بڑھانے کیلئے) اس کی نظر کے سامنے ایک درخت کھڑا کیا جائے گا جو پہلے درخت سے زیادہ اچھا ہوگا، وہ شخص (اس درخت کو دیکھ کر) کہے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو اس درخت کے پاس پہنچا دیجئے تاکہ اس کا سایہ حاصل کروں اور اس کے چشمہ سے پانی پیوں! نیز میں اب

اس درخت کے علاوہ کچھ اور نہیں مانگوں گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ ''اے ابن آدم! کیا تو نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تو اس (پہلے) درخت کے علاوہ کچھ اور مجھ سے نہیں مانگے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ''اگر میں تجھے اس درخت کے پاس بھی پہنچا دوں تو ہو سکتا ہے کہ تو مجھ سے کچھ اور مانگنے لگے، پس اس کا پروردگار اس کو معذور جان کر اس سے درگزر کرے گا، کیونکہ وہ ایسی چیز دیکھے گا جو اس کو بے صبر کر دے گی، اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو اس درخت کے پاس پہنچا دے گا، وہ شخص اس درخت کے سایہ میں بیٹھے گا اور اس کے چشمہ کا پانی پیئے گا، اور (تیسرا) درخت اس کے سامنے کھڑا کیا جائے گا جو جنت کے دروازے کے قریب اور پہلے دونوں درختوں سے زیادہ اچھا ہوگا، وہ شخص (اس درخت کو دیکھ کر) کہے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے اس درخت کے پاس پہنچا دیجئے تا کہ میں اس کا سایہ حاصل کروں اور اس کے چشمہ میں سے پانی پیوں'' اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ ''ابن آدم! کیا تو نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ اس کے علاوہ کچھ اور مجھ سے نہیں مانگے گا'' وہ عرض کرے گا کہ ''ہاں (میں نے بیشک عہد کیا تھا لیکن اب یہ میرا آخری سوال ہے) اس کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگوں گا، پس اس کا پروردگار اس کو معذور جان کر اس سے درگزر کرے گا، کیونکہ وہ شخص ایک ایسی چیز دیکھے گا کہ جو اس کو بے صبر کر دے گی، اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو اس درخت کے پاس پہنچا دے گا، اور جب وہ اس درخت کے پاس پہنچ جائے گا اور اس کے کان میں وہ (دلچسپ اور مزے دار) باتیں آئیں گی جو جنتی لوگ اپنی بیویوں اور اپنے دوست واحباب سے کریں گے، تو وہ شخص (بے اختیار ہو کر) عرض کرے گا کہ ''اے میرے پروردگار! اب مجھے جنت میں بھی پہنچا دیجئے!'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''ابن آدم! کیا کوئی ایسی چیز بھی ہے جو تجھ سے (یعنی تیرے بار بار آرزو اور خواہش کرنے سے) میرا پیچھا چھڑا دے؟'' کیا تو اس سے بھی خوش ہوگا یا نہیں کہ میں تجھے جنت میں دنیا بھر کی مسافت کے برابر اور اسی قدر مزید تجھے جگہ دیدیوں؟'' وہ شخص (انتہائی خوشی ومسرت کے عالم میں) کہے گا کہ ''پروردگار! کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟ حالانکہ آپ تو تمام جہانوں کے پروردگار ہیں؟'' (حدیث کے یہ الفاظ بیان کرنے کے بعد) حضرت ابن

مسعود رضی اللہ عنہ ہنسے اور پھر (حدیث سننے والوں سے) فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں پوچھو گے کہ میں کیوں ہنسا؟ لوگوں نے پوچھا کہ (ہاں بتائیے) آپ کیوں ہنسے تھے؟ آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح ہنسے تھے، اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپؐ ہنسے کیوں؟ تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں اس وجہ سے ہنسا کہ جب وہ شخص کہے گا کہ پروردگار! کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کررہے ہیں، حالانکہ آپ تمام جہانوں کے پروردگار ہیں؟ تو پھر پروردگار عالم اس پر ہنس پڑے گا، بہرحال! اللہ تعالیٰ (اس شخص کی یہ بات سن کر) فرمائے گا کہ "نہیں" میں تجھ سے مذاق نہیں کررہا ہوں، لیکن (یہ سب تجھ کو اس لئے دے رہا ہوں کہ) میں جو چاہوں کرسکتا ہوں (کہ ہر چیز کا مالک ومختار اور قادر مطلق میں ہی ہوں)"۔

ایک اور روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کے الفاظ میں منقول ہے۔ لیکن اس روایت میں، **فیقول یا ابن اٰدم ما یصرنی منک** سے آخر تک کے الفاظ تو نہیں ہیں، البتہ یہ الفاظ اور نقل کئے گئے ہیں کہ "پھر اللہ تعالیٰ اس شخص کو یاد دلائے گا اور بتائے گا کہ فلاں فلاں چیز مانگ اور جب (وہ تمام چیزیں مانگ چکے گا اور) اس کی آرزوئیں تمام ہولیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ نہ صرف یہ تمام چیزیں (جس کی تو نے آرزو اور خواہش کی ہے) بلکہ ان کے دس گنا اور چیزیں بھی عطا کی جاتی ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کے بعد وہ شخص جنت میں اپنے گھر میں داخل ہوگا، وہاں اس کے پاس حورعین میں سے اس کی دو بیویاں آئیں گی، اور کہیں گی کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے (اس عالیشان محل میں کہ جہاں عیش و راحت جاودانی کے سوا نہ کوئی غم وفکر ہے اور نہ موت کا خوف) تمہیں ہمارے لئے اور ہمیں تمہارے لئے پیدا کیا" آنحضرتؐ نے فرمایا "وہ شخص (فرطِ مسرت سے) کہے گا کہ جتنا مجھے عطا کیا گیا ہے اتنا کسی اور کو نہیں دیا گیا۔"

(صحیح مسلم، باب اثبات الشفاعۃ و اخراج الموحدین من النار ج ۲ ص ۱۳۳ حاشیہ القسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحوض و الشفاعۃ ص ۴۹۱)

فائدہ:

''خدا کی قسم! مجھے میرے پروردگار نے وہ چیز عطا کی ہے جو اس نے اگلے پچھلے لوگوں میں سے کسی کو عطا نہیں کی'' اس موقع پر اس شخص کا قسم کھانا اور یہ بات کہنا دراصل اس کے اندر بدرجہ غایت امنڈ آنے والی خوشی اور مسرت کا غماز ہوگا، کیونکہ اس وقت وہ اسی چیز کو سب سے بڑی نعمت جانے گا کہ دوزخ کی آگ سے باہر آنے کا موقع مل گیا۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ دوزخ سے نکلنے کے وقت کسی اور کو اپنے ساتھ نہ دیکھے اور یہ نہ جانے کہ کتنی زیادہ مخلوق جنت کی نعمتوں اور وہاں کے عیش و احت میں ہے، اس لئے وہ یہی سمجھے گا کہ اس وقت میرے پروردگار نے دوزخ سے باہر لانے کی صورت میں مجھے جو نعمت عطا کی ہے، اتنی بڑی نعمت اس نے اگلے پچھلے لوگوں میں سے کسی کو عطا نہیں کی۔

اس شخص کے یہ کہنے پر کہ ''پروردگار! کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں الخ'' اللہ تعالیٰ کے ہنسنے سے مراد بندے سے اس کا بہت زیادہ خوش ہونا ہے، اور اس بات کو بیان کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا اس عجب و سرور کی بناء پر تھا جو ایک گنہگار بندے پر اللہ تعالیٰ کے کمال لطف و مہربانی کو دیکھ کر آپؐ کے اندر پیدا ہوا تھا، رہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بات تو وہ بیان حدیث کے وقت ان الفاظ پر پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اور خود اپنی بھی مسرت کے اظہار کے لئے ہنسے۔

''وہاں اس کے پاس حورعین میں سے اس کی دو بیویاں آئیں گی'' حُوْر اصل میں حَوْرَاءُ کی جمع ہے جس سے ''گورے رنگ اور حسین چہرے والی عورت'' مراد ہوتی ہے اور ''عِیْن'' اصل میں ''عَیْنَاء'' کی جمع ہے جو ''بڑی اور کالی آنکھ'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ (مظاہر حق ج۵ ص۱۸۴)

(۲۶۷) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں یقیناً اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے آخر میں دوزخ سے نکالا جائے گا اور سب سے آخر میں جنت میں پہنچایا جائے گا، یہ ایک ایسا شخص ہوگا جو گھٹنوں کے بل چل کر

دوزخ سے باہر آئے گا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ جا اور جنت میں داخل ہو جا، وہ شخص جب وہاں (جنت کے اندر یا جنت کے دروازے پر) پہنچے گا تو اس کو جنت اس حال میں دکھائی دے گی کہ گویا وہ بالکل بھر گئی ہے، (اور اس میں مزید کسی کے لئے گنجائش نہیں ہے) وہ شخص عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے تو یہ جنت بالکل بھری ہوئی ملی ہے (یہاں میرے لئے کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی ہے)'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جا اور جنت میں داخل ہو، وہاں تیرے لئے دنیا (کی مسافت) کے بقدر اور اس سے دس گنا مزید جگہ تیرے لئے (مخصوص کر دی گئی) ہے'' وہ شخص (انتہائی تحیر واستعجاب کے عالم میں) کہے گا کیا آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں؟ یا (کہے گا) کیا آپ مجھ سے ہنسی کر رہے ہیں؟ حالانکہ آپ تو بادشاہ ہیں!؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بات فرما کر ہنسے، یہاں تک کہ آپ کی کچلیاں نظر آنے لگیں'' اور کہا جاتا تھا کہ یہ شخص جنتیوں میں سب سے چھوٹے درجہ کا آدمی ہوگا۔''

(صحیح مسلم، باب اخراج الموحدین من النار ج ۲ ص ۱۳۳ حاشیہ القطلانی)

(۳۶) قیامت کے روز بندوں کا اللہ جل شانہٗ کے سامنے کھڑا ہونا

(۲۶۸) حضرت محل بن خلیفہ الطائی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھا، آپؐ کے پاس دو آدمی آئے، ایک فقر و فاقہ کی شکایت کر رہا تھا اور دوسرا راستہ میں ڈاکہ کے خوف کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''رہا ڈاکہ کا معاملہ، تو یاد رکھو کہ تم پر تھوڑا عرصہ ہی گزرے گا کہ تم دیکھو گے کہ قافلہ مکہ سے بغیر محافظ کے نکلے گا، اور رہا فقر و فاقہ! تو یاد رکھو کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک وہ وقت نہ آجائے کہ تم میں سے ایک شخص اپنا صدقہ لے کر پھرے گا لیکن اس کو کوئی قبول کرنے والا نہیں ملے گا، پھر تم میں سے ہر شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوگا، اس کے اور خدا تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب اور ترجمان نہ ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: ''کیا میں نے تجھے مال عطا نہیں کیا تھا؟ وہ کہے گا، کیوں نہیں، پھر اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: کیا میں نے تمہاری طرف رسول نہیں بھیجے تھے؟ وہ کہے گا، کیوں نہیں! پھر وہ اپنی دائیں طرف دیکھے گا، اور آگ کے سوا کچھ نہ دیکھے گا، پھر اپنی بائیں طرف دیکھے گا اور صرف آگ ہی آگ دیکھے گا، اس لئے تم میں سے ہر شخص کو چاہئے کہ آگ سے بچے، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے بدلہ کیوں نہ ہو، اور اگر یہ نہ پائے تو پھر حسنِ گفتار کے ذریعہ ہی جہنم سے بچے''۔ (صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقۃ قبل الرد ج۲ص۱۰۹)

ایک پیش گوئی، جو حرف بحرف پوری ہوئی:

(۲۶۹) حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ اچانک ایک شخص آیا اور آپؐ سے اپنے فقر و فاقہ اور افلاس کا شکوہ کرنے لگا، پھر ایک اور شخص آیا، اس نے راہ زنی کی شکایت کی، (کہ راستہ میں

کچھ ڈاکو اور قزاقوں نے مجھے لوٹ لیا ہے) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (ان دونوں کی باتیں سننے کے بعد مجھ سے) فرمایا: کہ اے عدیؓ! تم نے تو حیرہ (مقام) دیکھا ہوگا؟ اگر تمہاری عمر دراز ہوئی تو تم یقیناً دیکھو گے، ایک عورت تنہا اونٹنی پر سوار ہو کر حیرہ سے چلے گی، اور (مکہ پہنچ کر) کعبہ کا طواف کرے گی، اور سوائے اللہ تعالیٰ کے اس کو کسی (رہزن) کا خوف نہیں ہوگا، اگر تم زیادہ دنوں تک زندہ رہے تو (دیکھو گے کہ) کسریٰ (فارس کے بادشاہ) کے خزانے کھول دیئے جائیں گے (جو غنیمت کے طور پر ہاتھ لگیں اور تمام مسلمانوں میں تقسیم ہونگے) اور اگر تمہاری عمر زیادہ ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا یا چاندی لے کر (خیرات کرنے کو) نکلے گا، اور قبول کرنے والے کو ڈھونڈتا پھرے گا، مگر اس کو ایسا کوئی شخص نہیں ملے گا جو اس سے خیرات کا مال لے لے، اور قیامت کے روز تم میں سے ایک شخص اللہ کے حضور اس طرح پیش ہوگا کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی تر جمان نہیں ہوگا، جو اس کا حال بیان کرے، پھر اللہ تعالیٰ اس سے سوال کرے گا کہ کیا میں نے (تجھ کو دین کے احکام پہنچانے اور قیامت کے دن کی خبر دینے کے لئے) تیری طرف رسول نہیں بھیجا تھا! وہ شخص کہے گا کہ بے شک آپ نے رسول بھیجا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں نے تجھ کو مال وزر عطا نہیں کیا تھا، اور کیا میں نے تجھ پر فضل واحسان نہیں کیا تھا؟ وہ کہے گا، بے شک آپ نے مجھ کو مال بھی عطا کیا تھا اور مجھ پر فضل واحسان بھی فرمایا تھا، اس کے بعد وہ شخص اپنے دائیں طرف دیکھے گا تو اس کو دوزخ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا (جس کو اس نے ترک طاعت وعبادت کے سبب اپنے لئے واجب کر رکھا ہوگا)، پھر وہ اپنے بائیں طرف دیکھے گا تو اس کو دوزخ کے علاوہ کچھ نظر نہ آئے گا (جس کو اس نے ارتکاب معصیت کے سبب اپنے اوپر واجب کر رکھا ہوگا)، پس رسول کریم ﷺ نے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''لوگو! دوزخ کی آگ سے (خیرات کے ذریعہ) اپنے آپ کو بچاؤ، اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی خیرات کرنے کی استطاعت رکھتے ہو، اور اگر کوئی شخص (اللہ کے نام پر خرچ کرنے کیلئے کھجور کا ایک ٹکڑا بھی) نہ رکھتا ہو تو نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ بات کرے (خود کو دوزخ کی آگ سے) بچائے''۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے (روایت کرنے کے بعد) کہا: (آنحضرت کی اس پیش گوئی کے مطابق) میں نے یہ تو دیکھ لیا کہ اونٹنی پر سوار عورت خانہ کعبہ کا طواف کرنے کیلئے حیرہ سے تنہا سفر کرتی ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے ڈر نہیں لگتا، اور میں خود ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے کسریٰ بن ہرمز (ابن شیرواں، فارس کے بادشاہ) کے خزانوں کو کھولا، اب اگر تم زیادہ دنوں تک زندہ رہے تو نبی کریم ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس پیش گوئی کو بھی حرف بحرف پورا ہوتے دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر کر (سونا چاندی خیرات کرنے کو) نکلے گا (اور کوئی شخص اس کو لینے والا نہیں ملے گا)''۔

(صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، مشکوٰۃ المصابیح، باب علامات النبوۃ ص۵۲۴)

فائدہ:

اس حدیث مبارک میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی پیش گوئی فرمائی: (۱) ایک تو یہ کہ ملک عرب میں مکمل امن وامان ہو جائے گا، ڈکیتی اور رہزنی جیسے جرائم، جو عام زندگی کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیتے ہیں، اس طرح ختم ہو جائیں گے کہ حیرہ جو کوفہ کے پاس ایک پرانا شہر ہے اور نیشاپور میں ایک محلّہ ہے (مجمع بحار الانوار ج۱ ص۵۹۰) اور مکہ معظمہ سے بہت دور ہے، وہاں سے ایک عورت زیارت بیت اللہ اور طواف کعبہ کے لئے مکہ معظمہ تک اونٹنی یا کسی بھی سواری پر تنہا سفر کرے گی اور اس کی جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

(۲) دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ مجاہدین اسلام کے ہاتھوں فارس (ایران) کی عظیم سلطنت فتح کرائے گا، اور وہاں کے بادشاہ کسریٰ کے خزانوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

(۳) اور تیسرے یہ کہ اسلامی حدود سلطنت میں اقتصادی خوشحالی اور مال و دولت کی فراوانی سے چند لوگ یا کوئی خاص طبقہ نہیں بلکہ تمام لوگ اس طرح بہرہ مند ہوں

گے کہ زکوۃ خیرات نکالنے والا اپنے ہاتھ میں سونا چاندی اور روپیہ پیسہ لئے پھرے گا، مگر ڈھونڈنے سے بھی کوئی صدقہ لینے والا اس کو نہیں ملے گا، کیونکہ پوری اسلامی قلمرو میں جب کوئی بھوکا محتاج ہی نہیں ہوگا تو صدقہ خیرات کا سونا چاندی لینے والا کون ہوگا۔ ان تینوں پیش گوئیوں میں سے دو تو پوری ہوگئیں اور ان کا مشاہدہ خود حدیث پارک کے راوی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کیا۔ اور تیسری پیش گوئی کے بارے میں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد پوری ہوگی کہ ان کے عہد سلطنت میں کوئی شخص بھوکا محتاج نہیں ہوگا، اور عام خوشحالی کا یہ عالم ہوگا کہ ڈھونڈنے پر بھی کوئی صدقہ خیرات لینے والا نہیں ملے گا۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ تیسری پیش گوئی بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ خلافت میں پوری ہو چکی ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو جزم کے ساتھ اختیار کیا ہے، چنانچہ ان کے عہد میں عام لوگوں کی اقتصادی حالت اتنی زیادہ بہتر تھی کہ صدقہ خیرات کا مال لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پہلی پیش گوئی فرمائی وہ دراصل اس شخص کے جواب میں تھی جس نے رہزنی کی شکایت کی تھی، اور دوسری پیش گوئی اس شخص کے جواب میں تھی جس نے اپنے فقر وافلاس کی شکایت کی تھی۔ روئے سخن آپؐ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی طرف رکھا جو اس وقت مجلسِ نبویؐ میں حاضر تھے، اور خطاب عام تھا! مقصد یہ تھا کہ ان باتوں کی بشارت تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سن لیں، اور اس ضمن میں ان دونوں شکایت کنندہ کو جواب بھی حاصل ہو جائے جس سے ان کو تسلی ہو۔ یہ بشارت دینے کے بعد کہ مسلمانوں پر معاشی خوشحالی اور مالی وسعت کا زمانہ جلد آنے والا ہے، آپؐ نے یہ واضح کر دینا بھی ضروری سمجھا کہ مال و دولت کی فراوانی چونکہ عام طور پر انسان کو دنیا کی عیش وعشرت میں ڈال کر آخرت سے غافل کر دیتی ہے، اس لئے اہل ایمان کو چاہئے کہ اس فراخی و تونگری کے زمانہ میں یہ بات فراموش نہ کریں کہ دنیا میں مال و دولت کی آسائش و راحت دراصل آخرت میں تنگی وسختی اور ندامت کا باعث ہے۔

ہاں! اگر مال و دولت کو دنیاوی آسائش وراحت کے ساتھ مصارف خیر میں خرچ

کر کے آخرت کا توشہ بھی بنا لینے کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہو جائے تو دنیا و آخرت دونوں جگہ آسائش ہی آسائش ہو گی۔

حاصل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اس شانِ نبوت کے تحت کہ آپؐ بھلائیوں کی بشارت دینے والے بھی ہیں اور خرابیوں سے ڈرانے والے بھی ہیں، مسلمانوں کو وسعتِ رزق اور فراغتِ معیشت کی بشارت بھی عطا فرمائی اور قیامت کے دن کی سختی وشدت اور ہولناکی سے ڈرایا بھی۔

''ترجمان'' اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو کسی بات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کرے، اس کو مترجم بھی کہا جاتا ہے۔ ''پس اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان کسی مترجم وغیرہ کا واسطہ نہیں ہوگا۔ پروردگارِ عالم کے حضور بندہ کی براہ راست پیشی اور گفتگو ہو گی۔

''کیا میں نے تجھ کو مال وزر عطا نہیں کیا تھا؟'' یہ استفہامِ اقراری ہے، یعنی میں نے تجھ کو مال و دولت سے سرفراز کیا، تجھ پر اپنا فضل و انعام کیا، اس مال و دولت کو خرچ کرنے، اس سے فائدہ اٹھانے اور مستحق اور ضرورت مند لوگوں پر اس کو صرف کرنے کی قدرت عطا کی۔

''دائیں اور بائیں دوزخ کو دیکھنے'' کا ذکر کرنا دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ اس دن بندہ اپنے کو چاروں طرف سے دوزخ کے درمیان گھرا ہوا دیکھے گا اور اس ہولناک جگہ سے گلوخلاصی کا راستہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا کہ اس کو دوزخ کے اوپر (پل صراط) سے گزرنا پڑے گا، اگر دنیا میں ایمان وتقویٰ کی زندگی اختیار کی ہو گی، اور اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو اس کے اوپر سے گزر کر جنت میں پہنچ جائے گا، ورنہ دوزخ میں گر پڑے گا۔

ارشاد ربانی ''وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا، ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا'' یعنی ''اور تم میں ایسا کوئی شخص نہیں جس کو اس (دوزخ) کے اوپر

سے گزرنا نہ پڑے گا، یہ تمہارے رب کا حتمی فیصلہ ہے، پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے۔"

اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ اور اس کا ایک بہترین طریقہ صدقہ خیرات بھی ہے، جس قدر مالی وسعت ہو، جتنی ہمت ہو اس کے مطابق غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کی مالی مدد کر کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا چاہئے، اگر کوئی سائل تمہارے سامنے دستِ سوال دراز کرے تو تمہیں جو کچھ بھی میسر ہو اس کو دے دو، یہاں تک کہ تم کھجور کے ایک ٹکڑے کے برابر کوئی معمولی چیز دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں دے سکتے تو وہی معمولی چیز دے کر اس کا سوال پورا کرو، اور اگر سرے سے کچھ بھی دینے کی استطاعت نہیں رکھتے تو کم سے کم یہ کرو کہ اپنے کھرّے اور بھدے جواب کے ذریعہ اس کی دل شکنی کرنے کی بجائے نہایت نرمی وملائمت کے ساتھ اس کے سامنے اپنا عذر بیان کرو، اور ایسے الفاظ اور اسلوب میں اس کو جواب دو کہ وہ تمہارے برتاؤ ہی سے خوش ہو جائے، بشرطیکہ اس میں دین کی مداہنت نہ ہو۔ (مظاهر حق ج۵ ص۴۰۵ تا ص۴۰۶)

قیامت کے دن مومن پر رحمت خداوندی:

(۴۷۰) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے (فضل وکرم اور اپنی رحمت کے) قریب کرے گا، اور (پھر) اس کو اپنی حفاظت اور اپنی عنایت کے سایہ میں چھپا لے گا (تا کہ وہ اہل محشر پر اپنے گناہوں اور اپنی بداعمالیوں کے کھل جانے کی وجہ سے شرمندہ اور رسوا نہ ہو) پھر اللہ تعالیٰ اس (مومن) سے پوچھے گا کہ کیا تو اس گناہ کو جانتا ہے، کیا تو اس گناہ کو جانتا ہے؟ (یعنی کیا تجھے یاد اور اعتراف ہے کہ تو نے دنیا میں فلاں فلاں گناہ کئے تھے) وہ عرض کرے گا کہ ہاں، اے پروردگار! (مجھے اپنا وہ گناہ یاد ہے اور میں اپنی بدعملی کا اعتراف کرتا ہوں) غرضیکہ اللہ تعالیٰ اس سے اس کے تمام گناہوں کا اعتراف اور اقرار کرائے گا، اور وہ (مومن) اپنے دل میں کہتا ہوگا کہ (ان گناہوں کی پاداش میں) میں اب ہلاک ہوا، اب

تباہ ہوا!، لیکن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ''میں نے دنیا میں تیرے ان گناہوں اور ان عیوب کی پردہ پوشی کی اور آج بھی میں تیرے ان گناہوں کو بخش دوں گا، پس اس (مومن) کو اس نیکیوں کا اعمال نامہ دے دیا جائے گا (اور برائیوں کا اعمال نامہ کالعدم کر دیا جائے گا)، اور جہاں تک کافر اور منافق لوگوں کا تعلق ہے تو ان کو تمام مخلوق کے سامنے طلب کیا جائے گا اور پکار کر کہا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے (کفر و شرک کے ذریعہ) اپنے رب پر بہتان باندھا تھا! جان لو! ظالموں پر خدا کی لعنت ہے''۔

(صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ ہود، ج۶ ص۷۴)

امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو المظالم، الادب اور التوحید میں بھی نقل کیا ہے، نیز امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے التوبة میں اور امام نسائیؒ نے التفسیر والرقائق میں اور امام ابن ماجہؒ نے السنة میں نقل کیا ہے۔

(شرح قسطلانی ج۴ ص۲۵۸)

فائدہ:

اس حدیث میں ''مومن'' کا لفظ یا تو بطور نکرہ ہے، کہ غیر متعین طور پر کسی بھی مومن کے بارے میں یہ بشارت دی گئی ہے، اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ ''مومن'' سے جنسِ مومن مراد ہو، یعنی تمام مومنوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کا یہی معاملہ فرمائے گا۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ بشارت ان مومن بندوں کے حق میں ہے جو اس دنیا میں کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے، کسی پر عیب والزام نہیں لگاتے تھے، کسی کو ذلیل و رسوا نہیں کرتے، کسی مسلمان کی فضیحت سے خوش نہیں ہوتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں، اور لوگوں میں کسی کی آبرو ریزی کا باعث نہیں بنتے، پس اللہ تعالیٰ ان کے اوصاف کی جزا کے طور پر قیامت کے دن ان کی پردہ پوشی فرمائے گا، اور ان کو اپنی حفاظت ورحمت کے سایہ میں چھپائے گا۔ (مظاہر حق ج۵ ص۱۳۶)

روایت کے آخر میں سورۃ ہود کی آیت کریمہ (نمبر ۱۸): '' وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ

هٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ" کی توضیح میں علماء فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کئے جائیں گے تو "اَشْهَاد" (اس سے مراد فرشتے، انبیاء علیہم السلام اور مومنین ہیں) خدا کے سامنے ان افتراء اور بہتان باندھنے والوں کے بارے میں شہادت دیں گے کہ یہ دنیا میں اللہ پر افتراء کیا کرتے تھے،" اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ" یہ ادخالِ الٰہی ہے یعنی ان اشہاد (گواہوں) کا کلام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ ان مشرکین پر خدا کی لعنت ہے، اور وہ رحمتِ الٰہی سے دور ہیں، جو دوسرے لوگوں کو بھی راہ توحید سے بھٹکانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں شبہات پیدا کر کے ان کو ایمان و توحید اور اطاعت و عبادت سے روک کر شرک و معاصی کی ترغیب دیتے ہیں۔

(تفسیر کبیر ج ۷ ص ۲۰۴، تفسیر قرطبی ج ۹ ص ۱۹)

قیامت کے دن دیدارِ الٰہی:

(۲۷۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا قیامت کے دن (اپنی آنکھوں سے) ہم اپنے رب کا دیدار کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کیا دوپہر کے وقت، جبکہ ابر نہ ہو، تم سورج کو دیکھنے میں کوئی شک رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا چودھویں رات میں، جبکہ ابر نہ ہو، تم چاند کو دیکھنے میں کوئی شک رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! جس طرح تم سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتے، اسی طرح (قیامت کے دن) اپنے پروردگار کو دیکھنے میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھو گے" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "جب بندے اپنے پرودگار کو دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ ایک بندے کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ: "اے بندے! کیا میں نے تجھے (دیگر مخلوقات پر) فضیلت و شرف نہیں بخشا تھا؟ کیا میں نے تجھے تیری بیوی عطا نہیں کی تھی؟ کیا میں نے تیرے لئے گھوڑے اور اونٹ (اور دیگر کارآمد جانوروں اور چیزوں) کو تیرا مطیع نہیں

بنایا تھا؟ اور کیا میں نے تجھے یہ موقع نصیب نہیں کیا تھا کہ تو اپنی قوم کا سر براہ اور سردار ہو، اور چوتھائی مال غنیمت حاصل کرے؟ (واضح رہے کہ یہ زمانہ جاہلیت میں بھی رواج تھا کہ کسی بھی قوم وقبیلہ کا سر براہ حاصل ہونے والے مالِ غنیمت میں سے اپنے لئے چوتھائی حصہ لیتا تھا اور باقی مال پوری قوم کے لئے چھوڑ دیتا تھا)، وہ بندہ (یہ سُن کر) عرض کرے گا کہ: ''اے میرے پروردگار! بے شک ایسا ہی ہوا تھا (یعنی تو نے اپنے جن انعامات کا ذکر فرمایا ہے وہ سب مجھے دنیا میں حاصل ہوئی تھیں)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کے بعد پروردگار فرمائے گا کہ'' کیا تجھے یہ بھی خیال تھا کہ (ایک دن) تو مجھ سے ملے گا'' بندہ عرض کرے گا کہ نہیں'' (مجھے یہ خیال نہیں رہا تھا اور میں ایسی غفلت میں پڑ گیا تھا کہ اس بات کو بھول ہی گیا)، پس پروردگار فرمائے گا کہ'' تو میں بھی تجھے فراموش کروں گا، (یعنی آج میں بھی تجھے اپنی رحمت سے دور کردوں گا) جیسا کہ تو نے (دنیا میں میری اطاعت اور میری یاد کو) فراموش کر دیا تھا'' پروردگار دوسرے بندے سے ملاقات اور خطاب فرمائے گا''۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ اور اس بندے کے درمیان اسی سوال و جواب کا ذکر کیا جو پہلے بندے کے سلسلہ میں منقول ہوا، پھر پروردگار تیسرے بندے سے ملاقات و خطاب فرمائے گا اور اس سے وہی فرمائے گا جو اس نے پہلے بندہ سے فرمایا تھا اور وہ (تیسرا بندہ) جواب دے گا کہ'' میرے پروردگار! میں تجھ پر، تیری کتاب پر اور تیرے پیغمبروں پر ایمان لایا تھا، میں نے نماز پڑھی، روزے رکھے، اور صدقہ دیا (یعنی زکوٰۃ ادا کی)'' اور اس طرح جس قدر ہو سکے گا وہ اپنی نیکیوں کے بارے میں تعریف وتوصیف بیان کرے گا، اللہ تعالیٰ (اس کی یہ تمام باتیں سُن کر) فرمائے گا کہ'' تم یہیں ٹھہرو! ہم ابھی تمہارے بارے میں گواہ پیدا کیئے دیتے ہیں (یعنی تو نے اپنی نیکیوں کے بارے میں جو دعویٰ کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تو نے ہماری نعمتوں کی شکر گزاری میں اپنی دنیاوی زندگی کو اعمالِ خیر سے معمور کر رکھا تھا، تو ذرا ٹھہر جا ہم گواہوں کے ذریعہ ابھی بتائے دیتے ہیں کہ تو اپنے دعویٰ میں کہاں تک سچا ہے؟) بندہ (یہ سُن کر) اپنے دل میں سوچے گا کہ بھلا اس وقت میرے خلاف کون گواہی دے گا، لیکن جبھی اس کے منہ کو مہر لگا دی جائے گی اور اس کی ران سے کہا جائے گا کہ بول!

چنانچہ اس کی ران، اس کا گوشت اور ہڈی (یعنی ران کے) سب حصے اس کے (ان) اعمال کے بارے میں (جو اس نے دنیا میں واقعۃً کئے ہونگے) بیان دیں گے، اور یہ سب کچھ (یعنی مذکورہ سوال و جواب، بندہ کے منہ کو مُہر لگانا اور اس کے اعضاء کے ذریعہ گواہی دلانا) اس لئے ہوگا تاکہ بندہ کی بداعمالیاں ثابت ہو جائیں، اور وہ کوئی عذر نہ کر سکے اور یہ تیسرا بندہ (جو اپنی نیکیوں کے بارے میں دعویٰ کرے گا لیکن خود اس کے اعضاء اس کے دعویٰ کی تردید کریں گے) درحقیقت منافق ہوگا، اور یہ وہ بندہ ہے جس سے حق تعالیٰ غصہ اور ناراض ہوگا''

(صحیح مسلم، کتاب الزھد ج ۱۰ ص ۳۴۳ حاشیہ القسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحساب والقصاص، والمیزان ص ۴۸۵)

فائدہ:

''اسی طرح تم اپنے پروردگار کو دیکھنے میں شک وشبہ نہیں رکھو گے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہیں سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، کوئی دقت نہیں اٹھانا پڑتی، کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، اسی طرح تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کو بھی بلا تکلف دیکھو گے۔ واضح رہے کہ حدیث میں مذکور لفظ ''تُضَارُّوْنَ'' تؔ کے پیش اور رؔ کی تشدید کے ساتھ منقول ہے، اور یہ لفظ ''رؔ'' کی تشدید کے ساتھ ہو تو اس کی اصل ''مضارت'' ہوگی جس کے معنی ضرر ونقصان کے ہیں، اور اگر یہ لفظ ''رؔ'' کی تشدید کے بغیر ہو تو پھر اس کی اصل ''ضیر'' ہوگی، اور اس کے معنی بھی ضرر ونقصان کے ہیں، پس لفظی ترجمہ کے اعتبار سے ''لاتضارّون'' کے معنی یہ ہوں گے کہ پروردگار کے دیدار کے وقت تم آپس میں لڑائی جھگڑے، دھکم پیل، مخالفت و موافقت اور تصدیق و تکذیب کے ذریعہ ایک دوسرے کو نقصان و تکلیف نہیں پہنچاؤ گے، کیونکہ اس کا دیدار اس طرح واضح و عام اور ہر ایک کے لئے عیاں ہوگا کہ ہر شخص بڑی آسانی اور اطمینان کے ساتھ اس کو دیکھے گا۔

بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اس دیدار کے وقت تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کیلئے پردہ اور رکاوٹ نہیں بنے گا۔

اور مجمع بحار الانوار میں لکھا ہے کہ "تضارون" کا لفظ "مضارت" سے ہے اور مضارت، کے معنی کسی کے دیدار کے وقت اجتماع اور ازدحام کا ہونا (اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے کو تکلیف و پریشانی اٹھانا) مراد ہے"۔ (مجمع البحار ج ۳ ص ۳۹۹)

اسی طرح قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "مضارت" کے معنی مضایقت یعنی ایک دوسرے کو تنگ گیری میں مبتلا کرنا، مراد ہیں، اور یہ معنی اجتماع وازدحام کے قریب ہیں، نیز انہوں نے لکھا ہے کہ مضایقت یعنی آپس میں ایک دوسرے کو تنگ گیر ہونے کا اطلاق کسی ایسی چیز کو دیکھنے کے موقع پر ہوتا ہے جو بالکل مخصوص نوعیت اور خاص انداز سے کسی ایک محدود جگہ پر ہو، اور مجمع وہجوم کی وجہ سے ہر شخص آسانی کے ساتھ اس کو نہ دیکھ سکتا ہو، پس اس صورت میں "لاتضارون" کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پروردگار عالم کے دیدار کے وقت ایک دوسرے سے ملے اور جڑے ہوئے اور تنگ گیری میں مبتلا نہیں ہوں گے، جیسا کہ محدود جگہ پر مجمع وہجوم کے وقت کسی چیز کو دیکھنے کی صورت میں ہوتا ہے، بلکہ جس طرح تم سب اپنی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے بڑے اطمینان اور فراغت کے ساتھ سورج اور چاند کو دیکھتے ہو اسی طرح قیامت کے دن تم سب اپنی اپنی جگہ پر بہ فراغت اپنے پروردگار کا دیدار کروگے۔

ایک روایت میں یہ لفظ تضارون کی بجائے "تضامون" یعنی رؔ کی جگہ مؔ ہے، پھر تضامون کا لفظ بھی دونوں طرح منقول ہے۔ یعنی تؔ کے پیش اور میمؔ کی تشدید کے ساتھ بھی آیا ہے اور م کی تشدید کے بغیر بھی، تشدید کی صورت میں یہ لفظ "ضم" سے مشتق ہوگا اور بغیر تشدید کی صورت میں "ضَیْم" سے! ضم "اجتماع وازدحام کے معنی میں ہے اور "ضیم" ظلم وزیادتی کرنے کے معنی میں ہے، لیکن دونوں صورتوں میں مفہوم وہی ہوگا جو "تضارون" کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ (دیکھئے: مجمع بحار الانوار ج ۳ ص ۳۹۹)

"تو میں بھی تجھے فراموش کردوں گا الخ" اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جب میں نے تجھ کو دنیا میں اپنے ان انعامات سے نوازا اور تجھ پر اتنے بڑے بڑے احسانات کیے تو تیرا فرض تھا کہ تو میری اطاعت وعبادت اور میرے احکام کی اتباع وپیروی کے ذریعہ میرا

شکر ادا کرتا، اور میرے دیدار کا امیدوار رہتا، تاکہ میں تجھے اور زیادہ انعام و جزاء دیتا، اور دنیا کی طرح آج کے دن بھی تجھے سربلند اور سرخرو کرتا، پس جبکہ تو نے دنیا میں میری ان نعمتوں اور میرے ان احسانات کے باوجود مجھے فراموش کر دیا تھا اور میری طرف سے غافل ہو گیا تھا تو اب میں بھی احسان اور اچھا سلوک نہ کر کے تیرے ساتھ وہی معاملہ کروں گا جو کسی غافل اور احسان فراموش شخص کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور اس طرح میں تجھے اپنی رحمت سے دور کر دوں گا۔

واضح رہے کہ یہی مضمون اس آیت کریمہ میں بھی بیان کیا گیا ہے: "قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى" یعنی "اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ایسا ہی (چاہیے تھا) تیرے پاس (دنیا میں) ہماری آیتیں آئیں تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج (یعنی قیامت کے دن) ہم تجھ کو بھلا دیں گے"

اس آیت کریمہ کی تشریح میں علماء مفسرین لکھتے ہیں کہ "جس شخص نے اللہ کی ہدایت کو محض اپنی انا اور ضد کی وجہ سے رد کر دیا، قیامت کے روز اس کو جب قبر سے اندھا اٹھایا جائے گا تو وہ اللہ سے دریافت کرے گا کہ اے اللہ! دنیا میں تو میں اچھا بھلا تھا، تو نے مجھے آنکھوں کا نور دے رکھا تھا تو آج مجھے کیوں آنکھوں کی روشنی سے محروم کر دیا گیا ہے؟! قَالَ كَذٰلِكَ تو اللہ تعالیٰ اس کو جواب دیں گے کہ جس طرح دنیا میں تیرے پاس ہماری آیتیں آئیں، ہمارے پیغمبروں نے تجھے پڑھ کر سنائیں تو تو نے ان کو پس پشت ڈال دیا، ان کی کچھ پرواہ نہ کی، اور ان سے آنکھیں بالکل بند کر لیں اور ان سے اندھا ہو گیا تھا، اسی طرح آج تجھے بھلا دیا گیا ہے اور تجھے کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور تیری آنکھوں سے نور (روشنی) چھین کر تجھے اندھیرے میں چھوڑ دیا گیا ہے (دیکھئے: البحر المحیط ج۶ ص۲۸۷)۔ لیکن یہ اندھا پن ایک مدت معینہ کے لئے ہوگا، اس کے بعد زائل ہو جائے گا اور وہ قیامت کی ہولناکیوں اور دوزخ وغیرہ کا مشاہدہ کرے گا۔ (دیکھئے: روح المعانی ج۶ ص۴۵۱)

"چنانچہ اس کی ران، اس کا گوشت اور اس کی ہڈی، سب حصے اس کے اعمال کے بارے میں بیان دیں گے۔" اس کے بارے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم

میں ہاتھ، پاؤں، زبان اور کھال کا بولنا اور بندے کے اعمال کے سلسلہ میں گواہی دینا مذکور ہے، جب کہ یہاں "ران، گوشت اور ہڈی کے بولنے اور گواہی دینے" کا ذکر ہے، تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کے اس جملہ کا مقصد بھی یہی بیان کرنا ہے کہ بندے کے تمام اعضاء بولیں گے اور اس کے اعمال کے بارے میں گواہی دیں گے، جن میں ہاتھ اور پاؤں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ (مظاہر حق ج۵ص۱۴۱،۱۴۲)

قیامت کے دن بندے کے اعضاء گواہی دیں گے:

(۲۷۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ یکا یک ہنسنے لگے اور پھر فرمایا: "کیا تم جانتے ہو کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں؟" حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں، آپؐ نے فرمایا: میں (قیامت کے دن) بندے اور خدا کے درمیان روبرو گفتگو ہونے (کا خیال کرکے) ہنس رہا ہوں! (اس دن) بندہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! کیا تو نے مجھ کو ظلم سے پناہ نہیں دی ہے؟ (یعنی کیا تو نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ میں اپنے بندوں پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(یہ سن کر) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہاں، (تجھ کو میں نے پناہ دی ہے اور میں یقیناً بندوں پر ظلم نہیں کرتا) تب بندہ کہے گا کہ (اگر تو نے مجھ کو ظلم سے پناہ دی ہے تو) میں اپنے متعلق اور کچھ نہیں چاہتا کہ میرے بارے میں گواہی دینے والا مجھ ہی میں سے ہو؟ آنحضرتؐ نے فرمایا (بندے کی یہ بات سن کر) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ (مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے) آج کے دن تیرے بارے میں خود تیری ذات گواہی دے گی اور اعمال لکھنے والے فرشتے بھی گواہی دیں گے۔" آنحضرتؐ نے فرمایا: "پھر بندے کے منہ پر مُہر لگا دی جائے گی (یعنی اس کی قوت گویائی کو معطل کر دیا جائے گا)، اور اس کے بعد اس کے تمام اعضاء کو حکم دیا جائے گا کہ بولو! چنانچہ اس کے اعضاء اس کے (ان) اعمال کو بیان کریں گے جو اس نے کئے تھے، پھر اس بندے اور اس کی گویائی کے درمیان سے (پردہ) اٹھا دیا جائے گا" (یعنی اس کے منہ کو جو

مُہر لگائی گئی تھی اس کو توڑ دیا جائے گا اور اس کی قوت گویائی بحال ہو جائے گی جس سے وہ پہلے کی طرح باتیں کرنے لگے گا)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ (یہ صورتحال دیکھ کر اپنے اعضاء سے) کہے گا کہ دور ہو، بدبختو، اور ہلاک ہو، میں تمہاری ہی طرف سے اور تمہاری ہی نجات کے لئے لڑ جھگڑ رہا تھا۔ (صحیح مسلم، کتاب الزھد، ج ۱۰ ص ۳۴۲، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحساب والقصاص والمیزان ص ۴۸۵)

فائدہ:

''میرے بارے میں گواہی دینے والا مجھ ہی میں سے ہو'' مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ گوارہ نہیں ہے کہ میرے اعمال و کردار اور میری دنیاوی زندگی کے بارے میں گواہی دینے والا کوئی دوسرا ہو، میں تو صرف اس گواہ کو تسلیم کروں گا جو میری ذات کے اندر سے پیدا ہو، گویا بندہ تو یہ خیال کرے گا کہ میری ذات کے اندر سے گواہی دینے والا کون ہوسکتا ہے، کیونکہ کوئی ذات خود اپنے کو ضرر و نقصان پہنچانے کیلئے گواہی نہیں دیا کرتی، لیکن اس کو یہ خیال نہیں آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر بھی پوری طرح قادر ہے کہ وہ اس بندے کی ذات میں ایسا گواہ پیدا کردے جو اس کے خلاف گواہی دے، اور اس کو خدا کے حکم کے خلاف انکار کی مجال اور دم مارنے کی گنجائش نہ ہو۔

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہنسنے کا سبب یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بندہ کا اس طرح کلام کرنا کہ خود اپنے جال میں پھنس جائے، اس کی کس درجہ کی مضحکہ خیز حرکت ہوگی۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ کے منہ کو مہر لگانا، ان اعضاء کا اعمال کے بارے میں گواہی دینا، جن کے ذریعہ بندے نے وہ عمل کئے ہوں گے، اور پھر اس بندے کا اپنی نادانی پر جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اپنے ان اعضاء کو برا بھلا کہنا اور ان کو بددعا دینا جیسے عجیب و غریب امور کا خیال کر کے آپؐ ہنسے!

خود بندے کی درخواست اور خواہش کے مطابق خود اسی کے اعضاء کو اس کے بارے میں گواہ بنانے کے بعد پھر نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بھی گواہ بنانا، مقصود سے

زائد بات ہوگی، اور اس کا سبب یہ ہوگا کہ اعضاء جو گواہی دیں گے اس کی تصدیق وتوثیق ہو جائے، اور بندے کو یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ یہ اعضاء درست گواہی نہیں دے رہے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ صرف فرشتوں کو گواہ بنائے گا تو یہ بات اس قرارداد کے خلاف ہوگی جو اس کے اور بندے کے درمیان طے پائی گئی۔ حاصل یہ کہ اصل گواہ تو بندے کے اپنے اعضاء ہی ہوں گے جن کو خود بندے کی عرض وخواہش کے مطابق گواہ بنایا جائے گا، اور ان اعضاء کی گواہی ثابت کرنے کیلئے نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بطور زائد گواہ پیش کیا جائے گا، لہٰذا یہ اعتراض پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ، بندے کی عرض وخواہش کو مان کر اس کی ذات کے اندر سے یعنی اسی کے اعضاء کو گواہ بنائے گا تو فرشتوں کو گواہ بنانے کی کیا ضرورت ہوگی!

''دور ہو، بدبختو اور ہلاک ہو'' مطلب یہ ہے کہ جب وہ بندہ دیکھے گا کہ یہ میرے اعضاء تو میرے ہی خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ ادھر ان اعضاء کا اس کے خلاف گواہ بننا خود اس کی درخواست وخواہش کے مطابق ہوگا تو وہ اس صورت حال سے جھنجھلا جائے گا اور اپنے اعضاء کو برا بھلا کہنے لگے گا کہ کم بختو! میں تمہاری ہی طرف سے لڑ جھگڑ رہا تھا تا کہ تمہیں اعمالِ بد کی سزا نہ بھگتنی پڑے، لیکن اپنے خلاف تم ہی گواہی دے رہے ہو، اور اپنے آپ کو عذاب و ہلاکت میں ڈال رہے ہو؟۔ یا یہ کہ میں دنیا میں تمہاری ہی وجہ سے بندوں سے لڑتا جھگڑتا تھا، تمہیں ضرر ونقصان سے بچانے کیلئے دوسروں کو نقصان پہنچایا کرتا تھا، تمہاری راحت اور تمہارے آرام کی وجہ سے سب کچھ کیا کرتا تھا، ہر وقت تمہاری ہی حفاظت اور تمہاری ہی مدد میں لگا رہتا تھا، اور تمہیں ہی اپنا دوست اور غم خوار مانتا تھا، مگر آخر کو تم ہی میرے دشمن اور میرے بدخواہ نکلے اور مجھے عذابِ الٰہی کے حوالے کئے جانے کا سبب بنے!۔

اس حدیث میں ان اعضاءِ جسم کا وہ جواب ذکر نہیں کیا گیا ہے جو وہ آخر میں اس بندے کی یہ بات سُن کر دیں گے، لیکن قرآن مجید کی ایک آیت میں اس جواب کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے: '' وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا، قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ

اَلَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ وَّهُوَ خَلَقَکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ." یعنی وہ اپنی کھالوں سے (یعنی اپنے اعضاءِ جسم سے) کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ تو وہ کہیں گے کہ ہمیں اس اللہ نے بلایا جس نے ہر ایک کو بلایا ہے اور اس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔"

(تفصیل کیلئے دیکھئے: مظاهر حق ج ۵ ص ۱۳۹ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۹۵)

(۲۷۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے دن ابن آدم کو اس طرح لایا جائے گا کہ گویا وہ دُنبے کا بچہ ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:"میں نے تجھے عطا کیا اور تجھ پر انعام کیا اور تجھے خوب دیا، تو نے اس کا کیا کیا؟ وہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اسے جمع کیا، بڑھایا اور پہلے سے زیادہ بنا دیا، آپ مجھے دنیا میں بھیج دیجئے، میں آپ کے پاس اسے لے کر آؤں گا" وہ ایسا شخص ہوگا جس نے کوئی نیک عمل پہلے سے آگے نہ بھیجا ہوگا، لہٰذا اسے دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا۔"

(جامع الترمذی، باب ماجاء فی شأن الحشر، ج۲ص۶۹، مشکوٰة المصابیح، کتاب الرقاق ص۴۴۲)

فائدہ:

حدیث میں مذکور لفظ "بَذَج" کے متعلق "القاموس" میں لکھا ہے کہ بَذَج حرکت کے ساتھ ہے اور یہ دُنبے کے بچے کو کہتے ہیں، جیسے بکری کے بچہ کو عَتُود کہتے ہیں، بَذَج کی جمع بِذْجان (کسرہ کے ساتھ) آتی ہے۔ (مجمع بحار الانوار ج۱ص۱٦۴) پر بھی یہی مرقوم ہے۔

یہ حدیث مبارک اس بات کی دلیل ہے کہ اگر بندہ اپنی آخرت کے لئے کوئی نیک عمل بجا نہ لائے تو وہ اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتا، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:" یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَاقَدَّمَتْ یَدَاهُ" (النباء: ۴۰) یعنی جس دن انسان دیکھ لے گا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا ہوگا"۔ لہٰذا عقلمند انسان کو چاہئے کہ وہ کثرت مال وزر پر مغرور

نہ ہو، ہاں البتہ نیک عمل آگے بھیج کر ضرور خوش ہو، تا کہ وہاں جا کر ندامت اور شرمندگی نہ اٹھانا پڑے، جہاں ندامت وشرمندگی کچھ کام نہ آئے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ'' (سورة المؤمنون: ۹۹) یعنی جب کسی کو موت آجائے تو پھر کہے کہ اے میرے رب! مجھے واپس لوٹا دے شاید میں نیک عمل بجالاؤں'' اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی آخرت سنوارنے کے لئے اعمال خیر کی توفیق عطا فرمائے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں ابن آدم کی جس حالت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ چیزیں اور نعمتیں حاصل ہوں اور وہ ان کے ذریعہ آخرت کی بھلائی حاصل کرنے سے غافل رہا، تو اس کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کو اس کا آقا بہت سامال واسباب اس مقصد کیلئے دے کہ وہ اس کے ذریعہ تجارت کر کے زیادہ سے زیادہ نفع کمائے، مگر وہ (غلام) اپنے آقا کی مرضی اور اس کے حکم سے سرتابی کر کے اس سارے مال واسباب کو لٹا کر تلف وضائع کردے یا ایسے کاروبار اور تجارت میں پھنسا دے جس کا حکم اس کو نہیں دیا گیا تھا، تو ظاہر ہے کہ وہ غلام نہ صرف یہ کہ نا اہل سمجھا جائے گا بلکہ مستوجب سرزنش بھی قرار پائے گا، ٹھیک اسی طرح وہ بندہ بھی نہایت ٹوٹے میں رہے گا اور مستوجبِ عذاب قرار دیا جائے گا۔

ابوحامد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ اگرچہ ہر بھلائی، ہر لذت اور ہر سعادت یہاں تک کہ ہر مطلوب چیز کو ''نعمت'' کہا جاتا ہے، لیکن حقیقی نعمت صرف اور صرف ''اخروی سعادت ہے'' اس کے علاوہ کسی بھی چیز کو ''سعادت'' کہنا غلط ہے، بلکہ کسی دنیاوی چیز پر مجازاً بھی ''سعادت'' کا اطلاق کرنا یعنی اس کو ''دنیوی سعادت'' کہنا بھی صحیح نہیں ہے، ہاں البتہ جو دنیاوی چیزیں ''اخروی سعادت'' کے حصول کا سبب اور ذریعہ ہوں اور اس کی راہ میں کسی ایک واسطہ یا کئی واسطوں کے ساتھ معاون ومددگار ہوں تو ان چیزوں کو ''نعمت'' کہنا صحیح ہوسکتا ہے، اور یہ بھی اس وجہ سے کہ وہ چیزیں ''حقیقی نعمت'' تک پہنچا سکتی ہیں۔

ایک روایت میں آتا ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' قیامت کے روز سب سے پہلے بندے سے نعمتوں کے بارے میں جو سوال کیا جائے گا، وہ یہ ہوگا کہ کیا ہم نے تیرے بدن کو تندرستی عطا نہیں کی تھی، اور تجھ کو ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا۔'' (ترمذی شریف) اس میں کوئی شک نہیں کہ تندرستی اور پانی بھی ایک بڑی نعمت ہے، اسی لئے قیامت کے دن سب سے پہلے ان ہی دو نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائیگا۔

ایک بڑے بزرگ (غالباً حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ مراد ہیں) کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے اپنے ایک مرید سے فرمایا'' پانی ٹھنڈا کر کے پیا کرو، کیونکہ ٹھنڈا پانی، خدا کا شکر، دل کی گہرائیوں سے ادا کراتا ہے۔

نیز حضرت شیخ عبدالحق محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ'' مجھے اپنے والد صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں خوب یاد ہے کہ وہ جب بھی ٹھنڈا پانی پیتے تو بے خود ہو جاتے اور جب تھوڑی دیر تک اسی عالم بے خودی میں رہنے کے بعد اپنی حالت پر واپس آتے تو فرماتے، سبحان اللہ! یہ ٹھنڈا پانی بھی کیا چیز ہے! اور خدا نے اس کو کتنا بہترین جوہر بنایا ہے اور اسی طرح کے عالمِ ذوق وتوحید سے متعلق کلمات ارشاد فرماتے۔

حاصل یہ کہ پانی بذاتِ خود تو بہت بڑی نعمت ہے، لیکن ٹھنڈا پانی، جو کیف ولذت اور جو فوائد اپنے اندر رکھتا ہے ان کی وجہ سے اس نعمت کا درجہ کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ قدرت نے پانی کو چیز تو ایسی دل عزیز اور اہم بنایا کہ زندگی کا مدار ہی اس پر ہے، لیکن عام اتنا کر دیا کہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔

ایک دلچسپ حکایت:

اس موقع پر ایک بڑی دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کسی طرح بھٹک کر کہیں اور جنگل میں پہنچ گیا، وہاں اس کو پیاس لگی مگر آس پاس پانی کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا، پیاس کے ساتھ اس کا اضطراب بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ مرے بے بالکل

قریب پہنچ گیا، پھر اچانک اس کے سامنے ایک عارف یا کوئی فرشتہ نمودار ہوا، اور بولا کہ اگر میں تمہیں پانی پلادوں تو تم مجھے کیا دو گے؟ بادشاہ نے فوراً جواب دیا کہ اپنا آدھا مُلک، اس غیبی انسان نے اس کو پانی پلا دیا، اس کے بعد اس کا پیشاب رک گیا، اس نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح پیشاب کر لے، مگر ناکام رہا، اور سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا، آخر کار پھر وہی غیبی انسان نمودار ہوا اور کہا کہ اگر میں تمہارے اس مرض کا علاج کر دوں اور تمہارا پیشاب کھل جائے تو مجھے کیا انعام دو گے؟۔

بادشاہ نے کہا کہ باقی آدھا مُلک بھی تمہیں دے دوں گا، اس نے علاج کیا اور بادشاہ کا پیشاب کھل گیا، تب اسی غیبی انسان نے کہا کہ: بادشاہ سلامت! آپ اپنا ملک خود سنبھالیں، مجھے اسکی حاجت نہیں ہے، لیکن اپنی سلطنت اور اپنے ملک کی حیثیت دیکھ لیجئے کہ (ذرا سے پانی اور پیشاب کیلئے آپ نے تمام ملک اور سلطنت کو قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا)، لہٰذا اتنی بے حیثیت چیز اور اس کی ظاہری چمک دمک پر کبھی گھمنڈ نہ کیجئے گا۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دن انہوں نے حضرت عُوَیمرؓ سے فرمایا کہ عُوَیمرؓ! (خیال کرو) قیامت کے دن تمہاری کیا کیفیت ہوگی جب تم سے سوال کیا جائے گا کہ آیا تم عالم تھے یا جاہل؟ اگر تم یہ جواب دو گے کہ میں عالم تھا تو پھر تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے جو کچھ علم حاصل کیا اس کے موافق کیا عمل کیا؟ اور اگر تم نے یہ جواب دیا کہ میں تو جاہل تھا، تو پوچھا جائے گا کہ تمہارے لئے جاہل رہنے کی کیا وجہ تھی اور تم نے علم کیوں حاصل نہیں کیا؟۔

جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن انسان کے پاؤں سرکنے نہیں پائیں گے اور اس کو بارگاہِ رب ذوالجلال میں اس وقت تک کھڑا رکھا جائے گا جب تک کہ اس سے پانچوں باتوں کا جواب نہیں لے لیا جائے گا، چنانچہ اس سے پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں صرف کی، (بالخصوص یہ کہ) اس نے اپنی جوانی کو کس کام میں بوسیدہ کیا؟ (یعنی جوانی گویا نیا لباس ہے جو رفتہ رفتہ پرانا ہوتا ہے) اس نے مال کیونکر کمایا (یعنی اس نے دنیا میں جو کچھ مال و دولت اور روپیہ پیسہ کمایا وہ

حلال وسائل وذرائع سے حاصل کیا یا حرام ذرائع سے؟)، اس نے مال کو کہاں خرچ کیا؟ (یعنی اپنے مال ودولت اور روپیہ پیسہ کو اچھے کاموں میں صرف کیا یا برے کاموں میں گنوایا؟) اور یہ کہ اس نے جو علم حاصل کیا تھا اس کے موافق عمل کیا یا نہیں؟ (ترمذی شریف)۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا'' (حق تعالیٰ کی طرف سے) ہر امت کیلئے (کوئی نہ کوئی) فتنہ وآزمائش ہے (جس میں اس امت کے لوگوں کو مبتلا کر کے ان کو آزمایا جاتا ہے)، چنانچہ میری امت کیلئے جو چیز فتنہ وآزمائش ہے وہ مال ودولت ہے (یعنی اللہ تعالیٰ میری امت کے لوگوں کو مال دولت دے کر یہ آزمانا چاہتا ہے کہ وہ راہِ مستقیم اور حدِّ اعتدال پر قائم رہتے ہیں یا نہیں؟)۔''

(ترمذی شریف، مستفاداز مظاہر حق ج۴ ص ۲۰۲، ۲۰۳)

(۲۷۴) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو تلاوت قرآن اور میرے ذکر نے مجھ سے مانگنے کا موقع نہ دیا تو میں اس کو اس سے افضل (اور زیادہ) عطا کروں گا جو میں سوال کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں'' اور اللہ تعالیٰ کے کلام کو دوسرے تمام کلاموں پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر (فضیلت) حاصل ہے''۔

(جامع الترمذی، ابواب تفسیر القرآن سے قبل: ج۲ص۱۵۲، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب فضائل القرآن ۱۸۶)

فائدہ:

اللہ ربّ العزت کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن یاد کرنے، اس کے مفہوم ومعنی کے سمجھنے اور جاننے اور قرآن کریم میں مذکور احکام وہدایات پر عمل کرنے میں مشغول رہتا ہے، اور اس کی یہ مشغولیت اس کو ان اذکار واوراد اور دعا سے، کہ جو کلام اللہ کے علاوہ ہیں، باز رکھتی ہے، یعنی وہ قرآن میں مشغولیت کی وجہ سے نہ تو مجھے یاد کرتا ہے اور نہ ہی مجھ سے کچھ مانگتا ہے۔ تو میں اسے مانگنے والوں سے بھی زیادہ دیتا ہوں۔ کیونکہ

قرآنِ مجید کے ساتھ اس درجے کی مشغولیت اور انہماک درحقیقت اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ شخص اپنی ہر خواہش اور اپنی ہر طلب کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اس کے کلام پاک ہی سے تعلق قائم کیے ہوئے ہے، لہٰذا اس کے اس عظیم جذبے کے تحت اسے یہ اجر و انعام دیا جائے گا۔

اس موقع پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ حدیث قدسی کے شروع کے الفاظ تو یہ ہیں کہ ''من شغله القرآن عن ذكري ومسألتي'' لہٰذا اس کا تقاضا یہ تھا کہ آخر میں بھی ''ذکر کرنے اور مانگنے'' والوں کو بیان کیا جاتا کہ ''میں اس کو اس چیز سے بہتر عطا کرتا ہوں جو ذکر کرنے والوں اور مانگنے والوں کو دیتا ہوں۔'' مگر یہاں صرف ''مانگنے والوں'' کا ہی ذکر کیا گیا ''ذکر کرنے والوں'' کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''ذکر'' بھی درحقیقت دُعا (مانگنا) ہی ہے، کیونکہ کریم کی حمد و ثناء اور اس کے ذکر کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ مجھے کچھ عطا ہو۔ اس لئے اس ارشاد کے آخر میں ''مانگنے والوں'' کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

حدیث کے آخری جملہ و افضل کلام اللہ الخ کے بارے میں جہاں یہ احتمال ہے کہ یہ جملہ حدیث قدسی ہی کا تتمہ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے۔ وہاں یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے، بلکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اور یہی احتمال زیادہ صحیح ہے۔ (مظاہر حق: ج ۲ ص ۴۰۸)

قیامت کے دن امت محمدیؐ، حضرت نوحؑ کی گواہ بنے گی:

(۲۷۵) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن (میدانِ حشر میں) حضرت نوحؑ کو لایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے (اپنی امت تک اللہ تعالیٰ کے احکام دین و ہدایت) پہنچائے تھے؟ وہ عرض کریں گے کہ بیشک، اے میرے پروردگار! (میں نے تیرے احکام و دین و ہدایت اپنی امت کے لوگوں تک پہنچائے تھے)، پھر حضرت نوحؑ کی امت (کے ان لوگوں سے کہ جن تک حضرت نوحؑ نے اللہ تعالیٰ کے احکام دین و ہدایت پہنچائے تھے) سے پوچھا جائے گا

کہ کیا (نوحؑ نے) تم تک ہمارے احکام پہنچائے تھے؟ (وہ لوگ انکار کریں گے) اور وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی بھی ڈرانے والا (خواہ وہ نوحؑ ہوں یا اور کوئی نبی) نہیں آیا تھا، اور پھر حضرت نوحؑ سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے گواہ کون ہیں؟ (یعنی اگرچہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہوگا کہ نوحؑ نے جو کچھ کہا ہے بالکل درست کہا ہے لیکن ان کی منکر امت کو قائل کرنے کیلئے حضرت نوحؑ سے ان کے اس دعوے پر گواہ طلب کرے گا کہ انہوں نے منصب تبلیغ و رسالت کی ذمہ داریوں کو پورا کیا تھا) چنانچہ حضرت نوحؑ کہیں گے کہ میرے گواہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کی امت کے لوگ ہیں'' اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ رضی اللہ عنہم سے) فرمایا کہ تب تمہیں پیش کیا جائے گا، اور تم یہ گواہی دو گے کہ حضرت نوحؑ نے امت کو احکام خداوندی پہنچائے تھے، پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس صورت واقعہ کی تصدیق وتوثیق کے لئے) یہ آیت پڑھی: (جس میں اللہ تعالیٰ، امت محمدی کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے) کہ: '' وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا'' (البقرة ۱۴۳) یعنی'' اور اسی طرح ہم نے (اے مسلمانو) تمہیں نیک وعادل اور افضل امت بنایا ہے تا کہ تم ان لوگوں کے بارے میں (کہ جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور کفر وشرک پر قائم رہے) گواہی دو اور تمہارے گواہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں گے۔''

(صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب انا ارسلنا نوحا الی قومه ان انذر قومک ج ۴ ص ۱۳۴، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحساب والقصاص والمیزان ص ۴۸۵)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ ج ۶ ص ۳۱ پر بھی اسی کے قریب قریب نقل کی ہے۔ امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے نقل کیا ہے:

(۴۷۶) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک نبی آئے گا، اس کے ساتھ دو آدمی ہوں گے، ایک نبی آئے گا اور اس کے ساتھ تین آدمی ہوں گے اور کسی کے ساتھ اس سے کم زیادہ ہوں گے، ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا آپ نے اپنی قوم تک (احکام خداوندی) پہنچائے تھے، وہ کہیں گے کہ جی ہاں، چنانچہ ان کی

قوم کو بلایا جائے گا، اور پوچھا جائے گا: کیا انہوں نے تم تک (احکام دین) پہنچائے تھے؟ وہ کہیں گے نہیں، پھر ان نبی سے پوچھا جائے گا کہ آپ کا گواہ کون ہے؟ وہ کہیں گے: محمد ﷺ اور ان کی امت، چنانچہ امت محمدی کو بلایا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا، کیا انہوں نے (احکام دین) پہنچائے تھے؟ وہ کہیں گے، جی ہاں! اللہ تعالیٰ پوچھیں گے، تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ وہ کہیں گے: ہمیں یہ بات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی تھی کہ رسولوں نے پیغام رسالت پہنچایا ہے، اور ہم نے اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا کہ یہی مصداق ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان عالی کا: ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا'' (البقرۃ: ۱۴۳) ''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت عادل بنایا ہے تا کہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور رسول گواہ رہیں تم پر''۔

(سنن ابن ماجه، باب صفة امة محمد صلى الله عليه وسلم ج۲ص۲۹۷)

فائدہ:

(گزشتہ حدیث میں) حضرت نوح علیہ السلام کا یہ کہنا کہ بے شک اے میرے پروردگار! میں نے تیرے احکام اپنی امت کے لوگوں تک پہنچائے تھے، قرآن کریم کی اس آیت کے منافی نہیں ہے جس میں یوں ہے کہ: ''يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ'' یعنی اس دن (میدان حشر میں) اللہ تعالیٰ، رسولوں کو جمع کرے گا اور پھر ان سے پوچھے گا کہ تمہیں (تمہاری امت کی طرف سے تمہاری دعوت و تبلیغ کا) کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں علم نہیں، بلا شبہ پوشیدہ باتوں کو آپ ہی بہت زیادہ جاننے والے ہیں'' کیونکہ اس آیت کی مراد تو یہ ہے کہ ''اجابت'' کا سوال ہوگا جس کے بارے میں وہ رسول اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے، جب کہ یہاں حدیث میں حضرت نوحؑ سے جس سوال کا ذکر ہے وہ ''دعوت و تبلیغ'' کے بارے میں ہوگا اور ظاہر ہے کہ ''اجابت'' اور ''دعوت و تبلیغ'' دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

''حضرت نوحؑ یہ کہیں گے کہ میرے گواہ حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت کے

لوگ ہیں'' مطلب یہ ہے کہ اصل گواہ تو امت محمدیؐ کے لوگ ہیں کہ حضرت نوحؑ کے دعوے کی گواہی وہی دیں گے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مُزَکِّی ہوں گے۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ اصل گواہ یعنی امت محمدیؐ کے لوگوں سے پہلے مُزَکِّی یعنی آنحضرت ﷺ کا ذکر کرنا آپ کی تعظیم وتوقیر کے اظہار کے لئے ہوگا۔

اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ خود آنحضرت ﷺ بھی حضرت نوحؑ کی گواہی دیں، کیونکہ وہ وقت اور جگہ ہی ایسی ہوگی جہاں زیادہ سے زیادہ مدد ونصرت پہنچانے کی ضرورت ہوگی!

''رسول کریم ﷺ نے (صحابہ رضی اللہ عنہم سے) فرمایا کہ تب تمہیں پیش کیا جائے گا'' ان الفاظ کا اسلوب بیان بتاتا ہے کہ اس وقت، جبکہ دربار الٰہی میں لوگوں کی سب سے بڑی پیشی ہوگی، آنحضرت ﷺ حاضر ناظر ہوں گے، یعنی آپؐ پوری کاروائی کے دوران موجود رہیں گے، اور شاہد ہوں گے، چنانچہ جب انبیاء اور رسولوں کی پیشی ہوگی تو سب سے پہلے حضرت نوحؑ کو پیش کیا جائے گا، اور پھر ان کے گواہوں یعنی امت محمدیؐ کے لوگوں کو لایا جائے گا۔

''اور تم یہ گواہی دو گے الخ'' یعنی حضرت نوحؑ کے کہنے کے مطابق تم ان کی گواہی دو گے، اور تمہارے نبیؐ تمہارے مزکی ہوں گے یا یہ کہ تم گواہی دو اور تمہارے ساتھ نبیؐ بھی گواہی دیں گے۔ مذکورہ آیت کریمہ (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا) میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمان قیامت کے دن گزشتہ امتوں کے بارے میں گواہی دیں گے اور ان (مسلمانوں) کی گواہی ان کے پیغمبر ﷺ دیں گے، تو ان گزشتہ لوگوں کے بارے میں مسلمانوں کی گواہی کی مثال تو یہی ہے کہ وہ حضرت نوحؑ کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنی امت کے لوگوں تک خدا کے احکام پہنچائے تھے، اور ان کے بارے میں ان کے پیغمبر ﷺ کی طرف سے گواہی کی صورت وہ ہوگی جس کا ذکر سنن ابن ماجہ کی مذکورہ حدیث (نمبر ۲۷۶) میں کیا گیا ہے کہ جب قیامت کے دن گزشتہ انبیاءؑ اور رسولوں کی امتیں انکار کرتے ہوئے کہیں گی کہ ہم تک کسی نبی نے کچھ نہیں پہنچایا، اور ہمیں خدا کے احکام نہیں

بتائے گئے تو وہ رسول اور انبیاء، امت محمدیؐ کے لوگوں کو اپنا گواہ بنائیں گے، اور جب مسلمان ان کی گواہی دیں گے تو ان سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاءؑ نے اپنی امت کے لوگوں کو خدا کے احکام پہنچائے تھے؟ اور تم یہ گواہی کس بناء پر دے رہے ہو؟ تو وہ (مسلمان) جواب دیں گے کہ اس سلسلہ میں ہم نے کتاب اللہ کو ناطق پایا تھا، (یعنی قرآن مجید نے ہمیں اس بارے میں بالکل سچی خبر دی تھی)، چنانچہ اس کی بناء پر ہم یہ گواہی دے رہے ہیں، اس کے بعد ان رسولوں کی امتوں کے لوگ مسلمانوں کی صداقت و عدالت یعنی ان کے معتبر ہونے کی اور ان کی سچائی کے بارے میں جرح کریں گے، تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کا سچا اور معتبر ہونا ثابت کریں گے، اور گواہی دیں گے کہ یقیناً یہ لوگ قابل اعتماد اور اپنی بات میں سچے ہیں۔

پس اپنی امت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے گواہی دینے کے یہی معنی ہیں اور اسی اعتبار سے آپؐ کو اپنی امت کا گواہ کہا گیا ہے کہ جب آپؐ نے اپنی امت کو سچا اور گزشتہ امتوں کے بارے میں ان کی گواہی کو معتبر ثابت کیا تو گویا آپؐ نے بھی گواہی دی، اور اسی لحاظ سے حضرت نوحؑ یہ کہیں گے کہ میرے گواہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی امت کے لوگ ہیں۔ (مظاهر حق ۵ ص ۱۳۷، ۱۳۸)

(آیت کریمہ (مذکورہ) اور اس میں لفظ "شَهِيْد" اور لفظ "شُهَدَآء" کی مزید تحقیق کیلئے دیکھئے: (جامع البیان ص۱۰۰، ص۳۶۴، تفسیر عزیزی ص۶۴۱، روح المعانی ج۵ ص۳۴، عمدة القاری ۱۸/۹۵)

(۳۷) ﴿حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا انجام﴾

(۲۷۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''(قیامت کے دن) حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر سے اس حال میں ملیں گے کہ آزر کا چہرہ (غم وفکر کے سبب) سیاہ ہوگا اور غبار آلود ہوگا، حضرت ابراہیمؑ (یہ دیکھ کر حسرت و افسوس کے ساتھ) کہیں گے کہ کیا (دنیا میں) میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ (میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بتاتا اور تعلیم دیتا ہوں اس میں) میری نافرمانی نہ کیا کر! ان کا باپ آزر ان سے کہے گا کہ میں آج کے دن تمہاری نافرمانی نہیں کروں گا، (خدارا میری شفاعت کرو اور مجھے نجات دلاؤ) حضرت ابراہیمؑ (باپ کی یہ بات سن کر) عرض رسا ہوں گے کہ ''اے میرے پروردگار! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس دن جب لوگوں کو (دوبارہ زندہ کرکے) اٹھایا جائے گا (میدان حشر میں) تو مجھ کو ذلیل ورسوا نہ کرے گا، پس میرے باپ کی رسوائی وذلت سے بڑی ذلت ورسوائی میرے لئے اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ تیری رحمت سے اس قدر دور ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ (ابراہیم! آج کے دن تمہارے باپ کے حق میں مغفرت و نجات کی تمہاری درخواست منظور نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ کافر ہے اور) حقیقت یہ ہے کہ میں نے جنت کو کافروں کے اوپر حرام کردیا ہے'' پھر حضرت ابراہیمؑ سے کہا جائے گا کہ نیچے دیکھو، تمہارے پیروں میں کیا چیز ہے؟ حضرت ابراہیمؑ (یہ سن کر) اپنے پیروں کی طرف نگاہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ (ان کا باپ آزر) بجو کی شکل میں مٹی اور گوبر میں لتھڑا ہوا پڑا ہے، پھر اس (آزر) کے پاؤں پکڑ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا''۔

(صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب قوله تعالیٰ: واتخذ اللّٰه ابراهیم خلیلاً، ج ۴ ص ۱۳۹، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحشر ص ۴۸۳)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت کتاب التفسیر، باب ولاتخزنی یوم یبعثون، سورۃ الشعراء ج ۶ ص ۱۱۱ پر بھی مختصر الفاظ میں نقل کی ہے۔

فائدہ: لفظ آزر کی تحقیق:

آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا لقب ہے، اور ان کا نام بقول امام زجاج رحمۃ اللہ علیہ باتفاق مؤرخین تارح یا تارخ (حاء کے ساتھ یا خاء کے ساتھ) تھا، امام ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تارح (حاء کے ساتھ) منقول ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، امام مجاہدؒ، امام سدیؒ، سعید بن مسیّبؒ اور سلمان تیمیؒ کہتے ہیں کہ آزر، حضرت ابراہیم کے والد کا لقب ہے، نیز وہ کہتے ہیں کہ آزر ایک بت کا نام تھا، اس صورت میں اس سے پہلے مضاف ہوگا یعنی عابد آزر (آزر بت کو پوجنے والا)۔

بعض کہتے ہیں کہ آزر ان کی زبان میں بمعنی مخطی (خطا کار) کے ہیں، سلمان تیمی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آزر بمعنی اعوج (ٹیڑھا) ہے، آزر مشرک ہونے کی وجہ سے خطا کار اور ٹیڑھے راستہ پر گامزن تھا، اس لئے اس لقب سے ملقب کیا گیا۔

(روح المعانی ج۷ص۱۹۴، تفسیر کبیر ج۴ص۱۰۲)

آزر کون تھے؟

آزر، وزنِ فعل اور علمیت یا وصفیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آزر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد نہیں تھا بلکہ ان کا چچا تھا اور چچا کو باپ کہنا عربی زبان کے محاورات میں عام ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر قرآن مجید کی آیت: **وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ**" (الشعراء، رکوع ۱۱) سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ اس آیت میں "ساجدین" سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد ہیں اور "تَقَلُّب" سے پشت بہ پشت منتقل ہونا مراد ہے، تو اس سے ثابت ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد موحد تھے، ان میں کوئی مشرک نہیں تھا، اس لئے آزر، حضرت ابراہیم کا باپ نہیں بلکہ چچا تھا۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ آزر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد تھا، جیسا کہ قرآن مجید کی نص سے ظاہر ہوتا ہے اور اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور "ساجدین"

سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، جیسا کہ آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے۔

اس حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ آزر کی صورت کو بجھو جیسے حقیر جانور کی شکل وصورت میں اس لئے بدل دیا جائے گا تا کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل سے محبت پدری جاتی رہے اور وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں یا اس لئے کہ ان کی سبکی نہ ہو کہ ان کا باپ دوزخ میں ڈالا گیا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر چہ حضرت ابراہیمؑ دنیا ہی میں اپنے باپ سے بیزار ہو گئے تھے۔ اور اس سے اپنی برأت کا اظہار کر چکے تھے، (جیسا کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے) لیکن جب قیامت کے دن میدان حشر میں اس کو دیکھیں گے تو بے اختیار محبت پدری ان کے دامن گیر ہو جائے گی، اور وہ اس کیلئے مغفرت ونجات کی خواہش کریں گے کہ شاید ان کی درخواست وشفاعت قبول ہو جائے، مگر جب ان کی درخواست وشفاعت قبول نہیں ہوگی اور وہ اپنے باپ کو ایک حقیر شکل وصورت میں بدلا ہوا دیکھیں گے تو نا امید ہو جائیں گے اور اس سے ہمیشہ کے لئے اپنی برأت و بیزاری ظاہر کریں گے۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یقین نہیں تھا کہ ان کا باپ آزر کفر کی حالت میں مرا ہے، ان کا گمان تھا کہ ممکن ہے کہ وہ پوشیدہ طور پر ایمان لے آیا ہو اور مجھے اس کی اطلاع نہ کی ہو، اور شاید وہ قیامت کے دن اپنے اسی گمان کی بناء پر اس کے حق میں شفاعت کریں گے، البتہ چونکہ ظاہری طور پر وہ کفر ہی کی حالت میں تھا اس لئے انہوں نے دنیا میں ظاہری احوال کا اعتبار کرتے ہوئے اس سے اپنی برأت و بیزاری کا اظہار کیا اور پھر جب قیامت میں اس کا کفر کی حالت میں مرنا یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے گا تو اپنے باپ سے ان کی وہ برأت و بیزاری، جو انہوں نے دنیا میں ظاہر کی تھی، ہمیشہ کے لئے ہو جائے گی۔ (مظاہر حق ج ۵، ص ۱۲۵)

ایک شبہ اور اس کا جواب:

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ قیامت کے دن جو یہ کہیں گے کہ اے میرے پروردگار، تو نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو مجھے ذلیل ورسوا نہیں کرے گا جس دن سب اٹھائے جائیں گے، تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف وعدہ خلافی کی نسبت کر رہے ہیں،

یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے اس روایت کی صحت کا انکار بھی کیا ہے (فتح الباری ۳/۵۰۰)۔
لیکن جمہور علماء فرماتے ہیں کہ اس میں وعدہ خلافی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ کلامِ استعطاف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کو طلب کرنے کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ گزارش کریں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے خلیل کی رعایت فرمائیں گے اور آزر کی شکل وصورت تبدیل کر دی جائے گی، اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد ہے۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ۱۹/۱۰۱)

قاسمِ ثانی علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ آیت کی تشریح میں رقمطراز ہیں:
''ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دعاء باپ کی موت کے بعد کی ہے، مگر دوسری جگہ تصریح آ گئی کہ جب اس کا دشمن خدا ہونا ظاہر ہو گیا تو برأت اور بیزاری کا اظہار فرمایا: کما قال تعالیٰ: ''وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ'' (التوبہ: رکوع ۱۴) اور اگر ''اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ'' میں ''كَانَ'' کا ترجمہ ''تھا'' کے بجائے ''ہے'' سے کیا جائے، پھر کوئی اشکال نہیں، کیونکہ زندگی میں ایمان لے آنے کا امکان تھا تو دعا کا حاصل یہ ہے کہ الٰہی! اس کو ایمان سے مشرف فرما کر کفر کے زمانہ کی خطائیں معاف فرما دے''۔

(تفسیر عثمانی ص۴۸۰، فائدہ نمبر۱۰ سورۃ الشعراء: ۸۶، ۸۷)

(اس مسئلہ کی مزید تحقیق کیلئے دیکھئے: مسالک الحنفاء فی والدی المصطفی ص۲۲۱، النکت والعیون للماوردی: ۳/۱۸۵، الحاوی للفتاوی للسیوطی ۲/۲۱۰-۲۱۶، روح المعانی ۱۹/۱۳۸، ۱۳۷)

بہرحال! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باپ اگر مسلمان نہ ہو تو بیٹا اس کے کچھ کام نہ آئے گا اور اسی طرح اگر بیٹا مسلمان نہ ہو تو باپ اس کے کچھ کام نہ آئے گا، جیسے حضرت نوح اپنے بیٹے کنعان کے کچھ کام نہ آ سکے۔ (شرح قسطلانی ج۵ ص۳۷۳)

شرک کے خلاف سخت انتباہ:

(۲۷۸) حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دوزخیوں میں سے اس شخص سے، جو سب سے ہلکے

عذاب میں گرفتار ہوگا، فرمائے گا کہ ''اگر تیرے پاس روئے زمین کی چیزوں میں سے کوئی ایسی چیز ہوتی جس کو تو بدلہ میں دے سکتا اور تو اس کے عوض دوزخ کے عذاب سے (خواہ وہ کتنا ہی ہلکا ہو) چھٹکارا پاسکتا، تو کیا تو ایسا کرتا؟ وہ دوزخی کہے گا کہ ہاں، (میں دنیا کی حاصل شدہ بڑی سے بڑی چیز بدلہ میں دے کر دوزخ کے عذاب سے چھٹکارا پانا چاہوں گا) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ (بدنصیب انسان) میں نے تو اسی وقت جب تو آدمؑ کی پشت میں تھا، اس (بدلہ میں کوئی چیز دینے) سے سہل اور آسان چیز تیرے لئے چاہی تھی اور وہ یہ کہ تو میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا، مگر تو اس سے مکر گیا (اور میرے احکام کی کوئی پابندی نہیں کی)، یہاں تک کہ (بتوں وغیرہ کی پرستش وتعظیم کے ذریعہ) میرا شریک ٹھہرا کر ہی رہا، (پس اب میں اس عذاب دوزخ کے بدلہ میں کوئی چیز قبول نہیں کروں گا خواہ تو دنیا کی تمام چیزیں ہی کیوں نہ لے آئے)'' (صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب خلق آدم ج۴ص۱۳۴، مشکوٰۃ المصابیح، باب صفۃ النار واھلھاص۵۰۲)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو باب صفۃ الجنّۃ والنار، کتاب الرقاق قسطلانی ج ۹ ص ۳۲۱ پر بھی نقل کیا ہے۔ نیز امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے باب الکفارات ج۱۰ص۲۶۴ حاشیہ القسطلانی پر نقل کیا ہے اور

(۲۷۹) صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''قیامت کے دن کافر سے کہا جائے گا کہ تیرا کیا خیال ہے کہ اگر تیرے پاس زمین بھر سونا ہوتا تو کیا تو اسے بدلہ میں دے کر عذاب سے چھٹکارا پاتا؟ وہ کہے گا کہ ہاں، اس سے کہا جائے گا، تجھ سے تو اس سے بھی آسان ترین چیز کا مطالبہ کیا گیا تھا''۔ (صحیح مسلم، باب الکفارات: ج۱۰ص۲۶۴)

فائدہ:

مظہر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہاں ''ارادہ'' کا لفظ ''امر'' کے معنی میں ہے، (یعنی چاہنے سے مراد حکم دینا ہے)، اور ارادہ اور امر میں فرق یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے سب اسی کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے جبکہ امر کا اطلاق کبھی اس چیز پر بھی ہوتا ہے جو

اس کے ارادے اور مشیت کے خلاف ہو۔ (مظاہر حق ج۵ ص۲۴۱)

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہاں ''ارادہ'' کو ''میثاق'' یعنی عہد لینے پر محمول کیا جائے، جس کا ذکر قرآن کریم میں یوں فرمایا گیا ہے: ''وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ الخ، اور اس کا قرینہ خود حدیث قدسی کے یہ الفاظ: '' وانت فی صلب آدم'' (اور جبکہ تو آدم کی پشت میں تھا) ہیں۔ اور یہاں ''مکر جانے'' کو عہد توڑنے پر محمول کیا جائے۔

(۲۸۰) مسلم کی ایک روایت میں ''کذبت'' کے بھی الفاظ آئے ہیں۔ یعنی ''تو نے جھوٹ کہا ہے'' (ان روایات کی مزید تحقیق وتفصیل کے لئے دیکھئے:

(شرح النووی علی صحیح مسلم اور شرح القسطلانی ج۵ ص۳۲۴ وغیرہ)۔

(۳۸) جنت اور دوزخ کی شکایت

(۲۸۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت اور دوزخ نے آپس میں بحث و تکرار کی، چنانچہ دوزخ نے تو یہ کہا کہ مجھے سرکش و متکبر اور ظالموں کیلئے چھانٹا گیا ہے، اور جنت نے یہ کہا کہ میں اپنے بارے میں کیا کہوں، میرے اندر بھی تو وہی لوگ داخل ہوں گے جو ضعیف و کمزور ہیں، لوگوں کی نظروں میں گرے ہوئے ہیں، اور جو بھولے بھالے اور فریب میں آ جانے والے ہیں، (یہ سن کر) اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا: ''تو میری رحمت کے اظہار کا ذریعہ اور میرے کرم کی آماجگاہ کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں اپنے بندوں میں سے جس کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہوں، اس کے لئے تجھے ہی ذریعہ بناتا ہوں'' اور دوزخ سے فرمایا: ''تو میرے عذاب کا محل و مظہر ہونے کے علاوہ کچھ نہیں، میں اپنے بندوں میں سے جس کو عذاب دینا چاہتا ہوں اس کے لئے تجھے ہی ذریعہ بناتا ہوں'' اور میں تم دونوں ہی کو لوگوں سے بھر دوں گا، البتہ دوزخ کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوگا کہ وہ اس وقت تک نہیں بھرے گی جب تک کہ اس پر اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں نہ رکھ دے گا، (چنانچہ جب اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں رکھ دے گا تو) دوزخ پکار اٹھے گی کہ بس، بس، بس، اس وقت دوزخ (اللہ تعالیٰ کی قدرت سے) بھر جائے گی، اور اس کے حصوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا جائے گا، پس وہ سمٹ جائے گی، مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرے گا، رہا جنت کا معاملہ تو (اس کے بھرنے کیلئے) اللہ تعالیٰ نئے لوگ پیدا کر دے گا''۔

(صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ ق ج ۶ ص ۱۳۸، مشکوٰۃ المصابیح، باب خلق الجنۃ والنار ص ۵۰۵)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت کتاب التوحید، باب ماجاء فی قول اللّٰہ تعالیٰ: ان رحمۃ اللّٰہ قریب من المحسنین ج ۹ ص ۱۳۴ پر بھی اسے نقل کیا، نیز امام

مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو "باب جھنم" میں متعدد روایات کے ساتھ نقل کیا ہے۔

فائدہ:

اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کی تخلیق ہو چکی ہے اور وہ موجود ہیں، جبکہ اس کے برخلاف بعض گمراہ فرقے کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ کی ابھی تخلیق نہیں ہوئی ہے اور یہ دونوں قیامت کے دن ہی عالم وجود میں آئیں گی۔

"جنت اور دوزخ نے آپس میں بحث وتکرار کی" اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں نے گویا اپنے اپنے بارے میں ایک طرح کا شکوہ شکایت کیا، دوزخ کا کہنا اگر یہ تھا کہ سرکش اور ظالم لوگوں کیلئے مجھے ہی کیوں مخصوص کیا گیا؟ تو جنت نے یہ کہا کہ میرا معاملہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، میرے اندر بھی تو ان ہی لوگوں کو داخل کیا جائے گا دنیا میں جن کی کوئی شان وشوکت نہیں ہے اور کمزور جسم، لاغر بدن، خستہ حال ومفلس اور لوگوں کی نظر میں بے وقعت ہیں۔

ان دونوں کا شکوہ سُن کر اللہ تعالیٰ نے ان پر واضح کیا کہ تم میں سے کسی کا بھی اس کے علاوہ کوئی معاملہ نہیں کہ تم دونوں کو محض میری مشیت اور مصلحت کے نتیجہ میں وجود میں لایا گیا ہے کہ میں نے ایک کو اپنی رحمت اور لطف وکرم کا اور دوسرے کو قہر وغضب کا محل ومظہر بنایا، پس مومن اور کافر کی طرح تم دونوں بھی یعنی جنت ودوزخ، دراصل خدائی جمال وجلال کے مظاہر کا نقطہ کمال ہو، اور تم دونوں میں سے کسی کو بھی ایسی کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے جس سے دوسرے کے مقابلہ پر اس کی فضیلت اور برتری ظاہر ہو، اگرچہ اتنی بات ضرور ہے کہ دوزخ کے معاملات کا تعلق عدل وانصاف سے جڑا ہوا ہے اور جنت کے معاملات، فضل وکرم سے تعلق رکھتے ہیں۔

"لوگوں کی نظروں میں گرے ہوئے ہیں" یعنی وہ لوگ جو اگرچہ اپنے عقیدہ و عمل اور اپنے کردار واخلاق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی قدر ومنزلت رکھتے ہیں اور اللہ کے نیک بندوں یعنی علماء وصلحاء اور ارباب باطن کی نظروں میں بھی انہیں قدر و

منزلت ہی حاصل ہوتی ہے، لیکن ظاہری طور پر ان کے کمزور اور ضعیف، خستہ حال اور غریب ونادار ہونے کی وجہ سے اکثر دنیا والے ان کو حقیر اور کمتر اور نا قابل اعتناء سمجھتے ہیں۔

''نیز میرے اندر وہی لوگ داخل ہوں گے جو کمزور وضعیف ہیں'' اس جملہ میں جو حصر ہے اس سے مراد ''اکثر واغلب'' ہے کہ جنت میں زیادہ تر لوگ اسی زمرہ کے ہوں گے، ورنہ جنت میں جانے والے تو انبیاء ورسول بھی ہوں گے اور امراء وسلاطین بھی، یا یہ کہا جائے کہ ''ضعیف وکمزور'' سے مراد وہ بندے ہیں جو اپنے پروردگار کے سامنے بھی ذلت وفروتنی ظاہر کرتے ہیں، مخلوق کے ساتھ بھی تواضع وانکساری کا رویہ اختیار کرتے ہیں، اور خود اپنی نظر میں بھی اپنے کو گرائے رکھتے ہیں۔ (دیکھئے: فتح الباری شرح صحیح البخاری ۸/ ۵۹۷)

''جو بھولے بھالے اور فریب میں آجانے والے ہیں'' مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ فکر آخرت میں سرگرداں رہنے کی وجہ سے دنیاوی امور سے غافل اور دنیاوی معاملات میں نا تجربہ کار ہیں، اس لئے دنیا والے ان کو بڑی آسانی کے ساتھ بیوقوف بنا دیتے ہیں، اپنے مکر وفریب کے جال میں پھانس لیتے ہیں، اسی اعتبار سے ایک حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے کہ ''اہل جنت کی اکثریت (دنیاوی امور سے نابلد اور) نادان لوگوں پر مشتمل ہوگی، ان کے مقابلہ پر کافر ومنافق دنیاوی معاملات میں بڑے چالاک اور مکار ہوتے ہیں، کیونکہ وہ دنیا کے معاملات کو سب کچھ سمجھ کر اپنے فکر وعمل کی پوری توانائی ادھر ہی لگائے رکھتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ''۔

''وہ اس وقت تک نہیں بھرے گی ...... الخ، یعنی جتنے لوگوں کا دوزخ میں جانا مقدر ہوگا ان سب کے دوزخ میں پہنچ جانے کے بعد بھی جب دوزخ کا پیٹ نہیں بھرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے مزید دوزخیوں کا مطالبہ کرے گی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ''. لیکن اللہ تعالیٰ اس کا پیٹ بھرنے کیلئے یہ نہیں کرے گا کہ بے گناہ لوگوں کو جہنم میں ڈال کر اس کو بھر دے یا جو گنہگار بخشے جانے والے ہوں گے ان ہی کو دوزخ کے سپرد کر دے، یا نئے لوگ اس لئے پیدا کرے کہ

ان کو دوزخ کا پیٹ بھرنے کے کام میں لایا جائے، بلکہ یہ کرے گا کہ اپنا پاؤں دوزخ پر رکھ دے گا جس سے دوزخ کے تمام اطراف ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے اور دوزخ کا پیٹ سمٹ کر وہاں موجود لوگوں سے بھر جائے گا۔

قدم رکھنے سے کیا مراد ہے؟

یہاں روایت میں اللہ تعالیٰ کے لئے ''قدم'' (پاؤں) ثابت کیا گیا ہے، قدم سے کیا مراد ہے، اس سلسلہ میں اسلاف کا اختلاف ہے، مختلف اقوال ہیں: **متقدمین علماء** کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں واقع اس طرح کے مواقع میں تفویض وتسلیم ہی اولیٰ ہے (یعنی ان کے معانی اللہ کے سپرد کر دیئے جائیں)، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ''استواء عرش'' ہی کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''**الاستواء معلوم، والكيف مجهول، و الايمان به واجب والسؤال عنه بدعة**'' یعنی استواء عرش معلوم ومتعین ہے، لیکن اس کی کیفیت مجہول ونامعلوم ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔''

(روح المعانی ۱۳۴/۸، شرح العقیدۃ الطحاویہ ص۲۸۰، ۲۸۱، منهج و دراسات لايات الاسماء والصفات ص۲۱، مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیۃ ۵۸/۳، کتاب مجمل اعتقاد السلف)

لیکن متاخرین علماء نے اس طرح کے مواقع میں تاویل کا طریقہ اختیار کیا ہے، چنانچہ یہاں بھی ''قدم'' کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں۔

(۱) چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ دراصل یہ ''اذلال'' سے کنایہ ہے کہ دوزخ کا طغیان جب بڑھ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کریں گے، اس اذلال کو ''وضع قدم'' (پاؤں رکھنے) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ محاورہ میں کہتے ہیں ''**وضعت فلاناً تحت قدمي**'' اور مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ میں نے اس کو ذلیل کیا، قدم کے حقیقی معنی اس میں مراد نہیں ہوتے ہیں، کیونکہ اہل عرب ضرب الامثال میں اعضاء کے نام استعمال کرتے ہیں مگر ان کے حقیقی معنی مراد نہیں لیا کرتے۔ (فتح الباری ۵۹۶/۸)

(۲) بعض حضرات کہتے ہیں کہ ’’قدم‘‘ (پاؤں) ایک خاص مخلوق کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جہنم میں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے، جب جہنم ’’هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ‘‘ کا مطالبہ کرے گی تو اس وقت اس کو جہنم میں داخل کیا جائے گا، تب اس کی شورش ختم ہو جائے گی۔

(فتح الباری ۸/۵۹۶)

(۳) بعض کہتے ہیں کہ ’’قدم‘‘ سے مراد جہنم میں سب سے آخر میں داخل ہونے والی جماعت ہے، کیونکہ قدم انسانی جسم کا آخری عضو ہے، اس صورت میں معنی ہوں گے کہ: ’’یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ دوزخ میں سب سے آخری دوزخی کو داخل کریں گے۔

(فتح الباری ۸/۵۹۶)

(۴) امام داودی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہاں ’’قدم‘‘ سے مراد ’’قدم صدق‘‘ ہے اور وہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت یعنی مقام محمود کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی شفاعت سے وہ تمام لوگ جہنم سے نکال لئے جائیں گے جن کے دل میں تھوڑا بہت ایمان موجود تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دوزخ کی طغیانی بھی ختم ہو جائے گی اور وہ مزید کا مطالبہ ترک کردے گی۔ (فتح الباری ۸/۵۹۶)

لیکن متقدمین علماء کا مسلک سب سے بہتر راستہ ہے کہ بس یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس سے جو کچھ مراد ہے وہی درست اور حق ہے، اس کی حقیقت وکیفیت کی جستجو میں نہ پڑا جائے۔

حدیث ہذا میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ’’اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر ظلم نہیں کرے گا‘‘ تو اس سے مراد یہ ہے کہ دوزخ کا پیٹ بھرنے کیلئے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرے گا جس کو صورۃً ظلم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، ورنہ اصل بات یہ ہے کہ اگر پروردگار عالم بے گناہ لوگوں ہی کو دوزخ میں ڈال کر اس کا پیٹ بھرے تو حقیقت میں اس کو ظلم نہیں کہیں گے، کیونکہ اپنی ملکیت میں کسی طرح کے بھی تصرف کو ظلم قرار نہیں دیا جاتا، مگر اللہ تعالیٰ صورۃً بھی ظلم نہیں کرے گا۔

’’جنت کو بھرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نئے لوگ پیدا کرے گا‘‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جمع کر کے جنت میں داخل کردے گا جنہوں نے کبھی کوئی عمل نہیں کیا

ہوگا اور جنت کے مستحق نہیں ہوں گے، پس یہ رب کریم کی شانِ رحمت کا اظہار ہوگا کہ وہ دوزخ کو بھرنے کیلئے بے گناہ لوگوں کو تو اس میں نہیں ڈالے گا لیکن بہشت کو بھرنے کے لئے بے عمل لوگوں کو اس میں داخل کر دے گا۔ (مظاہر حق ج۵ ص۲۵۳، ۲۵۴)

آخری بات یہ ہے کہ جنت و دوزخ کا یہ مخاصمہ (بحث و تکرار) یا تو زبان حال سے ہوا۔ یا اللہ جل شانہ نے ان دونوں کو قوت گویائی عطا فرمائی اور اس کے بعد یہ بحث و تکرار ہوئی۔ (عمدۃ القاری ۱۸/ ۱۸۷)

جنت و دوزخ کو بھرا جائے گا:

(۲۸۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''دوزخ میں (لوگوں کو) برابر ڈالا جاتا رہے گا اور وہ کہتی رہے گی کہ کچھ اور بھی ہے؟ (یعنی ابھی تک میرا پیٹ نہیں بھرا ہے مجھے اور لوگ چاہئیں)، آخر کار خداوندِ بزرگ و برتر اس پر اپنا پاؤں رکھ دے گا، اور دوزخ کے حصے ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے، (جس سے) دوزخ سمٹ جائے گی'' تب وہ کہے گی کہ بس، بس، تیری عزت اور تیرے کرم کی قسم! میں بھر گئی، اسی طرح جنت کے اندر وسعت و زیادتی ہوتی رہے گی (یعنی جنتیوں کے جنت میں پہنچ جانے کے باوجود اس کے محلات خالی بچ جائیں گے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جنت (کے ان خالی محلات کو پُر کرنے) کیلئے نئے لوگ پیدا کر دے گا جنہیں ان میں بسا دیا جائے گا'' (صحیح مسلم، باب جهنم، مشکوٰۃ المصابیح، باب خلق الجنة والنار ص۵۰۵)

(۲۸۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ''جنت کا وہ حصہ خالی بچ جائے گا جسے اللہ تعالیٰ خالی رکھنا چاہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کیلئے جس میں سے چاہیں گے ایک مخلوق پیدا کر دیں گے۔''

(صحیح مسلم، باب جهنم)

(۲۸۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جنت و دوزخ کا مناظرہ ہوا، جنت نے کہا کہ میرے پاس ضعفاء و مساکین ہی

آتے ہیں، دوزخ نے کہا کہ میرے پاس سرکش ومتکبر آتے ہیں۔ اللہ تعالی نے دوزخ سے فرمایا کہ تو میرا عذاب ہے، میں جس سے چاہتا ہوں تیرے ذریعہ انتقام لیتا ہوں، اور جنت سے فرمایا: تو میری رحمت ہے میں تیرے ذریعہ جس پر چاہتا ہوں رحم کرتا ہوں''

(صحیح مسلم)

(مزید تحقیق وتشریح کیلئے دیکھئے (قسطلانی شرح بخاری ج ۷ ص ۳۵۴، وج ۱۰ ص ۴۱۳، شرح النووی علی صحیح مسلم ج ۱۰ ص ۲۹۷ حاشیہ القسطلانی وغیرہ)۔

اے اللہ! ہماری التجاء ہے کہ ہمیں محض اپنے فضل واحسان سے جنت میں داخل فرما اور دوزخ سے نجات عطا فرما اور اپنے دیدار سے ہماری آنکھوں کو لطف اندوز فرما۔

آمین یا رب العالمین۔

(۲۸۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی، کہا کہ: میرا بعض حصہ بعض کو کھائے جا رہا ہے، لہٰذا اسے دو سانس لینے کی اجازت دے دی گئی، ایک سانس سردی میں اور ایک سانس گرمی میں، تم جو سخت گرمی محسوس کرتے ہو (تو وہ اسی وجہ سے ہے)، اور تم جو سخت سردی محسوس کرتے ہو (تو وہ اسی سانس کی وجہ سے ہے)'' (صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة النار ج ۴ ص ۱۴۰)

(اس کی تشریح وتوضیح کے لئے دیکھئے: (القسطلانی شرح صحیح البخاری ج ۵ ص ۲۸۸)

(۳۹) حوضِ کوثر کا ذکر

(۲۸۶) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں حوض کوثر پر تمہارا امیر سامان ہوں گا، پھر تم میں سے کچھ آدمی میرے سامنے کردیئے جائیں گے، پھر مجھ تک پہنچنے سے پہلے کچھ لوگوں کو اچک لیا جائے گا، تو میں کہوں گا، اے میرے پروردگار! یہ میرے اصحاب ہیں، تو فرمایا جائے گا: آپ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد کیا کچھ گھڑ لیا تھا۔'' (صحیح البخاری، باب الحوض ۸/ ۱۱۹)

(۲۸۷) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے اصحاب میں سے کچھ لوگ میرے پاس حوض پر آئیں گے، یہاں تک کہ جب میں انہیں پہچان لوں گا تو انہیں مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی اچک لیا جائے گا، میں کہوں گا: یہ میرے اصحاب ہیں، تو فرمایا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا بدعات ایجاد کی تھیں''۔

(صحیح البخاری)

(۲۸۸) حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں حوض پر تمہارا میر ساماں ہوں گا، جو میرے پاس سے گزرے گا وہ (اس کا پانی) پیئے گا اور جو ایک مرتبہ پی لے گا اسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی، میرے پاس ایسی قومیں آئیں گی جن کو میں پہچانوں گا اور وہ مجھے پہچانیں گی، پھر میرے اور ان کے درمیان رکاوٹ کھڑی کردی جائے گی'' (راوی) ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نعمان بن ابی عیاش رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے سنا تو فرمایا: کیا آپ نے حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے اسی طرح سنا ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں! انہوں نے کہا: میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے بارے میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ان سے سنا، انہوں نے یہ الفاظ بھی مزید ذکر کیے: ''میں کہوں گا، یہ میرے لوگ ہیں، کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا خرافات کی تھیں، میں کہوں گا، دور ہو، ہر اس شخص کیلئے دوری ہو جس نے میرے بعد تبدیل کر دیا''۔ (صحیح البخاری، مشکوٰۃ المصابیح، باب الحوض والشفاعۃ ص ۴۸۷)

(۲۸۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ یہ بیان کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن میرے پاس میری امت کے لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو لایا جائے گا، اور انہیں حوض سے دور کر دیا جائے گا، میں کہوں گا کہ اے میرے پروردگار! یہ میرے اصحاب ہیں، (اللہ) فرمائیں گے کہ آپؐ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپؐ کے بعد کیا کیا تھا! یہ اپنی پشت کے بل واپس لوٹ گئے تھے'' (صحیح البخاری)

(۲۹۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''دریں اثناء کہ میں کھڑا تھا کہ یکا یک ایک جماعت آئی، جب میں نے اسے پہچان لیا تو میرے اور ان کے درمیان میں سے ایک شخص نکلا اور اس نے کہا کہ آؤ! میں نے کہا کہ کس طرف؟ اس نے کہا کہ دوزخ کی طرف، میں نے کہا کہ ان کو کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ آپؐ کے بعد اپنی پشت کے بل الٹے پاؤں پھر گئے تھے، (یعنی مرتد ہو گئے تھے) میرا خیال ہے کہ ان میں صرف اتنے بچیں گے جیسے کہ گم شدہ اونٹ (کہ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی بچتا ہے)''

(صحیح البخاری)

(۲۹۱) حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا: ''میں حوض پر ہوں گا اور ان لوگوں کو دیکھوں گا جو تم میں سے میرے پاس وہاں آئیں گے، اور کچھ لوگوں کو میرے پاس آنے سے پہلے ہی پکڑ لیا جائے گا، میں کہوں گا کہ اے میرے پروردگار! یہ میرے لوگ ہیں اور میری امت میں سے ہیں، کہا جائے گا کہ کیا آپؐ کو معلوم ہے کہ آپؐ کے بعد ان لوگوں نے کیا کیا تھا؟ خدا کی قسم! یہ لوگ الٹے پاؤں پھرتے رہے، چنانچہ ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ اے اللہ! ہم آپؐ کی اس بات سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہم (دین کے معاملہ میں) الٹے پاؤں پھر جائیں یا اپنے دین کے بارے میں کسی فتنہ سے دوچار ہوں''۔ (صحیح البخاری، شرح القسطلانی ج۹ص۳۴۳)

فائدہ: حوض کوثر کے معنی:

لغت میں ''حوض'' احواض اور حیاض کا واحد ہے، اور اس کے معنی ہیں،

''پانی کا جمع ہونا اور بہنا'' (الصحاح)، اسی لئے جو گندا خون عورتوں کو ہر مہینہ آتا ہے اسے ''حیض'' کہتے ہیں اور یہ لفظ بھی ''حوض'' ہی سے مشتق ہے۔ یہاں حوض سے مراد وہ حوض (نہر) ہے جو قیامت کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مخصوص ہوگا، اور جس کی صفات وخصوصیات احادیث سے معلوم ہوتی ہیں۔

ابوعبید اللہ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے التذکرۃ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دو حوض ہوں گے، ایک حوض تو میدان حشر میں پل صراط سے پہلے عطا ہوگا اور دوسرا حوض جنت میں ہوگا اور دونوں کا نام کوثر ہوگا۔ (فتح الباری صحیح البخاری ج۱۱ص۴۰۵)

واضح رہے کہ عربی میں ''کوثر'' کے معنی ہیں ''خیر کثیر'' یعنی بے شمار بھلائیاں اور نعمتیں، پھر زیادہ صحیح اور درست بات یہ ہے کہ میدان حشر میں جو حوض عطا ہوگا، وہ ''میزان'' کے مرحلہ سے پہلے ہی ہوگا، پس لوگ اپنی قبروں سے پیاس کی حالت میں نکلیں گے اور پہلے حوض پر آئیں گے، اس کے بعد میزان عمل کا مرحلہ پیش آئے گا۔

اسی طرح میدان حشر میں ہر پیغمبر کا اپنا الگ حوض ہوگا جس پر اس کی امت آئے گی، چنانچہ اس وقت تمام پیغمبر آپس میں اظہار فخر کریں گے، کہ دیکھیں کہ کس کے حوض پر زیادہ لوگ آتے ہیں، ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں امید رکھتا ہوں کہ میرے حوض پر آنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

(رواہ الترمذی بحوالہ مظاہرِ حق ۵/۱۹۰، فتح الباری ج۱۱ص۴۰۶)

بہر حال! ان احادیث مبارکہ میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ حوض کوثر کی طرف آئیں گے لیکن ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حوض کوثر سے دور رکھا جائے گا، ان کے بارے میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ وہ کون لوگ ہوں گے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مسلمان ہو گئے تھے اور جب تک آپؐ اس دنیا میں رہے مسلمان ہی رہے، لیکن آپؐ کی وفات کے بعد وہ مختلف گمراہ کن تحریکوں جیسے مسلمہ کذاب اور اسود عنسی وغیرہ کے جھوٹے دعویٰ نبوت کا شکار ہو کر مرتد ہو گئے تھے۔

جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز میدان حشر میں جب میں اپنے کچھ لوگوں کو دوزخ کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھوں گا تو کہوں گا کہ یہ تو میرے اصحاب ہیں، یہ تو میرے اصحاب ہیں؟! لیکن پھر مجھے بتایا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو آپؐ کے سامنے مسلمان تھے لیکن آپؐ کے بعد اسلام سے پھر گئے تھے۔

(فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الحشر ۱/۳۸۵)

ایک احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان احادیث میں مذکورہ لوگوں سے مراد اہل بدعت ہوں جو دین میں نئی نئی باتیں نکالتے ہیں، لیکن یہ بات چونکہ ثابت ہے کہ اس امت کا کوئی بھی گنہگار، خواہ اس کا گناہ کتنا ہی بڑا ہو، حوض کوثر پر آنے اور اس کا پانی پینے سے نہیں روکا جائے گا، اس لئے یہ احتمال سرے سے رد ہو جاتا ہے، ہاں البتہ اگر ''بدعت'' کا تعلق دین وملت میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرنے سے ہو جس سے اصول دین کی نفی ہوتی ہو اور نبوت وشریعت پر براہ راست اس طرح کی زد پڑتی ہو کہ اس پر کفر کا اطلاق ہو جائے تو اس درجہ کے اہل بدعت یقیناً ''مرتد'' ہی کہلائیں گے اور ایسے لوگوں کو ان احادیث مبارکہ کا محمل قرار دیا جاسکتا ہے۔ (مظاہر حق ج۵ص۱۶۰)

اب بطور تتمہ کے وہ احادیث ذکر کی جاتی ہیں کہ جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''حوض'' کے متعلق ذکر کی ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''تمہارے سامنے ایک حوض ہوگا، اتنا طویل وعریض ہوگا جتنا فاصلہ جِرباء اور اَذْرُح کے درمیان ہے۔'' (اذرح ہمزہ کے فتح اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے، شام میں ایک بستی ہے۔ (مجمع البحار ج۱ص۵۹) اور جرباء بھی شام میں ایک بستی ہے، ان دونوں (اذرح اور جرباء) کے درمیان تین رات کی مسافت ہے۔

(مجمع البحار ج۱ص۳۳۸)

ضیاء مقدسی کی روایت میں مذکور ہے کہ ''اس کا عرض ایسا ہوگا جیسا کہ جرباء اور اذرح کے درمیان ہے۔''

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''میرے حوض کی مسافت ایک ماہ کے برابر ہوگی، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہوگا اور اس کی خوشبو مشک سے زیادہ عمدہ ہوگی، اور اس کے پیالے آسمان کے ستاروں کی طرح بے شمار ہوں گے، جو ایک مرتبہ اس میں سے پی لے گا اسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی،'' ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یوں ہے: ''اس پر سب سے پہلے وہ آئے گا جو پیاسے کو (پانی) پلاتا ہو۔''

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''میرے حوض کی مقدار ایسی ہے جیسے یمن کے ایلہ اور صنعاء کے درمیان، (ایلہ، ہمزہ کے فتح اور یاء کے سکون کے ساتھ، مصر اور شام کے درمیان ایک شہر، (مجمع البحار ج ۱ ص ۱۳۷)، اور صنعاء مد کے ساتھ، یمن کا ایک شہر، طوفان نوح کے بعد تعمیر ہونے والا یہ پہلا شہر ہے۔ (مجمع البحار ج ۳ ص ۳۶۲) اور اس پر آسمان کے ستاروں کی تعداد میں پیالے ہوں گے۔''

(مشکوٰۃ المصابیح، باب الحوض والشفاعۃ ص ۴۸۷)

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''میرے گھر اور منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، اور میرا منبر میرے حوض پر ہوگا''۔

(۵) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''خدا کی قسم! میں اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں، مجھے دنیا کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں، اور خدا کی قسم! مجھے تمہارے بارے میں یہ خوف نہیں کہ تم میرے بعد شرک کروگے، البتہ مجھے تمہارے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ تم دنیا میں منہمک نہ ہو جاؤ اور اس کی وجہ سے قتل وقتال کرنے لگو''۔

(۶) حضرت حارثہ بن وھب رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''وہ حوض اتنا بڑا ہوگا جیسی مسافت مکہ اور صنعاء کے درمیان ہے'' مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اس پر ستاروں کی طرح بے شمار پیالے ہوں گے، اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ستاروں سے زیادہ ہونگے۔''

(۴۰) ﴿جنت اور جہنم کے درمیان ''موت'' کا ذبح کیا جانا﴾

(۲۹۲) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''موت کو سیاہ و سفید (چتکبرے) رنگ کے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، پھر اس کو جنت اور جہنم کے درمیان کھڑا کیا جائے گا، پھر کہا جائے گا کہ اے جنتیو! کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟ تو وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے اور کہیں گے کہ ہاں، ہم اس کو پہچانتے ہیں، یہ موت ہے، پھر کہا جائے گا کہ اے دوزخیو! کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟ تو وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے اور کہیں گے کہ ہاں، یہ موت ہے، آپؐ نے فرمایا کہ: ''پھر اس کے بارے میں حکم ہوگا تو اس کو ذبح کر دیا جائے گا، پھر کہا جائے گا کہ اے جنتیو! ہمیشہ رہو گے، موت نہیں آئیگی اور اے دوزخیو! ہمیشہ رہو گے، موت نہیں آئیگی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''وَاَنْذِرْ هُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَهُمْ لَايُؤْمِنُوْنَ'' (مریم: ۳۹) ''اور آپؐ ان کو حسرت کے دن سے ڈرائیں جبکہ معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے''۔

(صحیح البخاری، کتاب التفسیر ج ۲ ص ۶۹۱، صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۲)

(۲۹۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب جنت والے جنت میں اور جہنم والے جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو موت کو باندھ کر لایا جائے گا، پھر اس دیوار پر کھڑا کیا جائے گا جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہے، پھر کہا جائے گا کہ اے جنتیو! تو وہ خوفزدہ حالت میں جھانک کر دیکھیں گے، پھر کہا جائے گا کہ اے دوزخیو! تو وہ شفاعت کی امید کرتے ہوئے خوش خوش دیکھیں گے، پھر جنت اور جہنم والوں سے کہا جائے گا، کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟ تو دونوں کہیں گے کہ ہم اس کو پہچانتے ہیں، یہ وہی موت ہے، جس کو ہم پر مسلط کیا گیا تھا، پھر اس کو لٹا کر دیوار پر ذبح کر دیا جائے گا، پھر کہا جائے گا کہ اے جنتیو! ہمیشہ رہو گے، اب موت نہیں ہے، اور اے دوزخیو! ہمیشہ

رہو گے، اب موت نہیں ہے“۔

(جامع الترمذی، باب ما جاء فی خلود اهل الجنة و اهل النار ج ۲ ص ۸۳، سنن ابن ماجه، باب صفة النار ج ۲ ص ۳۰۵)

فائدہ:

”موت کو سیاہ وسفید (چتکبرے) رنگ کے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا“

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ موت تو ایک عرض ہے، اسے مینڈھے کی شکل میں کس طرح لایا جائے گا؟ علماء نے اس کے متعدد جواب دیئے ہیں۔

(۱) علامہ مازری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ کلام علی سبیل التمثیل ہے، اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ آئندہ کسی کو موت نہیں آئے گی۔ (عمدة القاری ۵۲/۱۹، رفع الصوت بذبح الموت للسیوطیؒ ص ۹۶، فتح الباری ۴۲۱/۱۱، کتاب الرقاق)

(۲) بعض کہتے ہیں کہ اصل میں مینڈھے کو ہی لایا جائے گا، تاہم لوگوں کے خیال میں یہ بات ڈال دی جائے گی کہ یہ موت ہے۔

(الحاوی للفتاوی للسیوطیؒ، رفع الصوت بذبح الموت ص ۹۶)

(۳) اکثر حضرات یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موت ہی کو مینڈھے کی شکل عطا کر دیں گے۔ (عمدة القاری ۵۲/۱۹)

اعراض کا اجسام کی شکل میں تبدیل ہو جانا (خصوصاً آج کے دور میں) کوئی مستبعد نہیں ہے، جب جدید سائنس نے ایسے آلات ایجاد کر لئے ہیں جن سے اعراض، مجسد ہو کر سامنے آجاتے ہیں تو عالم آخرت میں اگر اس طرح کا واقعہ ہو تو اس پر کسی قسم کا اشکال نہیں ہونا چاہئے۔

علامہ ابن القیم حنبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنی معروف کتاب ”حادی الارواح إلی بلاد الافراح“ میں لکھتے ہیں کہ: ”موت کو مینڈھے کی شکل میں لانا اور اس کو لٹانا اور ذبح کرنا اور جنت و دوزخ والوں کو اس کا معائنہ کرانا ایک حقیقت رکھتا ہے، محض خیال و تمثیل نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے اس بارے میں بہت بڑی غلطی کی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ موت تو

ایک عرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ، موت کو مینڈھے کی شکل میں تبدیل کردے گا، جیسا کہ اعمال کو ان صورتوں میں تبدیل کردے گا جن کے ساتھ ان کو ثواب وعقاب دیا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ، اعراض کو ایسے اجسام میں تبدیل کرسکتا ہے جن کا اصل مادہ اعراض ہوں، اور اجسام کو اعراض سے تبدیل کرسکتا ہے، جیسا کہ وہ اعراض کو اعراض سے اور اجسام کو اجسام سے تبدیل کرنے پر قادر ہے، یہ چاروں اقسام ممکن ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت داخل ہیں اور اس سے نقیضین (دو متضاد چیزوں) کا اجتماع لازم نہیں آتا، اور نہ ہی کوئی امر محال لازم آتا ہے، اور اس تکلف کی بھی کوئی ضرورت نہیں جو بعض لوگوں نے اختیار کیا ہے کہ موت سے ملک الموت (فرشتہ موت) مراد ہے، اسے ذبح کیا جائے گا، پس یہ سب کچھ اللہ اور اس کے رسول کے (کلام کے) بارے میں غلط سوچ اور بے بنیاد تاویل کرنا ہے جس کو نہ عقل جائز سمجھتی ہے اور نہ عقل، اور اس کی وجہ دراصل کلام رسولؐ کی اصل مراد کو نہ سمجھنا ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ نفس عرض کو ذبح کیا جائے گا اور غلط خیال ہے، بے شک عرض ختم ہوجائے گا اور اس کی جگہ جسم بن جائے گا جس کو ذبح کیا جائے گا، اور جو قول ہم نے ذکر کیے ہیں ان میں دونوں فریق راہ راست سے ہٹے ہوئے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ، اعراض کو اجسام میں تبدیل کردے گا اور ان کو اس کا مادہ بنائے گا۔

جیسا کہ صحیح روایات میں سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا قیامت کے دن بادل کی طرح آنے اور تسبیح وتحمید اور تہلیل کا عرش الٰہی کے گرد چکر لگانے اور شہد کی مکھی کی طرح بن بناہٹ کرنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ (صحیح مسلم ج۱ص۲۷۰، مسند احمد ج۴ص۲۶۸)

نیز آپؐ نے فرمایا کہ: ''صاحب قبر کے اعمال کو صورتیں عطا کردی جائیں گی جن کو وہ دیکھے گا تو وہ پوچھے گا کہ تم کون ہو؟ تو اگر نیک آدمی ہوگا تو وہ جواب دے گا کہ میں تیرا نیک عمل ہوں، اور برے آدمی کو کہے گا کہ میں تیرا برا عمل ہوں، اور یہ حقیقت ہے، محض خیال نہیں ہے۔ (حادی الارواح إلی بلاد الافراح)

بہرحال! جب موت کو ذبح کردیا جائے گا تو یہ اعلان ہوگا کہ جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، اور ذبح کرنے والے حضرت جبریل علیہ السلام

ہوں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اسے ذبح کریں گے، کیونکہ ان کا نام ''یحییٰ'' حیات سے مشتق ہے اور حیات، موت کے منافی ہے۔

(عمدۃ القاری ۱۹/۵۲، فیض الباری ۴/۲۰۳، فتح الباری ۱۱/۳۶۲)

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''موت'' کو اس طرح (سیاہ و سفید رنگ کے مینڈھے کی شکل میں) لانے میں حکمت یہ ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کیلئے مینڈھے کو فدیہ بنایا گیا اسی طرح ان کیلئے بھی یہ فدیہ ہو جائے اور چتکبرے (سیاہ و سفید رنگ) شکل میں لانے میں اہل جنت اور اہل جہنم کی صفت (حلیہ و صورت) کی طرف اشارہ ہے۔ (فتح الباری ج ۱۱/۳۶۲)

جنت اور جہنم دونوں دائمی ہیں:

جیسا کہ مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت ہمیشہ کیلئے جنت میں اور اہل جہنم ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہیں گے، تمام اہل سنت والجماعت کا یہ اجماعی عقیدہ ہے، البتہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد رشید علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جنت تو دائمی رہے گی، تاہم دوزخ کا عذاب دائمی نہیں ہے، بلکہ ایک طویل عرصہ تک جہنم رہے گی جس کو اللہ تعالیٰ نے (نصوص) میں ''خلود'' سے تعبیر کیا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جہنم اور اہل جہنم فنا اور ختم کر دیئے جائیں گے۔ (العرف الشذی شرح جامع الترمذی، باب ماجاء فی خلود اهل الجنة والنار ۲/۸۲، الصواعق المرسلة لابن القيم).

لیکن ان کا یہ قول شاذ اور جمہور علماء امت کے عقیدے کے خلاف ہے، اور ان تمام نصوص سے متعارض ہے جن میں خلود فی النار (ہمیشہ دوزخ میں رہنے) کی تصریح آئی ہے۔ (روح المعانی ۱۲/۱۴۶، فتح الباری ۱۱/۳۶۳، کتاب الرقاق)

اگر جہنم کو فنا اور ختم ہی ہونا ہے تو پھر انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ کفار کا یہ مقابلہ اور انبیاء علیہم السلام کا تکلیفیں اور مشقتیں اٹھانا سب بے فائدہ اور بے مقصد ہو جاتا ہے، اس لئے اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ جس طرح جنت کیلئے خلود ہے اسی طرح جہنم کیلئے بھی خلود ہے۔

علامہ ابن القیم حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے "حادی الارواح إلی بلاد الافراح" میں اس موضوع پر بھرپور انداز میں مفصل شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے۔ جو اہل علم کیلئے قابل مطالعہ ہے اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے موت کو ذبح کرنے کے مسئلہ پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "رفع الصوت بذبح الموت" ہے اور یہ رسالہ ان کے فتاوی کے مجموعہ "الحاوی للفتاوی" میں شامل ہے اور مطبوع ہے۔ دیکھئے (ج ۲ ص ۹۵، ۹۶)۔ لیکن یہاں طوالت کلام کے خدشہ سے اسے چھوڑا جاتا ہے۔

(۲۹۳) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت والے جب جنت میں داخل ہو جائیں گے اور دوزخ والے دوزخ میں، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو تو اسے (دوزخ سے) نکال لو، چنانچہ انہیں وہاں سے اس حالت میں نکالا جائے گا کہ وہ جل کر کوئلہ ہو چکے ہوں گے، پھر ان کو نہر حیات میں ڈالا جائے گا، وہ اس میں سے ایسے اُگ کر نکلیں گے جیسے دانہ سیلاب کے کوڑے کچرے میں سے نکلتا ہے یا نہر کے پانی کے بہنے کی جگہ سے نکلتا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ زرد رنگ کا لپٹا ہوا نکلتا ہے۔''

(صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۸/۱۱۵)

(۲۹۴) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب جنت والے جنت میں داخل ہو جائیں گے اور دوزخ والے دوزخ میں، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ہر اس شخص کو (دوزخ سے) نکال لو جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان موجود ہے، چنانچہ وہ وہاں سے کالے ہو کر نکلیں گے، پھر انہیں نہر حیا یا نہر حیات میں ڈال دیا جائے گا، پھر وہ اس سے اس طرح اگیں گے جس طرح دانہ سیلاب کے کوڑے کچرے میں اگتا ہے، کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ زرد رنگ کا لپٹا ہوا نکلتا ہے۔''

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب تفاضل اهل الایمان فی الاعمال)۔

(اس حدیث کی تشریح پہلے کہیں گزر چکی ہے، مزید تشریح وتوضیح کیلئے دیکھئے: شرح القسطلانی ج۹ ص ۳۲۳، نیز ج۱ ص۱۰۵ اور فضل الباری شرح صحیح البخاری ج۱ ص ۳۷۲ تا ص ۳۸۰)

(۴۱) جنت کو مکروہاتِ نفس سے اور جہنم کو خواہشاتِ نفس سے گھیر دیا گیا ہے

(۲۹۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جب جنت کو بنایا تو حضرت جبریلؑ سے فرمایا کہ جاؤ! ذرا جنت کی طرف نگاہ اٹھا کر تو دیکھو، (میں نے کتنی اچھی اور کس قدر نازک اور دیدہ زیب چیز بنائی ہے) چنانچہ وہ گئے اور جنت کو اور اس کی ان تمام چیزوں کو جو اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے بنائی ہیں، دیکھا، پھر واپس آ کر عرض کیا کہ پروردگار! تیری عزت کی قسم! (تو نے اتنی اعلیٰ اور نفیس جنت بنائی ہے اور اس کو ایسی ایسی نعمتوں اور خوبیوں سے معمور کیا ہے کہ) جو کوئی بھی اس کے بارے میں سنے گا وہ اس میں داخلہ کی یقیناً خواہش کرے گا، تب اللہ تعالیٰ نے جنت کے چاروں طرف ان چیزوں کا احاطہ قائم کر دیا، جو نفس کو ناگوار ہیں، اور فرمایا کہ جبریل! جا کر جنت کو دوبارہ دیکھ آؤ، چنانچہ وہ گئے اور جنت کو (اس اضافہ کے ساتھ جو چاروں طرف احاطہ کی صورت میں ہوا تھا) دیکھ کر واپس آئے اور عرض کیا کہ اے پروردگار! تیری عزت کی قسم! مجھے خدشہ ہے کہ اب شاید ہی کوئی جنت میں داخل ہونے کی خواہش کرے (کیونکہ اس کے گرد مکروہاتِ نفس کا جو احاطہ قائم کر دیا گیا ہے اس کو عبور کرنے کیلئے نفسانی خواہشات کو مارنا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ انسان، خواہشاتِ نفس کو مار کر جنت تک پہنچنا دشوار سمجھے گا)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ بنائی تو حکم دیا کہ جبریلؑ! جاؤ، دوزخ کو دیکھ آؤ، (کہ میں نے کتنی ہولناک اور بری چیز بنائی ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پس جبریلؑ گئے اور دوزخ کو دیکھ کر واپس آئے تو عرض کیا کہ پروردگار! تیری عزت وجلال کی قسم! جو کوئی بھی دوزخ کے بارے میں سنے گا وہ ڈر کے مارے اس سے دور رہے گا (اور اس میں جانے کی خواہش نہ کرے گا) تب اللہ تعالیٰ نے دوزخ کے چاروں طرف خواہشاتِ نفس اور

لذات دنیا کا احاطہ قائم کر دیا، اور جبریلؑ سے فرمایا کہ جبریلؑ! جاؤ، دوزخ کو دوبارہ دیکھ آؤ، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''چنانچہ جبریل گئے، اور دوزخ کو (اس احاطہ کے اضافہ کے ساتھ) دیکھ کر واپس آئے اور عرض کیا کہ پروردگار! تیری عزت وجلال کی قسم! مجھے خدشہ ہے کہ اب شاید ہی کوئی باقی بچے جو دوزخ میں نہ جائے۔ (کیونکہ جن خواہشاتِ نفس اور لذاتِ دنیا کا احاطہ دوزخ کے چاروں طرف کر دیا گیا ہے وہ اس قدر دلفریب اور اتنی زیادہ مزیدار ہیں کہ نفسِ طبیعت کی پیروی کرنے والوں میں سے ایسا کوئی بھی نہیں ہوگا جو ان خواہشات و لذات کی طرف نہ لپکے اور اس کے نتیجے میں دوزخ میں نہ جا پڑے)''۔ (جامع الترمذی، باب حفت الجنة بالمکارہ ج ۲ ص ۹۲، مشکوٰۃ المصابیح، باب خلق الجنة والنار ص ۵۰۵)

نیز امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو سنن ابی داود، باب خلق الجنة والنار ج ۴ ص ۱۸۵ پر نقل کیا ہے اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی سنن میں باب الحلف بعزة اللّٰہ تعالٰی کے تحت تقریباً ان ہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

فائدہ:

حدیث میں مذکور لفظ ''مَکَارِہ'' اصل میں مَکْرُوہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں، مکروہ، یعنی ناپسندیدہ اور دشوار گزار چیزیں، یہاں ''مَکَارِہ'' سے مراد وہ شرعی امور ہیں جن کا انسان کو مکلّف قرار دیا گیا ہے کہ فلاں فلاں کو اختیار کیا جائے اور فلاں فلاں سے اجتناب کیا جائے، پس جنت کے چاروں طرف ''مکارہ'' کا احاطہ قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے اور گناہوں سے اجتناب کرنے کی تکلیف و مشقت نہ اٹھائی جائے گی اور نفس کی خواہشات اور اس کی تمناؤں کو ختم نہ کر دیا جائے گا اس وقت تک جنت میں داخل ہونا ناممکن ہوگا۔ (مظاہر حق ج ۵ ص ۲۵۶)

مطلب یہ ہوا کہ جنت کو ایسے امور سے گھیر دیا گیا ہے جو نفوس انسانی کو طبعاً ناپسند ہوتے ہیں، ان مصائب وابتلاءات سے گزر کر ہی انسان جنت میں جا سکتا ہے، مشقتوں اور تکلیفوں پر صبر کرنا پڑے گا، اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کیلئے یہ سب چیزیں خندہ پیشانی

سے برداشت کرنا پڑیں گی۔

اس کے برخلاف دوزخ کو خواہشات نفس سے گھیر دیا گیا ہے کہ جو نفس لذیذ سے لذیذ تر کی تلاش وجستجو اور خواہش پرستی کا شکار رہتا ہے وہ آخر کار دوزخ تک پہنچ جاتا ہے، انسان طبعاً خواہشات ولذات کی طرف مائل ہوتا ہے، بالخصوص جب گندے ماحول و بری سوسائٹی میں رہتا بستا ہو تو اس کے بگاڑ میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے اور پھر ان ہی برائیوں میں مبتلا رہتا ہے حتیٰ کہ موت آجاتی ہے اور دوزخ میں چلا جاتا ہے۔

بہرحال! حدیث کا اصل مقصد اور اس میں ہمارے لئے خاص سبق یہ ہے کہ نفسانی خواہشات جو بظاہر بڑی لذیذ اور بڑی مرغوب ہیں، ہم جان لیں کہ ان کا انجام دوزخ کا دردناک عذاب ہے، جس کا ایک لمحہ زندگی بھر کے عیشوں کو بھلا دے گا، اور احکام خداوندی کی پابندی والی زندگی جس میں ہمارے نفسوں کو گرانی اور سختی محسوس ہوتی ہے اس کا انجام اور منتہیٰ جنت ہے، جس میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عیش وراحت کے وہ سامان ہیں جن کی دنیا کے کسی انسان کو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ (معارف الحدیث ج ۱ ص ۲۲۷)

اللہ تعالیٰ ہمیں دوزخ سے نجات عطا فرمائے اور جنت میں متقین اور ابرار کے ہمراہ داخل فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

دوزخیوں کی کرب ناک حالت:

(۲۹۶) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دوزخیوں پر بھوک اس طرح مسلط کر دی جائے گی کہ اس بھوک کی اذیت اس عذاب کے برابر ہوگی جس میں وہ دوزخی پہلے سے گرفتار ہوں گے، چنانچہ وہ بھوک کی اذیت سے بیتاب ہو کر فریاد کریں گے اور ان کی فریاد اسی ضریع کے کھانے کے ذریعہ کی جائے گی جو نہ فربہ کرے گا، نہ بھوک کو دفع کرے گا، پھر وہ (پہلے کھانے کو لاحاصل دیکھ کر) دوسری مرتبہ فریاد کریں گے، اور اس مرتبہ ان کی فریادرسی گلہ میں پھنس جانے والے کھانے کے ذریعہ کی جائے گی، اس وقت ان کو یہ یاد آئے گا کہ جب (دنیا میں) کھاتے وقت ان کے گلہ میں کوئی چیز پھنس جاتی

تھی تو اس کو وہ کسی پینے والی چیز سے نیچے اتارتے تھے، چنانچہ وہ (اپنے گلہ میں پھنسے ہوئے کھانے کو اتارنے کیلئے) کسی پینے والی چیز کی التجاء کریں گے، تب ان کو تیز گرم پانی دیا جائے گا جس کو زنبوروں کے ذریعہ پکڑ کر اٹھایا جائے گا (یعنی جن برتنوں میں وہ تیز گرم پانی ہوگا وہ زنبوروں کے ذریعہ پکڑ کر اٹھائے جائیں گے اور اٹھانے والے یا تو فرشتے ہوں گے یا براہ راست دست قدرت ان کو اٹھا کر دوزخیوں کے منہ کو لگائے گا) اور جب گرم پانی کے وہ برتن ان کے مونہوں تک پہنچیں گے تو ان کے چہروں (کے گوشت) کو بھون ڈالیں گے، اور جب ان برتنوں کے اندر کی چیز (جو ان کو پینے کیلئے دی جائے گی جیسے پیپ پیلا پانی وغیرہ) ان کے پیٹ میں داخل ہوگی تو پیٹ کے اندر کی چیزوں (یعنی آنتوں وغیرہ) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی، پس (اس صورت حال سے بیتاب ہو کر) وہ دوزخی (دوزخ پر متعین فرشتوں سے) کہیں گے، اے دوزخ کے سنتریو! اللہ تعالیٰ سے دعا کرو (کہ کم سے کم ایک ہی دن کیلئے ہمارے اوپر مسلط اس عذاب کو ہلکا کر دے)، دوزخ کے سنتری جواب دیں گے کہ (اب ہم سے دعا کیلئے کہتے ہو) کیا خدا کے رسولؑ خدائی معجزے اور واضح دلیلیں لے کر تمہارے پاس نہیں آئے تھے (اور تم سے یہ نہ کہتے تھے کہ کفر اور سرکشی کی راہ چھوڑ کر خدا کی اطاعت وفرماں برداری کا راستہ اختیار کرلو تا کہ کل آخرت میں دوزخ کے سخت عذاب سے محفوظ رہ سکو؟) وہ کہیں گے کہ بے شک (خدا کے رسولؑ) ہمارے پاس آئے تھے (اور ان کی تعلیمات ہم تک پہنچیں تھیں، لیکن وائے افسوس! ہم گمراہی میں پڑے رہے اور ایمان وسلامتی کی راہ اختیار نہ کر سکے) دوزخ کے سنتری کہیں گے کہ پھر تم خود ہی دعا کرو (اور اپنا معاملہ سمجھو، ہم تو تمہاری سفارش کرنے سے رہے) اور کافروں کی دُعا زیاں کاری اور بے فائدگی کے علاوہ کچھ نہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''دوزخی (جب جہنم کے سنتریوں سے دعا وسفارش کرانے میں ناکام ہو جائیں گے اور انہیں سخت مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا تو وہ یقین کرلیں گے کہ ہمیں عذاب خداوندی سے نجات ملنے والی نہیں ہے، پھر کیوں نہ موت ہی مانگی جائے، چنانچہ وہ آپس میں) کہیں گے کہ مالک (یعنی داروغہ دوزخ) سے مدد کی درخواست کرو! اور پھر وہ التجاء کریں گے کہ اے مالک! اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ

ہمیں موت دیدے (تا کہ ہمیں آرام مل جائے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''(دوزخیوں کی التجاء سن کر) مالک (خود اپنی طرف سے یا پروردگار کی طرف سے) جواب دے گا کہ (اس دوزخ سے نجات یا موت کا خیال چھوڑ دو) تمہیں ہمیشہ ہمیشہ یہیں اور اسی عذاب میں گرفتار رہنا ہے'' حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ (جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے (بطریق مرفوع یا موقوف) مجھ سے بیان کیا کہ مالک سے ان دوزخیوں کی التجاء اور مالک کی طرف سے ان کو جواب دینے کے درمیان ایک ہزار سال کا وقفہ ہوگا (یعنی وہ دوزخی، مالک سے التجاء کرنے کے بعد ایک ہزار سال تک جواب کا انتظار کرتے رہیں گے اور اس دوران بھی وہ اس عذاب میں مبتلا رہیں گے)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پھر وہ دوزخی (آپس میں) کہیں گے کہ اب ہمیں براہ راست اپنے پروردگار ہی سے اپنی نجات کی التجاء کرنی چاہیے (کیونکہ وہی قادر مطلق، رحیم وکریم اور غفار ہے) ہمارے حق میں بھلائی اور بہتری کرنے والا اس پروردگار سے بہتر اور کوئی نہیں، چنانچہ وہ التجاء کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری بدبختی نے ہمیں گھیر لیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم (توحید کی راہ سے) بھٹک گئے تھے، اے ہمارے پروردگار! ہمیں دوزخ (اور یہاں کے عذاب) سے رہائی عطا فرمادے، اگر ہم اس کے بعد بھی کفر وشرک کی طرف جائیں تو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کو جواب دے گا: ''دور ہو، کم بختو! (کتوں کی طرح ذلیل وخوار ہو اور) اسی دوزخ میں پڑے رہو، اور (رہائی و نجات کے بارے میں) مجھ سے کوئی بات نہ کرو، (تمہاری گلوخلاصی ہرگز نہیں ہوسکتی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''آخر کار وہ دوزخی ہر بھلائی سے مایوس ہو جائیں گے اور تب وہ حسرت اور نالہ وفریاد کرنے لگیں گے'' حضرت عبداللہ بن عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ (جو اس حدیث کے راوی ہیں) کہتے ہیں کہ ''اس حدیث کو مرفوع قرار نہیں دیا جاتا'' لیکن ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو (مرفوع) نقل کیا ہے''۔

(جامع الترمذی، باب صفة طعام اهل النار ج ۲ ص ۹۶، ۹۷، مشکوٰة المصابیح، باب صفة النار واهلها ص ۵۰۴)۔

فائدہ:

''اس بھوک کی اذیت اس عذاب کے برابر ہوگی ...... الخ'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر جو بھوک مسلط کی جائے گی اس کی دردناکی، دوزخ کے اور تمام عذاب کی درناکیوں کے برابر ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ بھوک کی آگ دوزخ کی آگ کی مانند ہے۔

''اور ان کی فریادرسی ضریع کے کھانے کے ذریعہ کی جائے گی'' یعنی جب وہ دوزخی بھوک سے بیتاب ہو کر کچھ کھانے کو مانگیں گے تو ان کو کھانے کیلئے ضریع دیا جائے گا۔

واضح رہے کہ ''ضرِیع'' ایک خاردار جھاڑ کو کہتے ہیں جو حجاز میں ہوتا ہے، یہ ایک ایسی زہریلی اور کڑوی گھاس ہوتی ہے جس کے پاس کوئی جانور بھی نہیں پھٹکتا، اور اگر کوئی جانور اس کو کھا لیتا ہے تو مرجاتا ہے۔ (تفسیر قرطبی ج ۲۰ ص ۲۹) بہرحال! حدیث میں یہاں ''ضَرِیع'' سے مراد آگ کے کانٹے ہیں جو ایلوے سے زیادہ کڑوے، مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ سخت ہوں گے۔'' (مجمع البحار ج ۳ ص ۴۰۴)

''فربہ کرے گا اور نہ بھوک دفع کرے گا'' یہ دراصل قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: ''لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِن ضَرِيعٍ، لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ، (الغاشیۃ) ''ان کو ایک خاردار جھاڑ کے سوا اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا جو نہ تو کھانے والوں کو فربہ کرے گا اور نہ ان کی بھوک دفع کرے گا''

''گلہ میں پھنس جانے والے کھانے کے ذریعہ فریادرسی کی جائے گی'' اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری مرتبہ ان کو کھانے کیلئے ہڈی یا آگ کے کانٹے وغیرہ کی طرح کی ایسی چیزیں دی جائیں گی جو گلے میں جا کر پھنس جائیں گی کہ نہ حلق سے نیچے اتر سکیں گی اور نہ باہر آسکیں گی۔

پس حدیث کے اس جملہ میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: ''اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا'' یعنی حقیقت یہ ہے کہ (کفر و شرک کرنے والوں کیلئے) ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں، اور (دوزخ کی) بھڑکتی آگ ہے۔

حدیث کے یہ الفاظ ''وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلَالٍ''(اور کافروں کی دعا بازیاں کاری و بے فائدگی کے علاوہ کچھ نہیں) بھی دراصل قرآن مجید ہی کے الفاظ ہیں، اوران کی دعا کو زیاں کاری سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس وقت ان کے حق میں کوئی بھی دعا وسفارش کارگر نہیں ہوگی، خواہ وہ خود دعا کریں اور گڑگڑائیں یا کسی اور سے دعا وسفارش کرائیں۔ لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ کافر ومشرک کی دعا اس دنیا میں بھی قبول نہیں ہوتی، جیسا کہ قرآن وحدیث کے ان الفاظ سے بعض حضرات نے نتیجہ اخذ کیا ہے۔ حقیقت حال تو یہ ہے کہ اس دنیا میں شیطان تک کی درخواست، جو اس نے اپنی عمر کی درازی کیلئے کی تھی، اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی، پھر کافر کی دعا کیونکر قبول نہیں ہوسکتی! بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرے۔

''ہماری بدبختی نے ہمیں گھیرلیا'' اس جملہ میں مذکور لفظ ''شِقْوَۃٌ'' شین کے زیر اور قاف کے جزم کے ساتھ ہے اور یہ لفظ شَقَاوَۃٌ (شین کے زبر کے ساتھ) بھی پڑھا گیا ہے، دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی ''بدبختی'' جو ''سعادت'' کی ضد ہے، مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری تقدیر کہ جس میں ہمارا خاتمہ بدلکھ دیا گیا، پوری ہوکر رہی اور ہم خود اپنی بدبختی کا شکار ہوگئے۔

''اگر ہم اس کے بعد بھی کفر وشرک کی طرف جائیں الخ''۔

کافر دوزخیوں کا یہ کہنا بھی مکر وکذب پرمبنی ہوگا، جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے: ''وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَکٰذِبُوْنَ'' یعنی ''اگر یہ لوگ پھر (دنیا میں) واپس بھی بھیج دیئے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

''حسرت اور نالہ وفریاد کرنے لگیں گے'' اس جملہ میں لفظ ''زَفِیْر'' کے اصل معنی ہیں ''گدھے کا سانس اندر لے جانا، جیسا کہ شَہِیْقٌ کے معنی ہیں۔'' گدھے کا سانس باہر نکالنا''۔ یا یہ کہ جب گدھا رینگنا شروع کرتا ہے تو پہلے اس کی آواز باریک اور چھوٹی نکلتی ہے جس کو ''زَفِیْر'' کہا جاتا ہے اور آخر میں اس کی آواز تیز اور بڑی ہوجاتی ہے اس کو ''شَہِیْقٌ''

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی ج۹ص۹۹)

حدیث کے ان الفاظ میں قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے:

"لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّشَهِيقٌ" یعنی دوزخ میں گدھے کی چھوٹی اور بڑی آواز کی طرح ان دوزخیوں کی چیخ وپکار پڑی رہے گی"

بہرحال! حدیث کے اس آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی جب بارگاہ خداوندی کا جواب سن لیں گے تو وہ بالکل ناامید اور مایوس ہو جائیں گے کہ دوزخ کے سنتریوں کو پکارا کچھ سودمند نہ ہوا، داروغہ دوزخ سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے موت ہی دلوا دے، اس کا بھی فائدہ نہ ہوا، آخر میں بارگاہ خداوندی میں روئے گڑگڑائے، وہاں بھی کوئی بات قبول نہیں ہوئی، اب کہاں جائیں؟ کس کے سامنے فریاد کریں؟ ایسے میں وہ بے معنی آوازوں اور بے ہنگم صداؤں میں نالہ وفریاد اور چیخ وپکار کرنے لگیں گے، جیسا کہ مایوسی کے عالم میں ہوتا ہے۔

روایت کے آخر میں ان الفاظ "اس حدیث کو مرفوع قرار نہیں دیا جاتا" کا مطلب یہ ہے کہ بعض محدثین کے نزدیک یہ حدیث، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی نہیں ہے، بلکہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث بہرصورت مرفوع حدیث یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد گرامی ہی کے حکم میں ہے، خواہ اس کے احوال، دوزخیوں کی گفتگو اور دوزخ کے عذاب وغیرہ سے متعلق جو مضمون ہے وہ کوئی بھی صحابی رضی اللہ عنہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنے بغیر اپنی طرف سے بیان کر ہی نہیں سکتا۔ (مظاہر حق ج۵ص۲۴۸تا۲۵۰ص)

(۴۲) دیدار الٰہی کا بیان اور اہل جنت سے پروردگار عالم کا خطاب

(۲۹۷) حضرت صہیب رضی اللہ عنہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”جب جنتی، جنت میں (اپنی اپنی جگہ) پہنچ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ (جو کچھ تمہیں عطا کیا جا چکا ہے) اس سے زیادہ کچھ اور تم مجھ سے چاہتے ہو؟ جنتی (یہ سن کر) عرض کریں گے، (پروردگار) کیا آپ نے ہمارے چہروں کو روشن ومنور نہیں کیا؟ کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا؟ کیا آپ نے ہمیں دوزخ کی آگ سے نجات نہیں دی؟ (اتنی بڑی بڑی نعمتوں سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے جو ہم آپ سے مزید چاہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”تب حجاب اٹھا دیا جائے گا اور جنتی، ذاتِ اقدس کی طرف دیکھیں گے، (جو صورت وجسم اور جہت ومقام کی قیود وشرائط سے پاک ومنزہ ہے) اور (اس وقت معلوم ہوگا کہ) اہل جنت کو ایسی کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی جو پروردگار کی طرف ان کے دیکھنے سے زیادہ بہتر وپسندیدہ ہو، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ”لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ“ (یونس:۲۶) (جن لوگوں نے اچھے کام کیے ہیں ان کی جزا بھی اچھی ہے یعنی جنت اور مزید برآں یعنی خصوصی انعام کے طور پر دیدار الٰہی ان کو نصیب ہوگا)“۔

(صحیح مسلم ج۲ص۱۰۷ حاشیہ القسطلانی، مشکوٰۃ المصابیح، باب رؤیۃ اللّٰہ تعالیٰ ص۵۰۰)

(۲۹۸) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ: ”(آپؐ نے فرمایا) جب جنتی اپنی حاصل شدہ نعمتوں سے لذت وکیف اٹھانے میں مشغول ہوں گے کہ اچانک ان کے سامنے ایک عظیم نور پھیل جائے گا، وہ (اس نور کو دیکھنے کے لئے) اپنا سر اٹھائیں گے تو کیا دیکھیں گے کہ ان کے اوپر پروردگار جلوہ گر ہے، اور پروردگار ان سے فرمائے گا کہ ”اے اہل جنت! السلام علیکم، اور یہ (یعنی اس وقت

پروردگار عالم کا جنتیوں کو سلام کرنا) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد عالی: "سَلٰمٌ قَوْلاً مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (یٰس: ۵۸) سے ثابت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "پھر اللہ تعالیٰ جنتیوں کی طرف دیکھے گا، اور جنتی، اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھیں گے، اور وہ دیدار الٰہی میں اس قدر محو ہوں گے کہ اس وقت جنتیوں کی نعمتوں میں سے کسی چیز کی طرف توجہ والتفات نہیں کریں گے تا آنکہ پروردگار ان کی نظروں سے مخفی ہو جائے گا، اور اس کا نور (اور ان کے گھروں میں اس کی برکت) باقی رہ جائے گی"

(صحیح مسلم، مشکوٰۃ المصابیح، باب رؤیۃ اللّٰہ تعالیٰ ص۵۰۲)

(۲۹۹) امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ (یونس: ۲۶) "جو لوگ نیکی کرتے رہے ان کے لئے بھلائی ہے اور اس پر مزید بھی" اور (پھر) آپؐ نے فرمایا: "جب جنتی، جنت میں چلے جائیں گے اور دوزخی، دوزخ میں تو ایک پکارنے والا پکارے گا: اے اہل جنت! تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک وعدہ ہے۔ وہ اس کو پورا کرنا چاہتا ہے، وہ کہیں گے: وہ کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے میزان (عمل) کو بھاری نہیں کیا؟ اور ہمارے چہروں کو روشن نہیں کیا؟ (یعنی سرخ رو نہیں کیا؟) اور ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا؟ اور دوزخ کی آگ سے نجات نہیں دی؟ آپؐ نے فرمایا: پھر حجاب ہٹا دیا جائیگا، جنتی اس کی طرف دیکھیں گے، پس خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھنے سے زیادہ محبوب وپسندیدہ اور ان کی آنکھوں کے لئے زیادہ ٹھنڈی کرنے والی ان کو نہ دی ہوگی" (سنن ابن ماجہ)

سنن ابن ماجہ کے محشی (حاشیہ نگار) کہتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہٗ ان کے دلوں سے حرص نکال دے گا اور انہیں وہ کچھ عطا کرے گا جس سے زائد کی انہیں کوئی طمع نہ ہوگی اور اپنے فضل سے ان کو راضی اور خوش کر دے گا۔

فائدہ:

"دیدار الٰہی" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا، اور اللہ تعالیٰ

کو دیکھنے کی یہ سعادت مومنین کو آخرت میں نصیب ہوگی۔ اسی موضوع سے متعلق مندرجہ بالا احادیث نقل کی گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا دیدار عقلاً بھی ممکن ہے:

اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ایک ایسی حقیقت ہے جس کا وجود عقلاً بھی ممکن ہے، اور اس دیدار کے لئے اللہ تعالیٰ کا کسی خاص جگہ و مقام پر اور کسی خاص سمت و جہت میں موجود اور قائم ہونا، نیز اس کی ذات کا اور دیکھنے والوں کا آمنے سامنے ہونا قطعی ضروری اور شرط کے درجہ کی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی ذات اور اپنے وجود کے اعتبار سے جو کچھ بھی ہے، اسی حیثیت کے ساتھ اس کا دیکھا جانا ممکن ہے، اگر چہ وہ جسم اور جسامت سے ماوراء، اور مکان و جہت کی قید سے آزاد ہو، رہی یہ بات کہ شے مرئی (یعنی کھلی آنکھوں سے نظر آنے والی چیز) کو دیکھنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ جسم ہو، کسی خاص جگہ و مقام پر موجود ہو، اور قائم ہو اور نگاہ کی سمت و جہت میں ہو، تو دیکھنے میں ان چیزوں کا عمل دخل ہونا دراصل اس لئے ضروری ہے کہ قدرت نے اسی طرح کا نظام جاری فرمایا ہے، اور انسانی نگاہ کو اپنا فعل انجام دینے کے لئے ان اسباب کا پابند بنا دیا ہے، اگر قادر مطلق اس جاری نظام اور عادت کے برخلاف ان عوامل کے بغیر بھی کسی کو کوئی چیز دکھانا چاہے تو بے شک وہ اس پر قادر ہے اور ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔

پس اس میں کوئی خلافِ عقل بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کل قیامت کے دن انسانی نگاہ میں بصیرت یعنی چشم قلب کی قوت رکھ دے کہ جس طرح آج دنیا میں اہل ایمان اس کو بصیرت سے پاتے اور دیکھتے ہیں، کل کو آخرت میں بصارت یعنی سر کی آنکھوں سے اس کو دیکھیں گے۔

دیدارِ الٰہی کا تعلق آخرت سے ہے:

تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ دیدار تمام اہل ایمان کو آخرت میں نصیب ہوگا، اس کا ثبوت وہ قرآنی آیات، احادیث صحیحہ، اجماع صحابہؓ و تابعینؒ اور

اقوال ائمہ ہیں جو اس ضمن میں مذکور اور منقول ہیں، تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اس دیدار کے منکر ہیں، انہوں نے دیدار الٰہی سے متعلق قرآنی آیات واحادیث اور منقول دلائل کی جس طرح تاویل کی ہے، اس کی تفصیل اور علمائے حق کی طرف سے ان کی تاویلات کے مضبوط جوابات مختلف تحقیقی کتابوں میں مذکور ہیں۔

(مثلاً علامہ ابن القیمؒ کی کتاب "حادی الارواح إلی بلاد الافراح" وغیرہ)

علماء امت نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کا اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہونا جنت میں ہوگا کہ وہ (اہل ایمان) جنت میں پہنچیں گے تو وہاں دیدارِ الٰہی کی سعادت سے مشرف ہوں گے، لیکن جہاں تک تعلق ہے اس دیدار کا جو موقف یعنی میدان حشر میں ہوگا تو وہاں تمام ہی مخلوق، کیا اہل ایمان اور کیا اہل کفر، سب اللہ تعالیٰ کو دیکھے گی، لیکن اہل کفر اس دیدار کے بعد محجوب ہو جائیں گے اور پھر ہمیشہ دیدار کی حسرت میں رہیں گے۔

عورتیں بھی دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوں گی:

عورتوں کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ ان کو دیدار ہوگا اور بعض انکار کرتے ہیں، لیکن درست بات یہ ہے کہ عورتیں بھی اس سعادت سے محروم نہ رہیں گی، مردوں کی طرح ان کو بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان عورتوں کو بعض خاص ایام میں جیسے جمعہ کے ایام میں اور عیدین کے دن ہی دیدار کی سعادت حاصل ہوگی جو عام بازیابی کے اوقات ہوں گے، جو حضرات مطلقاً عورتوں کے دیدار کے منکر ہیں، ان کا یہ کہنا ہے کہ عورتیں چونکہ خیموں میں پردہ نشیں ہوں گی، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: "حُوْرٌ مَّقْصُوْرَاتٌ فِي الْخِيَام" (الرحمٰن)، لہٰذا ان کو دیدار کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ ایک ناقابل التفات بات ہے، کیونکہ اول تو دیدار الٰہی کے بارے میں جو آیات واحادیث منقول ہیں ان میں کوئی خصوص مذکور نہیں ہے، بلکہ وہ سب عموم پر محمول ہیں، اور مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہیں۔ دوسرے یہ کہ عالم آخرت کو دنیا پر قیاس کرنا

اور وہاں عورتوں کے خیموں میں رہنے کو دنیا کے پردہ پر منطبق کرنا بجائے خود غلط ہے، کیونکہ جنت کے خیمے (کہ جن میں وہاں کی عورتیں رہیں گی) پردہ وحجاب کو مستلزم نہیں ہوں گے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ فاطمۃ الزہراءؓ، خدیجۃ الکبریٰؓ، عائشہ صدیقہؓ اور دوسری امہات المؤمنینؓ، نیز ان جیسی دیگر عظیم خواتین جو لاکھوں کروڑوں مردوں سے زیادہ عظمت وفضیلت رکھتی ہیں، آخر کس طرح دیدارِ الٰہی کی سب سے بڑی سعادت سے محروم رہ سکتی ہیں۔

جنّات اور فرشتوں کو بھی خدا کا دیدار نصیب ہوگا:

جنّات اور فرشتوں کے بارے میں بھی اختلافی اقوال ہیں کہ آیا ان کو دیدارِ خداوندی نصیب ہوگا یا نہیں؟ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کے علاوہ دیگر فرشتوں کو خدا کے دیدار کی سعادت حاصل نہیں ہوگی، اور خود حضرت جبریل علیہ السلام بھی اس سعادت سے ایک ہی بار مشرف ہوں گے، اور اسی طرح جنّات بھی دیدار الٰہی سے محروم رہیں گے، لیکن اس سلسلہ میں صحیح اور درست قول یہی ہے کہ دیدار الٰہی کی سعادت تمام اہل ایمان کے لئے ہے، کیا انسان، کیا فرشتے اور کیا جنّات!۔

کیا دنیا میں خدا کا دیدار ہوسکتا ہے؟

یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ کیا اس دنیا میں بحالت بیداری کھلی آنکھوں سے خدا کا دیدار ہوسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں ارباب تحقیق نے اس قول کو اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بھی ممکن تو ہے لیکن بالاتفاق غیر واقع ہے، رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شب معراج میں خدا کا دیدار ہونا ایک امر واقع ہے تو یہ ایک استثنائی صورت ہے، اگرچہ بعض حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شب معراج میں بچشمِ سر خدا کا دیدار ہوا تھا، بہرحال! محدثین، فقہاء، متکلمین اور مشائخ طریقت سب اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ نہ آج تک اس دنیا میں کسی کو بھی، خواہ وہ کوئی بڑے سے بڑا ولی ہی کیوں نہ ہو، خدا کا دیدار حاصل ہوا ہے، نہ اولیاء اللہ اور مشائخ میں سے کسی

نے اس کا دعویٰ کیا ہے اور نہ آئندہ کسی کو حاصل ہوسکتا ہے، بلکہ مشائخ نے متفقہ طور پر یہاں تک کہا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے خدا کو بیداری کی حالت میں دیکھا ہے (جیسے بعض جاہل اور نام نہاد صوفیاء کہہ دیا کرتے ہیں) تو اس کی تکذیب کرنا اور اس کو گمراہ قرار دینا لازم ہے۔ فقہ شافعی کی مستند کتاب "الانوار" میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ میں اس دنیا میں بچشمِ سر عیاناً (کھلی آنکھوں سے) خدا کو دیکھتا ہوں اور خدا مجھ سے بالمشافہ گفتگو کرتا ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن ہے اور انسانی حاسۂ بصر میں ایسا کوئی نقص بھی نہیں کہ کسی چیز کو دیکھنے میں رکاوٹ پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ ہونے کا کیا سبب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دیکھنا اور نظر آنا دراصل نظام قدرت اور تخلیقِ الٰہی کا سبب ہے نہ کہ اس کی اصل علت، وہ حاسۂ بصر ہے جو انسان اپنی آنکھوں میں لئے پھرتا ہے۔ حاسۂ بصر تو صرف ایسا ظاہری سبب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص نظام اور معمول کے تحت دیکھنے کا ذریعہ بنا دیا ہے، اگر وہ کسی کو دکھانا چاہے تو آنکھوں اور بینائی کے بغیر بھی دکھا سکتا ہے، اور اگر کسی کو نہ دکھانا چاہے تو وہ کھلی آنکھ اور مضبوط بینائی رکھنے کے باوجود نہیں دیکھ سکتا۔

مثلاً ایک بڑا پہاڑ سامنے ہو اور اللہ کسی کی آنکھوں میں دیکھنے کی صفت پیدا نہ کرے تو وہ اس پہاڑ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح اگر کوئی اندھا شخص دنیا کے مشرقی کنارے پر ہو اور دنیا کے مغربی کنارے پر ایک مچھر پڑا ہو، اور اللہ تعالیٰ اس اندھے کو وہ مچھر دکھانا چاہے تو وہ یقیناً دیکھ سکتا ہے۔

پس واضح ہوا کہ دیکھنا اور دکھانا نظام قدرت کے تحت آنکھ کا عمل یا غیر عمل بے شک ہے، لیکن آنکھ کا وہ عمل یا اس عمل کی وہ طاقت جس سے انسان دیکھنے پر قادر ہوتا ہے غیر محدود اور خود مختار نہیں ہے، بلکہ اس کی کارکردگی اس حد تک ہے جہاں تک اللہ تعالیٰ نے اس

کو کارگر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی مصلحت چونکہ یہی ہے کہ وہ انسان کو دنیا میں اپنا دیدار نہ کرائے، اس لئے اس نے حاسۂ بصر میں وہ توانائی ہی نہیں رکھی جس سے خدا کو دیکھا جا سکے۔ اس بات کو دنیا کی چیزوں پر قیاس کرنا، عقل و قیاس کی مہمل تابع داری ہے۔

خواب میں اللہ کا دیدار:

کیا خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوسکتا ہے؟ اس بارے میں بھی علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ لیکن صحیح قول یہی ہے کہ خواب کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ صرف ممکن ہے بلکہ امر واقع بھی ہے، اور یہ از روئے عقل و نقل کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ایک قلبی مشاہدہ ہے جس کا تعلق مثال سے ہوتا ہے نہ کہ مثل سے، اور خدا کا مثل نہیں ہے اگر چہ مثال ہے۔

بہر حال! حالت خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار خدا رسیدہ لوگوں سے ثابت ہے، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا ہے، اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے، میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو دریافت کیا کہ وہ کون سا عمل ہے جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟ فرمایا تلاوتِ کلام مجید، پھر پوچھا کہ معانی و مطالب سمجھنے کے ساتھ، یا اس کے بغیر؟ فرمایا کہ خواہ معانی سمجھنے کے ساتھ تلاوت کرے یا اس کے بغیر۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار اور اس کی رؤیت (دیدار) ہوسکتی ہے۔

(مظاہر حق ج۵ص۲۲۶ تا ص۲۲۸)

احادیث مبارکہ کی توضیح

اب مذکورہ بالا احادیث کی توضیح کی طرف آیئے: حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ”تب حجاب اٹھا دیا جائے گا“ اس سلسلہ میں واضح رہے کہ حجاب کا اٹھنا اہل جنت کو حیرانی و تعجب سے نکالنے کے لئے ہوگا، یعنی اس وقت جنتی اس حیرانی و تعجب میں ہوں گے کہ آخر اب کون سی نعمت رہ گئی ہے جو اللہ تعالیٰ ہمیں عطا کرنا چاہتا ہے۔ تب

اللہ تعالیٰ اپنے دیدار کے ذریعہ گویا یہ فرمائے گا کہ دیکھو یہ ہے وہ نعمت عظمیٰ جو میں تمہیں عطا کرنا چاہتا تھا، اور یہ نعمت تمہارے اصل بدلہ اور جزاء سے زیادہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات حجاب و پردہ سے بے نیاز، پاک ومنزہ ہے، ایسا نہیں ہے کہ (نعوذ باللہ) وہ پردے میں چھپا ہوا ہے، اور جنتیوں کو دیدار کے وقت گویا اس کی نقاب کشائی ہوگی، ظاہر ہے کہ وہ محجوب ہے نہ کہ محجوب، وہ غالب مطلق ہے نہ کہ زیر حجاب مغلوب، پس ''حجاب اٹھا دیا جائے گا'' کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے حجاب ہٹ جائے گا تو وہ اپنے پروردگار کے دیدار سے شرف یاب ہوں گے۔ اس کی تائید خود حدیث کے اگلے جملہ ''اور جنتی ذات اقدس کی طرف دیکھیں گے'' سے ہوتی ہے۔

''اور اہل جنت کو ایسی کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی جو پرودگار کی طرف ان کے دیکھنے سے زیادہ بہتر و پسندیدہ ہو'' اس جملہ کے ذریعہ ایک ایسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ جس طرح اس دنیا میں حاصل ہونے والے تمام ذاتی وروحانی مراتب ودرجات کی رفعت اور بلندیاں، ذات باری تعالیٰ پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں، اسی طرح آخرت میں حاصل ہونے والی تمام نعمتوں اور سعادتوں کا منتہٰی، ذات اقدس تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ (مظاہر حق ج۵ص۲۲۹،۲۳۰)

کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا؟

مختلف روایات واقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کو بچشم سر دیکھنے کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں اختلاف ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اس بات سے انکار ہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کے قائل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی تائید حاصل ہے کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہیں اور کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ، پھر صحابہؓ کے بعد تابعین کرام اور سلف صالحین بھی اسی نقش قدم پر چلے ہیں، کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کچھ

حضرات اس کا انکار کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے سکوت وتوقف اختیار کیا ہے اور کسی بھی فریق کے ساتھ نہیں گئے ہیں، ان حضرات کا کہنا ہے کہ دونوں میں سے کسی جانب بھی واضح دلیل موجود نہیں ہے، اس لیے ہم یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں سکوت اور توقف ہی اختیار کیا جائے اور حقیقت حال اللہ کے سپرد کر دی جائے کہ اصل بات اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

تاہم جمہور علماء اسی کے قائل ہیں کہ شب معراج میں آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا عینی دیدار حاصل ہوا ہے۔

حضرت شیخ محی الدین نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر علماء کبار کے نزدیک راجح اور مختار یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے معراج کی رات اپنے پروردگار کو سر کی آنکھوں سے دیکھا، نیز انہوں نے کہا کہ اس کا اثبات آنحضرت ﷺ سے سماعت کے بعد ہی ہوا ہے (کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو یہ کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو شب معراج میں اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوا تو انہوں نے یہ بات آنحضرت ﷺ سے سننے کے بعد ہی کہی تھی) جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے انکار میں حدیث سے استدلال نہیں کیا ہے اور اس بارے میں آنحضرت ﷺ سے کچھ سن کر روایت نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کریم کی اس آیت: ''مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' اور اس آیت ''لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ'' سے ان کے اپنے اجتہاد اور استنباط کا نتیجہ ہے، جبکہ ان آیتوں کے بارے میں بھی ائمہ مفسرین نے لکھا ہے کہ پہلی آیت (مَا كَانَ لِبَشَرٍ الخ) میں جو نفی بیان کی گئی ہے وہ حالت رؤیت میں کلام کی نفی ہے جس سے رؤیت بے کلام کی نفی قطعاً لازم نہیں آتی اور دوسری آیت (لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ الخ) میں ''ادراک'' کا ذکر ہے جس کے معنیٰ ''احاطہ'' کے ہیں اور احاطہ کی نفی سے مطلق رؤیت کی نفی مفہوم نہیں ہوتی!

بعض علماء نے بھی لکھا ہے کہ مذکورہ مسئلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول پر زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے اور یہ طے ہے کہ انہوں نے یہ بات آنحضرت ﷺ سے سنے بغیر نہیں

کہی تھی اور یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ وہ اتنی بڑی بات اپنے ظن واجتہاد سے کہیں۔

منقول ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کافی بحث وتکرار کی اور پوچھا کہ کیا واقعۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے پورے وثوق کے ساتھ جواب دیا کہ ہاں، دیکھا تھا، چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی بات کو قطعی طور پر تسلیم کیا اور کسی تردد وانکار کا اظہار نہیں کیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اثبات اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے انکار کے درمیان جو تضاد ہے اس کو دور کرنے کیلئے یہ تاویل کی جانی چاہیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا انکار بچشم سر دیکھنے پر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اثبات بچشم قلب دیکھنے پر محمول ہے، لیکن ”بچشم قلب دیکھنے“ کا مطلب ”مجرد علم“ نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا علم وعرفان تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت ہی حاصل رہتا تھا، اس کو شب معراج کے ساتھ مخصوص کر کے بیان کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ لہٰذا ”بچشم قلب دیکھنے“ کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ اس خاص موقع پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں وہ بینائی (کی قوت) پیدا فرمادی تھی جو آنکھوں میں ہوتی ہے اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل کیا جو کوئی شخص آنکھوں کے ذریعہ دوسری چیزوں کا حاصل کرتا ہے۔“

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا منکرین دیدار کی تردید کرنا:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو جب بتایا گیا کہ کچھ لوگ جیسے معتزلہ، یہ کہتے ہیں کہ آخرت میں اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھیں گے اور قرآن کریم کی اس آیت: ”اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ“ کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھنے کے بجائے اس کے ثواب یعنی جنت کی نعمتوں اور وہاں کے مراتب ودرجات کو دیکھنا مراد ہے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کی زبردست تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ لوگ عقل وسمجھ سے کوسوں دور ہیں کہ بالکل ظاہری معنی رکھنے والی اس آیت کی غلط تاویل تو کرتے ہیں لیکن

اس آیت: ''كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ'' کو نہیں دیکھتے، جس میں اہل کفر کو اسی بات کی عار دلائی گئی ہے کہ وہ قیامت کے دن پروردگار کے دیدار سے روک دیئے جائیں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی سعادت سے محروم رہیں گے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور اس کے دیدار کی سعادت سے مشرف ہوں گے۔

آیات قرآنی کا ظاہری تعارض اور اس کا جواب:

قرآن کریم میں تین مختلف آیات ہیں:

(۱) لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

(پارہ ۷، رکوع ۱۹ سورۃ الانعام)

(۲) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (پارہ ۲۹، رکوع ۱۷، سورۃ القیٰمۃ)

(۳) كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (پارہ ۳۰، رکوع ۸، سورۃ التطفیف)

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ نگاہیں اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کرتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت (دیدار) نہیں ہوگی اور دوسری اور تیسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، اس لیے کہ دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بہت سے بارونق چہرے قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے اور تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ قیامت کے روز کفار اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان دیدار سے محروم نہیں ہوں گے، ان کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دیدار الٰہی سے محرومی کفر کے سبب ہوگی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کی وجہ سے دیدار نصیب ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر قیامت کے روز مومنین کو دیدار الٰہی نصیب نہ ہوتا تو کفار کو محرومی کے ساتھ عار نہ دلائی جاتی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ مومنین کو دیدار الٰہی نصیب ہوگا۔ (کما فی تفسیر الخازن)۔ بہرحال! ان آیات میں بظاہر تعارض ہے کہ پہلی آیت سے دیدار الٰہی کی نفی ہوتی ہے اور آخری دونوں آیتوں سے اس کا اثبات ہوتا ہے؟!

اس ظاہری تعارض کے چند جوابات ہیں:

(۱) نفی دنیا میں ہے اور اثبات آخرت میں ہے۔ یعنی **لا تدرکہ الابصار فی الدنیا**، دنیا میں آنکھیں اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کرتی ہیں، یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت نہیں ہوتی ہے، البتہ آخرت میں رؤیت ہوگی۔ آخر کی آیتوں میں ''یَوْمَئِذٍ'' کی قید سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اثبات رؤیت، آخرت سے متعلق ہے۔ یہ توجیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ''**لا تدرکہ الابصار فی الدنیا وھو یریٰ فی الاٰخرۃ**''۔ اثبات ونفی کا محل مختلف ہونے کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں رہا۔ (تفسیر الخازن)

(۲) پہلی آیت میں نفی ادراک کی ہے اور دوسری دو آیتوں میں اثبات رؤیت کا ہے۔ ادراک اور رؤیت میں فرق ہے۔ ادراک کہتے ہیں کسی چیز کو اس طرح سے دیکھنا کہ اس کی حدود و جوانب کا احاطہ ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ طول اتنا ہے اور عرض وعُمق کی مقدار اتنی ہے اور ایسی ایسی شکل وصورت ہے۔ اور رؤیت کہتے ہیں کسی چیز کا بغیر احاطہ کے معائنہ اور مشاہدہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ حدود و جوانب اور صورت وشکل اور جہات واطراف سے منزہ ومقدس ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں ہوگا البتہ رؤیت ہوگی، کیونکہ رؤیت بغیر احاطۂ حدود وجوانب کے ہو جاتی ہے۔ جمہور مفسرین نے اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے، نیز حضرت ابن جریر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک تفسیر یہی نقل کی ہے۔ **قال لا تدرکہ الابصار لا یحیط بصر احد باللّٰہ تعالیٰ**. لہٰذا جس چیز کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں اور جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں **فلا تعارض**۔

(تفسیر الخازن، المدارک ج ۲ ص ۲۱، روح المعانی)

(۳) قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا دیدار اذن الٰہی پر موقوف ہوگا، جب تک اللہ تعالیٰ ''ادراک'' کی اجازت نہیں دیں گے اس وقت تک نگاہیں ''ادراک'' نہیں کریں گی اور جب اجازت مل جائے گی تو ''ادراک'' ہوگا۔ پس پہلی آیت میں نفی ادراک، قبل از اجازت پر موقوف ہے اور آخری دو آیتوں میں اثبات ادراک بعد از اجازت پر محمول ہے۔ **فلا تعارض** (روح المعانی ۷ ص ۲۴۹)

(۴) اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی پہلی آیت کفار سے متعلق ہے کہ کفار کی نگاہوں کو اللہ کی رؤیت (دیدار) نصیب نہیں ہوگی اور دوسری دونوں آیتیں مومنین سے متعلق ہیں کہ ان کی نگاہیں اللہ کا دیدار کریں گی، اس کی تائید تیسری آیت: ''كَلَّآ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ'' سے ہوتی ہے کہ کفار اس دن اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے۔ **فلا تعارض بعد اختلاف الاشخاص** (مستفاد از حاشیہ جلالین)

(۵) حضرت ضرار بن عمرو الکوفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت میں آنکھوں کے ذریعہ ادراک و رؤیت کی نفی کی گئی ہے کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کریں گی، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز حواس خمسہ (پانچ حواس) کے علاوہ کوئی حاسۂ سادسہ (چھٹا حاسہ) پیدا فرمادیں جس سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا جائے، پس نفی رؤیت کا تعلق حاسۂ بصر کے ساتھ ہے اور اثبات رؤیت کا تعلق حاسۂ غیر بصر کے ساتھ ہے۔ **فلا تعارض**

(تفسیر کبیر ج ۴ ص ۱۱۶، روح المعانی)

اہل علم کے افادہ کیلئے تفسیر کبیر کی عربی عبارت نقل کی جاتی ہے:

''(الوجه الرابع) في التمسک بهذه الأية ما نقل أن ضرار بن عمرو الكوفي كان يقول ان الله تعالىٰ لايرى بالعين وانما يرى بحاسة سادسة يخلقها الله تعالىٰ يوم القيامة واحتج عليه بهذه الأية فقال دلت هذه الأية على تخصيص نفي ادراک الله تعالىٰ بالبصر و تخصيص الحكم بالشيء يدل على اَن الحال في غيره بخلافه فوجب أي يكون ادراک الله تعالىٰ بغير البصر جائزا في الجملة ولما ثبت أن سائر الحواس الموجدة الآن لاتصلح لذلک ثبت أن يقال انه تعالىٰ يخلق يوم القيامة حاسة سادسة بها تحصل رؤية الله تعالىٰ وادراكه''۔ (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۱۱۶)

(۶) علاوہ ازیں امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''اَلۡاَبۡصَارُ'' جمع کا صیغہ ہے جس پر الف لام داخل ہے اور صیغہ جمع پر الف لام کا داخل ہونا مفید استغراق و عموم ہوتا ہے، پس ''لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ'' کا مطلب ہوگا ''لَا تُدۡرِكُهُ جَمِيۡعُ الۡاَبۡصَارِ'' یعنی تمام

آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کریں گی اور یہ سلب عموم کا فائدہ دیتا ہے نہ کہ عموم سلب کا اور مجموعہ کا سلب، بعض کیلئے ثبوت حکم پر دلالت کرتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ''اِنَّ زیدًا مَاضَرَبَهُ کُلُّ النَّاسِ'' یعنی زید کو سب لوگوں نے نہیں مارا، اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ بعض نے اسے مارا ہے۔ اسی طرح آیت مبارکہ میں جب کہا گیا کہ سب آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کریں گی تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ بعض آنکھیں اس ذات کا ادراک کریں گی، پس پہلی آیت میں مجموعہ کی نفی ہے اور دوسری دو آیتوں میں بعض کیلئے اثبات ہے، جس کا اثبات ہے، اس کی نفی نہیں اور جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، لہٰذا ان آیات قرآنی میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۱۱۲)

افادۂ اہل علم کیلئے عربی عبارت ملاحظہ فرمایئے: **(الوجه الثالث) في الاستدلال بالأية أن لفظ الابصار صيغة جمع دخل عليها الالف واللام فهي تفيد الاستغراق فقوله لا تدركه الابصار يفيد أنه لايراه جميع الابصار فهذا يفيد سلب العموم ولا يفيد عموم السلب اذا عرفت هذا فنقول تخصيص هذا السلب بالمجموع يدل على ثبوت الحكم في بعض افراد المجموع ألاترى أن الرجل اذا قال ان زيدًا ماضربه كل الناس فانه يفيد أنه ضربه بعضهم فاذا قيل ان محمّدًا صلى الله عليه وسلم ما آمن به كلّ الناس أفاد انه آمن به بعض الناس وكذا قوله لاتدركه الابصار معناه أنه لاتدركه جميع الابصار فوجب أن يفيد أنه تدركه بعض الابصار أقصىٰ مافي الباب أن يقال هذا التمسک بدليل الخطاب فنقول هب أنه كذلک الا أنه دليل صحيح لان بتقدير أن لايحصل الادراک لاحد البتة كان تخصيص هذا السلب بالمجموع من حيث هو مجموع عبثًا و صون كلام اللّٰه تعالىٰ عن العبث واجب".** (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۱۱۶)

آخر میں بارگاہ خداوندی میں بصد عجز و نیاز دعا ہے کہ وہ ذات ہم جیسے سیاہ کاروں کو بھی محض اپنے فضل واحسان سے آخرت میں اپنا ''دیدار مبارک'' نصیب فرمائے۔

(آمین ثم آمین) (مزید تفصیل وتحقیق کیلئے امام ابن قیم الجوزیؒ کی تصنیف لطیف ''البیان فی اقسام القرآن ص ۱۲۰ تا ۱۶۴ مطالعہ فرمائیں'')

''لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ'' کی تفسیر:

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اس آیت مبارکہ میں ''الحسنیٰ'' سے مراد تو جنت ہے اور ''زِیَادَۃٌ'' سے مراد رب تعالیٰ کا دیدار ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تفسیر اسی طرح فرمائی ہے جن پر قرآن کا نزول ہوا ہے۔ اور آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی تفسیر کی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی (مذکورہ) روایت جو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، (اس سے واضح ہوتا ہے، کچھ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ) نیز حضرت حسن بن عرفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''**للّذین احسنوا العمل فی الدنیا الحسنی و هی الجنّة والزیادة هی النظر إلی وجه الله**'' یعنی جن لوگوں نے دنیا میں اچھے کام کئے ان کیلئے ''اَلْحُسْنٰی'' ہے اور اس سے مراد جنت ہے اور ان کے لئے ''زِیادۃ'' بھی ہے اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔

امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ: ''لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ'' میں ''زِیَادَۃٌ'' سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ''اَلْحُسْنٰی'' سے مراد جنت اور ''زِیَادَۃٌ'' سے مراد دیدار خداوندی ہے۔ اور اسد السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایک پکارنے والے کو بھیجے گا، جو پکار کر کہے گا کہ اے جنت والو! اور اس کی آواز ایسی ہوگی کہ اگلے پچھلے تمام اس (آواز) کو سنیں گے، اور وہ کہے گا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے

تمہارے ساتھ ''الحسنیٰ'' کا وعدہ فرمایا تھا اور ''الحسنیٰ'' سے مراد جنت ہے اور ''زیادۃ'' کا وعدہ کیا تھا تو اس سے مراد اس کا دیدار مبارک ہے۔

اور ابن وھب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک پکارنے والے کو حکم دے گا تو وہ پکار کر کہے گا، اور اس کی پکار کو اگلے پچھلے تمام سنیں گے، وہ پکارے گا کہ اے جنت والو! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ ''الحسنیٰ'' اور ''زیادۃ'' کا وعدہ کیا تھا تو ''الحسنیٰ'' سے مراد جنت ہے اور ''زیادۃ'' سے مراد رحمٰن کے چہرے کو دیکھنا ہے۔

بہرحال! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن حضرات سے ''زیادۃٌ'' کی تفسیر دیدار الٰہی سے نقل کی گئی ہے ان میں سے امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے ''لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''زِیَادَۃٌ'' سے مراد اللہ کا دیدار ہے، اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ''زِیَادَۃٌ'' سے مراد اپنے رب تعالیٰ کے چہرہ کو دیکھنا ہے، اور علی بن عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک آواز دینے والے کو بھیجے گا جو آواز دے گا، اے جنت والو! جن چیزوں کا تم سے رب تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کیا تم نے وہ تمام چیزیں حاصل کر لی ہیں؟ تو جنت والے ان چیزوں کی طرف دیکھیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے بطور اعزاز کے تیار کی ہونگی تو وہ کہیں گے کہ ہاں، ہم نے ہر چیز حاصل کر لی ہے تو وہ فرشتہ کہے گا ''للذین احسنوا الحسنی و زیادۃ'' اور ''زیادۃ'' سے مراد رحمان کے چہرہ کو دیکھنا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ ابوتمیمہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے بصرہ کی جامع مسجد میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرمار ہے تھے کہ بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن

ایک فرشتہ کو جنت والوں کی طرف بھیجے گا، تو وہ کہے گا کہ اے جنّت والو! کیا جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے تم سے وعدہ کیا تھا وہ سب تمہیں حاصل ہوگئی ہیں؟ تو وہ (یہ سُن کر) اپنے زیورات اور لباس کے جوڑوں اور نہروں اور پاکیزہ اور صاف ستھری بیویوں کو دیکھ کر کہیں گے کہ ہاں، ہم نے سب کچھ حاصل کرلیا ہے، فرشتہ پھر اسی طرح سوال کرے گا اور جنّت والے اسی طرح جواب دیں گے، جب تین بار اسی طرح سوال و جواب ہو جائے گا، تو وہ فرشتہ کہے گا کہ جن چیزوں کا رب تعالیٰ نے تم سے وعدہ کیا تھا کیا ان میں سے کوئی چیز باقی تو نہیں رہ گئی؟ وہ کہیں گے، نہیں، کوئی چیز باقی نہیں رہی، تب فرشتہ کہے گا کہ ایک چیز باقی رہ گئی ہے، بے شک اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا: "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ" آگاہ رہو کہ "الحسنٰی" سے مراد جنت ہے اور "زِيَادَةٌ" سے مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ اور اسباط بن نصر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اس آیت میں "الحسنٰی" سے مراد جنت اور "زیادۃ" سے مراد دیدار خداوندی ہے اور "قترٌ" سے مراد سیاہی ہے۔ (اسی طرح) عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ، عامر بن سعیدؒ، اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدیؒ، ضحاک بن مزاحمؒ اور عبدالرحمٰن بن سابطؒ، ابو اسحاق السبیعیؒ، قتادہؒ، سعید بن المسیبؒ، حسن بصریؒ، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، اور امام مجاہدؒ بن جبر فرماتے ہیں کہ "الحسنٰی" سے مراد جنت اور "زیادۃ" سے مراد اللہ تعالیٰ کے چہرے کو دیکھنا ہے، اور اس آیت کریمہ کی تفسیر میں بہت سے اسلاف فرماتے ہیں کہ "لَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ" سے مراد یہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے چہرہ کی طرف دیکھیں گے تو اس کے بعد کبھی یہ حالت ان پر نہ آئے گی اور اس بارہ میں احادیث صحیحہ موجود ہیں، اور جب اللہ تعالیٰ نے "زیادۃ" کا عطف "الحسنیٰ" پر کیا ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جنت اور ہے اور زیادۃ اور ہے، (کیونکہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے)، اور وہ جنت کے علاوہ ہے، اس پر زائد مقرر کیا ہے، اور جن لوگوں نے "زیادۃ" کی تفسیر مغفرت و رضوان سے کی ہے۔ تو یہ دیدار الٰہی والی روایات اور تفاسیر سے متعارض نہیں ہے، اس لئے کہ مغفرت اور رضوان، رب تعالیٰ کے دیدار کے لوازمات میں سے ہی ہے، ان ہی لوگوں کو

دیدار آخر تک نصیب ہوگا، جن کو مغفرت ورضوان کا پروانہ ملے گا جبکہ دوسرے اس سے محروم رہیں گے۔'' (حادی الارواح إلی بلاد الافراح ص۳۱۷)

بعض کہتے ہیں کہ "زیادۃ" سے مراد جنت عدن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت اور رؤیت ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے تضعیف اجر مراد ہے، اور بھی اقوال ہیں۔ (تفصیل کیلئے دیکھئے: عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ۲۸۵/۸، تفسیر مدارک التنزیل ج۲ص۱۲۳، لامع الدراری شرح صحیح البخاری ۱۰۳/۹)

بہر حال! مندرجہ بالا دوسری حدیث جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ: ''تا آنکہ پروردگار ان کی نظروں سے مخفی ہو جائے گا الخ'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب تک چاہے گا ان کی نظروں کے سامنے خود کو جلوہ گر رکھے گا اور پھر ان کی آنکھوں کے سامنے حجاب حائل کر دے گا، لیکن اس کے جلوے کی نورانیت اور اس کے دیدار سے حاصل ہونے والے کیف وسرور کا خمار باقی رہے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ حجاب اور جنتیوں کی نظر سے پروردگار کا مخفی ہو جانا بھی اس کی طرف سے اپنے بندوں پر ایک طرح کا لطف وکرم ہی ہوگا، کیونکہ پروردگار کا اہل جنت کو برابر اپنی بارگاہ اور حضور وشہود میں رکھنا اور ہر وقت ان کی نظر کے سامنے جلوہ گر رہنا ایک ایسی صورت حال ہوگی جو جنتیوں کی تاب وطاقت سے باہر ہوگی، ظاہر ہے ایک دفعہ دیدار کرنے کے بعد پھر ان کو اتنے عرصہ کی ضرورت ہوگی جس میں وہ خود کو سنبھال سکیں اور اپنی اصل حالت پر واپس آ جائیں تاکہ جنت کی دوسری نعمتوں سے لطف اندوز ہو کر ذات باری تعالیٰ کی تجلی کا استحقاق نئے سرے سے حاصل کر سکیں اور ہر بار دیدار الٰہی کا نیا ذوق اور نیا کیف وسرور حاصل کریں۔

(مظاہر حق ج۵ص۲۳۸)

(رؤیتِ باری تعالیٰ کے جواز پر متعدد دلائل اور منکرین رؤیت کے دلائل اور ان کے رد پر تفصیلی بحث وتحقیق کیلئے مطالعہ کیجئے: (حادی الارواح إلی بلاد الافراح لابن القیم الحنبلی'' اختصار کے پیش نظر یہاں اس کو چھوڑا جاتا ہے)

حق تعالیٰ کی خوشنودی:

(۳۰۰) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جنتیوں کو (مخاطب کرنے کیلئے) آواز دے گا کہ ''اے جنتیو!'' تمام جنتی (یہ آواز سن کر) جواب دیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم حاضر ہیں، تیری خدمت میں موجود ہیں، تمام تر بھلائی تیرے ہی قبضۂ قدرت اور ارادے میں ہے (کہ جس کو چاہے عطا کرے) اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''(میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ) کیا تم (جنت کا انعام پا کر) مجھ سے راضی اور خوش ہو؟'' وہ عرض کریں گے کہ پروردگار! بھلا ہم آپ سے راضی اور خوش کیوں نہ ہوں گے، آپ نے تو ہمیں وہ بڑی سے بڑی نعمت اور سرفرازی عطا فرمائی ہے جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''کیا میں اس سے بھی بڑی اور اس سے بھی بہتر نعمت تمہیں عطا نہ کروں؟ وہ کہیں گے کہ پروردگار! اس سے بھی بڑی اور اس سے بھی بہتر نعمت اور کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں تمہیں اپنی رضا اور خوشنودی عطا کروں گا اور پھر تم سے کبھی ناخوش نہ ہوں گا۔'' (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار ج ۸ ص ۱۱۴، مشکوٰة المصابیح، باب صفة الجنة و اهلها ص ۴۹۶، ۴۹۷)

نیز امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت کتاب التوحید، باب کلام الرب مع اهل الجنة پر بھی نقل کی ہے اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے تقریباً مذکورہ الفاظ ہی نقل کئے ہیں دیکھئے: صحیح البخاری ج ۹ ص ۱۵۱، مع شرح القسطلانی ج ۱۰ ص ۲۵۱ نیز امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مذکورہ روایت کتاب الجنة و نعیمها و اهلها میں (امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح) ج ۲ ص ۹۱ پر نقل کی ہے۔

فائدہ:

مولیٰ کریم کا اپنے بندے سے راضی اور خوش ہونا نعمتوں اور سعادتوں کے حاصل ہو جانے کی ضمانت ہے، لہٰذا جب پروردگار اہل جنت سے اپنی رضا و خوشنودی کا اظہار فرمادے گا تو گویا انہیں تمام ہی نعمتیں اور سرفرازیاں حاصل ہو جائیں گے اور عظیم ترین

نعمت ''دیدار الٰہی'' بھی اسی کا ثمرہ ونتیجہ ہے۔

پہلے اللہ تعالیٰ جنتیوں سے پوچھیں گے کہ آیا تم مجھ سے خوش اور راضی ہو؟ اور جب ان کی طرف سے اثبات میں جواب مل جائے گا تب اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اپنی رضا وخوشنودی کا اظہار فرمائیں گے، تا کہ واضح ہو جائے کہ بندے سے اللہ تعالیٰ کے راضی و خوش ہونے کی دلیل وعلامت یہ ہے کہ وہ بندہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا پروردگار بھی اس سے راضی اور خوش ہے۔

منقول ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، آپس میں یہ بحث وتمحیص اور غور وفکر کیا کرتے تھے کہ اس بات کو جاننے کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارا پروردگار ہم سے راضی اور خوش ہے؟ آخر کار انہوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ خود ہم اپنے رب سے راضی اور خوش ہیں تو ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ ہمارا رب بھی ہم سے راضی اور خوش ہے۔

''اور پھر تم سے کبھی ناخوش نہ ہوں گا'' ظاہر ہے یہ اہل جنت کے حق میں سب سے بڑی سرفرازی کی بشارت ہوگی کہ ان کا پروردگار ہمیشہ ہمیشہ ان سے راضی اور خوش رہے گا۔ اس سعادت ونعمت سے بڑی سعادت ونعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تھوڑی سی بھی رضا وخوشنودی پوری جنت اور جنت کی تمام نعمتوں اور سعادتوں سے بڑھ کر ہے، چہ جائیکہ وہ رضا اور خوشنودی مستقل طور پر ہمیشہ کے لئے حاصل ہو جائے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ'' (التوبہ:۷۲)

لہٰذا ہر صاحب ایمان کو یہی التجاء کرنی چاہئے کہ اے اللہ! ہم سے راضی ہو جایئے اور ہمیں بھی اپنے سے راضی رکھیئے (آمین)۔ (مظاہر حق ج۵ص۲۱۰)

جنت میں زراعت کی خواہش اور اس کی تکمیل:

(۳۰۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک دیہاتی مسلمان بیٹھا ہوا تھا اور آپ یہ حدیث ارشاد فرما رہے تھے کہ ''جنتیوں میں سے ایک شخص اپنے پروردگار سے کھیتی کی اجازت طلب کرے گا، اللہ تعالیٰ

اس سے فرمائے گا کہ ''جو کچھ تم چاہتے ہو وہ موجود نہیں ہے، (یعنی جب یہاں ہر جنس کی ہر وہ چیز موجود ہے جس کی تمہیں خواہش ہو تو، پھر کھیتی کرنے کی کیا ضرورت ہے) وہ شخص عرض کرے گا کہ بے شک یہاں سب کچھ موجود ہے، لیکن میری خواہش یہی ہے کہ میں کھیتی کروں، (آنحضرتؐ نے فرمایا) بہرحال اس شخص کو کھیتی کی اجازت دیدی جائے گی، اور وہ زمین میں بیج ڈالے گا اور پلک جھپکتے ہی سبزہ اگ آئے گا، اور جب ہی کھیتی بڑھ کر پک کر کٹ جائے گی، اور پہاڑ کے برابر انبار لگ جائیں گے، تب اللہ تعالیٰ اس شخص سے فرمائے گا کہ ''ابن آدم! (دیکھ، تیری خواہش پوری ہوگئی) حقیقت یہ ہے کہ تیری حرص کا پیٹ کوئی چیز نہیں بھرتی'' (راوی کہتے ہیں کہ یہ حدیث سن کر) وہ دیہاتی (جو حضورؐ کے پاس بیٹھا تھا) کہنے لگا، خدا کی قسم! وہ شخص یقیناً یا تو قریشی ہوگا یا انصاری (یعنی جنت میں کھیتی کرنے کی خواہش کرنے والا شخص یا تو مکہ والوں میں سے ہوگا یا مدینہ والوں میں سے) کیونکہ یہی لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں، جہاں تک ہم صحرانشین دیہاتیوں کا تعلق ہے، کھیتی باڑی سے ہمارا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے، (ہم تو جنگلوں میں اونٹ بکری چرا کر اور محنت مزدوری کر کے دودھ اور کھجوروں پر گزرا کر لیتے ہیں، ان چیزوں کے علاوہ ہمیں اور کسی چیز کی خواہش نہیں ہے) پس (اس دیہاتی کی یہ بات سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہنس پڑے'' (صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب کلام الرب مع اهل الجنة ج ۹ ص ۱۵۱، مشکوٰۃ المصابیح، باب صفة الجنّة واهلها ص ۵۰۰) نیز امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو کتاب المزارعة باب (خالی) کے تحت بھی (جو باب کراء الارض بالذهب کے بعد ہے) نقل کیا ہے۔

فائدہ:

''تیری حرص کا پیٹ کوئی چیز نہیں بھرتی''۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے آدم کے بیٹے! یہ تو ہوگیا کہ تو نے ایک خواہش ظاہر کی، اور ہم نے تیری وہ خواہش آن واحد میں پوری کردی، مگر ذرا سوچ کہ جنت میں تجھے ان گنت نعمتیں حاصل ہونے اور تیری خواہش کی ہر

چیز تجھے میسر ہونے کے باوجود تو نے کھیتی باڑی کرنے کی جو عجیب وغریب خواہش ظاہر کی وہ کس بات پر دلالت کرتی ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تیری حرص کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتا، اور عیش و تنعم کی آخری سے آخری حد بھی تجھے قناعت تک نہیں پہنچا سکتی، اس سے معلوم ہوا کہ حرص اور ترکِ قناعت، انسان کی جبلّت میں داخل ہے، اور یہ ایک ایسی خصلت ہے جو اس سے نکل نہیں سکتی، خواہ وہ جنت میں پہنچا ہوا کیوں نہ ہو۔ (مظاہر حق ج ۵ص ۲۲۵)

(اس حدیث مبارک کی مزید تشریح کیلئے دیکھئے: شرح القسطلانی ج ۱۰ص ۴۵۱)۔

دیدارِ الٰہی اور جنت کا بازار:

(۳۰۲) حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ (تابعی) سے روایت ہے کہ (ایک دن بازار میں) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات ہوئی تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ (جس طرح آج مدینہ کے بازار میں ہم دونوں کی ملاقات ہوئی ہے اسی طرح) جنت کے بازار میں ہم دونوں کو ملائے، حضرت سعید رحمۃ اللہ علیہ نے (یہ سُن کر) کہا کہ کیا جنت میں بازار بھی ہوگا؟ (حالانکہ بازار تو خرید وفروخت کی ضرورت پوری کرنے کیلئے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جنت میں یہ ضرورت پیش نہیں آئے گی) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، (جنت میں بازار بھی ہوگا مگر وہاں کا بازار دنیاوی بازار جیسی ضروریات پوری کرنے کیلئے نہیں ہوگا) مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا تھا کہ جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو اپنے اپنے اعمال کی فضیلت و برتری کے لحاظ سے جنت (کی منزلوں اور درجوں) میں فروکش ہوں گے، (یعنی جس کے اعمال جتنے زیادہ اور جتنے اعلیٰ ہوں گے اس کے اعتبار سے اس کو بلند تر اور خوب تر مکانات اور منازل ملیں گی)، پھر ان کو دنیاوی دنوں کے اعتبار سے جمعہ کے دن اجازت دی جائے گی، اور وہ سب اس دن اپنے پروردگار کی زیارت کریں گے، پروردگار ان کے سامنے اپنا عرش ظاہر کرے گا اور جنتیوں کو اپنا دیدار کرانے کیلئے جنت کے ایک بڑے باغ میں جلوہ فرما ہوگا، پس

(پروردگار کی زیارت کو آنے والے) جنتیوں کیلئے اس باغ میں (مختلف درجات کے منبر یعنی) نور کے منبر، موتیوں کے منبر، یاقوت کے منبر، سونے کے منبر اور چاندی کے منبر رکھے جائیں گے، جن پر وہ جنتی (اعمال وافعال اور مراتب ودرجات کے تفاوت کے اعتبار سے) بیٹھیں گے، (کہ جو جنتی جس درجہ اور مرتبہ کا ہوگا اسی کے مطابق اس کے لیے ان منبروں میں سے ایک منبر مخصوص ہوگا)، نیز ان جنتیوں میں سے جو جنتی ادنیٰ مرتبہ ودرجہ کا ہوگا (یعنی صرف مرتبہ کے اعتبار سے ادنیٰ) نہ کہ ان میں کوئی معمولی اور ذلیل ہوگا، وہ مشک اور کافور کے ٹیلوں پر بیٹھے گا (گویا منبر اور کرسیاں اعلیٰ مرتبہ والوں کیلئے مخصوص ہوں گے اور ادنیٰ مرتبہ کے لوگ ٹیلوں پر بیٹھیں گے، جیسا کہ دنیا میں بھی قاعدہ ہے کہ عام اجتماعات میں اونچی حیثیتوں کے لوگ کرسیوں اور شہ نشینوں پر بیٹھتے ہیں، جبکہ کم حیثیت کے لوگ زمین اور فرش پر بیٹھتے ہیں) لیکن ٹیلوں پر بیٹھنے والے لوگوں کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ منبر اور کرسیوں پر بیٹھنے والے لوگ جگہ اور نشست گاہ کے اعتبار سے ان سے برتر اور افضل ہیں''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا اس دن ہم اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ''ہاں، یقیناً، کیا تم سورج کو اور چودھویں شب کے چاند کو دیکھنے میں کوئی شبہ رکھتے ہو؟'' ہم نے عرض کیا: ہرگز نہیں، آپؐ نے فرمایا کہ ''اسی طرح تمہیں اس دن اپنے پروردگار کو دیکھنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوگا، اور دیدار الٰہی کی اس مجلس میں ایسا کوئی شخص باقی نہیں رہے گا جس سے پروردگار تمام حجابات اٹھا کر براہ راست ہمکلام نہیں ہوگا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ، حاضرین میں سے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمائے گا: ''اے فلاں ابن فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد ہے، جب تو نے ایسا ایسا کہا تھا (یعنی اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالے تھے، یا ایسے کام کئے تھے جو شرعاً ناجائز تھے؟ وہ شخص یہ سن کر گویا توقف کرے گا، اور اپنے کئے ہوئے گناہوں کے اظہار میں تأمل کرے گا) پس پروردگار اس کو کچھ اور عہد شکنیاں یاد دلائے گا جس کا اس نے دنیا میں ارتکاب کیا ہوگا (یعنی اس کے دنیا کے وہ گناہ یاد دلائے گا جن کے ارتکاب میں عہدِ ربوبیت کا توڑنا لازم آتا ہے) تب وہ شخص عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار! کیا آپ نے میرے وہ گناہ بخش نہیں

دیئے ہیں؟ پروردگار فرمائے گا کہ ''بے شک (میں نے تیرے وہ گناہ بخش دیئے ہیں) اور تو میری وسعت بخشش کے طفیل اس مرتبہ کو پہنچا ہے'' پھر وہ لوگ اسی حالت اور اسی جگہ پر ہوں گے کہ ایک بادل آ کر ان کے اوپر چھا جائے گا، اور ان پر ایسی خوشبو برسائے گا کہ انہوں نے اس جیسی خوشبو کبھی کسی چیز میں نہیں پائے ہوگی۔

اس کے بعد ہمارا پروردگار فرمائے گا کہ: ''لوگو! اٹھو اور اس چیز کی طرف آؤ جو ہم نے عظمت و بزرگی کی قسم میں سے تمہارے لئے تیار کر رکھی ہے اور تم اپنی پسند اور خواہش کے مطابق جو چاہو لے لو، (آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ سن کر) ہم جنتی لوگ اس بازار میں پہنچیں گے جس کو فرشتے گھیرے ہوئے ہوں گے، اس بازار میں ایسی ایسی چیزیں موجود ہوں گی کہ ان جیسی کوئی چیز نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوگی، نہ کسی کان نے سنی ہوں گی اور نہ کسی دل میں ان کا تصور آیا ہوگا، پھر اس بازار میں سے اٹھا اٹھا کر وہ چیزیں دی جائیں گی جن کی ہم خواہش کریں گے، درآنحالیکہ اس بازار میں خرید و فروخت جیسا کوئی معاملہ نہیں ہوگا (بلکہ وہ بازار دراصل جنتیوں کو ان کی من پسند چیزیں عطا کئے جانے کا مرکز ہوگا)، نیز اس بازار میں تمام جنتی آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک بلند مرتبہ شخص ایک ایسے شخص کی طرف متوجہ ہوگا اور اس سے ملاقات کریگا جو (مرتبہ میں) اس سے کمتر ہوگا۔ لیکن جنتیوں میں (کسی کا اعلیٰ ہونا اور کسی کا کمتر ہونا صرف مرتبہ اور درجہ کے اعتبار سے ہوگا)، یہ نہیں کہ کوئی معمولی اور کوئی ذلیل خیال کیا جائے گا۔ (گویا ذاتی اعتبار سے تو تمام ہی جنتی بلند حیثیت اور بلند عزت ہوں گے، تاہم دنیا میں اختیار کئے جانے والے اعمال و افعال کی نسبت سے کچھ لوگ اعلیٰ مرتبہ کے ہوں گے اور کچھ لوگ ان سے کم مرتبہ کے) بہر حال! اس بلند مرتبہ شخص کو وہ لباس پسند نہیں آئے گا جو وہ کمتر درجہ کے اس شخص کو پہنے ہوئے دیکھے گا اور ان دونوں کا سلسلہ گفتگو (یا ان کے خیالات کا سلسلہ) ختم بھی نہ ہونے پائے گا کہ وہ بلند مرتبہ شخص محسوس کرے گا کہ میرے مخاطب کا لباس تو میرے لباس سے بھی بہتر ہے، اور یہ (یعنی کمتر درجہ والے شخص کے جسم پر اعلیٰ لباس کا ظاہر ہونا) اس لئے ہوگا کہ جنت میں کسی شخص کو غمگین ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔

(آنحضرتؐ نے فرمایا) اس کے بعد ہم سب جنتی اپنے اپنے محلات اور مکانوں کی طرف واپس ہوں گے، اور وہاں ہماری بیویاں (یعنی دنیا کی بیویاں اور جنت کی حوریں) ہم سے ملیں گی تو مرحبا، خوش آمدید کہہ کر ہمارا استقبال کریں گی، اور ہر ایک عورت اپنے مرد سے کہے گی کہ تم اس حال میں واپس آئے ہو کہ اس وقت تمہارا حسن و جمال اس حسن و جمال سے کہیں بڑھ کر ہے جو ہمارے پاس سے جاتے وقت تم میں تھا، پس ہم اپنی بیویوں سے کہیں گے کہ آج ہم نے اپنے پروردگار کے ساتھ ہم نشینی کی عزت (اور اعزاز) حاصل کی ہے جو جسم و بدن اور حسن و جمال کی ہر کمی کو پورا کر کے خوب تر بنانے والا ہے، لہٰذا ہم اپنی اسی شان کے ساتھ واپس آنے کے لائق ہیں جس شان کے ساتھ کہ ہم آئے ہیں، (کیونکہ جس شخص کو اس ذاتِ عالی کی ہمنشینی حاصل ہو جائے کہ تمام تر حسن و جمال، اسی کے نور کا پرتو ہے، تو وہ شخص زیادہ سے زیادہ حسن و جمال کیسے نہیں پائے گا)''۔

(جامع الترمذی، باب ماجاء فی سوق الجنۃ ج ۲ ص ۸۹، ۹۰، مشکوٰۃ المصابیح، باب صفۃ الجنۃ و اھلھا ص ۴۹۹)

(۳۰۲) نیز امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو اپنی سنن ج ۲ ص ۳۰۷ پر نقل کیا ہے اور انہوں نے یہ الفاظ بھی زائد نقل کئے ہیں: ''پھر ان کے لئے نور کے منبر، موتیوں کے منبر، یاقوت کے منبر، زمرد کے منبر، سونے کے منبر اور چاندی کے منبر رکھے جائیں گے...... الخ''

نیز اس میں ہے کہ ''اس مجلس میں کوئی شخص ایسا باقی نہیں رہے گا جس سے اللہ عز و جل گفتگو نہ فرمائیں گے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے ایک شخص سے فرمائیں گے، اے فلاں شخص! کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ تو نے فلاں دن یہ کہا تھا اور اسے دنیا میں کئے ہوئے اس کے بعض عذر یاد دلائیں گے، وہ عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار! کیا آپ نے میری مغفرت نہ فرما دی تھی؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''کیوں نہیں! میری وسعت مغفرت کے سبب سے ہی تو تم اپنے اس مرتبہ اور درجہ تک پہنچ پائے ہو...... الخ''

اور اس میں یہ بھی ہے کہ: ''پھر (اس بازار سے) ہم اپنے لئے جو پسند کریں گے اٹھالیں گے، اور فرمایا (ان جنت والوں) میں سے کوئی شخص حقیر اور کمتر نہ ہوگا۔''

فائدہ:

جنت میں چونکہ نہ شب وروز کی گردش ہوگی اور نہ ایام کا وجود، لہٰذا دنیاوی اعتبار سے ''جمعہ کے دن'' سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کا عرصہ جتنے وقت پر مشتمل ہوتا ہے جنت میں اسی عرصہ کا تعین کر کے کچھ وقت کو ''جمعہ کا دن'' قرار دے دیا جائے گا، اور اس اعتبار سے وہ وقت گویا وہ دن ہوگا جو دنیا میں جمعہ کا دن ہوتا تھا، اور پھر اس وقت جنتیوں کو حکم ہوگا کہ اپنے پروردگار کی زیارت کیلئے اپنے اپنے محلات اور مکانات سے نکل کر فلاں باغ میں پہنچیں، پس جنت میں پروردگار کی زیارت کیلئے ''جمعہ کے دن'' کا تعین دراصل اس بات کا نتیجہ اور اجر وانعام ہوگا کہ وہ جنتی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جمعہ کے دن اپنے گھروں سے نکل کر جامع مسجد پہنچتے اور جمعہ کی نماز پڑھتے تھے۔

''پروردگار ان کے سامنے اپنا عرش ظاہر کرے گا'' اس جملہ میں ''عرش'' سے مراد پروردگار کا نہایت لطف وکرم اور زیادہ سے زیادہ رحمت وعنایت ہے، ورنہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ عرش، جنت کی چھت ہے، لہٰذا جنتیوں کے سامنے عرش کا ظاہر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

''نہ کہ ان میں کوئی معمولی اور ذلیل ہوگا'' یہ جملہ ماقبل عبارت کی وضاحت ہے، گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ میں نے جو یہ کہا ہے کہ ''ان جنتیوں میں سے جو جنتی ادنیٰ مرتبہ و درجہ کا ہوگا'' تو ''ادنیٰ'' سے مراد اعلیٰ درجات اور زیادہ سے زیادہ مراتب رکھنے والے جنتیوں کے مقابلہ پر کمتر درجہ اور قلیل مرتبہ رکھنا ہے، نہ کہ ''ادنیٰ'' کا لفظ حقارت کی جگہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ذات کے اعتبار سے ذلیل وحقیر اور ادنیٰ ہونا ہے۔

پس واضح رہے کہ جنت میں ذاتی شخصیت کی حد تک ہر جنتی یکساں مرتبہ کا ہوگا، کوئی کسی کے مقابلہ پر ذلیل وحقیر نہ ہوگا، صرف حیثیت اور مرتبہ کا فرق ہوگا کہ دنیا میں اختیار کئے جانے والے اعمال وافعال کے اعتبار سے کچھ لوگ اعلیٰ درجات اور زیادہ مراتب

کے حامل ہوں گے اور کچھ لوگ ان کی بہ نسبت کم درجہ ومرتبہ کے ہوں گے۔

''ٹیلوں پر بیٹھنے والے لوگوں کو یہ احساس نہیں ہوگا..... الخ'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ٹیلوں پر بیٹھے ہوں گے وہ کرسیوں اور منبروں پر بیٹھنے والوں کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں گے، کیونکہ جنت میں ہر شخص اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت پر صابر و شاکر ہوگا، جو لوگ کمتر درجہ کے ہوں گے وہ یہ جاننے کے باوجود کہ ہم کم تر درجہ کے ہیں اور ہمارے مقابلہ پر فلاں لوگ برتر درجہ کے ہیں، اپنے طور پر پوری طرح مطمئن ہوں گے، نہ وہ بلند مرتبہ کی آرزو کریں گے، نہ انہیں بلند مرتبہ کی محرومی کا احساس اور غم وافسوس ہوگا، اور نہ انہیں کسی طرح کی غیرت اور خجالت محسوس ہوگی۔

حدیث میں مذکور عبارت ''فیروعہ مایریٰ علیہ من اللباس'' (اس بلند مرتبہ شخص کو وہ لباس پسند نہیں آئے گا جو وہ کمتر درجہ کے اس شخص کو پہنے ہوئے دیکھے گا)۔اس عبارت کے دو مطلب ہوسکتے ہیں، اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ لفظ ''روع'' کے دو معنی آتے ہیں ایک ڈرانا، اور دوسرے خوش کرنا، پہلے معنی مراد لینے کی صورت میں اس عبارت کا ترجمہ اور مطلب وہی ہوگا جو اوپر بیان کیا گیا، یعنی جب وہ بلند مرتبہ شخص اس کم مرتبہ شخص کے بدن کا لباس دیکھے گا تو اس کو ذرا سی کراہت محسوس ہوگی، کیونکہ وہ لباس اپنے لباس سے کمتر درجہ کا ہوگا، دوسرے معنی کی صورت میں ترجمہ اور مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ بلند مرتبہ شخص اس کم رتبہ شخص کا لباس دیکھے گا تو اسے اس بات کی بہت خوشی محسوس ہوگی کہ خود ان کے جسم پر اعلیٰ لباس ہے، لیکن زیادہ صحیح معنیٰ پہلے ہی ہیں اور اس عبارت سے متعلق اگلے جملوں کا ترجمہ بھی اسی پہلے معنیٰ کو بنیاد بنا کر کیا گیا ہے۔

(دیکھئے: مجمع بحار الانوار ج ۲ ص ۳۹۹، مظاہر حق ج ۵ ص ۲۲۱، ۲۲۲)

بحمد اللہ تعالیٰ، ''مجموعہ احادیث قدسیہ''

مع جامع تشریحات وتوضیحات اور علمی نکات

بتاریخ ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ/۱۴، ستمبر ۲۰۰۹ء بروز پیر بعد العصر

پایۂ تکمیل کو پہنچا،

وللہ الحمد علیٰ ذلک

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.

اللّٰھم صلّ علیٰ محمدن النبیّ الامّیّ

وعلیٰ اٰلہ وصحبہ و بارک وسلم

محتاج دعا: ابو الحسّان خالد محمود بن مولانا حافظ ولی محمد قدس اللہ سرہ

(مدرس) جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور